

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ المؤمنون —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

## جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	.....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	.....	از: جناب غلام احمد پرویز
ناشر	.....	بزم طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	.....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
ایڈیشن اول	.....	فون نمبر 5714546-5753666
مطبع	.....	ستمبر 2007ء
	.....	باقرپرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآن فی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

## الانساب

### رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب میں کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قدیل آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلب نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شام جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطربیزی و عذراقتی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہیں منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محراب کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحن کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستارے گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمین انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیِ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ و رپکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر

بحق، دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

## اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ”اسوۂ حسنہ“ قرار دیا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رہبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو  
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام  
خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست  
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]



مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ  
نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ  
قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر  
انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا  
امکان ہے۔ لہذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ  
کو صحیح نظر آئے وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور  
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے  
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔ معراجِ انسانیت)



## فہرست مشمولات سورۃ المؤمنون

### مطالب القرآن فی دروس الفرقان

32	صلوٰۃ کے سلسلہ میں منشاء خداوندی اور فحشا کا تصور	15	پیش لفظ
33	قلب کی تبدیلی کے بغیر معاشرے کو بدلا ہی نہیں جاسکتا	15	پہلا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 1 تا 4)
34	قرآن حکیم کے نزدیک خشوع کا مفہوم	20	قرآنی الفاظ کے مفہوم کی ایک بین مثال مذہب میں نجات کا تصور؟
35	ذہنیت کی یہ تبدیلی انسان کو خود ہی کرنا ہوگی	21	نجات کا یہ تصور فیثا غورث کا دیا ہوا ہے
36	ارباب اقتدار سے میری التماس	22	ہندوؤں، عیسائیوں اور خود اپنے ہاں مذہبی دنیا میں نجات کا تصور
36	قرآن حکیم کے نزدیک لغویات کا مفہوم	23	نجات کے متعلق یہ تمام کے تمام تصور باطل ہیں
37	خود ساختہ مروجہ اسلام میں قدم قدم پر تضاد	24	قرآن حکیم نے انسانیت کو صراطِ مستقیم سے متعارف کرایا ہے
38	زکوٰۃ کے لیے اسلامی حکومت کا قیام از بس ضروری ہے	25	صراط کے بعد طبقاً عن طبع کی بلند ترین منازل
39	مملکت اسلامیہ زکوٰۃ لوگوں سے لگی نہیں بلکہ انہیں زکوٰۃ دے گی	25	زندگی کے کسی منزل پر رک جانے کا نام جہنم ہے
40	زکوٰۃ کا تو بنیادی معنی ہی نوع انسانی کو سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا ہے	26	انسان کے لیے قدم قدم پر اپنے سفرِ حیات کی پیمائش کرنا لازم ہے
40	جسمانی نشوونما کے ساتھ انسانی ذات کی نشوونما بھی	26	قرآن حکیم کے الفاظ میں فائزوں کا مفہوم
40	ذاتِ انسانی کی نشوونما کے لیے قرآنی حدود کا تعین اور ان کی اہمیت	26	انسانی نامہ اعمال کی برومندی کے سلسلہ میں زراعت کی مثال
	<b>دوسرا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 5 تا 7)</b>	27	زندگی کی کامرانی ایمان اور عمل صالح کا فطری نتیجہ ہے
42	قرآن حکیم کے نزدیک حفاظتِ عصمت کی اہمیت	28	زندہ قوم کے لیے زندگی کا ایک زندہ تصور
	جنسیات کے سلسلے میں اہل یورپ کے مفکرین کی	30	تسبیح کے مروجہ مفہوم کے بالمقابل قرآنی مفہوم
43	ریسرچ کے باوجود ان قوموں کی حالتِ زار	31	ایران کے آتش کدوں کے نزدیک گردش کا مفہوم
45	ہمارے ہاں کی کیفیت: بیباکی، آوارگی اور شادی	31	اپنی اپنی جگہ کائنات کی ہر شے معروفِ تسبیح ہے
45	حفاظتِ عصمت کے متعلق قرآن کا پیغام	32	نماز کے متعلق ہمارے ہاں الجھے ہوئے مسائل

70	قرآن حکیم وحی کی بنا پر ایک عالمگیر ضابطہ حیات ہے	47	جنسیات کے متعلق ڈاکٹر انون کے تحقیقاتی نتائج
70	اصل مسئلہ تو صحیح نظام حکومت کا ہے	49	جنسیات کے سلسلہ میں فرائیڈ کی تحقیق
	چودہ سو سال پیشتر قرآن کی طرف سے پیش کردہ	51	شرفِ انسانیت کا جوہر حقیقی دراصل تخلیقی قوت کا ظہور ہے
72	نظریہ میثاق کے خدوخال اور اس کی ضمانت	51	مرد اور عورت کو مساوی حیثیت دینے کے ثمرات
73	اسلامی حکومت کی شرطِ اوّل	53	ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت مشروط اجازت ہے
	سنگِ اسود کے اوپر ہاتھ رکھنا دراصل عہدِ پکا کرنے کا	55	نزولِ قرآن کے وقت عربوں کی معاشرتی زندگی
75	ہی معاملہ ہوتا ہے	55	قرآن حکیم کا غلام اور لونڈیوں کے متعلق پیش کردہ حل
76	حاکم اور رعایا کا قرآنی مفہوم	56	قرآن حکیم کے نزدیک غلاموں کے حقوق
78	امانات لوٹانے کا قرآنی مفہوم	57	دین کے مقامِ بلند کی پہلی منزل
	خدا تعالیٰ کی طرف سے نظامِ ربوبیت کا وعدہ	57	غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے وسیع میدان
81	جماعتِ مومنین کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے	58	انسان نے غلامی کی بیسیوں شکلیں ایجاد کر رکھی ہیں
83	خدا تعالیٰ سے بھی اس کے کیے گئے وعدہ کے متعلق پوچھا جاسکتا ہے	58	مذہب کے بالمقابل دین: پیغامِ موت ہے ہر نوعِ غلامی کے لیے
86	نظامِ ربوبیت کی تشکیل کے دوران کچھ مشکل گھاٹیوں کا ذکر	59	دینی معاشرے میں کوئی شخص تنہائی محسوس نہیں کرے گا
87	علامہ اقبال کے نزدیک چنگیزیّت کا مفہوم	60	خدا کے نزدیک سب سے بڑی نیکی
87	خدا اپنا وعدہ یا اپنا عہد کس طرح پورا کرتا ہے؟	60	غلام بنانے اور آزاد کرانے کے چکر میں ثواب کے حصول کا طریق
90	علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے نزدیک مملکت کے حصول کی اہمیت	60	غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مودودیؒ کی تفسیری بیان
90	قرآنی نظریہ میثاق کی بنیاد پر قائم ہونے والی مملکت کا حاصل	61	غلامی کے سلسلہ میں یو این او کا چارٹر ہمیں قبول نہیں
92	قرآن حکیم پیکر کی تبدیلی کے لیے جذبہ محرکہ عطا کرتا ہے	61	مملکتِ پاکستان میں لونڈیوں کے لیے مطالبہ
	یہ پوری کائنات تو بطور عطیہ انسان کو مل سکتی ہے	62	جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھنے کی بجائے تین تین ہزار لونڈیاں
93	لیکن جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں	63	آج مسلمان قوم کی حالت اور تواہم پرستی کا نتیجہ
	<b>چوتھا باب: سورة المؤمنون (آیات 12 تا 14)</b>	64	قوم کی جذباتی کیفیت کی وجہ جواز
97	دینِ خداوندی اور سیکولر ازم کا بنیادی فرق	65	عصمت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا اندازِ باریک بینی
98	انسان کی خصوصیت صرف Values (اقدار) کی بنا پر ہے		<b>تیسرا باب: سورة المؤمنون (آیات 8 تا 11)</b>
98	انسان اور گدھے کی طبعی مشینری میں کچھ فرق نہیں	68	گزشتہ سے پیوستہ
	انسان کو معاشرتی زندگی کی خاطر سوسائٹی کے قانون کی	68	امانات، معاہدات اور عالمگیر ضابطہ اخلاق کے مروجہ تصورات

110	نفسِ انسانی کی بنیاد پر انسان کا مقام بلند	99	لازمی ضرورت ہوتی ہے
110	لفظ اطوار کا مفہوم اور انسانی ذات	99	انسان کا وقار تو قانون کے احترام ہی میں ہے
111	تصوف کی دنیا نے خودی کا چہرہ ہی مسخ کر دیا ہے		سوسائٹی کے غلط نظام کے باعث انسانی فکر کی ناکامی
	خودی کے لیے Personality کے لفظ کی بجائے	100	اور اس کی مشکلات
112	Psyche کا لفظ بھی مکمل نہیں	100	انسانی عقل کے نزدیک مصائب و آلام کا تجویز کردہ حل
113	انسانی زندگی کا اصل مقصد نفسِ انسانی کی نشوونما کرنا ہے	101	انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل وحی کی روشنی میں موجود ہے
113	نفس یا خودی کی نشوونما کے لیے اقدار کی ضرورت لازم ہے		نزولِ قرآن کے وقت دنیا نے عرب کی علمی سطح اور
114	انسانی جسم کے فنا ہونے سے انسانی ذات ختم نہیں ہوتی	102	رحمِ مادر میں جنین کے متعلق قرآنی انکشافات
115	ذاتِ انسانی کا جو قطرہ موتی بن جائے تو پھر وہ سمندر کا حصہ نہیں بنتا		قرآنِ حکیم کا تو ایک ایک لفظ اپنی جگہ سائنٹفک ریسرچ
115	خدا تعالیٰ تو انسانی ذات کو مقامِ بلند پر فائز کرنا چاہتا ہے	102	کی انتہا ہوتا ہے
115	ذاتِ انسانی کو مستحکم کرنے کی خاطر ارادے کا محکم ہونا لازم ہے	103	تخلیقِ آدم کے سلسلہ میں سائنسی انکشافات
116	دنیا نے تصوف نفسِ انسانی کے مقامِ بلند کی سوچ سے بہت بعید ہے		انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہمارے ہاں صدیوں سے
	اقبال کے الفاظ میں عظمتوں کے اس مقام پر ایک احتیاط کو	104	پائے جانے والے تصورات
116	پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا	104	رحمِ مادر میں قدم قدم پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ
117	انسان کو تو درجہ بدرجہ بلندیوں کی ہی طرف بڑھتے جانا ہے	105	آج کی سائنٹفک ریسرچ کا آخری مقام
	حقیقی عمل خدا پرستی نہیں بلکہ احکامِ خداوندی کی اطاعت ہے	106	اس مادی جسم کے بعد انسان اور حیوان میں ایک خط امتیاز کھینچ دیا گیا
118	جس سے انسانی ذات میں چٹنگی آتی ہے	106	آخر کے لفظ کا مفہوم
	قرآنِ حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظریہ حیات کو نہ اپنانا		خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے روحِ خداوندی کا
119	خدا کو فراموش کرنا ہی نہیں بلکہ اپنی ذات کو بھی بھلا دینا ہے	107	لفظ انسان کے اختیارِ ارادہ کی قوت کے عطا ہونے کا نام ہے
120	اپنی ذات کا انکار خدا کی ذات کے انکار سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے		ہمارے ہاں روحِ خداوندی کے متعلق پائے جانے
	<b>پانچواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 15 تا 22)</b>	108	والے غلط تصورات کا نتیجہ
122	کفر اور اسلام کا مدار انسانی ذات یا خودی کے صحیح تصور پر ہے	108	مقلد کا قرآنی مفہوم اور تقلید پرستی کا نتیجہ
123	خدا کے صحیح تصور کے بغیر مسلم اور کافر کا فرق متعین نہیں ہوتا		کائنات کی کسی شے کو بھی اختیارِ ارادہ کی یہ قوت (روح)
123	آج دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ابتری کی وجہ جواز اور اس کا حل	109	عطا نہیں کی گئی
	حیوان ہمیشہ ہر جگہ مکمل شکل میں دنیا میں آتا ہے جبکہ	109	علامہ اقبالؒ کی زبانی ”خلقا آخر“ کی تفسیر

135	انسانی ذات کے متعلق اہل تصوف کا نظریہ حیات	124	انسان کی یہ کیفیت نہیں ہوتی
136	قرآن حکیم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ ماسکہ ذاتِ انسانی کا تعارف ہے		حیوان کے مد مقابل انسان کے سامنے زندگی کا ایک عظیم
	قرآن حکیم کا نظام حیات انفرادیت کی بجائے	124	مقصد ہوتا ہے
136	اجتماعیت کا درس دیتا ہے	125	قدرت صرف آدمی پیدا کرتی ہے انسان اس نے خود بننا ہوتا ہے
136	تبلیغ اور احسان کا مفہوم	126	خلد کا قرآنی مفہوم
138	انسان کی ہر دو قسم کی پرورش کی اہمیت اور خدا تعالیٰ کی ذمہ داری	126	خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کے فرشتے مومنین پر بھی دور بھیجتے ہیں
138	چودہ سو سال پہلے آسمانی کڑوں کی کیفیت کا بیان	127	قرآن حکیم نے اپنے ہاں آدم اور انسان میں واضح فرق بیان کیا ہے
139	1913ء میں یورپ کی علمی سطح کی حالت		قرآن حکیم کی تعلیم کا بنیادی مقصد انسان کو اس کے
	سامان نشوونما کے پیش نظر سمندر کے پانی کو کشید کرنے	128	مقام سے آگاہ کرنا ہے
139	کی غرض سے سورج کی بھٹی کا انتظام		قرآنی اقدار پر عمل پیرائی کا نتیجہ ہر قدم پر نفع کی شکل
	رزق کی فراوانی اور زندگی کو زندہ رکھنے کے لیے	128	میں سامنے آتا ہے
141	پانی کے مہیا کرنے کا حیران کن انتظام		نیک و بد اعمال کے نتائج انسانی ذات پر نفسیاتی اثرات
	قدرت کی طرف سے یہ تمام نعمتیں کسی ایک فرد کے لیے	128	کی شکل میں مرتب ہوتے ہیں
142	نہیں ہیں بلکہ ”لکم“ (تم سب) کے لیے ہیں	129	انسانی ذات پر مرتب ہونے والے اثرات دو قسم کے ہوتے ہیں
142	دنیا کی ساری جنت ”لکم“ کے ایک لفظ میں پوشیدہ ہے		جسمانی موت کے بعد زندگی کا اگلا پروسس مزید
	جسمانی طور پر رزق کا یہ سارا نظام ایک عظیم مقصد کے	129	ارتقائی منازل کی طرف
143	حصول کا ذریعہ ہے	131	انسان کے لیے ذات کے تصور سے انکاری ہونا سب سے بڑا کفر ہے
	ایک جنین سے جسمِ انسانی، جسمِ انسانی سے نفسِ انسانی		خدا کے متعلق موجودہ سائنسٹسٹ کا تصور ہمارے ہاں کے
	اور اس نفسِ انسانی کی نشوونما کے بعد جہانِ فردا کی کئی	131	تصور سے زیادہ علی وجہ البصیرت ہے
144	ایک نئی اور طویل منازل کی طرف سفر کا آغاز	132	آج کے نوجوانوں کی پریشانی
	<b>چھٹا باب: سورة المؤمنون (آیات 23 تا 26)</b>	133	بادشاہ کا ذہن اور بچے کا ذہن ایک ہی جیسا ہوتا ہے
145	انسان کی زندگی کی دو سطحیں: حیوانی اور انسانی	133	خدا کا تصور قرآن کے آئینے میں
	نوعِ انسانی کی جانب سلسلہ نبوت جاری کرنے کی		قرآن حکیم نوعِ آدم کا ترجمان ہے وہ انسانی زندگی کی اقدار
146	غرض و غایت کیا تھی؟	134	تو دیتا ہے کسی کو ڈراتا نہیں ہے
	دین کی اہمیت کے سلسلہ میں قرآنی تعلیم کی جامعیت	134	قرآن کے نزدیک انسانی نفس کی اہمیت

148	کی ایک روشن مثال	169	قوموں کے جرائم کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا انداز بیان
150	قرآنی اقدار کے اس انقلابی اقدام کی غرض و غایت	171	طوفانِ نوح ♦ کے سلسلہ میں کشتی کی تیاری اور مخالفانہ ذہنیت
151	فرقہ بندی کو شرک قرار دینے کی وجہ جواز		انسانی ذہنیت میں احترامِ آدمیت کے جذبے کی اہمیت اور
152	انسانی تصورات کو قبائلی طور پر تقسیم کرنے کا ابتدائی عمل کیسے شروع ہوا؟	174	قائد اعظم کا ایک واقعہ
153	نام و نمود کے تصور کے تحت زندہ رہنے کا فریبِ تمنا	175	قرآن حکیم کے نزدیک اہل کا مفہوم
154	مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی	176	کسی چیز سے بچ جانا کافی نہیں ہوتا
155	ملکیت کے تصور کے متعلق محققین کی موجودہ تحقیق	177	قرآن حکیم میں ”آیات“ کا مفہوم
156	نوعِ انسانی میں اختلافات کی نوعیت اور وسعت		نوعِ انسانی میں نسلی امتیاز کی بنیاد قبیلے کی صورت میں
157	گھٹا ٹوپ اندھیروں میں قندیلِ آسمانی کی نعمتِ عظمیٰ	178	اُبھری اور پاکستان کی مثال
158	انسانی معاملات کے حل کے سلسلہ میں عقل و فکر کی زبوں حالی		بیٹے کے ڈوبنے پر حضرت نوحؑ کے استفسار پر خدا تعالیٰ کا جواب
159	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا	180	تشکیلِ قومیت کا ابتدائی فارمولا اور غیر متبدل اصول
	اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کی کتاب کو حاکم تسلیم کیے	182	نسلی امتیاز کے سلسلہ میں ہمارا باہمی برتاؤ
160	بغیر باہمی اختلافات ختم ہو ہی نہیں سکتے	184	پہلی وحی کی اصولی ہدایت اور راہنمائی
160	دین کی حکمرانی میں مذہبی فرقوں کا تصور ممکن ہی نہیں	184	قرآن حکیم میں کوئی بات بھی مافوق الفطرت نہیں ہے
	دین کے نظام کی سب سے زیادہ مخالفت سرمایہ داروں		انسانی کوتاہیوں اور بد اعمالیوں کا نتیجہ طبعی اسباب کی
161	کی طرف سے ہوتی ہے	185	شکل میں سامنے آتا ہے
	معاشرے میں کام کرنے والوں (یعنی کمیوں) پر کام	186	طبعی چیزوں کا اخلاقیات کے ساتھ باہمی ربط
162	نہ کرنے والوں کی حکومت	187	جاپان کی مادی دنیا پر اخلاقیات کا اثر
	حضرت نوح کے دور میں بھی سب سے پہلا اختلاف	190	انسانیت کے لیے سب سے بڑی نعمت اور دولت سمع و بصر ہے
164	دولت کے معیار پر تھا	191	خود نمائی کی ہوس کا نتیجہ قوموں کی تباہی کی شکل میں نکلتا ہے
164	دین کی تعلیم دینے والا کسی شخص سے معاوضے کا طلب گار نہیں ہوتا	192	آخر قومِ عاد کیوں تباہ ہوئی؟ لفظ جرم کا قرآنی مفہوم
165	ہر نبی کی پیش کردہ تعلیم کا مرکزی نکتہ طبقاتی فرق کو مٹانا ہوتا تھا	193	صاحبِ اقتدار کے کردار کا قوم کی تمدنی زندگی پر اثر
166	قرآن حکیم کی تعلیم مساواتِ انسانیہ کے سوا کچھ اور نہیں	194	المتکبر اور کبریا کی حقیقی مقام
	<b>ساتواں باب: سورة المؤمنون (27 تا 33)</b>		<b>آٹھواں باب: سورة المؤمنون (34 تا 43)</b>
168	انبیائے کرام کی بعثت کا اولین مقصد	197	گزشتہ سے پیوستہ

199	وحدتِ انسانیت کے اعتبار سے خونی رشتہ کوئی رشتہ نہیں ہوتا	224	فرعون کی سیاست میں سرفرازی یا حمیت کا اظہار موت کو دعوت دیتا ہے
200	تقسیم کار کی بنیاد پر قومیت کا تصور اور طبقاتی تفریق خلافِ قرآن ہے	226	فرعون کا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار دوسروں کی روٹی پر قبضہ تھا
201	قومِ عاد میں حاکم اور محکوم کی تفریق		حضرت موسیٰ ♦ کی زبان میں لکنت کا معاملہ اور
201	قومِ ثمود کا ذکر: گلہ بانی کی بنا پر باہمی تفریق یعنی	227	حضرت ہارون ♦ کی رفاقت کی التجا
201	ایک زمیندار دوسرا مزارع		فرعون کی سیاست اور پروپیگنڈا کی مشینری نے
202	غلط نظام کے اندر ہر قسم کا مادی سہارا تباہ ہو جاتا ہے	228	انسانی جذبات کو مدہوش کر دیا تھا
	معاشرے میں یہ کمزور اور غریب سرمایہ داروں کے پیدا		فرعون سے حضرت موسیٰ ♦ کا مطالبہ: ”قوم بنی اسرائیل کی آزادی“
204	کردہ ہوتے ہیں	229	قومِ موسیٰ ♦ کے روپ میں تحریک پاکستان کی کہانی تاریخ کی زبانی
205	دراصل یہ مخالفت انبیائے کرام کی نہیں تھی بلکہ خدا کے پیغام کی تھی	230	ہندوؤں کی نظر میں مسلمان اچھوتوں سے بھی کم تر تصور کیے جاتے تھے
	معاشرے کی تمام ناہمواریاں دارالسلطنت میں بیٹھے	232	تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جناب پرویز کو قائد اعظم کا فرمان
207	چند ایک سرغٹوں کی وجہ سے ہوتی ہیں	232	علامہ اقبال کی نظر میں محکوم قوم کی ذہنی پستی کی حالت
	نوعِ انسانی کے معاشی مسئلہ کا حل میری اور تیری کی	233	جب کوئی قوم اٹھ کھڑی ہو تو پھر خدا بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے
208	تفریق مٹانے میں مضر ہے		فرعون اس لیے فرعون تھا کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنا
209	قرآن حکیم کے معاشی نظام کی ایک روشن مثال	233	عبد بنا کر رکھنا چاہتا تھا
210	قرآن حکیم کے معاشی نظام کے متعلق حضور کی ایک حدیث	234	حضرت موسیٰ ♦ کے ساتھ فرعون کی ایک سرمایہ دارانہ چال
211	طبقاتی نظام حیات کا نتیجہ ایک الم انگیز تباہی ہے	234	خدا کے نور سے دیکھنے والی ہستی حضرت موسیٰ ♦ کا فرعون کو جواب
211	ظہور نتائج کے وقت خدا کا ہاتھ کا پتا ہی نہیں		تحریک پاکستان کے سلسلہ میں نیشا لٹ علما
212	پورے کا پورا نظامِ دین انہی تفرقوں کو مٹانے کی وضاحت میں مضر ہے	235	حضرات کی طرف سے مخالفت میں دیئے گئے دلائل
213	معاشرے میں طبقاتی تفریق پیدا ہونے کی وجہ اور اس کی اصلاح	236	لوگوں کو مذہبی جذبات برا بیچنے کرنے والی فرعون کی ایک چال
214	انسانی سطح کا تصور ہی معاشرتی مصائب و آلام کا حل ہے	237	فرعون کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی سودے بازی کا مطالبہ
215	جہاں فرد کی تصویر کشی نبأ واز بلند اپنے جرم کا اعتراف		ہندوستان میں انگریز کے غلبہ اور ہندوؤں کے تغلب کے بالمقابل
216	جرم کی سزا از خود وارد ہوتی ہے	237	مسلمانوں میں ابھرنے والا جو ہر مردانگی
	<b>نواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 44 تا 49)</b>		قائد اعظم کی جوان ہمتی کے سلسلہ میں
221	اپنے اپنے دور میں انبیائے کرام کی تعلیم کا خلاصہ	239	پرویز کی چشم دید گواہی اور ماؤ بیٹن کا اعتراف
223	فرعون کا سب سے موثر حربہ قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرنا تھا		قائد اعظم کے آنسو ان کی بلند ہمتی کا اظہار اور

270	خوف و حزن کے سلسلہ میں پیغام خداوندی	240	ایک نصیحت کا ”کام تیز کر دو“
270	خوف و ہراس کے ماحول میں پرورش پانے سے بچنے کی ذہنی کیفیت	241	نوع انسان کے لیے قرآن حکیم کا ابدی پیغام اور ابدی اصول
272	عربی لغت میں خوف کے ”معنی کسی عمل کے انجام سے آگاہ ہونا ہے“	<b>دسواں باب: سورة المؤمنون (آیات 50 تا 56)</b>	
273	انسانی معاشرہ میں نظامِ عدل کی اہمیت	244	عالم گیر سطح پر وحی کی تعلیم کا مقصد امت واحدہ کی تشکیل ہے
274	ایمان بالآخرت کی حقیقت اور اس کے نتائج	246	احبار و رہبان کی اصطلاحات کا مفہوم
275	خدا کے صحیح تصور کا جاننا اور ماننا ایک بنیادی امر ہے	247	حضرت عیسیٰ ﷺ کا ”جرم“
277	ہمارے ہاں قرآن حکیم کے تراجم کا معیار		حضرت عیسیٰ ﷺ کے دور نبوت میں مذہبی پیشوائیت کی
278	شفق کا قرآنی مفہوم	250	اجارہ داری کی کیفیت
279	شرک کی ایک واضح تر مثال	251	ہیکل کے اندر حضرت عیسیٰ ﷺ کا انقلابی خطاب
280	دو لفظوں میں قرآن حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت	253	قرآن حکیم نے انسانی ذہنیت کی ترجمانی کی ہے
281	انسانی ذات کی نشوونما کے قوانین صرف وحی کے ذریعے ہی ملتے ہیں	253	احبار و رہبان کی ذہنیت کی بنا پر فرقہ بنتا ہے
281	زکوٰۃ کا ادا کرنا حکومت کا فریضہ ہے		قومیت کے معیار پر علامہ اقبال ؒ اور حسین احمد مدنی ؒ
282	مملکت اسلامیہ اور دوسری مملکتوں میں ایک بنیادی فرق ہے	254	کی سوچ میں فرق
282	ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے دو مختلف میدانوں کی نوعیت	255	انجیلوں کی کہانی، حقائق کی زبانی
283	قرآن حکیم میں لفظ ”وسعت“ کی حدود کا تعین		ہیکل میں کاہن کے منصب کی کیفیت اور
287	ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لپٹا ہوا ہوگا	257	احبار و رہبان کی مخالفت کی وجہ
288	معاشرے کے مترفین کا انجام	259	نظام سرمایہ داری کا نتیجہ
289	انجام کار کے سلسلہ میں قرآن کا محاکاتی انداز	260	سامری کا کردار
289	ظہور نتائج کے موقع پر انسان کی نفسیاتی کیفیت	263	سلطانی و ملائی و پیری کے کشتہ نے قوموں کی قوموں کو ہلاک کر دیا
290	اسلامی مملکت اور ملوکیت میں ایک بنیادی فرق		نوع انسانی میں رنگ، نسل، وطن، زبان اور زمان و مکاں
292	Accountability (جواب دہی) کا ذریعہ صرف قرآن حکیم ہے	264	کے بعد کے باجود امت واحدہ کا قرآنی تصور
292	ہر کسی کو خدا کے ہاں یہ جواب دینا ہوگا کہ کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا	265	فرقہ بندی کی بنیادیں مستحکم رکھنے کی ایک نئی چال
<b>بارہواں باب: سورة المؤمنون (آیات 66 تا 75)</b>		<b>گیارہواں باب: سورة المؤمنون (آیات 57 تا 65)</b>	
294	دھاندلی اور اس کی نوعیت کا انجام	268	انبیائے کرام کی تعلیم کا مرکزی نکتہ
296	حضور ﷺ کی چالیس سالہ زندگی بطور شہادتِ سچائی کا ثبوت تھی	269	نوع انسانی کا دو گروہوں میں تقسیم ہونے کا معیار



297	خود ساختہ روایات پر مبنی ہماری سوچ کا معیار	314	نبی کے زیر تربیت تیار ہونے والی قوم کی خصوصیت
297	طبعی طور پر آپ ﷺ کی یہ کیفیت کبھی نہیں تھی	314	آخرت کے لمحات دراصل حال کا ہی پرتو ہوتے ہیں
298	قرآن فہمی کے لیے محاورہ عرب کا سمجھنا ایک لازمی امر ہے	<b>تیسروں باب: سورة المؤمنون (آیات 76 تا 90)</b>	
298	وحی کے نزدیک نوع انسانی میں مراتب کا معیار	317	مادی تصویر حیات کا دوسرا نام سیکولر نظام بھی ہے
298	دنیاۓ عرب میں نبی اکرم ﷺ کی خاندانی اور معاشرتی حیثیت	317	سیکولر نظام کا قوموں کی موت و حیات پر اثر
299	نبی اکرم ﷺ کا پیغام اہل عرب کے نام	318	غلط اور متضاد تصورات کی مثال
	سودوزیاں کے سلسلہ میں انبیائے کرام کی سوچ کے	319	مَسْنَدُ جُہم کا اور عذاب کا قرآنی مفہوم
301	پیمانے اور ہمارے ہاں کی روایات	320	غلط نظام کا تباہ کن نتیجہ
303	ہم نے آج بھی سید اور جولاہے میں امتیاز روا رکھے ہوئے ہیں	321	ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آنے کی صورت کیا ہوتی ہے؟
304	خارجی کائنات میں قانون سازی کی اہمیت کا حاصل	322	قوم و ملک کی تباہی کی شکلیں
304	انسانی سوچ کی متضاد کیفیات کا نتیجہ	323	تباہ حال قوم کے خلاف ظالم قوموں کا اتحاد اور ان کا طریق کار
305	دنیاۓ مذاہب سراپا تو اہم پرستیوں کا کھیل ہے	323	دنیاۓ انسانیت میں سب سے بڑا ظلم انسان کی تذلیل کرنا ہے
	سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات کے اقرار اور انکار	324	انسان کے اندر فیصلہ کرنے والی قوت کا تذکرہ
	میں آخر فرق کیا ہے؟	325	قرآنی لفظ افندہ کا اور شکر کا مفہوم
306	ایمان باللہ کا حقیقی تصور اور اس کا نتیجہ	325	تقلید پرست قوموں کی زبوں حالی
308	قرآن حکیم کا قابل غور و فکر پیغام	326	قرآن حکیم کے غلط تراجم کی ایک واضح مثال
308	قرآن حکیم کے نزدیک پاگل کون ہے؟	326	انسان اور حیوان میں صرف بصیرت کا فرق ہے
309	انسانیت کی دنیا میں سب سے بڑا ظلم تکبریم انسانیت کا نہ ہونا ہے		سامان زیت کی اس قدر فراوانی اور انسان کی غلط
310	قوائین خداوندی سے بے اعتنائی کا نتیجہ	328	جذباتی کیفیت کا نتیجہ
311	قرآن حکیم کی تعلیم کا عطا کردہ مقام بلند	329	قوموں کی موت و حیات خدا کے عطا کردہ پیمانوں کے مطابق ہوتی ہے
311	نبی کے مدعا میں ”حَوَّج“ کی کیفیت نہیں ہوتی	330	قرآن حکیم کے نزدیک خدا تعالیٰ کو ماننے کا ایک الگ تصور ہے
312	خیرات کے سلسلہ میں ایک حدیث مبارک	331	ہمیں بھی قرآن کریم میں دیئے گئے خدا کے تصور پر عمل ایمان لانا ہوگا
312	رزقِ حلال کے اثرات کی کیفیت صراطِ مستقیم کی شکل میں ہوتی ہے	333	روس میں مسلمانوں کے لیے مذہبی آزادی کی کیفیت
313	خدا نے تو اپنے آپ کو سیڑھیوں والا خدا بھی کہا ہے	334	تحریک پاکستان کی جنگ اور علامہ اقبالؒ کا ”خواب“
313	آخر انسان اس صراطِ مستقیم کو قبول کیوں نہیں کرتے؟	335	قرآنی ضوابط کو عملی شکل دیئے بغیر خدا پر ایمان قابل قبول ہی نہیں ہوتا

363	فیثا غورث کے پیدا کردہ اسی چکر میں گرفتار ہے	چودھواں باب: سورة المؤمنون (آیات 91 تا 98)	338	خدا تعالیٰ کے متعلق انجیل کا بیان
374	ہندو دھرم کی ساری بنیاد آج بھی اسی چکر کے عقیدہ پر ہے		339	عیسائیت کی پیروی میں مسلمانوں کے وضع کردہ عقائد
	تصور اور اگون کے برعکس، قرآن حکیم کا پیش کردہ ایک		340	عقیدہ حلول کے متعلق پائے جانے والے تصورات
364	عظیم تصور حیات 'صراط المستقیم' ہے		343	سنی حضرات کے عقائد
365	برزخی زندگی کا تصور اور عذاب قبر کی حقیقت		345	لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مفتی محمد شفیع مرحوم کا فتویٰ
	برزخ ایک پردہ ہے جہاں اہل قبور اہل دنیا کی نہ سن سکتے ہیں			محی الدین ابن عربی کا نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی
366	نہ سن سکتے ہیں		346	کے متعلق تصور اور ان کی تعلیم کا ماخذ
367	روز قیامت صنور پھونکنے کا قرآنی مفہوم		347	محی الدین ابن عربی کے عشق کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی
367	نجات کا یا عذاب کا تصور دوسروں نے مانگا ہوا ہے		348	اہل تصوف کے ہاں لکھی گئی تفاسیر کی بنیاد
368	زندگی تو جوئے رواں است و رواں است کے مصداق ہے		350	اہل تصوف کے نزدیک شرک خفی اور شرک جلی کی نوعیت
369	ہر دم جو اں ہے زندگی		351	ان تصورات کی سند کے لیے خود ساختہ روایات کا سہارا
	انسان کا ایک ایک سانس اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے		352	تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہابی اور گلابی وہابی ایک ہی ہیں
369	خدا کی ذات سفارشوں سے ماورا ہے		352	مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات کی ایک جھلک
370	قرآن حکیم کے نزدیک نسبتوں کی حیثیت اور کیفیت		353	خدا کی پرستش کا تصور ایک باطل تصور ہے
371	کسی انسان کا عمل دوسرے انسان کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا		354	انسانی دنیا میں تصور خدا کا تجزیہ
	قرآن حکیم کے بیان کردہ مکافات عمل کے مطابق		355	خدا کے صحیح تصور کو سمجھنے بغیر قرآن حکیم سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا
371	نبی اکرم ﷺ کا اعلان		355	نبی اکرم ﷺ کی 23 سال تک کی داستان کشمکش حیات
372	ایک روایت کی روشنی میں حضرت ابراہیم جنت کے دروازے پر		356	حضور ﷺ کی ایک حسین آرزو
373	قرآن حکیم کے نزدیک شفاعت کی نوعیت		358	دین خداوندی مدافعت کا سبق دیتا ہے طمانچہ کھانے کا نہیں
	دور حاضر کی سائیکولوجی (نفسیات) کے با مقابل		358	انسانیت کے لیے سیاست کا واحد علاج حسنت سے ہی ممکن ہے
373	قرآن حکیم کی روشنی میں انسانی ذات کی وضاحت		پندرھواں باب: سورة المؤمنون (آیات 99 تا 107)	
374	موت کے عمل سے انسان کا تو جسم مرجاتا ہے لیکن "میں" نہیں مرتی		362	مہلت کے وقت کی اہمیت
	مغرب کے مفکرین کے سامنے قرآن حکیم کو قرآن کی		363	موت کے بعد مختلف چکروں کا تصور یونان کا پیدا کردہ ہے
375	روشنی میں پیش کرنے کا طریق			زندگی کے سلسلہ میں انسانی سوچ آج بھی افلاطون، ارسطو اور
375	جہاں فردا کے متعلق ہمارے قائم کردہ تصورات			



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو ہر قسم کے مصائب والام سے محفوظ رکھنے کے لیے قدم قدم پر ہر دور کیلئے رحمانیت بدوش فلسفہ حیات کو قرآن حکیم کے اندر جس قدر جامع اور بلیغ صورت میں عطا کیا ہے، کرہ ارض پر اس کی مثال نہیں ملتی۔ خدائے علیم وخبیر نے قرآن حکیم کی تعلیم کو نوع انسانی کی اندھیری رات کو نورِ سحر سے آئینہ پوش کرنے کیلئے اپنی کتاب عظیم کو ہدیٰ للناس بنا کے بھیجا اور بڑے واضح تر انداز میں قدیل آسمانی کے جگمگ جگمگ کرتے ہوئے ستاروں کی مانند جنت، دوزخ، زکوٰۃ، صلوة، روح، ملائکہ، شیطان، ابلیس، ثواب، عرش، برزخ، قیامت، حشر، سورِ اسرافیل، اور میزان وغیرہ کے حقیقی مطالب سے روشناس کرایا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر ان اصطلاحات کا وہ مفہوم جو قرآن حکیم نے اپنے ہاں جا بجا متعین طور پر پیش کر رکھا ہے صرف اُسے ہی اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو قدم قدم پر انسان اپنی متضاد نظریات و تصورات کے بھنور میں الجھی ہوئی شکستہ کشتی کو ساحلِ مراد سے با آسانی ہمکنار کر سکتا ہے اور یہ تو ایک یقینی بات ہے!۔

بہر حال یہ ایک امر واقعہ ہے کہ قدرت اس کرہ ارض پر صرف آدمی پیدا کرتی ہے۔ انسان تو اسے خود بننا پڑتا ہے جبکہ انسان بننے کے بعد اس کا اگلا مرحلہ مومن بننے کا ہوتا ہے اور اگر بظہرِ عَمیق دیکھا جائے تو اس کائنات کا ذرہ ذرہ انسانی زندگی کے اس ارفع و اعلیٰ مقام کا تعین کرنے میں ہی مصروف کار ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنے ہاں مثنوی اسرار و رموز میں مقامِ مومن کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

لالہ کوہ بر سر کوہے دمید گوشہ دامن گلچنے ندید  
آتش او شعلہ گیر د بہر از نفس ہائے نخستین سحر  
آسمان ز آغوش خود گلزار دشت کوکب دا ماندہ پندار دشت  
بوسدش اوّل شعاع آفتاب  
شبم از چشمش بشوید گردِ خواب

پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر لالہ کا ایک پھول کھلا ہے۔ اس تک کسی گلچیں کا ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ صبح کی پاکیزہ ہوا اس کی پرورش کرتی ہے۔ آسمان اسے اپنی آغوش سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ سورج کی پہلی کرنیں اس کا منہ چومتی ہیں۔ شبنم اپنی زمزمہ باریوں سے اس کی آنکھوں سے نیند کی گرد صاف کرتی ہے۔ یہ کیفیت ہوتی ہے ایک مردِ مومن کی۔ جو ساری دنیا سے بلند ہو کر ایک خدا کی چوکھٹ پر جھکتا ہے۔

یہ تھا وہ مردِ مومن جس کی تلاش میں علامہ اقبال عمر بھر سرگرداں رہے اور آخر کار پکار اُٹھے کہ

اے بندہٴ مومن تو کجائی تو کجائی

سو کتابِ ہذا کے آئندہ تمام تر صفحات اسی مردِ مومن کے مقامِ بلند کے کھوجانے اور اسے دوبارہ حاصل کرنے کی داستان اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔

آئیے ہم خالی الذہن ہو کر ان اوراق کا مطالعہ کریں۔

نظر آئے گا اسی کو یہ جہاں دوش فردا  
جیسے آگئی میسر میری شوخیِ نظارہ  
ہے افق سے اک سنگ آفتاب آنے کی دیر  
ٹوٹ کر مانند آئینہ بکھر جائے گی رات

محمد اشرف ظفر

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور

جنوری 2007

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے  
 غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے  
 وہ آنکھ کہ ہے سرمہِ افرنگ سے روشن  
 پُرکار و سخن ساز ہے، نم ناک نہیں ہے  
 کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جُلوں کی  
 اُن کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے  
 کب تک رہے محکومی انجم میں مری خاک  
 یا میں نہیں، یا گردشِ افلاک نہیں ہے  
 بجلی ہوں، نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری  
 میرے لیے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے  
 عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث  
 مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!





## پہلا باب: سورة المؤمنون (آیات 1 تا 4)



عزیزانِ من! آج اپریل 1977 کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون سے ہوتا ہے۔ یہ 23 واں سورة ہے اور اسی سورة سے اٹھارویں پارے کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔

سابقہ سورة کی آخری آیات میں کہا گیا تھا کہ تم خدا کی حکومت اختیار کرو لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ (22:77) تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں، تمہیں کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل ہوں اور اب اس سورة کا آغاز ہوتا ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ<sup>①</sup> (23:1) یعنی وہی جو وہاں تَفْلِحُونَ (22:77) کہا تھا اب اس اجمال کی تفصیل آرہی ہے۔ اس لفظ کا مفہوم میں ابھی بیان کرونگا کہ کہا کیا ہے؟ اسی کے تسلسل میں آپ دیکھتے ہیں کہ کیسا ربط ہے! نہ صرف یہ کہ قرآنِ کریم کی آیات میں ربط ہے، بلکہ یہ سورتیں جس ترتیب سے آئی ہوئی ہیں ان میں بھی آپ دیکھیں گے کہ مفہوم کے اعتبار سے ربط معنوی ہے اور یہی ربط آپ میرے مفہوم القرآن میں بھی دیکھیں گے۔ اس میں یہ کتابِ مبین الحمد سے والناس تک کس طرح مسلسل مربوط کتاب جا رہی ہے: آیات میں ربط ہے، سورتوں میں ربط ہے۔ لہذا اب اسی اجمال کی تشریح اور تفصیل یہاں آئے گی۔ کہا ہے کہ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ<sup>①</sup> (23:1)۔ اس کا عام ترجمہ تو یہی ہوتا ہے کہ مومن کامیاب ہونگے اور کامیابی کے لیے ہمارے ہاں دوسرا لفظ لکھا جاتا ہے: ”نجات پالیں گے“۔

جیسا کہ میں متعدد بار، قریباً ہر درس میں یہ کہتا چلا آ رہا ہوں اور اسے بار بار کہتا جاؤنگا، اور یہ جو درس میں بار بار کہتا ہے، یہ تکرار یا Repetition نہیں ہوتی۔ آجکل گے ہوں کی کٹائی کا موسم آ رہا ہے۔ ہم جو شہر والے ہیں، انہوں نے تو کبھی گے ہوں کا پودا بھی نہیں دیکھا

① آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون ہیں جن کی کھیتیاں پکیں گی، جن کی مختیش شمر بار ہوں گی، جو دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے؟ (پرویز: مفہوم القرآن، ص ۱۷۳)



ہوگا۔ یہ تو گیہوں کا درخت ہی سمجھتے ہیں لیکن گاؤں والے جانتے ہیں کہ کٹائی کے بعد وہاں گہائی ہوتی ہے۔ وہ جو خوشے ہوتے ہیں جن کے اندر یہ دانے ہوتے ہیں وہ زمین پہ بچھا دیئے جاتے ہیں اور اسی دائرے کے اندر اس پر سارا دن بیل چکر لگاتے رہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ نظر آئے گا کہ ان بیلوں کی یہ جو رفتار ہے یہ جو دن بھر چلنا ہے یہ تکرار ہے وہ اسی دائرے میں چلتے چلے جا رہے ہیں لیکن اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خوشوں کے اندر جو دانے ہیں وہ باہر نکل آئیں چنانچہ اس کے لیے یہ پروسس (Process: عمل) اختیار کیا جاتا ہے یعنی بار بار اسی چیز کو سامنے لانا تاکہ چھلکا الگ ہو جائے اور اندر سے اس کا مغزیادانے باہر آجائیں۔ اسے درس کہتے ہیں۔ لہذا قرآن کریم نے اسے اپنے ہاں تصریف آیات کا انداز کہا ہے یعنی کہا یہ ہے کہ بار بار اس کے سامنے ہم ان آیات کو لاتے ہیں تاکہ قرآن کے حقائق کا مفہوم واضح ہو جائے۔ دراصل یہ وہی چیز ہے جسے درس کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ جو کسان کا ان خوشوں کا گاہنا ہوتا ہے اسے درس کہتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب تک وہ سارا طریق اسی طرح سے نہ چلایا جائے وہ دانہ چھلکے سے الگ نہیں ہوتا درس کا لفظ وہاں سے ہے۔ اس لیے اگر اس میں ایک ہی چیز بار بار آتی چلی جائے تو وہ تکرار نہیں کہلائے گی بلکہ چھلکوں کو الگ کرنے کا ایک طریق کہلائے گا۔ ویسے بھی درس میں تو صورت یہ ہوتی ہے کہ بہت سے نووارد حضرات ہوتے ہیں انہوں نے پہلے ان باتوں کو سنا نہیں ہوتا۔ ان کے لیے یہ نئی بات ہوتی ہے البتہ جو سنتے چلے آ رہے ہیں ان کے لیے یہ سند مقرر ہو جاتی ہے یا ان مفاہیم کی تجدید ہو جاتی ہے اس لیے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں سے دو چار بزرگوں کے سوا آپ حضرات ان دروس کے نوٹس نہیں لیتے یا میرے درس کو کہیں تحریر میں نہیں لاتے تو اس لیے تجدید یا داشت بھی ہو جاتی ہے۔

### قرآنی الفاظ کے مفہوم کی ایک بین مثال مذہب میں نجات کے تصور کی نفی ہے

میں شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ قرآن کریم کے کسی ایک لفظ پر بھی کھڑے ہو کر دیکھیں کہ اس نے اپنے ہاں کس کس قسم کے حقائق بیان کیے ہیں تو آپ کو اس کے مفہوم میں دو باتیں نظر آئیں گی۔ ایک تو یہ کہ دیگر مذاہب جو انسانی ذہن کے خود تراشیدہ ہیں وہ دین خداوندی نہیں ہیں وہ تو انسانوں کے وضع کردہ مذاہب ہیں۔ لہذا آپ دیکھیں گے کہ ان مذاہب کے مقابلے میں دین خداوندی میں جو بنیادی تصورات دیئے گئے ہیں ان کے مابین ایک ہی لفظ یا ایک ہی اصطلاح میں ایک واضح فرق سامنے آجائے گا۔ لہذا اس سے پہلے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں فرق کتنا ہے نیز اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دین کے مقابلے میں مذہب کا تصور کس قدر غلط ہے۔ دراصل قرآن حکیم کا یہ بڑا اعجاز ہے۔

قرآن حکیم نے تَفْلِحُونَ یا أَفْلَحَ کا جو انتخاب کیا ہے یہ وہی ہے جسے فلاحت کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر فلاح

کے بجائے جو تصور ہے وہ ”نجات پانا“ ہے۔ آپ کسی سے پوچھیے کہ اسکی ساری زندگی کی غایت اس کی لسم، اس کا منتہا، اس کا مقصد کیا ہے؟ وہ صرف یہی کہے گا کہ یہ سب کچھ صرف نجات کے حصول کے لیے ہے۔ آپ کے ہاں یہ جتنی بھی مذہب کی عبادات و رسومات ہیں، یہ جتنی بھی مناسک و مشقتیں ہیں، ریاضتیں اور قربانیاں ہیں، آخر ان سے مقصد کیا ہے؟ تو ایک لفظ میں بتایا جائے گا کہ جی! مقصد ہے نجات حاصل کر لینا، یعنی نجات کو آخری مقصد قرار دیا جاتا ہے اور جس کی نجات ہوگئی بس سمجھ لیجیے کہ اس نے سب کچھ پالیا۔ نجات کے متعلق مذاہب میں تصور تو یہ ہے۔ نجات، ہندو دھرم میں، مکتی کو کہتے ہیں۔ عیسائیت کے ہاں سے جو اس کا ترجمہ ہو کر آیا ہے، تو وہ اسے Salvation کہتے ہیں۔ یہودیت میں بھی نجات کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی مذہب میں یہ نجات ہی کا تصور ہے جبکہ قرآن اس تصور کو ہی باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک عجیب و غریب تصور پیش کرتا ہے اور اس تصور سے آپ دیکھیں گے کہ دین خداوندی کیا ہوتا ہے اور انسانی ذہن کا تراشیدہ مذہب کیا ہوتا ہے؟ یہ نجات، مکتی یا Salvation ہے کیا؟ اس کے معنی ہوتے ہیں، جیسا کہ نجات کا ہمارا تصور ہے، عذاب میں ڈال دیا، وہاں سے نکال دیا تو نجات ہوگئی۔ یعنی نجات کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی مصیبت میں کوئی پھنسا ہوا ہو اس مصیبت سے چھٹکارا ہو جائے تو اس کی نجات ہوتی ہے۔ یہ لفظ اب ہمارے ہاں عام طور پر اردو زبان میں استعمال ہونے لگ گیا ہے کہ اس عذاب سے نجات پائی، اس مصیبت سے نجات پائی یا یہ کہ صاحب! اس سے تو نجات کا کوئی طریقہ ہی نظر نہیں آتا، اور اس کے معنی ہوتے ہیں کہ انسان کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا، نجات کہلاتا ہے۔ آپ غور کریں گے تو آپ کو یقیناً مسرت بھی ہوگی اور حیرت بھی کہ اس تصور میں اور جو قرآن کریم نے تصور دیا ہے، کس طرح زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ یہ نجات کیا ہے؟ ہندو دھرم کی مکتی کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ انسان ایک جنم لیتا ہے، اس میں بہت سے پاپ یا گناہ کرتا ہے، اس پر گناہوں کی آلائشیں لگ جاتی ہیں، پھر اس کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے کہ کچھ آلائشیں اس کی صاف ہو جائیں، کچھ صاف ہوتی ہیں، کچھ اور لگ جاتی ہیں، وہ پھر جنم لیتا ہے، پھر جنم لیتا ہے اسے ”جون کا چکر“ کہتے ہیں۔ ایک چکر دیا جاتا ہے اور اس چکر میں تو پوچھو نہیں صاحب! تفصیل بڑی ہے کہ بتیں کروڑ دفعہ یہ جنم لیتا ہے یا کتنا لیتا ہے لیکن ایک چکر ہے جس میں وہ چلا جاتا ہے۔

### نجات کا یہ تصور فیثا غورث کا دیا ہوا ہے ❶

دائرے کا یہ تصور یونانیوں کے ہاں ہے۔ فیثا غورث (500-580 ق م) ان کے ابتدائی مفکر تھے۔ انہوں نے آسمانی کرّوں پر غور

❶ Pythagoras (c.580-500 B.C.)۔ وہ فلسفہ اور ریاضی دان ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی عالم (Theologian) بھی تھا۔

(Readers' Digest (1990): Universal Dictionary, London: Readers' Digest Association Ltd. ,P.1253)

کیا تو وہ انہیں گول نظر آئے۔ انہوں نے یہ فکر پیدا کی کہ زندگی دائرے کے اندر چلتی ہے۔ دائرے کا معنی ہوتا ہے کہ آپ ایک نقطے سے شروع کریں، چلتے جائیں، اتنی لمبی مسافت کے بعد پھر اسی نقطے پہ آجائیں، یعنی آپ کوئی قدم آگے نہیں بڑھاتے، منہا آپ کا دائرے میں اسی نقطے کے اوپر آ جانا ہے جہاں سے آپ چلے تھے۔

ہندوؤں کی کتنی کیا ہے؟ انسان پہلی دفعہ آیا تو پاک اور صاف تھا۔ یہاں دنیا میں اسے مایا وغیرہ کی یہ ساری آلائشیں لگیں، وہ اس چکر کے اندر چلتا چلا گیا اور آخر میں جا کر پھر ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا۔ اسے نجات یا مکتی کہا یعنی آلائشوں کے اس چکر سے چھوٹ گیا۔ دراصل یہ چکر کا تصور یا تناخ کا تصور یونان کے حکما کا دیا ہوا ہے۔ یہ وہی ہے جسے آپ Transmigration of Soul (جون کا چکر) کہتے ہیں۔ وہاں کا مفکر یہ فیثاغورث (500-580 ق م) تھا۔ یہ اس کا دیا ہوا تصور ہے کہ زندگی ایک دائرے کے اندر گھومتی ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس چکر کے اندر جتنی بھی اس کو آلائشیں لگتی ہیں، وہ پاک ہو کر پھر ویسا ہی ہو جائے جیسا پہلے تھا۔ اس نکتے کو ذہن میں رکھیے ”جیسا پہلے تھا پھر ویسے ہی ہو جائے“۔

### ہندوؤں، عیسائیوں اور خود اپنے ہاں مذہبی دنیا میں نجات کا تصور

عیسائیت نے کہا کہ ہر بچہ اپنے اولیں ماں باپ آدم اور حوا کی معصیت کی آلائش اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ آدم اور حوا نے گناہ کیا تھا، جنت سے نکالے گئے تو گناہ تو انہوں نے کیا لیکن ہر انسانی بچہ اس گناہ کی کثافت لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس کے دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ کے کفارے پر ایمان لایا جائے یعنی یہ ایمان لایا جائے کہ انہوں نے اپنی جان دیکر میرے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ یہ ہے کفارے کے معنی۔ جو اس حقیقت پہ ایمان لے آئے، وہ کہتے ہیں، کہ اس کی جہنم کے عذاب سے نجات ہوگئی، Salvation (نجات) ہوگئی۔ آلائش کے ساتھ پیدا ہوا، اس عقیدے پہ ایمان لایا، تو وہ ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ آلائش سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ پھر وہی بات ہوگئی، ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا، یعنی as you were۔ آپ کے ہاں بھی مذہب میں، دین میں نہیں، قرآن میں نہیں، تصور نجات ہی کا ہے: انسان پاک اور صاف پیدا ہوا، یہاں اس پر گناہوں کی آلائشیں آئیں، ان آلائشوں سے پاک صاف کرنے کے لیے اسے جہنم میں بھیج دیا گیا، وہاں اس کی یہ آلائشیں دھوئی گئیں، وہ صاف ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے یہ ”مفسرین اور مفکرین“، جہنم کی تشبیہ ہی یا تو دھوبی کی بھٹی سے دیتے ہیں، یعنی کپڑا لائے، صاف ستھرا پہننے سے اس پہ میل جم گئی، دھوبی نے بھٹی چڑھایا، پھر صاف ستھرا ہو گیا، as you were ہو گیا یا اسے Sanatorium (سینیٹوریم) قرار دیتے ہیں، انسان تندرست تھا، تپ دق (T.B) کی آلائشیں لگیں، اس مصیبت یا بیماری میں گرفتار ہو گیا، اسے Sanatorium (سینیٹوریم) بھیج دیا گیا، وہاں اس کا علاج ہوا

اس بیماری سے اس نے شفا پائی وہاں سے نجات حاصل کی، پھر اس کو ڈسچارج کر دیا، جیسا یہ اس بیماری سے پہلے تھا پھر ویسا ہی ہو گیا: as you were۔ یہ وہی ہے جو یونان میں دائرے (Cycle) کا تصور چلا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ساری زندگی Cyclic Order (دوری ترتیب) میں چلی۔ جس نقطے سے زندگی چلی تھی راستے میں یہ ساری مصیبتیں، مشقتیں، ریاضتیں، یہ سارا کچھ، بھگتنے کے بعد زندگی نے Cycle (دائرے) کو پورا کیا اور اسی نقطہ آغاز کے اوپر چلی گئی، as you were ہو گئی، یعنی جیسی پہلے تھی ویسی ہی ہو گئی۔ ہندوؤں کا مکتی کا دھرم تھا۔ ان کے ہاں کی جو ویدانت ہے جسے تصوف کہتے ہیں، اس کی رو سے ان کا تصور یہ ہے کہ انسانی آتما یعنی روح پر ماتما کا ایک جزو ہے، یعنی روح اعلیٰ کا مکمل روح کا۔ یہ ایٹور یا خدا کی روح کا ایک حصہ ہے۔ یہ آتما ہر انسان کے پیکر میں آیا ہوا ہے۔ یہ ایک حصہ ہے جو وہاں سے آیا ہے اب پتہ نہیں کہ باقی وی اتھے کچھ رہا کے نہیں۔ وہ اینا اینا وی وچوں بھرنا شروع ہووے تو وہ اس میں آ گیا<sup>1</sup> اب یہ حصہ انسان کے مادی پیکر میں آ کر دلدل میں پھنس گیا۔ اب یہاں اس Material World (مادی دنیا) میں اس مادے کی کثافت کو دور کرنے کے لیے ترک لذات، ترک دنیا اور ترک در ترک کرتے چلے جائے، یہ سارا کچھ چھوڑتے چلے جائے تو انسانی روح پھر خدا کی روح میں جا ملے گی۔ وہ جو سادھو اور ان کے سنیاسی مشقتیں بھگتے ہیں، وہ آپ بھی کرتے چلے جائے تو یہ آلائشیں دور ہو جائیں گی اور آپ کی یہ آتما جو روح خداوندی کا حصہ ہے، پر ماتما کے اندر جا کر پھر مل جائے گی، آپ کی نجات ہو گئی، یہ as you were<sup>2</sup> ہے۔ اے تے پر ماتما دی نجات ہوئی کہ اس میں سے ایک حصہ ٹوٹا ہوا تھا، اور پھر اس وچ مل گیا<sup>3</sup>۔ بہر حال آپ کے ہاں تصوف یہی ہے کہ روح خداوندی کا ایک حصہ ہے جو ہر انسان کے اندر ہے۔ آپ کے ہاں یہ ساری چیزیں دوسروں سے آئی ہوئی ہیں۔

### نجات کے متعلق یہ تمام کے تمام تصور باطل ہیں

میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن کا تو تصور ہی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ سارے مراقبے، ریاضتیں، اور مشقتیں جو تصوف میں اٹھائی جاتی ہیں، اور پوچھو نہیں کہ کس قدر تکلیف دہ مشقتیں ہیں، یہ وہی ہیں جو وہاں سنیاسی اور سادھوؤں کی ہیں۔ یہ سب اس لیے اٹھائی جاتی ہیں کہ یہ جو خداوندی روح اس پیکر میں آ کے پھنس گئی ہے اسے اس پیکر سے نجات مل جائے اور یہ پھر واصل بالحق ہو جائے۔ آپ کو

1 اب یہ معلوم نہیں کہ وہاں بھی کچھ باقی بچا ہے کہ نہیں بچا۔ وہ تھوڑا تھوڑا بھی وہاں سے انسان میں بھرنا شروع ہو جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔

2 جیسے آپ پہلے تھے ویسے ہی اب ہو گئے۔

3 یہ روح خداوندی کی نجات ہوئی کیونکہ اس میں ایک حصہ ٹوٹا تھا وہ پھر اس میں آ ملا۔

یاد ہوگا، میں یہ بتایا کرتا ہوں، کہ یہ وجہ ہے کہ ان کے ہاں یہ جتنے بزرگ ہیں، جب ان کی وفات ہوتی ہے، تو وہ اسے وفات نہیں کہتے۔ کہتے ہیں کہ حضور کا وصال ہو گیا ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے؟ وصال اور وصل کے معنی ہوتے ہیں: مل جانا۔ وصال ہو گیا یعنی ان کی روح خدا کی روح میں جا کر مل گئی ہے۔ وہ اس کو کہتے ہی وصال ہیں: اس روح کا اس کے ساتھ جا کر مل جانا۔ جب تک یہ نہیں ملتی، اس وقت تک اسے چین نصیب نہیں ہوتا۔

اس تصور کی شدت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ مثنوی مولانا روم<sup>1</sup> کے پہلے ہی شعر کا مطلب یہ ہے کہ سوچو، بنسری کا مطلب یہ آہ و فغاں کیوں کرتی ہے؟ اس لیے کہ یہ جہاں کی اصلاً تھی، اسے وہاں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہے اور اب یہ روتی رہتی ہے۔ اسے پھر سے وہاں جوڑ دیجیے، آہ و فغاں ختم ہو جائے گی، یہ پھر سے اصل میں مل جائے گی۔ یہ ہے زندگی کا تصور یعنی جیسے پہلے تھا ویسے ہو جانا: As you were

## قرآن حکیم نے انسانیت کو صراطِ مستقیم سے متعارف کرایا ہے

برادران عزیز! ایران کے مفکر ہوں یا مذاہب عالم کے ہوں، ہر جگہ زندگی کا Cyclic order یعنی دائری حرکت کا تصور ہے۔ قرآن کریم آیا تو اس نے صراطِ مستقیم کے الفاظ میں یہ جو سارے فکری باطل تصور تھے اور مذاہب کے خود تراشیدہ تصورات تھے، ان کی تردید کر کے، ان پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ صراطِ مستقیم دائرہ نہیں، سیدھا راستہ ہے اور سیدھے راستے پہ جب بھی آپ کا قدم چلے گا، آخر میں

<sup>1</sup> مولانا جلال الدین رومیؒ 1207ء میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ نیشاپور میں گزرا اور خواجہ فرید الدین عطارؒ کے زیر تلیذ رہے۔ پھر قونیہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت میں تصوف کے منازل طے کیے۔ مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل اور پیام بر ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور مثنوی میں اس مسلک کی تبلیغ کی ہے۔ علامہ اقبالؒ انہیں اپنا ”پیر و مرشد“ کہہ کر پکارتے ہیں اور اپنے کلام میں اکثر و بیشتر ان کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ چیز ارباب فکر و نظر کے لیے فی الواقعہ بڑی حیرت انگیز ہے کہ علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) جو تصوف کو اسلام کی سر زمین میں اجنبی پودا قرار دیتے ہیں (اور وہ فی الواقعہ اجنبی پودا ہے) اور اس فلسفہ وحدت الوجود کے امام شیخ اکبر ابن عربیؒ کی فصوص الحکم کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں ”الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں“ وہ اسی تصوف اور وحدت الوجود کے پیغام پر رومیؒ کو اپنا پیر و مرشد کس طرح تسلیم کرتے ہیں، بالخصوص جب دوسری طرف ان کا دعویٰ ہے کہ وہ (علامہ اقبالؒ) جو کچھ کہتے ہیں، قرآن کی روشنی میں کہتے ہیں۔ یہ واقعی ایک ایسا معممہ ہے جسے ہم حل نہیں کر سکتے (اور شاید کوئی بھی حل نہیں کر سکتا) ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ رومیؒ کے ہاں ایک جوش اور حرارت پائی جاتی ہے اور ان کی یہی چیز ہے جو اقبالؒ کو بھاگائی۔ یہ خصوصیت اقبالؒ کو کہیں بھی نظر آئے وہ اسے بے نگاہ پسندیدگی دیکھتے اور اس کی تعریف کرتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی کے مسلک یا نظریہ کو قرآنی قرار دینے کے لیے تنہا یہ چیز تو کافی نہیں ہو سکتی۔ (پرویز: مجلس اقبال (حصہ دوم: شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق) طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور 1997ء ص 20-21)

آپ جہاں کہیں بھی پہنچیں گے تو وہاں سے دُور چلے جائیں گے۔ کسی منزل پہ پہنچیں گے، نقطہ آغاز پہ واپس نہیں آئیں گے، بلکہ آگے بڑھیں گے۔ دائرے میں منتہا اسی نقطے پہ آ جانا ہے۔ جسے آپ صراط یا راستہ کہتے ہیں، اس میں تصور آگے بڑھنے کا ہے۔ صراط پہ آپ کا ہر قدم آگے جاتا ہے اور اس سفر کی انتہا وہی نقطہ آغاز نہیں ہوتا، وہاں سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ہوتا ہے، اگر آپ کی منزل متعین ہو تو پھر آپ منزل کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ منتہا آپ کا کسی منزل تک پہنچنا ہوتا ہے۔ آپ غور فرمائیے پہلی ہی سورۃ فاتحہ کے اندر جو پہلی دعا سکھائی گئی، صراط کے ایک لفظ میں ہے۔ وہ جو دنیا، فکراور جہان مذاہب میں جو ساری دنیا میں زندگی کا Cyclic (دوری) تصور چھایا ہوا تھا، عزیزانِ من! اس ایک لفظ صراط نے ان تمام تصورات کی نہ صرف تردید کی بلکہ زندگی کا ایک مثبت تصور بھی دیا کہ زندگی کو لہو کے تیل کی طرح ایک دائرے میں چکر لگانے کا نام نہیں ہے، زندگی ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے، آگے بڑھنے کا نام ہے، کسی منزل تک آگے پہنچنے کا نام ہے، اس میں واپسی نہیں ہے، اسی نقطہ آغاز پہ پہنچنا نہیں ہے، آگے بڑھنا ہے، زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن حکیم نے دائرے یا چکر پر سفر کرنے کے غلط تصور زندگی کو ایک لفظ صراط سے واضح کر دیا۔

### صراط کے بعد طبقاً عن طبق کی بلند ترین منازل

آپ نے اب دیکھا کہ ایک لفظ کے استعمال سے قرآن نے کیا کچھ کہہ دیا اور پھر اس صراط کے بعد یہ کہا ہے کہ یہ طَبَقاً عَنْ طَبَقٍ (84:19)۔ یعنی یہ صراط سیدھا بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والا بھی ہے یعنی یہ stage by stage (درجہ بدرجہ) ہے۔ اسی لیے اس نے خدا کو ذی المعارج (70:3) کہا ہے: سیڑھیوں والا خدا۔ سیڑھی میں آپ دیکھتے ہیں کہ وہ سیدھی بھی ہوتی ہے اور آپ کا ہر قدم جواٹھتا ہے وہ بظاہر تو سیدھی سیڑھی پہ ہوتا ہے لیکن پہلے قدم سے بلندی کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے۔ سیڑھی کے آخر پہ پہنچ کر آپ وہیں نہیں پہنچے جہاں سے شروع ہوئے تھے، آپ پستی کی منزل کو دُور چھوڑ آئے، آپ بلندی پہ جا پہنچے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

### زندگی کے کسی منزل پہ رک جانے کا نام جہنم ہے

عزیزانِ من! اگر زندگی درجہ بدرجہ ارتقائی منازل طے کرتی آگے نہیں بڑھتی، کسی مقام پہ رک جاتی ہے، تو اس کا نام قرآن کریم کے نزدیک جہنم<sup>①</sup> ہے۔ اس کے لیے لفظ جحیم<sup>①</sup> آیا ہے۔ جحیم کے معنی ہی کسی ایک مقام پہ کھڑے ہو جانا، رک جانا ہیں۔ اگر زندگی کا وہ سارا دائرہ ختم کر کے آپ پھر اسی نقطے پہ جا کر کھڑے ہو جائیں تو قرآن کی رو سے یہ جحیم ہے۔

① جہنم اور جحیم کی تشریح و مفہوم کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004ء، ص 275 (فٹ نوٹ 2)

انسان کے لیے قدم قدم پر اپنے سفرِ حیات کی پیمائش کرنا لازم ہے

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ اُولَئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (2:217) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کام تو بہت کیے، بیکار نہیں بیٹھے، بے عمل نہیں تھے ان کے اعمال ہیں لیکن ان اعمال نے کوئی نتیجہ پیدا نہ کیا کیونکہ وہ دائرے کے اندر سفر کرتے رہے آخر میں اسی نقطے پہ پہنچ گئے جہاں سے بات شروع کی تھی تو کہا کہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (2:217) ان کی ساری مسافت، ان کا سارا سفر بیکار چلا گیا۔ کیا بات ہے! آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ سے یا ایک اصطلاح سے قرآن کیا کام کر جاتا ہے۔

### قرآن حکیم کے الفاظ میں فائزوں کا مفہوم

قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی کوئی لفظ آئے، کھڑے ہو جائیے۔ یہ پہلی بات ہے اور دوسری یہ بات ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے جتنے بھی باطل یعنی غلط تصورات ہیں، وہ تمام آپ کے سامنے ہونے چاہئیں کیونکہ اس کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ قرآن اس ایک لفظ سے کیا بات کہہ گیا ہے۔ جہاں اس نے ”نجات“ کا لفظ استعمال کیا ہے تو مومنین کے لیے اس کے معنی ہوتے ہیں ”کسی آنے والی مصیبت سے بچائے رکھنا، محفوظ رکھنا، مصیبت میں پھنس جانے کے بعد اس سے نکالنا نہیں، بلکہ شروع سے ہی اس سے محفوظ رکھنا“ زندگی کے متعلق قرآن کریم نے اپنے ہاں ایک لفظ ”فائزون“ کہا ہے۔ یہ وہی ہے جسے آپ فائز المرام کہتے ہیں۔ یہ لفظ فوز (ف و ز) ہے۔ اس کے معنی Achievement (حصول و تکمیل) کے ہوتے ہیں: Some thing achieved یعنی کچھ حاصل کیا، ویسے کا ویسا نہیں ہو گیا۔ ہمارے ہاں بھی فوز و فلاح کا لفظ بولتے ہیں۔ فلاح کا یہ لفظ بھی قرآن کا ہے اور گہری سوچ کا تقاضا کرتا ہے۔

### انسانی نامہ اعمال کی برومندی کے سلسلہ میں زراعت کی مثال

اس سورۃ کا آغاز ہی قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (23:1) سے ہوتا ہے۔ فلاح سے بات شروع ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ انسانی اعمال کے بابت نتیجہ ہونے کی ایک ایسی نازک حسین اور اس کے ساتھ ہی اس قدر مکمل تشبیہ ہے کہ جسے اونٹ چرانے والا بدو بھی سمجھتا تھا اور آج کا حکیم برگسان<sup>1</sup> بھی سمجھتا ہے۔ مثال وہ دیتا ہے کھیتی کی، زراعت کی۔ فلاحت کہتے ہی زراعت کو ہیں، کھیتی کو ہیں۔ یہ کتنی حسین، عمدہ اور بامعنی تشبیہ ہے۔ کھیتی میں کیا ہوتا ہے؟ زمین جس میں کچھ اگانے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ کسان کو دے دی جاتی ہے۔ وہ زندگی، جس میں نمود کی صلاحیت ہوتی ہے، نشوونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ انسانی زندگی ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور پھر

1 برگسان، ہنری (1859-1941)، ایک فرانسیسی فلسفی

کہا جاتا ہے کہ اس کسان سے کہہ دو کہ لو یہ ہیں قوانین۔ ان کے مطابق اس زمین کو تیار کرو۔ اس میں اس طرح سے بیج ڈالو یوں اس بیج کی رکھوالی کرو اس کو پانی دو ہوا روشنی حرارت کی یہ ساری چیزیں مہیا کرو تو پھر آخر میں کیا ہوتا ہے؟ کیا آخر میں وہ زمین ویسے کی ویسی رہ جاتی ہے جیسے اسے دی گئی تھی؟ نہیں بلکہ ایک ایک دانے کے ساتھ ساتھ سودانے اس کے گھر میں آتے ہیں اس کی ساری کوشش ثمر بارو برومند ہوتی ہے نتیجہ خیز ہوتی ہے اس کے لیے کچھ لاتی ہے۔ کھیتی بونے سے پہلے کے کسان اور کھیتی کاٹنے کے بعد کے کسان کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایہدی کوٹھی داناں نال بھر جانندی اے جیہڑی پہلاں خالی سی<sup>1</sup>۔

قرآن کریم نے انسان کی اس زندگی کے لیے اسے اچھی زمین سے تشبیہ دی ہے پھر اس میں جو بیج ڈالا جائے گا اسے اس نے ایمان سے تشبیہ دی ہے یعنی اس بات کا یقین کہ یہ جو گیہوں کے دانے ہیں ان میں یہ صلاحیت ہے کہ انہیں اگر قوانین کے تابع بویا جائے گا رکھوالی کی جائے گی تو یہ خوشے بنیں گے اور ایک ایک خوشے میں اتنے اتنے دانے پڑیں گے۔ کسان کو یہ یقین ہو جیہ وہ اتنی محنت کرتا ہے اور اپنے گھر میں روٹی پکانے کے لیے رکھی ہوئی گیہوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہو تو وہ کبھی یہ کرتا ہی نہیں ہے۔ جس بیج کے متعلق کوئی سمجھدار کسی کسان سے یہ کہہ دے کہ نہیں اوئے! انہیں نہیں اگنا یعنی اس میں اگنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے وہ اس پر محنت نہیں کرتا۔ وہ اس بیج پر محنت کرتا ہے جس کے متعلق اسے یقین ہو کہ اس میں بار آور ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ جو اس چیز کا یقین ہے اسے ایمان کہتے ہیں۔ ان بیج کے دانوں پر جو یہ خالی یقین ہے یہ تو کچھ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس یقین کے بعد پھر وہ جو خدا کا قانون مقرر ہے اس کے مطابق اسے محنت کرنا پڑے گی۔ یہ جو ان قوانین کے مطابق محنت کے کام ہیں انہیں اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔

### زندگی کی کامرانی ایمان اور عملِ صالح کا فطری نتیجہ ہے

عزیزانِ من! إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ، إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ<sup>2</sup> سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ وہ تو ایمان کے بغیر عملِ صالح کا ذکر ہی نہیں کرتا اگر کسان کو اپنے بیج کی صلاحیتوں پر یقین ہی نہیں ہے تو وہ اس پر محنت ہی نہیں کرے گا پھر اعمال کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر بیج ناقص ہے اس میں اگنے کی صلاحیت نہیں ہے کسان یہ کہہ کر اسے بودے کہ کوئی بات نہیں پھر جتنا جی چاہے اس پر وہ محنت کرتا چلا جائے اس کے وہ اعمالِ اعمالِ صالحہ نہیں بنتے۔ صالح تو صلاحیت سے ہے۔ یہ وہ اعمال وہ کام ہیں جو اس بیج کی صلاحیتوں کو تکمیل تک پہنچادیں۔ اعمالِ صالحہ کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کا وہ پروسس (عمل) ہے جس سے زندگی میں کیے جانے والے کام یا اعمال برومند یا ثمر بار ہوتے ہیں۔ اسے قرآن نے ہر جگہ فلاح، کھیتی یا زراعت سے تشبیہ دی ہے۔

1 اس کی کوٹھی جو پہلے خالی تھی وہ دانوں سے بھر جاتی ہے۔

2 خدا پر ایمان رکھنے اور اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہنے والے۔



اب آپ سوچ لیجیے عزیزانِ من! کہ پہلے اس نے زندگی کے سفر کو صراط سے تشبیہ دے کر وہ جو دائرے کا چکر بلکہ گھن چکر تھا، کس طرح انسان کو اس سے نجات دلا دی اور پھر انسان کو ایک سیدھے راستے کے اوپر ڈال دیا جو سیدھا بھی ہے اور بلند یوں کی طرف لے جانے والا بھی ہے۔ اس کا ہر قدم پہلے قدم کے مقابلے میں آگے ہوتا ہے اور پھر اونچا بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے نبی اکرمؐ کی وہ حدیث جو میں سمجھتا ہوں کہ یقیناً حضورؐ کی ہو سکتی ہے، موتی کی طرح چمکتی ہے، جس میں یہ فرمایا تھا کہ جس شخص کا آج (Today) اس کے گزرے ہوئے کل (Yesterday) کے مقابلے میں زیادہ برومند نہیں ہے، سمجھ لو کہ وہ گھائے میں رہا، تباہ ہو گیا۔ یعنی اگر دو دن برابر ہیں آج کا دن (Today) کل کے دن (Yesterday) کی طرح کا ہی ہے تو حضورؐ نے فرمایا کہ وہ بھی تباہ ہوا۔ اس نے زندگی کا ایک دن ضائع کیا۔ اس کے آج (Today) کو اس کے گزشتہ کل (Yesterday) کے مقابلے میں زیادہ آگے بڑھا ہوا ہونا چاہیے۔

### زندہ قوم کے لیے زندگی کا ایک زندہ تصور

عزیزانِ من! جس قوم کو زندگی کا یہ تصور دیا جائے آپ سوچیے کہ وہ دنیا میں کس قسم کی قوم بن جائے گی۔ ہر دن یہ محاسبہ کرنا ہے کہ گزشتہ کل کے مقابلے میں ہم زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھے ہیں یا نہیں بڑھے۔ یہ ہے کسان جو دانہ بونے کے بعد، صبح گھر سے نکلتا ہے کہ وہاں جا کر یہ دیکھے کہ کل (Yesterday) جو گزر گیا ہے اس کے مقابلے میں آج (Today) حالت بہتر ہے یا نہیں۔ وہ سارا دن اس پر محنت کرتا ہے، شام کو بظاہر اسی طرح خالی ہاتھوں گھر آ جاتا ہے۔ غلت پسند انسان تو یہ کہے گا کہ اس کی مت ماری گئی، چھ مہینے سے ہم اسے دیکھ رہے ہیں، صبح رسی درانتی لے کر جاتا ہے، گھر سے اس کو روٹی پہنچائی جاتی ہے اور شام کو اسی طرح خالی ہاتھ گھر آ جاتا ہے۔ پوچھو! اس سے کیا کمایا؟ یہ کیا چیز ہے جو اسے ہر روز صبح اٹھتے ہی سارے کام کاج چھوڑ کر کھیت کی طرف لے جاتی ہے، جہاں سے شام کو اس نے بظاہر کچھ لے کر واپس نہیں آنا؟ کیا چیز ہے؟ یہ ایمان ہے کہ یہ جو میں نے دانہ بویا ہے اس میں اُگنے کی صلاحیت ہے، بڑھنے کی، پھولنے کی، پھلنے کی، صلاحیت ہے۔ وہ روز دیکھتا ہے کہ یہ بڑھتا پھولتا پھلتا ہے یا نہیں۔ وہ غلط قسم کے جھاڑ جھنکار کو جو کچھ ادھر ادھر سے نکل آتے ہیں، اکھیڑ کر پھینکتا چلا جاتا ہے۔ کہیں جسے گوڑی کہتے ہیں، وہ کرتا ہے، کہیں پانی دیتا ہے، کہیں باڑ لگاتا ہے، کہیں اس کی حفاظت کرتا چلا جاتا ہے اور روز دیکھتا چلا جاتا ہے کہ گزشتہ کل (Yesterday) کے مقابلے میں آج (Today) ایک قدم آگے ہے یا نہیں۔ جو پودا کچھ دنوں تک دیکھے کہ بڑھ نہیں رہا، وہ اسے اکھیڑ کر پھینک دیتا ہے۔ زندگی کا یہ ہے وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

اب عزیزانِ من! زندگی کے اس تصور کو پیش کیجیے۔ میں نے کہا ہے کہ گاؤں کے ایک دیہاتی زمیندار کو سمجھائیے۔ وہ اس معاملے کو آپ سے بہتر سمجھے گا جو میں سمجھا رہا ہوں اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اس دور میں ہمارے ہاں Evolution (ارتقا) کے فلسفے کا

سب سے مشہور مفکر برگسان<sup>①</sup> ہے۔ آپ برگسان کی کتابیں پڑھ کے دیکھیے وہ کس طرح ان الفاظ کی تشریح کرتا چلا جاتا ہے جو قرآن نے استعمال کیے ہیں۔ یہاں قرآن انہی الفاظ کو لایا ہے اور اسی تشبیہ کے مطابق بات سمجھاتا ہے۔ کہا کہ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (23:1) مومنوں کی کھیتی بار آور ہوتی ہے لیکن اس کے لیے مومنوں کی پہلی شرط یہ ہے کہ کسان کی طرح انہیں اپنے بیج کے متعلق یہ یقین محکم ہو کہ اس میں اگنے بڑھنے پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہے۔ یہ شرط اول ہے۔ یہی قَدْ أَفْلَحَ (23:1) ہے۔ یہ یقینی چیز ہے۔ اس میں یہ ”قد“ بھی یقین ہی تو ہے جو اس کسان کو روز لیے لیے جاتا ہے۔ اب اگلی بات یہ آئی کہ وہ مومنوں کو کسان کے زراعت کے طریق (Process) کی موٹی موٹی باتیں بتاتا ہے: دانہ یوں بوتا ہے کسان یوں کرتا ہے اس کو پانی یوں دیتا ہے حرارت یوں پہنچتی ہے یعنی یہ چیزیں آئیں گی۔

یہاں تو قرآن کے الفاظ میں سوال کیا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں جن کی کھیتیاں ثمر بار ہوتی ہیں۔ جواب میں کہا کہ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ<sup>②</sup> (23:2)۔ اب ہمارے ہاں ایک طرف صلوٰۃ کا ترجمہ نماز ہوا دوسری طرف خشوع خضوع کے الفاظ آگئے تو ان کا مفہوم ہوا کہ نماز کے اندر سر جھکائے ہوئے آنکھیں جھکائے ہوئے بہت انکساری کے ساتھ مسکینی شکل بنائے ہوئے نماز کی رکعتیں پوری کریں۔ میں پھر عرض کر دوں کہ یہ جسے ہم نماز کہتے ہیں یہ اجتماعات ہیں یہ بھی صلوٰۃ کا ایک حصہ ہیں۔ اس کسان کا جو طریق فلاح ہے اس کے اندر ایک پروگرام صلوٰۃ کے اجتماعات کا بھی ہے۔ یہاں صلوٰۃ کا لفظ ہے نماز کا نہیں ہے۔ قرآن میں کہیں نماز کا لفظ نہیں آیا۔ یہ تو لفظ ہی مجوسیوں کی زبان کا ہے ایرانیوں کی زبان کا ہے عربی لفظ ہی نہیں ہے۔ یہ صلوٰۃ ہے۔ اس کے متعلق بھی متعدد بار دروس میں یہ چیز ہمارے سامنے آچکی ہے۔ یہاں میں ایک ہی آیت پیش کرتا ہوں۔ آیت خود بتا دے گی کہ اس کا مفہوم کیا

① Bergson, Henri (1859-1941) French philosopher. The central item in Bergson's philosophy is the opposition between the life force and the material world. He also assigned an important role to intuition as opposed to the rational intelligence in man's perception of reality. Among his best known works are Time and Free-will (1889), Creative Evolution (1907) and the Creative Mind (1934). His philosophy asserts that the flow of time as personally experienced is free and unrestricted rather than measured as on a clock and contends that all living forms arise from a persisting natural force, the elan vital (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited. P.156)

② یہ وہ لوگ ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ ہمارے ضابطہ قوانین کے پیچھے پیچھے چلتے رہے یعنی اس کی رو سے جو فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں انہیں بطیب خاطر سرانجام دیتے رہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص-773)

ہے؟ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرِ صَفًّا (24:41) کیا تم یہ نہیں دیکھتے ہو یہ ایک ایسی چیز ہے جو محسوس طور پر نظر آ جاتی ہے، کیا تم اس پر غور و فکر نہیں کرتے ہو کہ ارض و سما یعنی اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی ”تسبیح“ کرتا ہے اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی۔

### تسبیح کے مروجہ مفہوم کے بالمقابل قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب پھر یہاں لفظ تسبیح آ گیا۔ اب اس کے مفہوم (Exposition) کے لیے ایک ٹیپ<sup>1</sup> (Tape) اور چاہیے اور مزید وقت بھی چاہیے۔ ”سج“ کے معنی ہوتا ہے ”کسی مقصد کے حصول میں پوری پوری توانائی صرف کر کے سرگرداں رہنا“۔ یہ جو دانے پھیرنے والی تسبیح ہے، اسلام میں تو اس کا تصور ہی نہیں۔ یہ تصور عربوں میں بھی نہیں تھا۔ ہاں البتہ بدھوں<sup>2</sup> کے ہاں یہ چیز تھی۔ کبھی فرصت ہوگی تو میں یہ بھی عرض کروں گا۔ کیا عرض کروں قرآن تو نصاب کی چیز ہے، تو پڑھانے کا ہے۔ ان بدھوں کے ہاں یہ جو دائرہ تھا، اس کے لیے انہوں نے اپنے ہاں دانے کی یہ منکا بنائی تھی۔ ان کے ہاں یہ تسبیح تھی۔ یہ وہاں سے عیسائی راہبوں نے لی اور جب عیسائیت کا تصوف<sup>3</sup> ہمارے ہاں سامنے آیا تو وہاں سے ہمارے ہاں یہ چیز آئی، ورنہ یہ دانے پھیرنے والی تسبیح، تو میں نے کہا ہے کہ اسلام تو ایک طرف رہا، عربوں کے ہاں قبل از اسلام بھی یہ نہیں تھی۔ سج کے معنی ہوتا ہے ”کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری توانائی صرف کر کے انتہائی کوشش کرنا“، یہ جو تیراک تیرنے میں اپنا پورا ہاتھ مارتا ہے، اس کو تسبیح کہتے ہیں، یہ جو گھوڑا دوڑتے وقت تیرنے والے کی طرح اس انداز سے چلتا ہے کہ اس کے پورے پاؤں آگے بڑھے ہوتے ہیں اس کو بھی تسبیح کہتے ہیں۔ ”سج للہ“ کے معنی ہیں: کائنات کی ہر شے خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے حصول کے لیے پوری توانائیوں سے سرگرم عمل رہتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سورج کس طرح سے نکلتا ہے خواہ سردی کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو۔ یہ وہی ہے جسے شاعر نے کہا ہے کہ

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید

صبح اٹھتا ہے کانپتا خورشید

وہ سردی خواہ کتنی ہی کانپنے والی کیوں نہ ہو وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ بیچ اک منٹ ہو ررضائی وچ سولین دے بڑا سیک ہیگا۔<sup>3</sup> وہ اگر کسی ایک

① A Tape recording

② اس کی مزید تشریح کے لیے یہ بھی ملاحظہ کیجیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورة الکھف و مریم ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2004، ص ص

212-213

③ پانچ ایک منٹ رضائی میں مزید سولینے دو۔ اس میں تو بڑی ہی مزید ارتش ہے (اور باہر ٹھنڈک)۔

دن بھی یہ کہہ دے یعنی تسبیح خداوندی کے اندر کوئی خلل واقع ہو جائے تو یہ کائنات تہس نہس ہو جائے۔

## ایران کے آتش کدوں کے نزدیک گردش کا مفہوم

عزیزانِ من! ”گردش میں ہے“ میں یہ جو گردش کا لفظ تھا یہ اصل میں دوری گردش (Circular Motion) کے معنوں میں تھا۔ یہ ہماری کم بختی ہے کہ جب ہمارے ہاں کی یہ شاعری ایران کے آتش کدوں سے ہو کر گزری تو اس نے ان تصورات کو مجوسی بنا دیا۔ اب اس میں گردش کے معنی تقدیر کے ہو جاتے ہیں جس میں یہ سب کچھ کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہ آج کل کی گردش ہی خراب ہے۔ ان ایرانیوں کا یہ خیال تھا کہ یہ جو آسمان کے ستاروں کی گردش ہے اس سے انسانوں کی تقدیریں وابستہ ہوتی ہیں۔ گردش کا یہ لفظ ان معنوں میں آگیا ورنہ اگر یہ لفظ قرآن کے معنوں میں آتا تو یہ بڑے صحیح معنوں میں آتا:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان  
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا<sup>①</sup>  
(غالب)

## اپنی اپنی جگہ کائنات کی ہر شے معروف تسبیح ہے

بات سچ للہ کی ہے بات صلوة کی ہے جس میں ہر شے اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں پورے جوش و خروش اور جذب و انہماک سے سرگرم عمل ہے اور آگے کل کا لفظ ہے یعنی کائنات کی ہر شے۔ پھر اس کائنات کی ہر شے کے بارے میں کہا کہ کُلُّ قَدْ عَلِمَ . (24:41) وہ ہر شے جانتی ہے: صَلَاتُهُ وَتَسْبِيحُهُ (24:41) اپنی اپنی ”صلوة“ کو بھی اور اپنی اپنی ”تسبیح“ کو بھی۔ غور فرمایا عزیزانِ من! کہ کائنات کی ہر شے کیا جانتی ہے؟ وہ جانتی ہے کہ اس کے ذمے کونسا فریضہ تفویض کیا گیا ہے اس کے کونسے فرائض منصبی ہیں؟ اور تسبیح یہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے مجھے کس طرح سے سرگرم عمل رہنا چاہیے کائنات کی ہر شے یہ جانتی ہے۔ قرآن کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ جو شخص جو سارا راستہ اختیار کرے اسی کے مطابق اس کے اعمال کے نتائج مرتب ہوں۔ اس مقصد کے لیے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سما) کی ساری مشینری سرگرم عمل ہے کہ ان اعمال کے نتائج پیدا کرے (11:7; 53:31)۔

① دن رات یعنی ارض و سما انسانی اعمال کو نتیجہ خیز بنانے میں مگوش ہیں۔ کسی بھی دن یہ نتائج سامنے آ ہی جائیں گے۔ اسمیں گھبرانے کی کیا بات؟ اسکی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورة النحل اُدارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2003، ص 148-144۔

## نماز کے متعلق ہمارے ہاں الجھے ہوئے مسائل

یہ فرائض کس طرح سرانجام دیئے جائیں؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ آج کل نماز کے متعلق ایک بڑا مسئلہ چل رہا ہے۔ ہمارے ہاں مذہب میں تو سارے مسئلے ہی مسئلے ہوتے ہیں۔ نماز کے متعلق مسئلہ یہ چل رہا ہے کہ کوئی نماز قرآن کے مطابق ہے۔ بہت بڑی بات ہے جو یہ متعین کیا جائے کہ کوئی نماز، کوئی صلوٰۃ، قرآن کے مطابق ہے لیکن جب بھی یہ جواب ان مولویوں کے بس میں پڑ جائے تو وہاں تو پھر یہ بات ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ یہ بحث چل نکلی کہ کیا پانچ وقتوں کی نماز ہے یا تین وقتوں کی نماز ہے اور یہ کہ نماز میں دو رکعتیں ہیں یا چار رکعتیں ہیں یا ایک ہی رکعت ہے اور پھر یہ بھی کہ کیا ایک رکعت میں دو سجدے ہیں یا ایک سجدہ؟ اب اس کے اوپر ساری لٹھم لٹھا ہو رہی ہے کہ یہ قرآن کے مطابق ہے اور وہ قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن سے پوچھیے کہ کوئی صلوٰۃ ہے جو منشاء خداوندی کے مطابق ہے۔ اب منشاء خداوندی تو ہم اللہ میاں سے جا کر پوچھنے سے رہے کہ جی! ہم نے یہ نمازیں پڑھ لی ہیں۔ فرمائیے جناب کی منشا کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔ یہ تو بات ہی نہیں ہے۔ اس نے خود بتا دیا ہے کہ منشاء خداوندی کے مطابق کوئی صلوٰۃ ہے۔ یہ جسے ہم منشاء خداوندی کہتے ہیں، یہ الفاظ ہمارے ہیں، اس نے بتایا یہ ہے کہ یہ ہے وہ فریضہ جو ہم نے تمہارے ذمے عائد کیا ہے۔ اگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ ہماری منشا کے مطابق ہو رہا ہے اور اگر یہ نتیجہ نہیں نکلتا تو ہماری منشا کے مطابق نہیں ہو رہا۔ اسے خود دیکھ لیا کرو۔ اے مسلمان! اپنے دل سے پوچھ کہ اس کا کیا جواب ملتا ہے۔

## صلوٰۃ کے سلسلہ میں منشاء خداوندی اور فحشا کا تصور

منشاء خداوندی تو قرآن نے اپنے ہر حکم کے ساتھ بتا دیا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اگر وہ نکلتا ہے تو خدا کی منشا کے مطابق ہے۔ اگر وہ نتیجہ نہیں نکلتا تو خدا کی منشا کے مطابق نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ منشاء خداوندی یا صلوٰۃ کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے؟ اس نے کہا ہے کہ **إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ** (29:45) اگر تم نے پہلی ہی، یعنی اولیں نگاہ میں یہ دیکھنا ہو کہ یہ صلوٰۃ کا منشا پورا ہو رہا ہے یا نہیں تو یاد رکھو! صلوٰۃ کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمہیں ہر ”فحشا“ اور ”منکر“ سے روک دے گی۔ ”فحشا“ ایک بڑا جامع لفظ ہے۔ ویسے ہمارے ہاں تو یہ ”فحش“ کا لفظ آگیا اور اس کے معنی میں وہی عریانیت کی چیز آگئی، جس کے خلاف روز جہاد ہوتا رہتا ہے۔ یہ جو فحشا ہے میں اس کو یہ نہیں سمجھتا۔ فحشا کے معنی ہوتا ہے ”سب کچھ سمیٹ کر اپنے لیے ہی رکھ لینا، بخیلی کو بھی فحشا کہتے ہیں“ اور چونکہ عربوں کے ہاں یہ بدترین خصلت تھی اس لیے اگر یہ چیز کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو وہاں ہر بدترین بات کے لیے یہ لفظ آیا اور وہاں سے یہ فحش کا لفظ ہے۔ اسکی بنیاد فحشا ہے۔ اس کے معنی بخل کے ہیں۔ پہلے تو صلوٰۃ اس چیز سے روکے گی کہ تم سب کچھ سمیٹ کر اپنے لیے رکھو اور اسے عام

نہ ہونے دو! اس کو روکے رکھو جب کہ اس کے برعکس صلوٰۃ تمہارے اندر اتنی وسعتِ قلب پیدا کر دے گی کہ تم پوری پوری محنت سے کماؤ اور انسانیت کی فلاح کے لیے اس کو کھلا چھوڑ دو۔ اس میں دوسرا لفظ ہے ”والممنکر“ یہ ہر وہ بات ہے جسے قرآن نے ناجائز قرار دیا ہے، قابلِ نفرت قرار دیا ہے اسے الممنکر کہا ہے۔ صلوٰۃ اس سے روک دیتی ہے۔ اگر صلوٰۃ یہ کچھ کرتی ہے تو یہ ہے قرآنی صلوٰۃ اور اگر یہ صلوٰۃ یہ کچھ نہیں کرتی تو وہ قرآنی صلوٰۃ نہیں ہے۔ مسئلہ کا تو حل یہاں مل گیا۔ قرآن نے خود ہی ان سے یہ پوچھا کہ کیا اب وہ پانچ وقتوں کی بجائے تین وقتوں کی دو رکعتوں کی یا ایک سجدے والی صلوٰۃ یہ کچھ کرتی ہے؟ اسکی اصل جانچ کا معیار تو یہ تھا۔

دل ہے مسلمان میرا نہ تیرا

تُو بھی نمازی میں بھی نمازی!

(اقبال: بال جبریل)

### قلب کی تبدیلی کے بغیر معاشرے کو بدلا ہی نہیں جاسکتا

جی! یہاں بات ہو رہی ہے کہ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (23:2)۔ فرائض منصبی جو خدا نے عائد کیے ہیں، کی بات ہو رہی ہے۔ اب مومن کے اعمال کی یا یوں کہیے کہ مومن کی صفات یا خصوصیات بیان ہو رہی ہیں کہ وہ کس طرح ان فرائض کی سر انجام دہی کرتا ہے۔ ایک سر انجام دہی قانون کے ڈر سے ہوتی ہے۔ مثلاً تھانیدار کے خوف سے، پکڑے جانے کے ڈر سے، اس سے بچ نکلنے کے تو ہزار راستے نکل آتے ہیں یعنی ادھر آپ کوئی ایک قانون بنائیے تو دوسری طرف قانون توڑنے والے اُسی وقت یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ اس قانون سے نکلنے کے راستے کون سے ہیں۔

عزیزانِ من! یاد رکھیے کہ صرف قانون کی رو سے آپ کسی معاشرے کے اندر بھی صداقت، امانت، دیانت اور یہ تمام چیزیں نہیں پیدا کر سکتے۔ اگر مکینکی طور پر (Mechanically) آپ کسی سے یہ کرانا چاہیں گے تو صرف وہ لوگ جو سزا سے ڈریں یا جنہیں سزا سے بچنے کے طریقے نہ آتے ہوں، وہ اس پہ کاربند ہونگے، جنہیں یہ کچھ آتا ہوگا وہ تو ڈریں گے ہی نہیں۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ قانون تو صرف ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جن میں یہ چیز نہ پیدا ہوگئی ہو۔ یہ وہ ہیں جنہیں سماج دشمن عناصر (Anti-State Element) کہتے ہیں۔ سوسائٹی کو ان کے ان مظالم سے محفوظ رکھنا مقصود ہو، تو ان کو پکڑ کر سزا دی جاتی ہے۔ لیکن جو پورا معاشرہ ہے اس کے اندر اس سے تغیر نہیں واقع ہوتا۔ لہذا جو قوانین خداوندی ہیں یا یوں کہیے کہ اس نے جو فرائض عائد کیے ہیں، ان سے صحیح نتیجہ اس صورت میں پیدا ہوگا جب انہیں مکینکی طور پر سر انجام نہ دیا جائے بلکہ وہ تمہارے دل کا تقاضا بن جائیں۔

## قرآن حکیم کے نزدیک خشوع کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ جو آپ پیاس کے وقت پانی پیتے ہیں، وہ کسی قانون کے ڈر سے، قانون کی رو سے، یا تھانیدار کے ہنٹر کے ڈر سے نہیں پیتے یا کسی سزا کے خوف سے نہیں پیتے یا لوگوں کو دکھانے کے لیے نہیں پیتے۔ وہ تو جنگل کی تنہائیوں میں بھی اگر آپ کو پیاس لگتی ہے تو لگتی چلی جاتی ہے، اس کا تقاضا ہوتا ہے، وہ شدت اختیار کر جاتی ہے تو آپ پانی پیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ جو کیفیت ہوتی ہے کہ ان قوانین کی اطاعت یا ان فرائض منصبی کی ادائیگی، آپ کے دل کا تقاضا بن جائے تو اسے خشوع کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ** (23:2) فرائض منصبی کی ادائیگی ان کے دل و قلب کا تقاضا بن جاتی ہے، یہ اندر سے ان کی زندگی کا تقاضا ہو جاتا ہے، یہ اندر سے ابھرتی ہے۔ اب اس کے لیے نہ کسی سپاہی کی ضرورت ہے نہ کسی حوالات کی، نہ کسی عدالت کی، نہ کسی جیل خانے کی، یہ تقاضا تو اندر سے ابھرتا ہے۔ کس قدر حسین انداز میں قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ ایک آیت کا حوالہ (4:65) ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ جو اسلامی نظام ہے اس کے اندر تو انینِ خداوندی کی ادائیگی کے سلسلہ کی کیا کیفیت ہوگی یا ان قوانین کی رو سے یہ جو فیصلہ دیا جائے گا ان پر عمل پیرا ہونے کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ **فَلَا وَرَبِّكَ** (4:65)۔ عجیب انداز ہے بات کہنے کا! **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ** (4:65) اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے۔ **حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ** (4:65) جب تک یہ اپنے ہر اختلافی یا نزاعی معاملے میں تمہیں حکم (فیصلہ کرنے والا ثالث) نہ بنائیں اور تم وہ فیصلہ قرآن کے مطابق، وحی کے مطابق، صادر کرو۔ ہر قانون یہ کہتا ہے کہ رعایا اسی صورت میں پُر امن ہو سکتی ہے کہ اگر اس میں کوئی جھگڑا ہو تو وہ عدالت سے آ کر فیصلہ لے۔ یہ مکینکل چیز ہے لیکن سینے، فرق کہاں پڑتا ہے؟ یہاں لفظ **خَاشِعُونَ** کی تشریح ہو رہی ہے اور کہا یہ جارہا ہے کہ تو جو فیصلہ بھی دے **ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ** (4:65) یہ لوگ اس فیصلے کے خلاف اپنے دل میں گرائی بھی محسوس نہ کریں، اس طرح سر تسلیم خم کریں کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اُس کے خلاف گرائی اور کبیدگی محسوس نہ کریں (24:62; 33:36)۔ اس طرح **وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا** (4:65) اور یوں اس کے سامنے جھکیں کہ یہ جسم ہی نہ جھکے بلکہ ان کا یہ دل بھی اس کے سامنے جھکے اور اس فیصلے کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرائی محسوس نہ کریں۔ اگر گرائی محسوس کر لی تو خدا کہتا ہے: تیرے خدا کی قسم، یہ مومن نہیں کہلا سکتے۔ جس دن کسی کسان نے یہ محسوس کر لیا کہ ساری دنیا میں مجھے ہی کیا مصیبت پڑی ہوئی ہے کہ میں صبح اٹھتا ہوں، سردی کے کپکپاتے جاڑے میں، اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں، اور روز جا رہا ہوں۔ وہ جو اس قسم کے کسان ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اس بیتابی

میں ہوں انہیں کچھ نہیں ملتا۔ اس کے دل میں جس دن بھی یہ بات پیدا ہوگئی تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس کے نتیجہ میں اس کی کھیتی جل جائے گی اور یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ اس نے اس قانون کو بطیب خاطر قبول ہی نہیں کیا، اس کا اس پر ایمان ہی نہیں تھا۔ چنانچہ یہ امر ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ **فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ** (23:2) ان فرائض کی سرانجام دہی ان کے دل کا تقاضا بن جائے اور دل ان کے ساتھ جھکے۔

### ذہنیت کی یہ تبدیلی انسان کو خود ہی کرنا ہوگی

اب سوال یہ ہے کہ دل کا یہ جھکاؤ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے قرآن کریم نے یہ بتایا ہے اور یہ بہت ہی اہم چیز ہے کہ آج ساری دنیا اس کا اقرار کر رہی ہے کہ **إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ** (13:11) اللہ کے ہاں سے بھی کسی قوم کی حالت میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی جب تک وہ قوم خود بھی اپنی حالت کو نہ بدلے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یاد رکھو! اور تو اور خدا بھی کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا **حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ** (13:11) جب تک وہ قوم اپنی ذہنیت کے اندر خود تبدیلی نہ پیدا کر لے، اپنے اندر خود نفسیاتی تغیر (Change) نہ پیدا کر لے بلکہ اس کے متعلق تو یہاں تک کہہ دیا کہ خدا بھی یہ نہیں کرتا۔

یہ جو اندر کی تبدیلی ہے اصل تو یہ ہے۔ اسے ہی دل کا تقاضا کہا گیا ہے۔ یہ ہے **خَاشِعُونَ** (28:2) اور پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان احکام کی بجا آوری میں اپنے دل میں گرانی تک محسوس نہ کرو۔ یہ ہوگی ذہنیت کی تبدیلی۔ اس کے بغیر یہ جواتنا کچھ ہمارے ہی ہاں نہیں، عزیزانِ من! بلکہ ساری دنیا میں کیا جا رہا ہے، اگر آپ ان قوانین کو دیکھیں تو یہ اتنے عظیم اور اتنے بلند نظر آتے ہیں کہ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں اور اس کے بعد اس قوم کا نقشہ دیکھیں تو دنیا بھر کے جرائم وہاں پائے جاتے ہیں اور پھر یہ کیفیت ہر جگہ ہو رہی ہے۔ آخر کار یہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ دُور نہیں جائے آپ اپنے ہاں تو روز بیٹھ کر یہ رونا روتے ہیں، مرثیہ پڑھتے ہیں، ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ پھر صاحب! کیا تدبیر اختیار کی جائے اور پھر تدبیر بھی سارے بیٹھ کر مکینکلی ہی سوچتے ہیں کہ جی! ٹھیک ہے کہ یہ قانون کچھ زیادہ سخت کر دیا جائے۔ یہ قانون اور پاس کر دیا جائے، یعنی او پہلے قانون انج کیڑے پئے ہوئے نے<sup>①</sup>۔ لہذا کیے جاؤ:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے

مگر خبط دوا ہے اور میں ہوں

① گویا اس پہلے قانون میں کیڑے پڑ گئے تھے۔



صرف یہ کیے جاؤ۔ یہی حظِ دوا ہے تغیرِ نفس نہیں ہے۔

### اربابِ اقتدار سے میری التماس

عزیزانِ من! ان چیزوں کا حقیقی حل ذہنیتوں کی تبدیلی ہے اور یہ میں تیس سال سے کہتا چلا آ رہا ہوں۔ یہاں تمام اربابِ حکومت سے میری سلام دعا تھی۔ میں یہ کہتا چلا آ رہا تھا کہ بابا! یہ جو اپنی ابھرنے والی نئی نسل ہے اس کو سنبھالو اس کی ذہنیت میں صحیح تبدیلی پیدا کرو اسے تعلیم صحیح دو۔ تقسیمِ ہند یا تشکیلِ پاکستان کے زمانے میں جو بچے پانچ پانچ دس دس پندرہ پندرہ سال کے تھے وہ ابھی ابتدائی تعلیم میں تھے۔ تیس برس کے بعد وہ پینتیس چالیس سال کے ہو گئے۔ آج کی قوم وہی ہے اور انہی کے ہاتھوں آپ نالاں ہیں۔ یہ کیوں دن بدن سرکشی بڑھتی چلی جا رہی ہے؟ وہ صرف اس لیے کہ تغیرِ نفس نہیں ہے ہم نے ذہنیت نہیں بدلی ہم قانون پہ قانون بنائے چلے جا رہے ہیں جب کہ بات تو ذہنیت بدلنے کی تھی۔

### قرآن حکیم کے نزدیک لغویات کا مفہوم

عزیزانِ من! یہاں خَاشِعُونَ (23:2) کہا تھا کہ وہ ہمارے ضابطہ حیات کی صداقت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کریں اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (23:3) ان کی توانائیاں ایسے کاموں میں ضائع نہ ہوں جن کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ نیز وہ ان تمام امور سے محتجب رہیں جو انہیں قرآن کی طرف آنے سے روک دیں وہ ہر طرح کی لغویات سے پرہیز کریں۔

اب اس آیت میں ان کی اگلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لغو سے اعراض برتیں گے۔ یہ ہمارے ہاں جو لفظ ”لغو“ ہے وہ بھی عام استعمال ہوتا ہے۔ کن معنوں میں ہوتا ہے؟ ”یہ بڑی لغوبات ہے“ اور آگے بڑھیں گے ان سے پوچھیں گے تو لغویات میں پڑیں گے۔ پھر جب مذہب پرست طبقہ آتا ہے تو یہاں تک بات ہوتی ہے کہ یہ تاش کھلتے ہیں شطرنج کھلتے ہیں چوسر کھلتے ہیں تو یہ ساری باتیں لغویات ہو جاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ دو ہی درس پہلے تو یہ بات آئی تھی۔ پھر تجدیدِ یادداشت کر دوں کہ (26:41) میں یہ کہا گیا تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ قرآن پیش کرتے تھے تو یہ جو مخالفین قرآن تھے وہ اپنے لوگوں سے کہتے تھے کہ اگر یہ تعلیم کسی کے کانوں میں پڑ گئی یا اسے کسی نے سن لیا تو پھر ہماری خیر نہیں پھر ہم ان لوگوں کے اوپر غالب نہیں آسکتے۔ لہذا اس کا طریقہ یہ ہے کہ لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ (41:26) دیکھنا! تم کہیں قرآن کو نہ سن لینا۔ اس لیے ایک تو تم خود بھی اس کو نہ سنو اور دوسرا یہ کہ وَالْعَوَا فِيهِ (41:26) جہاں دیکھو کہ کوئی شخص قرآن کی بات پیش کرتا ہے وہاں شور مچا دو کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ لغو کہتے ہیں کہ جیسے یہ چڑیاں اور کوے

کائیں کائیں چیں چیں کرتے ہیں اس قسم کا کچھ بیہودہ شور مچا دینا کہ وہ آواز کان میں نہ پڑے۔ تو ہر وہ شے جو قرآن کی آواز کو کسی کے کان تک نہیں پڑنے دے وہ لغو ہے۔ قرآن کی رو سے مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر اس بات سے اعراض برتتا ہے جو قرآن کی آواز میں حائل ہونے والی ہو۔ یہاں کہا ہے کہ وہ ایسے لغو سے اعراض برتیں گے۔

عزیزانِ من! آگے یہ ہے کہ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ<sup>①</sup> (23:41)۔ چلیے جی! ابھی ابھی صلوٰۃ کی بات ہو رہی تھی اور میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج اس کا مفہوم کیا سے کیا ہو گیا ہے اور اس کے بعد جب وہاں سے ذرا آگے نکلے ہیں تو زکوٰۃ کا یہ لفظ آگیا۔ صلوٰۃ تو رہ گئی آپ کے ہاں صرف مسجد میں پانچ وقت میں یا یہ اہل قرآن کے نزدیک تین وقت میں جا کے کچھ وہ کر لینا۔ زکوٰۃ کیا ہو گئی؟ جتنا مال جی چاہے جمع کرو اس میں سے ان کے مقرر کیے ہوئے نصاب<sup>②</sup> اور شرح کے مطابق نکال کے خیرات دیدو۔ یہ زکوٰۃ ہو گئی۔

### خود ساختہ مروجہ اسلام میں قدم قدم پر تضاد

اب جس چیز کا نام اسلامی اور غیر اسلامی رکھا جا رہا ہے اس میں اسلامی اسے کہتے ہیں کہ صاحب! یہ جو زکوٰۃ ہے اسے اپنے طور پہ خیرات کر دیا جائے۔ ایک نے کہا کہ اس کا یہ صحیح طریقہ نہیں۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ بیت المال میں جمع ہو اسے حکومت اکٹھا کرے۔ یہ حکومت کی آمدنی ہے حکومت کے خزانے میں جائے۔ دوسرا کہنے لگا کہ نہیں صاحب، خزانہ تو دنیاوی حکومتوں کا ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت میں بیت المال ہوتا ہے۔ اس سے کہا گیا کہ مال کے معنی دولت اور بیت کے معنی گھر یعنی جہاں دولت رکھی جائے۔ یہی تو خزانہ ہوتا ہے۔ کیا خزانے کے اندر سانپ رکھے جاتے ہیں؟ کہنے لگے کہ نہیں، خزانہ میں نہیں، ادھر بیت المال میں رکھا جائے۔ آپ دیکھتے ہیں عزیزانِ من! کس طرح کا یہ کھیل کھیلا جاتا ہے، یعنی وہی مال بیت المال میں رکھا جائے تو اسلامی ہے، خزانہ حکومت میں رکھا جائے تو غیر اسلامی ہے۔ بات وہی رہے کہ روپیہ جتنا جی چاہے دولت جتنی جی چاہے اکٹھی کرتے چلے جاؤ بس اس میں سے ان کی مقرر کردہ ادا کردو۔ میں نے پھر دوبارہ لفظ دوہرایا ہے: ”ان کی مقرر کردہ“۔ قرآن کریم میں تو زکوٰۃ کا یہ تصور ہی نہیں۔ جب یہ تصور ہی نہیں تو یہ کہ اس کا اتنا نصاب<sup>②</sup> ہوا اتنی شرح ہو اور پھر اس پہ یہ اتنے مسائل کے طومار ہوں عجیب سا لگتا ہے۔

① اور وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے جس سے تمام نوع انسان کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 773)

② زکوٰۃ کے مروجہ مفہوم کی رو سے جب کسی شخص کے پاس ایک خاص مقدار کے مطابق مال جمع ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک خاص حصہ (عام طور پر اڑھائی فیصد) خدا کی راہ میں دیدے۔ مال کی اس مقدار کو جس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے نصاب کہتے ہیں اور جس نسبت سے اس میں زکوٰۃ نکالی جائے اسے شرح کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نصاب حسب ذیل بتایا جاتا ہے:

(1) چاندی ساڑھے باون تولہ (2) سونا ساڑھے سات تولہ (3) اونٹ 5 پانچ راس (4) گائے تیس راس (5) بکریاں چالیس راس وغیرہ وغیرہ

(حوالہ پرویز 1989ء) نظام ربو بیت لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ص 415۔

اس پر تو ذہن میں بار بار قائد اعظم محمد علی جناح (1948-1976) کی یاد آ جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا یہ تصور قرآن میں ہے ہی نہیں۔ میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ قائد اعظمؒ سے جو باتیں ہوتی رہی ہیں کبھی وقت ملا تو شاید اکٹھی بھی عرض کروں۔ ایک دفعہ ان کے ساتھ اسلامی اقتصادیات (اکنامکس) پہ گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ جواڑھائی پرسنٹ کی مقرر کردہ شرح ہے اس میں بھی عجیب کیفیت ہے۔ میں یہاں یہ واضح کر دوں کہ یہ چیزیں خود ہی ان کے ذہن میں آیا کرتی تھیں۔ کیفیت یہ ہے کہ سونا ساڑھے سات تولے ہو تو اس پہ زکوٰۃ ہے اور چاندی ساڑھے باون تولے ہو تو اس پہ زکوٰۃ ہے۔ ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت تو ذرا دیکھیے کہ کہاں پہنچتی ہے۔ ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کچھ نہیں رہتی۔ غریبوں کے پاس تو یہی ساڑھے باون تولے والا نصاب ہوگا اور وہ جو ساڑھے سات تولے والا ہے تو اگر وہ سات تولے تک بھی ہوگا تب بھی آج<sup>1</sup> ساڑھے تین ہزار روپے ویسے ہی ہو جائیں گے۔ وہ تو سونے والوں کو معاف ہے۔ اس کے برعکس ساڑھے باون تولے والا غریب جس کے پاس ڈیڑھ سو کے قریب ہے اس پہ تو زکوٰۃ فرض ہوئی۔ مرے نوں ماریں شاہ مدار<sup>2</sup> اس غریب پہ تو وہ شرح زکوٰۃ لگی۔ انہوں نے کہا کہ یہ جو نصاب اور شرح ہے تو کیا، وہ ان Finances (مالیات) کی رو سے اس اسلامی مملکت کا جو کاروبار یا نظام ہے چل سکے گا؟ میں نے کہا کہ جی! یہ نصاب یہ شرح اور یہ اس قبیل کی چیزیں تو قرآن میں ہیں ہی نہیں۔ اس پر کہنے لگے: ”سچ بات، ٹھہر جا، بات سمجھ میں آگئی“۔ یہ میرے ساتھ پاکستان بننے کے چند ہی دنوں بعد کی بات ہے۔

### زکوٰۃ کے لیے اسلامی حکومت کا قیام از بس ضروری ہے

بہر حال سورۃ الحج کی 41 ویں آیت ہے، اسے دیکھیے تو سہی کہ قرآن حکیم میں زکوٰۃ کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ زکوٰۃ کی موجودہ صورت تو یہ ہے کہ انگریز کے زمانے میں بھی زکوٰۃ نکالتے تھے اور بانٹتے تھے کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ آج ہندو کی حکومت میں بسنے والا مسلمان بھی جس کا جی چاہے زکوٰۃ نکالے اور بانٹے یعنی اس میں یہ شرط ہی نہیں ہے کہ آپ کے ہاں کوئی اسلامی نظام ہو، اسلامی حکومت ہو۔ کچھ بھی اپنے طور پہ ہی ہو، زکوٰۃ نکلتی ہے۔ اگر یہی چیز زکوٰۃ ہے تو پھر اس کے لیے تو شرط نہیں ہے کہ خود مسلمانوں کو تمکن حاصل ہو، ان کی اپنی حکومت ہو، انہیں اقتدار حاصل ہو۔ یہ تو شرط ہی نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے: ”بات تو سمجھ میں آگئی۔“

① یاد رہے کہ یہ کوئی 1947 کی بات ہے۔

② (مثل) مصیبت زدہ کو اور ایذا پہنچانا۔

## مملکت اسلامیہ زکوٰۃ لوگوں سے لے گی نہیں بلکہ انہیں زکوٰۃ دے گی

قرآن کہتا ہے کہ **الَّذِينَ إِنْ مَّكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (22:41)** انہیں زمین پر حکومت ملے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو پھر یہ کیا کریں گے؟ کہا کہ **أَقَامُوا الصَّلَاةَ (22:41)**۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے۔ یہاں وہ لفظ صلوٰۃ آگیا۔ شرط یہ ہوئی کہ **الَّذِينَ إِنْ مَّكَّنَّهُمْ (22:41)** اگر انہیں حکومت مل گئی تو پھر پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے۔ نماز ہی پڑھنے والی بات کے لیے تو حکومت شرط تھی نہیں۔

عزیزانِ من! یہ سوچنے والی بات ہے کہ قرآن نے یہ کیا کہا ہے کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو پھر وہ یہ یہ کریں گے۔ نظر آیا کہ یہ کچھ اپنی حکومت میں کرنے کی بات ہے۔ بہر حال **أَقَامُوا الصَّلَاةَ** کو تو چھوڑ دیجیے کیونکہ ابھی اپنی حکومت تو قائم نہیں ہوئی۔ اگر ان کی ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اپنی حکومت قائم ہو جائے تو حکومت لوگوں سے یہ زکوٰۃ وصول کرے اور بیت المال کے اندر داخل کرے۔ اسے اسلامی کہا جاتا ہے۔ لوگوں سے یہ زکوٰۃ لے۔ اسے بہر حال الگ رکھے۔ یہ ہے جسے کہا جاتا ہے کہ اسلامی یوں بنے گی یعنی لوگوں سے زکوٰۃ لے اور الگ رکھے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ان کی حکومت قائم ہو جائے گی تو کیا ہوگا؟ **وَاتُوا الزَّكَاةَ (22:41)** یہ زکوٰۃ دیں گے۔ ہیں؟ یہ زکوٰۃ دیں گے؟ عزیزانِ من! قرآن حکیم کی آیات کے حوالے آپ کے سامنے موجود ہیں جو میں پیش کیے چلا جا رہا ہوں۔ قرآن میں تو ایک لفظ بھی اپنے خیال کے مطابق کہنا میرے نزدیک شرک ہے۔ اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے۔ اس کے لیے قرآن کی آیتیں شرط ہیں۔ کہا کہ **إِنْ مَّكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (22:41)** اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی تو زکوٰۃ دیں گے۔ اب پھر آجائے درس والی آیت پر یعنی **وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ (23:4)**۔ الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے کہا ہوا ہے عزیزانِ من! قرآن کے چھوٹے چھوٹے نسخے ہی ساتھ لے آیا کریں۔ اگر قرآن کے الفاظ سامنے ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہا ہے کہ **هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ** <sup>①</sup> (23:4)۔ یعنی یہ اس کی ترکیب ہوئی کہ: **هُمْ فَاعِلُونَ** کس لیے؟ للزکوٰۃ۔ اب بات صاف ہو گئی کہ **فَاعِلُونَ** کے معنی کام کرنا ہے۔ جب ان کو ممکن ملے گا زمین میں حکومت قائم ہوگی تو ان کا پورا کاروبار یہ پروگرام ان کے **فَاعِلُونَ** کا ہے۔ کا ہے کے لیے ہے؟ للزکوٰۃ۔ یہاں یہ ”ل“ نافع ہے۔ کا ہے کے لیے ہوگا؟ یہ سارا زکوٰۃ کے لیے ہوگا۔ وہاں (22:41) میں کہا تھا کہ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی تو زکوٰۃ دیں گے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ سارا کاروبار اس حکومت کا ہے اور اس کا منتہا زکوٰۃ دینا ہوگا۔

① اور وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے جس سے تمام نوع انسان کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 773)

## زکوٰۃ کا تو بنیادی معنی ہی نوع انسانی کو سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا ہے

یہ حکومت اپنے فنانسز (مالیات) میں اپنی آمدنی میں دیکھ لے گی کہ کتنا روپیہ سال بعد جمع ہو گیا اور اس میں سے بھی اڑھائی پرسنٹ نکال کے پھر کیا کرے گی: پاکستان والے سعودی عربیہ کو دیں گے عربیہ والے ہمیں بھیج دیں گے جس طرح کہ قربانی کا گوشت جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ عزیزانِ من! قرآن کو کھڑے ہو کے سوچیے۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **هُمُ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ** (23:4)۔ وہ مقصود یہ ہے کہ الزکوٰۃ دیں گے۔ یہ سارا کاروبار زکوٰۃ کے لیے ہوگا اور زکوٰۃ کے بنیادی معنی اور خود قرآن کریم کی رو سے اس کے معنی ہوتے ہیں ”نوع انسان کے لیے نشوونما کا سامان بہم پہنچانا“۔ بالفاظ دیگر اسلامی مملکت کا مقصود و منہا ہی انسانیت کو زکوٰۃ بہم پہنچانا ہے۔ لہذا اس مملکت کا کاروبار حیات قرآن کے الفاظ میں **هُمُ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ** (23:4) ہے۔ اس کے تمام افعال زکوٰۃ کے لیے ہونگے جب کہ اس کے برعکس دنیا کی جو اور حکومتیں قائم ہوئی ان کا مقصد صرف لینا لوٹنا، کھسوٹنا، ہوگا لیکن یہ مملکت اسلامیہ جو ان لوگوں کے ہاتھوں سے جب قائم ہوگی تو ان کا مقصود مملکت دینا ہوگا۔ تو مقصود اقامت صلوٰۃ ہوا کہ قرآن کی رو سے یہ جتنے بھی فرائض منصبی عائد کیے جاتے ہیں ان کا دل کی گہرائیوں سے طلب و تقاضے کی رو سے پورا کیے چلے جانا۔ یعنی مقصد اس تمکن کا ہوا، نوع انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔

## جسمانی نشوونما کے ساتھ انسانی ذات کی نشوونما بھی

قرآن کی رو سے اب نشوونما صرف جسمانی نشوونما ہی نہیں ہے بلکہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما بھی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما بھی اور اس قسم کی نشوونما کا حصول صرف اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ گویا اس مملکت کی پہلی چیز تو یہ ہوگی کہ اس کی حدود کے اندر حضرت عمر فاروق ♦ (A.D 581-644/45) کے الفاظ میں ”اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا، تو اس کی باز پرس خلیفۃ المسلمین سے ہوگی“۔ دیکھا زکوٰۃ بہم پہنچانے کا طریقہ کس طرح ادا ہو رہا ہے! نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس بستی میں ایک فرد نے بھی رات اس طرح بسر کی کہ وہ بھوکا سو گیا اور باقی جو تھے وہ سیر ہو کر سوئے، تو اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیتا ہے۔ غور فرمایا کہ اسکی کیا تشریح ہوئی؟ یہ کہ **وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ** ان کا سارا پروگرام، مملکت کا نظم و نسق اور کاروبار کا طریق کار، اقامت صلوٰۃ ہے اور مقصود و منہا پوری نوع انسانی کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچانا ہے۔

## ذات انسانی کی نشوونما کے لیے قرآنی حدود کا تعین اور ان کی اہمیت

اس نشوونما کے لیے جسے میں نے کہا ہے کہ اس میں خود انسانی ذات کی نشوونما بھی ہے انسان کے اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کی

جاتی ہیں۔ انہیں بیباک نہیں چھوڑا جاتا۔ انسانی صلاحیتوں اور اسکی استعداد کو اگر حدود اور قیود میں نہ رکھا جائے، انہیں بیباک چھوڑ دیا جائے، تو یہ سرکش ہو جاتی ہیں۔ اسے شیطان یا ابلیس کہتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھا جائے تو پھر یہ انسان اپنے اندر ایسا تغیر پیدا کر لیتا ہے کہ دوسروں کی نشوونما اس کی اپنی ذات کا تقاضا ہو جاتا ہے۔ وہ نشوونما کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کئی دفعہ میں نے مثال دی کہ پہاڑوں سے اترنے والا پانی، دریا کی شکل اختیار کرتا ہے۔ دریا ساحلوں کے اندر بہتا ہے۔ نہریں کناروں کے اندر بہتی ہیں۔ یہ ہر جگہ سامانِ نشوونما کے پھیلائے کا ذریعہ بنتا چلا جاتا ہے، مدحیات ہوتا ہے اور اگر اس کے کنارے اور ساحل ٹوٹ جائیں تو اسے سیلاب کہتے ہیں۔ وہی پانی تباہیاں لے آتا ہے۔ بات تو صاف ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس پر کچھ حدود عائد کی جائیں اور یہ حدود سب سے پہلے تو اپنے آپ پہ عائد کی جائیں۔ ان حدود میں قرآن نے جو اگلی بات کہی ہے، وہ ہے جہاں انسانی جذبات کی شدت کی انتہا ہوتی ہے، وہاں پہنچ کر قرآن حکیم نے ایک حد کا ذکر کیا ہے جبکہ باقی حدود اس کے تابع آ جاتی ہیں۔ وہ ہے جنسی جذبے کی تسکین۔

آج کے درس میں سورۃ المؤمنون کی صرف پہلی چار ہی آیات ہو گئیں۔ عزیزان من! پانچویں آیت سے ہم آئندہ اتوار کو لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



## دوسرا باب: سورة المؤمنون (آیات 5 تا 7)



عزیزانِ من! آج اپریل 1977ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 5 سے ہو رہا ہے: (23:5)۔

اس سورة کا آغاز پچھلے درس سے ہوا تھا۔ اسکی ابتدا یہ ہے کہ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (23:1) مؤمنین کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی، ان کی کوششیں بار آور ہوگی، ان کی جدوجہد نتیجہ خیز ہوگی، انہیں Achievements حاصل ہوگی۔ ”مؤمنون“ کہنے کے بعد اس سورة میں آگے ان کی چند ایک خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں پہلی خصوصیت یہ تھی کہ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (23:2) وہ دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ خدا کے قانون کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، یعنی اس کی رو سے جو فرائض اُن پر عائد ہوتے ہیں، یہ انہیں بطیب خاطر سرانجام دیتے رہے۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (23:3) اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ ان کی توانائیاں ایسے کاموں میں ضائع نہ ہوں جن کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ نیز وہ ان تمام امور سے مجتنب رہے جو انہیں قرآن کی طرف آنے سے روکنے والے تھے (26:41)۔ انہوں نے ہر طرح کی لغویات سے پرہیز کیا۔ اور تیسری خصوصیات یہ بتائی کہ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (23:4) اور وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے جس سے تمام نوعِ انسانی کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ یہ خصوصیات تو سابقہ درس میں ہمارے سامنے آ گئی تھیں۔

### قرآنِ حکیم کے نزدیک حفاظتِ عصمت کی اہمیت

اسی تسلسل میں اب آگے بھی دو چار اور خصوصیات بیان کی جا رہی ہیں۔ ویسے تو مؤمنین کی خصوصیات یا ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں ان کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سورة کے شروع کی چند ایک آیات میں

ہی ان کی چند ایک بڑی نمایاں یا بنیادی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور آج ہمارے سامنے پانچویں آیت میں ان کی جو خصوصیت آتی ہے وہ یہ ہے وَالَّذِينَ هُمْ لِغُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (23:5)۔ اس آیت کے عام ترجمے میں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ ”اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں“۔ اس سے مفہوم یہی ہے جسے عصمت کی حفاظت کہا جاتا ہے۔ عصمت کی حفاظت کا تصور کچھ ایسا عام ہے کہ اس کے متعلق کچھ سوچنے یا غور کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بگڑے ہوئے معاشرے میں بھی اس کی اہمیت بہر حال باقی رہتی ہے اور معاشرے میں بھی ہوتی ہے لیکن یہ چیز اس سے پہلے کبھی سامنے نہیں آئی تھی اور ہمارے ہاں تو اب تک بھی یہ نہیں آئی کہ یہ کیوں ضروری ہے۔ میں محتاط الفاظ میں ہی گفتگو کروں گا، ساتھ میری بیٹیاں بہنیں بھی ہوتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ عصمت کی حفاظت اس کی اہمیت تو ہمارے ذہنوں میں ہے اور یہ بڑا ہی نازک (Touchy) اور اہم مقام ہے لیکن اس پر کبھی Scientific (سائنسی) نقطہ نگاہ سے یا آج کے Psychology (علم نفسیات) کے نقطہ نگاہ سے کبھی تحقیق نہیں کی گئی کہ یہ کیوں ضروری ہے۔ عام طور پر تو یہی تصور دیا گیا ہے کہ فیملی یونٹ کے لیے عائلی زندگی کے لیے، ہوم لائف کے لیے، میاں بیوی کے تعلقات کا پابندیوں کے اندر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ میاں بیوی کے ہی تعلقات عائلی زندگی میں آتے ہیں لیکن آگے بڑھیں تو یوں کہیں کہ جنسی اختلاط کے متعلق پابندیاں ضروری ہیں۔ ذہن میں اتنا ہی تھا کہ فیملی لائف کے لیے ایک ضروری چیز ہے۔ یہی بات آج تک سمجھی جاتی تھی۔

### جنسیات کے سلسلے میں اہل یورپ کے مفکرین کی ریسرچ کے باوجود ان قوموں کی حالت زار

ہمارے دور کے ان ممالک میں اس کے متعلق خاص طور پر جو ریسرچ (تحقیق) ہوئی ہے اور جو ہو رہی ہے اُس میں جہاں یہ چیز عجیب بھی ہے اور دلچسپ ستم ظریفی کی بھی ہے کہ ریسرچ اتنی ہو رہی ہے اور انہی ممالک میں جنسی تعلقات کی بیباکیاں اتنی عام ہو رہی ہیں گویا وہاں کوئی پابندی باقی ہی نہیں ہے۔ یعنی وہی لوگ اس پر ریسرچ کر کے بتا رہے ہیں کہ یہ کتنی ضروری چیز ہے اور وہی اقوام ہیں کہ وہاں جو کچھ پابندیاں پہلے تھیں وہ انہیں بھی اڑاتے چلے جا رہے ہیں اور اب تو وہ اس انتہا تک پہنچ گئے ہیں جہاں حیوانی زندگی بھی نہیں ہے۔ اس سے یہ نظر آتا ہے کہ قرآن کریم میں اقوام سابقہ کے متعلق بھی یہ کہا اور تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ کوئی یونہی جاہل قومیں یا وحشی قومیں نہیں تھیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ وہ بڑی مہذب قومیں تھیں اور تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ ان کی تہذیب بہت بلند یوں تک پہنچی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ ایک مہذب قوم ایک ایسی قوم جو اپنے دوسرے معاملات میں اس قدر علم و بصیرت سے کام لیتی تھی ان کے ہاں یہ اس قسم کی خرابیاں کیوں پیدا ہوئیں لیکن آج یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔



میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یورپ میں اس قسم کی تحقیقات میں وہاں کے سائنسٹ (سائنسدان) وہاں کے سائیکالوجسٹ (ماہرین علم نفسیات) بلکہ سوشیالوجسٹ (ماہرین علم سماجیات) بھی اس ریسرچ (تحقیق) میں بہت آگے ہیں اور وہ بتا رہے ہیں کہ اس کی کتنی اہمیت ہے اور یہ وہی اقوام ہیں جو اپنی سوسائٹی میں پہلے سے چلی آنے والی روایتاً پابندیوں کو بھی اڑاتے چلے جاتے ہیں اور انتہا تک پہنچ چکے ہیں حالانکہ انہی کے ہاں کے ریسرچ اسکالر (علمائے تحقیق) یہ بتا رہے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا یعنی وہاں یہ بات ذہنی نہیں رہی۔ ہمارے ہاں تو یہ کچھ ذہنی طور پر ہے کہ تحقیق کے اس بدکرداری پہلو کو ہی معیوب سمجھا جاتا ہے اور خاص طور پر اس قسم کی تحقیق لڑکیوں اور عورتوں میں قابل برداشت بھی نہیں ہے۔ ہم لوگ تو اس لیے اس کو اہمیت دیتے ہیں لیکن وہ تو میں اس طرح ذہنی طور پر اسے اہمیت نہیں دے رہی ہیں، وہ تو ریسرچ کر رہے ہیں اور پھر اس کے بعد بتا رہے ہیں کہ یہ کتنی اہم چیز ہے لیکن اس کے باوجود وہاں بیباکیاں عام ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہیں۔ جس قوم میں مثلاً برطانیہ میں Homo-sexuality (ہم جنسیت) قانوناً جائز قرار پا جائے تو وہاں صورت حال کیا ہوگی۔ آپ اندازہ لگائیے کہ سابقہ تاریخ میں وہ قوم لوط تو بس ایک قوم تھی۔ ان کے شہر سدوم (Sodom) <sup>1</sup> کے نام سے Sodomy کا لفظ اس جنسی بدنہادی کے لیے چلا آ رہا ہے اور آج تک تاریخ میں کوئی دوسری من حیث القوم ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جن کے ہاں یہ چیزیں رائج ہو۔ اس کے بعد یہ چیز صرف آج ان اقوام میں مل رہی ہے جو اپنے ہی ہاں کی ریسرچ سے اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ جنسیت کے لیے یہ پابندیاں کتنی ضروری ہیں۔ انسانی اندازِ زیست کی یہ عجیب ستم ظریفی سی نظر آتی ہے کہ جہلا کے ہاں وحشی قبائل کے ہاں تو اب تک بھی وہ پابندیاں چلی آ رہی ہیں جو ان کے ہاں پہلے سے وراثتاً موجود تھیں اور وہ ترکے میں ان کو ملی ہیں لیکن یہ قوم ہے کہ ریسرچ کے بعد وہاں پہنچ گئی ہے جہاں ان کے ہاں ریسرچ (تحقیق) کرنے والے کہہ رہے ہیں کہ تباہ ہو جاؤ گے، برباد ہو جاؤ گے۔ قرآن نے اس پہ بڑا زور دیا ہے اور عزیزانِ من! آج یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ ریسرچ (تحقیق) وہ لوگ کر رہے ہیں اور قرآن نے جو اس کو اہمیت دی ہے اس بات کی وجہ آج تو سمجھ میں آ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے کیوں اتنی اہمیت دی گئی ہے؟ قرآن نے تو ہر مقام پر اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ <sup>2</sup> (23:5)۔ اور پھر یہ سب سے بڑی بات ہے جو بطور خصوصیت مومنین میں بتائی گئی ہے۔

1 لواطت کاروں کی بستی

2 انہوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 773)

## ہمارے ہاں کی کیفیت: بیباکی، آوارگی اور شادی

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں اس کی اہمیت تو ہے لیکن یہ اہمیت بھی عورتوں اور لڑکیوں کے معاملے میں ہی ہے۔ مردوں کے معاملے میں ایسی اہمیت نہیں ہے۔ گھر میں اگر بیوی میاں سے یہ کہتی ہے کہ بھئی! لڑکا جوان ہو رہا ہے، کچھ بیباک ہو رہا ہے، اس کی کچھ فکر کرنی چاہیے، شادی وادی کرنی چاہیے، دیکھیے یہ آوارہ ہوتا جا رہا ہے، راتوں کو اتنے اتنے بجے گھر آیا کرتا ہے۔ ”وہ ٹال کے کہہ دیندا: اے کوئی گل نہیں۔ اس عمر اچا ایہو جیا کچھ ہوندا ہی ہوندا ہیگا۔ او تھے تے ہوندا ہی ہوندا ہیگا۔“<sup>1</sup>

اور لڑکی کے متعلق اگر کہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کونے میں بیٹھی ایک خط لکھ رہی تھی، خواہ وہ اپنی سہیلی کو ہی لکھ رہی ہو، محلے بھر میں چرچا ہو جاتا ہے۔ اس کی حفاظت کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ آپ کو یاد ہے میں اپنے ہاں کا پرانا محاورہ سنایا کرتا ہوں۔ جوان لڑکی کی ماں سے یہ کہا گیا کہ بہن! تُوں کدی اوندی جاندی نہیں ہیگی۔ بہن! میں کی کتھے آواں جاواں؟ کاکیاں جوان ہوگیاں نیں، تے تہانوں پتہ اے پئی..... اے میری بیٹیاں تے سمجھ رہی ہیں اتنی سی پنجابی تو سمجھ لینی چاہیے: نی بہن! تہانوں پتہ ہیگا اے۔ اے تے آٹے وانگ ہویاں نیں نا۔ اندر رکھیے تے چوہیاں دا ڈر اے باہر رکھیے تے کاواں دا ڈر۔ اے ایس واسطے اوکل نہیں ہوندا۔ یعنی لڑکیاں دے متعلق تے اے کیفیت کہ اندر بھی ڈر باہر بھی ڈر اور لڑکے متعلق وہ جو کہہ رہی ہے، تو اس پر وہ کہتا ہے: کوئی گل نہیں۔ ایس عمر تے، اے ہوندا ہی ہوندا اے۔<sup>2</sup>

## حفاظت عصمت کے متعلق قرآن کا پیغام

عزیزانِ من! قرآن کریم نے جہاں جہاں حفاظتِ عصمت کا ذکر کیا ہے، اس میں ویسے تو دونوں کے لیے ذکر کیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کا جہاں بھی ذکر کیا ہے پہلے مردوں کا کیا ہے، اس کے بعد عورت کا کیا ہے۔ اس سے بھی یہ نظر آتا ہے کہ اس کی نگاہ کہاں تک جاتی تھی۔ معاشرت کے لحاظ سے ہی سہی، سوسائٹی کے اعتبار سے ہی سہی، لڑکیوں اور عورتوں کی عصمت کی اہمیت تو بہر حال کچھ برقرار

<sup>1</sup> وہ اس بات کو ٹال دیتا ہے۔ کہتا ہے: یہ کوئی بات ہی نہیں ہے، اس عمر میں یہ کچھ ہوتا ہی ہوتا ہے۔ ہاں اس عمر میں یہ کچھ تو ہوتا ہی ہوتا ہے۔

<sup>2</sup> اے بہن! تو نے آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ کبھی کہیں آتی جاتی ہی نہیں (وہ کہتی ہے کہ) اے بہن! کہاں آؤں جاؤں؟ لڑکیاں جوان ہوگئی ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ..... میری بیٹیاں تو سمجھ رہی ہیں اتنی سی پنجابی تو سمجھ ہی لینا چاہیے: اے بہن! آپ کو یہ معلوم ہے۔ یہ تو بمثل آنا ہوتی ہیں۔ اندر رکھو تو چوہوں کا ڈر اور باہر رکھو تو کوؤں (Crows) کا ڈر۔ اس لیے نکلا نہیں جاتا۔ یعنی لڑکیوں کے متعلق تو یہ کیفیت کہ اندر بھی خوف و ہراس اور باہر بھی۔ اور لڑکے متعلق بیوی یہ کچھ کہہ رہی ہے تو میاں صاحب کہتے ہیں: کوئی بات نہیں۔ اس عمر میں تو یہ ہوتا ہی ہوتا ہے۔ یا للہجب!

رہتی ہے۔ تصور جو شروع میں گزرتا ہے وہ مردوں کے متعلق گزرتا ہے اور اس کو کچھ اہمیت نہیں دی جاتی۔ قرآن حکیم نے جہاں بھی یہ حکم دیا ہے اس میں پہلے مردوں کو مخاطب کیا ہے حتیٰ کہ وہ جو حکم ہے کہ باہر نکل کر چلو تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو ہمارے ہاں تو اسکی پابندی صرف لڑکیوں سے عورتوں سے ہی کرائی جاتی ہے کہ برقعہ اوڑھ کر چلو یا کم از کم اتنی بڑی چادر ہو کہ وہ پلو نیچے تک ہو یعنی جسے آپ نگاہوں کی عصمت کہیں گے کہ بیباک نہ ہونے پائیں وہ پابندی عورتوں کے اوپر عائد کی جاتی ہے۔ مردوں کے متعلق ہمارے ہاں یہ کبھی نہیں ہوتا۔ قرآن میں جہاں ’’البصار‘‘ (24:30-31) کہا ہے اس میں ایک بڑی عجیب چیز ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ مومنین سے مردوں سے یہ کہو کہ وہ باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیا کریں۔ وہ جو ترجمہ ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ نگاہوں کو جھکا کے رکھیں تو یہاں نگاہوں کا جھکانا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ چلیں تو یوں کر کے چلیں۔

یہ بیباک ہونا عجیب چیز ہے۔ مردوں سے پہلے کہا ہے کہ اے رسول! ان سے کہو کہ باہر چلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں اور اس کے بعد اگلی آیت میں عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ عورتوں کو بھی یہ کہو کہ وہ باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کریم نے اس کی اہمیت ویسے تو مرد اور عورت دونوں کے لیے رکھی ہے لیکن جہاں جہاں اس کا حکم آیا ہے وہاں پہلے مردوں سے کہا گیا ہے اور اس کے بعد عورتوں کا ذکر آیا ہے تو گویا اس کی اتنی اہمیت ہے۔ پھر اس کے لیے لفظ ’’حفظون‘‘ کا آیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ پہ غور کرنے کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اسکی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک لفظ حفاظت آیا ہے اور دوسرا لفظ ص کے ساتھ ’’احصان‘‘ آیا ہے۔ اس سے مخصنین اور مخصنات ہے۔ ان دونوں کے حفاظت کے معنی ہیں یعنی کسی چیز کو Preserve (محفوظ) کرنے کے ہوتے ہیں یعنی ایسے محفوظ کرنا کہ وہ چیز Preserved (محفوظ) رہے۔ احصان کے معنی بھی کسی چیز کو ایسا محفوظ کرنا Preserve (محفوظ) کرنا ہے جیسے قلعے کے اندر فوج ہوتی ہے۔ یہ قلعہ بند ہو جانے والی بات ہے یعنی اتنی شدت کی حفاظت۔ اس کے لیے قرآن اس طرح کی حفاظت کرنے کا کہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس کے لیے قرآن یہ کہتا ہے کہ اس کو Preserve (محفوظ) رکھنا چاہیے۔ وہ کیا چیز ہے جس کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ وہ فروج ہے۔ ’’فروج‘‘ کا ترجمہ ہی جنسی توانائی ہونا چاہیے Sexual Energy ہونا چاہیے۔ اس انرجی یعنی توانائی کو محفوظ رکھنا چاہیے قرآن کے حفاظت<sup>1</sup> اور احصان کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ اس کو محفوظ رکھنے کی تاکید کر رہا ہے۔ اسی لیے جہاں قرآن یہ دو الفاظ لایا ہے وہ اس Preserve (محفوظ) رکھنے کے معنی کو واضح کرنے کے لیے لایا ہے گویا سورۃ النساء کی 24 ویں آیت جہاں جنسی اختلاط کی اجازت ہے وہ بذریعہ نکاح ہے۔ وہاں کہا ہے کہ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ (4:24) مومنین وہ ہیں جو اس توانائی کو Preserve (محفوظ) رکھتے ہیں<sup>2</sup>۔ اس میں پہلا لفظ تو

① یہاں لفظ ہے ’’حفظون‘‘ (23:5)۔ اسی سے حفاظت کا لفظ ہے۔

② یونہی اسے بہانہیں دیتے (غیر مسفحین)

وہی مھنیں ہے، وہی احسان ہے جو میں نے ابھی کہا ہے یعنی محفوظ رکھنے والے، قلعہ بند رکھنے والے اور مُسْفِحِیْنَ کا (مادہ س ف ح) (سُفْح) معنی ہوتا ہے، یونہی کسی چیز کو بہا دینا، جب کہ حفظوں کے معنی ہی اس کے Preserve (محفوظ) رکھنے کے ہیں۔ یہاں سے مغرب کے ریسرچ کرنے والوں کو یہ نکتہ ملا کہ یہ تو انسان کے اندر ایک ایسی انرجی ہے جس کو Preserve (محفوظ) رکھنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے انسان کی ہر توانائی، ہر صلاحیت، کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے استعمال کے لیے بھی قرآن نے بتایا اور ان ریسرچ اسکالرز نے بھی بتایا لیکن اس کو Preserve (محفوظ) رکھنے کی تاکید کی ہے کہ یہ ایک خاص مقصد ہے جس کے لیے اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، ورنہ اس کو Preserve (محفوظ) رکھا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے Preserve (محفوظ) رکھنا کیا ہوتا ہے؟

### جنسیات کے متعلق ڈاکٹر انون کے تحقیقاتی نتائج

آپ کو یاد ہے میں آپ کو انون<sup>1</sup> کی کتاب<sup>2</sup> کا ایک حوالہ دیا کرتا ہوں۔ اگرچہ میں نے اس کے بعد اس Subject (مضمون) پر اور کتابیں بھی دیکھی ہیں اور سائنکولوجی (علم نفسیات) میں تو اب بہت سی کتابیں آرہی ہیں۔ انون (J.D. Unwin) نے تو سوشیالوجی (علم سماجیات) کے Point of view (زاویہ نگاہ) سے ریسرچ کی تھی۔ اس کی کتاب کا نام Sex and Culture (جنس اور کلچر) ہے۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ ان لوگوں کی ریسرچ (تحقیق) ہے جو گوشوں، زاویوں، جھروں اور کمروں میں بیٹھ کر نہیں کرتے۔ یہ محقق ایک بہت بڑا فاضل ہے۔ اس نے پوری عمر اس ایک Subject (مضمون) کو لے کر دنیا بھر میں، جہاں بھی Primitive (انسانی ترقی کے ابتدائی مرحلوں کے) قبائل (Tribes) بستے ہیں، ان پر تحقیق کی ہے۔ یہ وہ پرانے وحشی قبائل ہیں جو مہذب دنیا سے بہت دور ہیں، جن کے ذہن ابھی تک تہذیب و تمدن سے متاثر نہیں ہوئے۔ پہلے تو اس نے اُن کے ہاں ریسرچ (تحقیق) کی کہ وہاں جن قبائل نے اپنی اس انرجی (توانائی) کو Preserve (محفوظ) رکھا ہے ان کی کیا کیفیت ہے

① انون (Unwin): کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر J.D. Unwin کا نام ان محققین میں شامل ہے جنہوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکا کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گزاری۔ وہ وہاں کے وحشی قبائل میں جا کر رہے۔ انہی کی معاشرت اختیار کی۔ وہی کچھ کھایا جو وہ کھاتے تھے۔ وہی کچھ پہنا جو وہ پہنتے تھے۔ انہی کے ساتھ کبھی درختوں کے کھوکھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر، کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات اپنی شادیاں بھی کیں اور اس طرح انہی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا وقت نظر سے مطالعہ کیا اور یوں ان کے متعلق براہ راست معلومات فراہم کیں۔ یہ ہیں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر انون (J.D. Unwin)۔

② Unwin, J.D., M.C. Ph.D. (CANTAB.) 1934. Sex and Culture- London Oxford University:

Humphrey Milfor.

اور جنہوں نے ان پابندیوں میں ڈھیل دیدی تھی ان کی کیا کیفیت ہوئی۔ عزیزانِ من! اس نے دنیا کے اکثر قبائل کے اندر جا کر ان کے ہاں رہ کر ان کی تہذیب، ان کی معاشرت، ان کے تمدن کا مطالعہ کیا اور اس کے موجودہ نتائج دیکھے اور پھر ان سارے کے سارے 80 معاشروں<sup>①</sup> (Societies) کے مشاہدات کے بعد وہ مہذب دنیا کی طرف آیا اور پھر سولہ مہذب (Civilized) قوموں کے متعلق اسی طرح سے یہ کچھ دیکھا اور اس ریسرچ (تحقیق) کے بعد وہ جس نتیجے پہ پہنچا، عزیزانِ من! وہ آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ قرآن نے حفاظتِ عصمت کے متعلق جو کچھ کہا تھا، آپ اسے بھی سامنے رکھیے۔ اس کے بعد میں مختصر الفاظ میں اس کی ریسرچ (تحقیق) کے نتائج پیش کرتا ہوں۔ میں نے اپنے ہاں ”سلیم کے نام“ خطوط میں بھی یہ لکھا ہے<sup>②</sup> اور 1974ء کی کنونشن میں جنسی بدنہادی پر میرا ایک خطاب بھی تھا، اس کا پمفلٹ بھی بعد میں چھپا تھا۔ اس میں بھی میں نے تصریحاً لکھا ہے۔

انون (J.D. Unwin) کی اس کتاب میں کہا یہ گیا ہے کہ ”میں (انون) اپنی اس ریسرچ (تحقیق) کے بعد نتائج کے لحاظ سے ان آبادیوں کو تین حصوں (گروہوں/قوموں) میں تقسیم کرتا ہوں“۔ انہوں نے کہا ہے کہ ”جس گروہ قبیلہ یا قوم نے شادی سے پہلے کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی، وہ تہذیب و تمدن کی پست ترین سطح پر تھا اور صرف اس آزادی پر جس قوم یا گروہ نے تھوڑی بہت پابندیاں عائد کی تھیں، وہ تمدن کی سطح کے درمیانی درجے پر تھا اور تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت حفاظتِ عصمت کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ ان کے ہاں شادی کی یہ شرط ہوتی تھی“۔ لہذا جن قبائل نے اپنے ہاں یہ پابندیاں عائد کی تھیں، انون کہہ رہا ہے کہ وہ تمدن کی بلند ترین سطح پر تھے۔ اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ جن اقوام نے اپنے ہاں جنسی تعلقات یعنی جنسی اختلاط کی پابندیوں میں، ذرا سی گرفت ڈھیلی کی، وہ اپنے تمدن کی سطح کو زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک برقرار رکھ سکیں اور اس کے بعد زوال پذیر ہو گئیں۔ موصوف اپنی اس کتاب کے اندر اس انرجی کا نام جنسی توانائی رکھتا ہے اور اس کے تحفظ کے لیے Preservation یا Protection کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کے لیے قرآن کریم نے محافظین کا لفظ استعمال کیا ہوا ہے۔ وہ صرف Restrictions یا

① ڈاکٹر انون کی کتاب Sex and Culture کے صفحہ 617 تا 618 پر (Appendix 1) میں ان 80 معاشروں (Societies) کے نام درج ذیل عنوانات/ممالک کے تحت درج ہیں: میلانیشیا (Melanesia) (7 قبائل) نیوگنی (New Guinea) (6 قبائل)، افریقہ (21 قبائل)، امریکا (29 قبائل)، اوشینیا (5 قبائل)، آسام (7 قبائل) اور متفرق (5 قبائل)۔ جو قارئین ان کا تفصیلی مطالعہ چاہتے ہیں وہ اس کتاب کا خود مطالعہ کریں۔ یہ کتاب پہلی دفعہ 1934ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن سے یورپ بابت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی تھی۔

② پرویز سلیم کے نام جلد سوم..... چھتیسواں خط: جنسی تعلقات کا تمدن پر اثر۔ ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) لاہور، 1986ء، ص 135-161۔

پابندیوں کا ذکر نہیں کرتا، وہ اس کو ”جینوں سانجھ کے رکھن والی گل کیندے آں“<sup>1</sup> کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ انسانوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے قومی تحفظ کے لیے، ان کی تہذیب اور تمدن کی بقا کے لیے، ان کے عروج کے لیے، یہ کتنی بنیادی چیز ہے! جسے یہ جنسی توانائی کہتے ہیں، وہ کتنی اہم ہے۔ اسے تو بہت سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔

### جنسیات کے سلسلہ میں فرائیڈ کی تحقیق

ہمارے اس دور میں یہ کچھ تو سوشیالوجی (سماجیات) کے Point of view (نکتہ نگاہ) سے ہوا کہ تہذیب، تمدن اور کلچر یہ جنسیات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں سائیکالوجی (علم نفسیات) کے نکتہ نظر سے بھی اس موضوع پر ریسرچ (تحقیق) کی گئی۔ اس میں فرائیڈ<sup>2</sup> کا نام بہت آگے ہے۔ وہ تو دنیا کے قدیم اور دنیائے جدید میں Sex (جنسیات) کے معاملے میں امام سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہر Pioneer (السا بقون الاولون) کی طرح اس کے نتائج میں بعد میں کچھ غلطیاں اور خامیاں بھی پائی گئیں لیکن ریسرچ تو اس نے ساری عمر بڑی کی۔ انون (J.D. Unwin) نے یہ لکھا تھا کہ نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ اب سنیے کہ یہ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ فرائیڈ (1856-1939) نے کہا کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے نیز محاسبہ خویش کی صلاحیت بھی۔ یعنی اس توانائی کو Preserve (محفوظ) کرنے سے، اس کی حفاظت کرنے سے، قوم میں فکر و عمل کی قوتیں بڑھ جاتی ہیں اور محاسبہ خویش کرنے کی صلاحیت بھی نشوونما پاتی ہے۔ غور کیجیے جس چیز کو ہم اتنی اہمیت دیتے چلے آ رہے ہیں وہ تو اس لیے ہے کہ معاشرے میں ہمارے ہاں یہ ایک تصور ہے کہ یہ ایک بڑی ضروری قدر ہے۔ ہم نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے اور اس طرز پر اس کا یہ ثمر بھی ملتا ہے۔

برادرانِ عزیز! انہی بنیادوں پر فرائیڈ (1856-1939) نے یہ لکھا تھا کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوتی ہے کہ لوگوں نے اپنے جذبات کی تسکین میں ایثار اور قربانی سے کام لیا اور یہ عمارت دن بدن اوپر اٹھتی گئی کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب ان پر کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں تو یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں، جسے Sublimation (عمل تصعید) کہتے ہیں، یعنی انہیں پست مقصد کی بجائے بلند مقصد کے لیے استعمال کرنا۔ یہ توانائی سائیکالوجی (علم نفسیات) کی اصطلاح میں Sublimation

1 جسے ہم سنبھال کر رکھنے والی شے کہتے ہیں۔

2 Signund Freud (1856-1939)

(تصعید) کہلاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لیے جو حصول لذت ہے، وہ بڑا پست مقصد ہے۔ اس سے ہٹ کر اگر اسے Preserve (محفوظ) کر دیا جائے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ توانائی پھر بڑے بلند مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے کام میں لائی جاتی ہے۔ اس طرح افراد کی یہ فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ قرآن کے دو الفاظ سنتے چلے جائیے کہ **هُمْ لَفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ** <sup>①</sup> (23:5) وہ انسان کی جنسی توانائی کی حفاظت کرتے ہیں، انہیں Preserve رکھتے ہیں۔ عزیزانِ من! انون (J.D.Unwin) کی کتاب کے آخری الفاظ <sup>②</sup> اسی نتیجے پر ہیں۔

① وہ اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

② قارئین کی سہولت کے لیے اس کتاب کے آخری الفاظ درج کیے جاتے ہیں:

If, on the other hand, a vigorous society wishes to display its productive energy for a long time, and even for ever it must recreate itself, I think, first, by placing the sexes on a level of complete legal equality, and by altering its economic and social organization in such a way as to render it both possible and tolerable for sexual opportunity to remain at a minimum for an extended period, and even for ever. In such a case the face of the society would be set in the Direction of Cultural Process; its inherited tradition would be continually enriched; it would achieve a higher culture than has yet been attained; by the action of human entropy its tradition would be augmented and refined in a manner which surpasses our present understanding.

(Unwin, J.D.: Sex and Culture, Oxford University Press, London: Humphrey Milford, 1934, P.432)

اردو پڑھنے والے قارئین کی سہولت کے لیے اس کا رواں ترجمہ درج ذیل ہے:

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اسکی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابد الابد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقا کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشاں مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیگی جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔

## شرفِ انسانیت کا جوہر حقیقی دراصل تخلیقی قوت کا ظہور ہے

تخلیقی توانائیاں (Creative Energies) جوڈاکٹر انون (J.D. Unwin) کہہ رہا ہے بڑی چیز ہے۔ یہ جو Creativity ہے یعنی تخلیقی توانائی ہے یہی تو شرفِ انسانیت ہے۔ حیوان کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اسمیں تو عملِ تولید ہے۔ اس میں Procreation ہوتی ہے یعنی جنسی اختلاط سے اسی قسم کا آگے ایک اور بچہ پیدا کر دینا۔ اس سے آگے اسکا کوئی قدم ہی نہیں بڑھتا، کوئی نئی چیز وجود میں نہیں آتی جبکہ تخلیق یہ ہوتی ہے کہ وہ جو Given (دیا ہوا) میٹریل (مواد) موجود ہو، جو سامان موجود ہو، اس سے ایک نئی چیز پیدا کرنا۔ یہ Creation (تخلیق) کہلاتا ہے۔ Creation (تخلیق) تو خدا کے لیے مخصوص ہے لیکن قرآن کریم نے تو انسانوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ خدا کو اس نے احسن الخالقین کہا ہے کہ تخلیق میں وہ دوسرے خالقوں کے مقابلے میں حسین ترین تخلیق کر نیوالا ہے۔ وہ دوسرے خالقوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور یہ صرف انسان ہے جو یہ Creation یا تخلیق کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہیے کہ یہ صلاحیت صرف انسان کو دی گئی ہے۔ یہ چیز اوپر خدا کو حاصل ہے اور نیچے انسان کو حاصل ہے اور جو قوم تخلیق نہیں کرتی یا جس قوم میں تخلیقی صلاحیتیں نہیں ہوتیں، وہ انسانی سطح پہ نہیں ہوتی، حیوانی سطح پہ ہوتی ہے۔ Procreation (تولید) تو اس میں ہوتی ہے، یہ حیوانی سطح کی چیز ہے۔ اسی لیے خدا نے اپنے متعلق کہا کہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ<sup>①</sup> (112:3)۔ خدا کے ہاں تولید کی بات نہیں، وہ خالق ہے۔ انسانی زندگی میں بہت سا حصہ حیوانی زندگی کا شامل ہے۔ تولید تو حیوانی زندگی کا ایک عمل ہے جب کہ انسانی سطح پر تخلیق یا Creation ہوگی۔ اسی لیے اقبال ؒ کہتا ہے کہ

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست

نزد ما جز کافر و زندیق نیست

جس قوم میں تخلیقی قوت نہیں ہوتی اسی کو تو کافر اور زندیق کہا جاتا ہے۔ اس کا شمار زندہ قوموں میں ہو ہی نہیں سکتا۔

## مرد اور عورت کو مساوی حیثیت دینے کے ثمرات

عزیز ان من! انون (Unwin) کہتا ہے کہ اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں برومند ہوں بلکہ ابدالاً بادتک قائم بھی رہیں اور آگے بھی بڑھتی رہیں تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق نو کے لیے کیا کرے؟

① اس نے تمام ذی حیات کو عملِ تخلیق (Creation) سے پیدا کیا ہے نہ کہ تولید کے ذریعے (By Procreation)۔ (عملِ تولید میں پیدا کرنے والے کا ایک حصہ مولود میں آ جاتا ہے اور اس طرح والد پیدا کرنے والا خود ناقص رہ جاتا ہے۔ تخلیق میں ایسا نہیں ہوتا)۔ نہ اس نے اس طرح کسی کو پیدا کیا ہے نہ وہ خود کسی کے عملِ تولید کا نتیجہ ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1496 تا 1497)



اس کے لیے کہا کہ پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے۔ آپ دیکھیے کہ یہ قرآن کی آیتوں کے ترجمے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں پیدا کرے جن سے معاشرے میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرے کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقا کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشاں مستقبل کی حامل ہوگی۔ وہ تمدن اور تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا کہ جس مقام پر آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔ عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ یہ وہی مسئلہ ہے جس کے متعلق ہم آپ مہذب معاشروں میں ذکر کرنا بھی کچھ معیوب سا ہی سمجھتے ہیں یا کم از کم مذموم سمجھتے ہیں اور اگر کہیں اس کی اہمیت ہے تو صرف اتنی کہ یہ اہمیت ابھی قائم ہے۔ مردوں کی اہمیت عصمتِ تو ختم ہو گئی ہے لیکن کم از کم عورتوں کے معاملے میں باقی ہے۔ ہم بھی انہی سے ڈیمانڈ کرتے ہیں؛ کیونکہ اس سے زیادہ تو ہم نے اس کے متعلق کبھی بھی سوچا نہیں کہ یہ بات ہے کیا؟ آپ اندازہ لگائیے کہ ریسرچ کرنے والوں میں ایک طرف فرائیڈ (1856-1939ء) ہے، جو نفسیاتی زاویہ نگاہ سے تحقیق کر رہا ہے تو دوسری طرف انون (Unwin) ہے جو Sociological point of view (سماجی زاویہ نگاہ) سے دیکھ رہا ہے۔ وہ دونوں ہی اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھنا اور ان کے استعمال کے لیے ایسے حدود مقرر کرنا جن میں ذرا سی بھی مہیا کیاں نہ ہونے پائیں، اقوام کے عروج کے لیے از بس ضروری ہیں۔ انون (Unwin) کہتا ہے کہ ایسا کرنے سے یہ قوم تہذیب و تمدن کی ان بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے جن کا تصور بھی اس وقت ہمارا ادراک نہیں کر سکتا۔

اب آپ اس بات پہ غور کیجیے کہ صدرِ اول میں جو ہم چند دنوں کے اندر دیکھتے ہیں کہ اس قوم نے، مومنین نے، چند دنوں کے اندر ہی اندر دنیا کے اندر کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا تھا، وہ آخر کس بات کا نتیجہ تھا یعنی حضرتِ عمرؓ کے زمانے (13-24 AH) بمطابق 634-644/645 AD) تک مملکت کی جو وسعت تھی اس زمانے کے اعتبار سے اس کی آبادی اتنی تھی جتنی آج یورپ کی ساری آبادی ہے۔ اس کے اسباب و خصوصیات یہ تھے جو قرآن بتا رہا ہے۔ یعنی ان مومنین کی یہ خصوصیات تھیں جو ان کے اندر پیدا ہوئی تھیں۔ ان میں یہ خصوصیتِ کبرِیٰ موجود تھی کہ انہوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا۔ قرآن نے تولید کی خاطر خود ہی اس کے مواقع کا تعین کر دیا اور وہ الفاظ ہیں **إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ** <sup>①</sup> (23:6)۔ یعنی اپنی جنسی

① انہوں نے (اپنی جنسی توانائیوں کو) صرف اپنی بیویوں پر صرف کیا یا ان لونڈیوں پر جو (اسلامِ غلامی کے متعلق قرآنی احکام نازل ہونے سے پہلے 47:4) ان کی ملک میں آچکی تھیں (لیکن جنہیں نکاح کے بعد بیویوں کا ہم پلہ قرار دیا جا چکا تھا)۔ ان سے زنا شوقی کے تعلقات رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 773 تا 774)۔

توانائیوں کا استعمال اپنی ازواج تک رکھا۔ یعنی اس میں مردوں اور بیویاں سے کہا جائے گا کہ خاوند اپنی جنسی توانائیوں کو ازواج تک رکھیں یا اپنی جنسی توانائیوں کو اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ (23:6) تک محدود رکھیں تو یہ قابلِ ملامت بات نہیں ہے۔ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ کی تشریح ابھی کرتا ہوں۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا کہ فَمَنْ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَاُولَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ<sup>1</sup> (23:7)۔ اس کے علاوہ اگر ان جنسی توانائیوں کو کسی طرح صرف کیا تو وہ یوں سمجھیے جیسے وہ دریا سیلاب بن جاتا ہے، ساحل توڑ دیتا ہے، اپنے کناروں میں محدود نہیں رہتا، حدود فراموش ہو کر سیلاب بن جاتا ہے۔ اس لیے اپنی جنسی توانائیوں کو ازواج اور ”ہاملکت“ تک محدود رکھو۔

### ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت مشروط اجازت ہے

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ یہ جنسی اختلاط تولید (Procreation) کے لیے نہایت ضروری ہے اور نشائے خداوندی ہے کہ نسلِ انسانی آگے بڑھتی جائے تولید کے لیے خاوند اور بیوی کا جنسی اختلاط ضروری ہے۔ اس کے لیے پہلے تو یہیں تک رہیے۔ قرآنِ کریم نے Monogamy (وحدت زوج) کا اصول<sup>1</sup> بتایا ہے۔

ایک بیوی ایک خاوند یہ اس کا اصولی قاعدہ ہے۔ ایک سے زیادہ بیویوں کی تعداد قرآن کا اصولی قاعدہ نہیں ہے۔ اس نے صرف ایک مقام پر ایک سے زائد کا کہا ہے۔ یہ اس مدنی زندگی میں ہے جہاں یہ کمیونٹی، مسلمانوں کا یہ معاشرہ، ایک بڑا ہی مختصر سا تھا، مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں سات آٹھ برس تک مسلسل جنگ ہوتے رہے اور جنگوں میں تو مرد ہی ضائع ہوتے ہیں۔ عورتوں کی تعداد بڑھ گئی۔ پھر مکے اور دیگر مقامات سے عورتیں جو اسلام لے آئیں، وہ اپنے گھر بار اور خاوندوں کو چھوڑ کر مدینے میں آ گئیں۔ عورتوں، بیواؤں اور یتیم بچوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ یہ جو مختصر سی کمیونٹی تھی اس کے پاس ان کی حفاظت کا کوئی حل نہیں تھا۔ اس لیے جو Monogamy (وحدت زوج) کا اصول تھا کہ ان کے ہاں ایک بیوی ہو، وہ اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ تو قرآنِ کریم نے اس مشکل مسئلے کے حل کے لیے صرف اس کی اجازت دی کہ..... اگر تمہیں یہ خطرہ پیدا ہو جائے کہ یہ جو بے شوہر کی عورتیں ہیں خواہ وہ بیوہ ہوں، کنواری لڑکیاں ہوں، یتیم ہوں، قرآن میں ان سب کے لیے یتامی کا یہ لفظ آتا ہے کہ ان کی حفاظت کا کوئی اور منصفانہ حل تمہارے ذہن میں نہ آئے، کوئی سوسائٹی ایسا حل نہ رکھتی ہو، تو ہمارا وحدت زوج کا ایک بیوی کا جو قانون ہے، اس میں یہ جوان مردوں کی پہلی بیویاں ہیں، ان کی باہمی رضامندی سے، کچھ Relaxations (رعایت) کی جاسکتی ہیں، یہ صرف اس مسئلے کے حل کے لیے اجازت

1 جو کوئی اس کے علاوہ، جنسی تعلق کی کوئی صورت اختیار کرے تو وہ قانون شکنی ہوگی اور حدودِ خداوندی سے تجاوز (جو سنگین جرم ہے 24:2)۔ (پرویز: مفہوم

القرآن القرآن ص 774) 2 ملاحظہ کیجیے: (4:3)

دی جاسکتی ہے۔ ایک سے زیادہ بیویوں کی یہ اجازت سارے قرآن میں صرف ایک مقام پہ ایک آیت میں آئی ہے، عزیزانِ من! یہ آیت شروع ہوتی ہے: **وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُفْسِدُوا** <sup>①</sup> (4:3) اگر تمہیں یہ خطرہ پیدا ہو جائے کہ معاشرہ میں عورتوں کی اس قدر بہتات ہوگئی ہے کہ وحدتِ زوج (Monogamy) کے اصول سے یہ معاشرتی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو اس کے لیے اجازت دی جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی لے لو۔ یہ ہے جی سارے قرآن میں یہ ایک جگہ اور اس میں بھی ایک دوسری شرط پیش کی جاتی ہے: یہ بھی ساتھ ہی دیکھ لیں کہ تم اس باب میں عدل قائم کر سکنے کے قابل ہو یا نہیں؟ اگر نہیں تو کہا کہ پھر وہی ایک بیوی کا اصول یاد رکھو! یاد رکھو! اگر تم عدل قائم نہیں رکھ سکتے تو اس صورت میں بھی Relaxation (رعایت) نہیں ہے۔ بہر حال یہ تھی ازواج کے متعلق قرآن کی رو سے پہلی چیز۔

اس کے بعد اب ہم اپنے معاشرے کی طرف آتے ہیں جس کی سند پھر شریعت سے ملنے لگ گئی۔ وہاں چار بیویاں تو کھلے بندوں ہو گئیں اور پھر جس بیوی کو جس وقت کوئی مرد چاہے، خاوند چاہے، بغیر کوئی وجہ بتائے ہوئے نیلام کرنے والوں کی طرح، ایک دو تین کہے اسے طلاق ہوئی۔ وہ ہوگئی ختم۔ اب رہ گئیں تین، تو چوتھی اور لے آئے۔ رابرٹ بریفو (R.Briffault) نے ایک کتاب لکھی۔ اس کا نام ہے: *The Making of Humanity* (نوع انسان کی تشکیل)۔ کیا کتاب ہے یہ! اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے: *The Mothers* (مائیں) <sup>②</sup> یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس میں وہ عورتوں کے مسائل کو لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھو

① (لیکن یتیموں کا مسئلہ ان کے مال و اسباب کی حفاظت ہی سے طے نہیں ہو جاتا۔ بات اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں مثلاً جنگ کی وجہ سے، کہ معاشرہ میں مرد ضائع ہو جائیں اور بیوہ عورتیں اور یتیم بچے (لڑکے، لڑکیاں) زیادہ رہ جائیں، بالخصوص زیادہ بے شوہر عورتیں (4:127)۔ اور اس مسئلہ کا کوئی خاطر خواہ منصفانہ حل نہ ملتا ہو یا کہیں انفرادی طور پر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو ایسے حالات میں تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ ان یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت اور پرورش کی خاطر، تم ان بے شوہر عورتوں سے حسبِ پسند (جو تمہارے نکاح میں آنا چاہیں (4:19) نکاح کر لو۔) اس مقصد کے لیے ”ایک مرد ایک بیوی“ کے قانون میں استثناء (Exception) کی جاتی ہے۔ اس صورت میں جب بھی حالات کا تقاضا اور معاشرہ کا فیصلہ ہو (دودو، تین تین، چار چار بیویاں تک (نکاح میں لاسکتے ہو) لیکن اگر تم دیکھو کہ تم اس طرح مختلف افراد خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر اسی ”ایک بیوی“ والے قانون پر کاربند رہو۔ یا وہ لونڈیاں جنہیں تم اس سے قبل اپنے نکاح میں لاکچے ہو (کیونکہ اس کے بعد تو غلام اور لونڈیوں کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا ہے)۔ بے انصافی (یا کثرتِ اولاد کے بوجھ) سے بچنے کے لیے یہ راہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔) یاد رکھو۔ یہاں جس عدل کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے مراد مختلف بیویوں میں سلوک و برتاؤ کا عدل ہے نہ کہ جذبات کا عدل۔ اس لیے کہ جذبات میں مساوات اور یکسانیت رکھنا نفسیاتی محال ہے جس کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ (4:19)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 176)

② *The Mothers* میں بریفو کے یہ الفاظ غور طلب ہیں:

"It is practically impossible to frame any definition of marriage"

یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ

when he (Briffault) speaks of marriage being instituted by a mythical legislator, he seems to use marriage as a synonym for exogamic regulations (R. Briffault: *The Mothers*, pp 523, 75)

یہ جو اس قسم کی مصنوعی پابندیاں ہوتی ہیں ان کا فائدہ کیسے اٹھایا جاتا ہے۔ اس نے بڑی ریسرچ کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں نے ایک کر دو دیکھا۔ وہ مسلمان تھا۔ ایک وقت میں اس کی چار بیویاں ہوتی تھیں۔ اس دوران میں وہ چالیس بیویاں تک کر چکا تھا۔ یہاں ہمارے ہاں بھی تحقیق کی ہو تو پتہ چلے۔ ہاں تو چار مستقلاً ہیں اور ان کی تبدیلیوں کی یہ کیفیت ہے۔ غور کیجیے قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ اپنی جنسی توانائی کی حفاظت کرتے ہیں ہمیشہ بلند رہیں گے اور یہاں یہ حالت ہے۔

## نزول قرآن کے وقت عربوں کی معاشرتی زندگی

اب آگے آتا ہے: مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ نزول قرآن کے وقت عربوں کے معاشرے میں جیسا کہ اس زمانے میں دیگر اقوام میں بھی یہ بات عام تھی غلام اور لونڈیاں موجود تھیں۔ جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدی مردوں کو تو وہ غلام بنا لیتے تھے اور عورتوں کو لونڈیاں پھر یہ کہ ان کی فروخت بھی ہوتی تھی۔ یعنی کسی دوسرے ملک کے اندر بنائی گئی لونڈیاں یہاں آتی تھیں اور غلام ہوتی تھیں نیز یہ کہ ان کو خرید لیا جاتا تھا۔ یہ اس زمانے میں عربی معاشرے کی ایک مسلم بات تھی۔

## قرآن حکیم کا غلام اور لونڈیوں کے متعلق پیش کردہ حل

جب اسلام آیا تو آپ غور کیجیے کہ گھروں کے اندر تو یہ لونڈیاں موجود ہیں اور باہر غلام بھی موجود ہیں۔ لہذا قرآن کریم نے پہلے تو یہ حکم دیدیا کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا ہی نہیں جاسکتا، انہیں تو چھوڑنا ہوگا، خواہ دشمن کی قوم کے ساتھ معاہدہ کر کے تبادلے میں لے کر زرفدیہ لے کر بہر حال انہیں چھوڑ دو۔<sup>1</sup> اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو قرآن کہتا ہے کہ فَاِمَّا مِّنَّا (47:4) یہ انسان ہیں انسانیت کی بنیادوں پر احسان رکھ کر ان کو چھوڑ دو۔

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن میں یہی ایک آیت ہے۔ انہیں ہر حال میں چھوڑنا ہے اور یہ کہا ہے کہ جب تک انہیں رکھو، مہمان بنا کر رکھو۔ اس کے بعد دشمن کی قوم کے ساتھ معاملہ کرو۔ اس معاملے میں ذہن یہاں تک ہی جاسکتا ہے کہ ٹھیک ہے جا کر اپنے قیدیوں کا تبادلہ کرو ورنہ اس کے لیے ان سے زرفدیہ لو لیکن قرآن ایک قدم آگے اٹھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے لیے تو یہ چیز کسی شکل میں بھی قابل برداشت نہیں کہ تم انسانوں کو کسی طرح سے بھی محبوس کر کے بند کر کے یوں رکھو۔ اگر یہ صورت پیدا نہیں ہوتی تو پھر انہیں

1 آیت (47:4)۔ پھر (جیسے حالات کا تقاضا ہو اس کے مطابق) انہیں یا تو معاوضہ لے کر رہا کر دو (یعنی زرفدیہ لے کر یا اپنے قیدیوں کے تبادلہ کے طور پر) اور یا محض احسان رکھ کر (38:40)۔ تا آنکہ خود لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے (یعنی ملک میں ہر طرف امن و امان ہو جائے)۔ (پرویز مہموم القرآن ص 1185)

احساناً چھوڑ دو۔ یہ ہے جی! جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کی ایک آیت۔ یہ سورۃ محمد ﷺ کی چوتھی (4:47) آیت ہے۔ اب یہ رہا کہ معاشرے میں اس وقت جو غلام اور لونڈیاں موجود تھیں تو ان کو تو Overnight (شبائش) نکالا ہی نہیں جاسکتا تھا کیونکہ اس سے معاشرے کے اندر جو معاشی نظم و نسق تھا اس کا توازن بگڑ جاتا، وہ وہاں خاصی تعداد میں تھیں ان کو باہر نکال کے کہاں بھیجا جاتا۔

## قرآن حکیم کے نزدیک غلاموں کے حقوق

قرآن کریم محض جذبات کی کتاب نہیں ہے۔ وہ Facts (حقائق) کو پیش کرتی ہے، Reality (حقیقت) کا حال بتاتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے جو اس وقت تمہارے ہاں موجود ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جنہیں تم نے لونڈیاں بنا کر رکھا ہے ان کو بیویوں کا درجہ دو کیونکہ ان کے ہاں پہلے ہی بیوی اور لونڈی میں بہت فرق تھا۔ لونڈی تو بیوی ہوتی نہیں تھی۔ وہ تو جنسی خواہش کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ پہلی چیز تو یہ ہوئی۔ اب اس کے بعد آپ قرآن کریم میں دیکھیے بار بار حکم ہوتا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرو غلاموں کو آزاد کرو غلاموں کو آزاد کرو۔ تو اگر کسی سے کہیں ذرہ بھر بھی لغزش یا سہو ہو جاتے تو کہا جاتا ہے کہ ایک غلام آزاد کرو۔ اگر کہیں کسی نے جھوٹی قسم کھالی تو کہا کہ ایک غلام آزاد کرو۔ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کو آزاد کرتے وقت اتنا کچھ دو کہ یہ اپنا آزاد ذریعہ معاش قائم کر سکیں۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے سہو اور لغزش کے لیے بھی یہی کہا کہ غلام آزاد کرو۔ آپ قرآن میں دیکھیں کہا ہے کہ فَكَ رَقَبَةٍ<sup>1</sup> (90:13) غلام آزاد کرو۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے جامع طور پر تو عزیزانِ من! یہ دو الفاظ ہیں: فَلَا مَمْنًا (47:4) یا محض احسان رکھ کر آزاد کرو۔ سورۃ محمد ﷺ کی اس آیت سے پوچھیے کہ کیا دنیا کے کسی مہذب سے مہذب قانون میں بھی یہ بات بتائی گئی ہے؟ دین کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یاد رکھو! دین تو پہاڑ کی بلندی پر چڑھنے کے<sup>2</sup> متبادل ہے، یہ تو پہاڑ کی گھاٹی کا سارا ستہ ہے۔ جب آپ اس پر جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں آپ کا کتنا زور لگتا ہے۔

① جہاں دیکھے کہ کوئی انسانی گردن کسی دوسرے کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے اُسے اس سے آزاد کرائے۔ یعنی سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم، مطیع، زیر دست نہ رہے۔ ہر ایک گردن اٹھا کر چلے۔ ہر ایک کو جسمانی، ذہنی اور قلبی آزادی حاصل ہو۔ (اُس پر تو انین خداوندی کے سوا کسی کی پابندی نہ ہو)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 451 تا 452)

② ان نکات کی مکمل تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان تیسواں پارہ (مکمل) سورۃ البلد، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ

## دین کے مقام بلند کی پہلی منزل

قرآن نے کہا ہے کہ یہ دین کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ کہا کہ یہ الْعَقَبَةُ (90:11) ہے یعنی یہ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (90:11) ہے۔ گویا یہ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنے کا نام ہے۔ پھر قرآن مجید نے خود ہی سوال کرتے کہا ہے کہ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ (90:12) یہ پہاڑ کی گھاٹی کیا ہے؟ سنئے عزیزانِ من! یہ جو ابتدا میں ہی ایثارِ قربانی، محنت، مشقت اور اپنے اوپر یہ ساری پابندی کی جو چیزیں کہنی تھیں ان کی ابتدا کس چیز سے کی؟ میں نے کہا ہے کہ عرب معاشرے میں یہ غلام اور لونڈیاں موجود تھیں۔ غلام وہ ہے جس کی محنت کا معاوضہ آپ کو کچھ نہیں دینا پڑتا یعنی وہ ساری عمر آپ کا کام کرتا رہے گا آپ اسے اس کا کچھ معاوضہ نہیں دیں گے۔ آپ سوچے کہ یہ کتنی عجیب اور مشکل بات ہے کہ وہ کہیں بھاگ بھی نہیں سکتا، کہیں جان نہیں سکتا، اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا اور اسے کوئی معاوضہ دینا نہیں پڑتا۔ جس قسم کا روٹی کپڑا آپ جی چاہے اسے دیں، حیوانوں سے بھی بدتر اس سے کام لیں۔ غلاموں کی یہ حیثیت ہے۔ ادھر گھروں کے اندر جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے لونڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کو بھی کچھ دینا نہیں پڑتا، ان کا کوئی حق ہی نہیں ہے ان کا بیویوں جیسا ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ سنئے اس دین کی اس گھاٹی کی پہلی منزل کیا گنائی گئی ہے؟ کہ یہ محض خالی نفل پڑھ لینے کا نام نہیں ہے دین ایک گھاٹی ہے، مشقت طلب ہے، قربانیاں چاہتا ہے۔ پہلی چیز کیا ہے؟ کہا کہ فَكُ رَقَبَةً (90:13)۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ غلاموں کو آزاد کرو۔ یہ ہے دین کا پہلا قدم، عزیزانِ من! دو ایک قدم اور بھی گنا دوں اس گھاٹی کی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دین تو پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا ہے۔ اس گھاٹی کا پہلا قدم فَكُ رَقَبَةً ہے۔

## غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے وسیع میدان

قرآن نے رقبة جو بتایا ہے وہ یہی نہیں ہے کہ تمہارے ہاں کے جو غلام ہیں انہیں رہا کرو۔ عزیزانِ من! وہ کہتا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی قوم کا کوئی غلام ہے اس کو آزاد کرانا اس جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ اسے فَكُ رَقَبَةً کہا ہے یعنی غلامی کو Abolish (ختم) کرنا۔ ابتدا تو اپنے گھر سے ہوگی۔ یہ نہیں کہا کہ تمہارے ہاں کے جو غلام ہیں ان کو آزاد کرو۔ یہ تو دین کا پہلا قدم ہے۔ مومن نے تو دنیا سے غلامی کو ختم کرنا ہے اور میں اس کے بعد آگے بڑھوں گا کہ غلامی کی وہی ایک نوعیت جو اس زمانے میں تھی آج وہی نہیں رہی۔ اُس زمانے کی غلامی (Slavery) کو پھر قوموں نے مسنوخ بھی کیا ہے اور اس میں تو آپ جانتے ہیں کہ امریکہ میں غلامی کے خلاف کتنی جنگ ہوئی تھی۔ بڑی لمبی جنگیں ہوئیں اور اس کے بعد کہیں جا کر انہوں نے غلامی کو Abolish (ختم) کیا اور اب یو این او کے چارٹر میں بھی یہ چیز موجود ہے۔

## انسان نے غلامی کی بیسیوں شکلیں ایجاد کر رکھی ہیں

جن قوموں نے غلامی کی اس شکل کو مٹایا ہے، انہوں نے ہی غلام بنانے کی اپنے ہاں اس سے بدتر غلامی کی بیسیوں شکلیں ایجاد کر رکھیں ہیں۔ وہاں تو پھر بھی غلام کو ہر وقت یہ احساس ہوتا تھا کہ میں غلام ہوں، بھاگ جانے کی خواہش بیدار ہوتی تھی۔ انہوں نے ایسی لطیف سی شکلیں بنائی ہیں کہ اگر وہ پنجرے سے اس پرندے کو باہر نکالتا ہے تو یہ خود پنجرے کے اندر آتا ہے، پھر آ کر چونچیں مارتا ہے اور اگر کوئی نہیں پکڑتا تو آوازیں دیتا ہے کہ اندھے نظر نہیں آتا، میں یہاں بیٹھا ہوں، تجھے نظر نہیں آتا، پکڑ مجھے۔

## مذہب کے بالمقابل دین: پیغام موت ہے ہر نوع غلامی کے لیے

عزیزانِ من! قرآن نے فَکْ رَقَبَکَ کہا اور اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں یوں ہے: ”موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے“۔ دین کی گھاٹی کا یہ پہلا قدم فَکْ رَقَبَکَ ہے۔ مذہب کی اسٹیج پہ کھڑے ہو کر بول رہا ہے۔ ذہن میں آتا تھا کہ اگر مذہب والے سے پوچھتے کہ صاحب! دین کا پہلا رکن کیا ہے تو آپ کو پتہ ہے کہ وہ کیا بتاتا؟ وہ تو اسلام کے پانچ ارکان بتائے گا۔ قرآن حکیم تو پہلا رکن فَکْ رَقَبَکَ بتا رہا ہے اور وہ اس لیے کہ دین تو انسانیت کی آزادی کے لیے آیا تھا۔ اس فَکْ رَقَبَکَ (90:13) کے بعد دین کا اگلا قدم سن لیجیے: اَوْ اطْعَمْ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (90:14) معاشرے میں اگر کسی وقت بھی کھانے پینے کی چیزوں کی کچھ تنگی پیدا ہو جائے تو دین کا اگلا قدم یہ ہے کہ تم ان لوگوں کے رزق کا، ان کی معیشت کا، انتظام کرو کہ جو خود اپنا انتظام نہیں کر سکتے تاکہ کوئی بھوکا نہ سونے پائے۔ یہ دوسرا قدم ہے۔

عزیزانِ من! مجھے نماز روزے کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ میں تو قرآن کی آیات پیش کر رہا ہوں۔ جو آپ کو دین کی گھاٹیاں بتا رہا ہے کیونکہ یہی تو دین کی گھاٹیاں اور منازل ہیں۔ میں پھر عرض کر دوں، یہ نہ کہیے گا کہ میں اہمیت کے اعتبار سے ان کا انکار کر رہا ہوں۔ یہ جو نفل پڑھ لینا ہے، اس میں تو گھاٹی چڑھنے والی کوئی بات نہیں اور ہمارے ہاں کے جو یہ کاروباری ہیں وہ تو جب نذر مانگتے ہیں تو عام طور پر تو نذر ہی یہ ہوتی ہے کہ ”میں دیگ پکا کے کھوادیاں گا۔ میں اپنے غریباں دااے کراں گا۔ میں تے چادر چڑھاواں گا اور اگر پیسوں کا معاملہ ہوئے تے پھراو کیندے میں پئی: یا اللہ! مینوں اے پیسے مل جان تے میں سونفل پڑھاؤں گا، پیسا ای نہ لگے۔ اونوں وی ٹھیکان وکھاندے نیں<sup>①</sup>۔ اس نے تو ان چیزوں کا ذکر نہیں کیا۔ لہذا فَکْ رَقَبَکَ (90:13) پہلا قدم ہے کہ کوئی محتاج نہ رہے۔

① میں دیگ خیرات کروں گا۔ میں ان غریبوں کے لیے یہ کچھ کروں گا۔ میں تو چادر چڑھاؤں گا۔ اور اگر پیسوں کا معاملہ درپیش ہو تو پھر یہ کہیں گے: یا اللہ! اگر مجھے یہ پیسے مل جائیں تو سونفل ادا کروں گا (تاکہ ان پر) کوئی رقم ہی خرچ نہ ہو۔ اُسے بھی خرچا دیتے ہیں۔

## دینی معاشرے میں کوئی شخص تنہائی محسوس نہیں کرے گا

ہوتا یہ ہے کہ جس دور میں مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے کر عوام کے لیے بھوک اور در ماندگی کو عام کر دیں تو معاشرہ میں ان لوگوں کے رزق کے لیے ایک دوسرا قدم اٹھائیں عزیزانِ من! اور وہ دوسرا قدم ہے: **يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15)**۔ میں تو جب ان آیات کے دودوالفاظ پہ غور کرتا ہوں تو پوچھوں نہیں کہ میری کیا کیفیت ہوتی ہے۔ عربی زبان میں یتیم کے معنی یہی نہیں ہوتا کہ جس بچے کے ماں باپ جب وہ چھوٹے چھوٹے ہوں تو مرجائیں۔ یتیم کے معنی ہوتا ہے ”جو اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے“۔ قرآن کہتا ہے: **يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15)**۔ وہ جو اتنی آبادی کے اندر رہتا ہوا بھی اپنے آپ کو یتیم یعنی تنہا محسوس کرتا ہے اس کی تنہائی کا دور کرنا دین کا فریضہ ہے۔ یہ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ لاریب یہ خدا کا کلام ہے۔ اس کی مثالوں کے لیے تو کہیں باہر جا کر ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں۔ معاشرہ تو اتنا وسیع ہے۔ اس کے باوجود کیا ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو یہاں تنہا محسوس نہیں کرتا؟ اس لیے کہا کہ **يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** <sup>①</sup> (90:15)۔ ہم میں سے آج جس پہ مصیبت پڑتی ہے تو اس مصیبت زدہ کو Exploit (سلب و نہب) کرنے والے تو بیسیوں مل جائیں گے لیکن اس کی تنہائی میں آ کر یہ کہنے والا کوئی نہیں ہے کہ تم تنہا نہیں ہو کوئی بات نہیں، گھبراؤ نہیں۔

دین کا تو یہ تقاضا تھا کہ وہ جو دوسرے انسانوں سے قریب ہوتے ہوئے بھی تنہا محسوس کرے یہ ان کے رزق کی فکر کرے تاکہ وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ پائیں۔ اور یہ کہا کہ **مُسْكِينًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:16)** ایسا شخص جو بیچارہ دن بھر دھول اور مٹی کے اندر لپٹا رہے اتنی محنت اور مشقت کرے کہ سر سے پاؤں تک مٹی مٹی ہو جائے اور اس کے باوجود مسکین رہے یہ اس کی روٹی کا انتظام کرے۔ قرآن صرف Work provide (کام مہیا) کرنا ہی نہیں بتاتا۔ دین کا تقاضا یہ ہے کہ کام تو ہر ایک کو کرنا ہوگا۔ وہ تو اس کا سامان زیست Provide (مہیا) کرنا ہے۔ یہاں ذامقربہ اور ذامقربہ دودو لفظ ہیں عزیزانِ من! یعنی **يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** اور پھر **مُسْكِينًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15-16)** وہی مسکین نہیں ہے جو معذور ہے کام کاج کرنے کے قابل نہیں ہے بیچارہ چار پائی پہ پڑا رہتا ہے۔ یہ وہ ہے جو صبح سے شام تک مشقت کرتا ہے پھر بھی مسکین ہی رہتا ہے۔ یہ ہے ذامقربہ میں سمجھتا ہوں کہ ذامقربہ کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو یوں ہے کہ آپ سرتوں پیراں نکر، مٹی مٹی، کسے مزدوروں و کھوتے سہی شام دے قریب حالت کی ہوئی ہوئی ہوندی اے؟ <sup>②</sup>

① وہ نظام ان لوگوں کے رزق کی فکر کرے جو معاشرہ میں ہزار ہا انسانوں کے قریب رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پائیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 422)

② آپ شام کو کسی مزدور کو سر سے پاؤں تک مٹی میں لتھرے ہوئے دیکھو تو سہی کہ اسکی کیا حالت ہو چکی ہوتی ہے؟



یہ ذَا مَتْرَبَةٍ (90:16) ہے اور اس کے باوجود جو کچھ اس کو دیا جاتا ہے اس سے وہ مسکین ہی رہتا ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن کریم نے دین کی گھاٹی کا پہلا قدم فَکُّ رَقَبَةٍ (90:13) بتایا یعنی غلاموں کو آزاد کرنا۔ سارے قرآن میں جیسا کہ میں نے کہا ہے جہاں جہاں آپ دیکھیں گے وہ کہتا ہے کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ ان کے رزق کا انتظام کرو۔

خدا کے نزدیک سب سے بڑی نیکی

اللہ نے فرمایا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے مشرق کی طرف منہ کر لیا یا مغرب کی طرف۔ ہمارے ہاں جو ساری شریعت ہے وہ یہیں سمٹ کر آگئی جبکہ نیکی یہ ہے کہ مال کی کشش اور محبت کے باوجود اسے انسانیت کی بہبود کے لیے خرچ کرے (2:177)۔ میں اس تفصیل میں نہیں جا رہا کہ کس کس کام کے لیے خرچ کریں۔ جہاں کہیں بھی کوئی غلام ہو، محکوم ہو، اس کو غلامی سے آزاد کرنے کے لیے خرچ کرو۔ یہ نیکی ہے۔ آپ سوچے کہ جو قرآن یہ بات کہے گا کہ تمہارے ہاں جتنے غلام ہیں سب سے پہلے تو ان کو بتدریج آزاد کرو تا کہ معاشرے کا توازن نہ بگڑے۔ تو اسی بنا پر آئندہ کے لیے اس نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

غلام بنانے اور آزاد کرانے کے چکر میں ثواب کے حصول کا طریق

غلام تو کسی کو بنایا ہی نہیں جاسکتا۔ جو اس وقت غلام ہیں، انہیں رفتہ رفتہ بتدریج آزاد کرتے جاؤ اور دنیا میں جہاں کہیں غلامی ہے اس کو Abolish (ختم) کرنا، تمہارا فریضہ ہو گیا، چہ جائیکہ قرآن کسی سے یہ کہے کہ تم جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں کو لونڈیاں بنالیا کرو اور مردوں کو غلام بنالیا کرو یعنی کیا یہ کرو کہ ایک طرف ان کو غلام بنا کے لایا کرو پھر قرآن کے یہ جوا حکام ہیں، ثواب لوٹنے کے لیے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے ان کو آزاد کیا کرو۔ اتنے میں کوئی اور جنگ چھیڑ لیا کرو پھر وہاں سے غلام اور لونڈیاں لے آیا کرو اور پھر ثواب کی خاطر انہیں رہا کیا کرو۔ اندازہ لگائیے آپ کے ہاں عزیزان من! شریعت کی یہ ایسی بخشش ہیں جن پہ سب متفق ہو گئے ہیں۔

غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مودودیؒ کی تفسیری بیان

یہ عجیب بات ہے کہ جس چیز پر یہ سب متفق ہوتے ہیں اس کے متعلق ہمارے مولانا اسلم جیراچپوریؒ (1879-1955) نے فرمایا تھا کہ تاریخ میں آپ دیکھیے کہ جب بھی یہ مختلف فرقوں کے لوگ متفق ہوئے تو باطل پہ متفق ہو گئے۔ یہ اس پہ متفق ہیں کہ جنگ کے قیدی مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاتا ہے۔ مردوں والی بات تو بہت دے ہوئے کہتے ہیں، لونڈیوں کی بات بہت اچھل

اچھل کر کہتے ہیں۔ پوری تفسیر<sup>1</sup> مودودی (1903-1979) صاحب کی تشریحاً بھری پڑی ہے: جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے، سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے، ان کے ساتھ نکاح کی ضرورت بھی نہیں، ان کی تعداد بھی متعین نہیں۔ بیویوں کی تو پھر بھی متعین کر لی ہے: چار بیویاں۔ ان کی تو تعداد بھی متعین نہیں ہے۔ کہا ہے کہ انہیں وہ سپاہی، میری بچیاں اور بیٹیاں معاف کریں، میں کیا کروں، انہیں وہ سپاہی اپنے استعمال میں لائیں گے۔ انسان کے لیے یہ الفاظ بتا رہے ہیں۔ ان کی نگاہ میں کیا قدر ہے عورت کی۔ یہ اسے Commodity (تجارتی مال) سمجھتے ہیں اور جب جی بھر جائے تو کسی دوسرے کو تحفہ بھی دے سکتا ہے اور فروخت بھی کر سکتا ہے۔ آج یہ تفسیر لکھی جا رہی ہے جس کے ترجمے دنیا میں دوسری زبانوں میں ہو رہے ہیں۔

### غلامی کے سلسلہ میں یو این او کا چارٹر ہمیں قبول نہیں

یو این او (UNO) میں جب یہ چارٹر پیش ہوا تو اس چارٹر میں بنیادی حقوق انسانی (Basic Human Rights) کے سلسلہ میں لکھا تھا: Abolition of Slavery یعنی غلامی کا انسداد۔ انہوں نے یہ بھی اپنے چارٹر میں لکھا تھا کہ اسے جرم قرار دینا چاہیے۔ یہ قانوناً جائز نہیں قرار دینا چاہیے۔ یو این او کی اس میٹنگ، محفل، میں جہاں یہ چارٹر Discuss (زیر بحث) ہو رہا تھا، نام نہیں لینا چاہتا آپ کے مسلمانوں کے ایک ممتاز ترین..... نمائندے نے وہاں کہا تھا کہ ہم اس چارٹر پہ دستخط نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف جاتا ہے۔ دنیا بھر کے کفار اس کے اوپر دستخط کر رہے تھے۔ اسلام کا نمائندہ یہ کہہ رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کے تقاضوں نے پھر اپنے ہاں یہ کرنے پہ انکو بھی مجبور کر دیا اور یہ پرانی بات ہے۔ اب یو این او میں کہاں جاییں۔

### مملکت پاکستان میں لونڈیوں کے لیے مطالبہ

آپ کے سامنے یہ آپ کی سنٹرل پارلیمنٹ اسمبلی موجود ہے۔ 1973ء کے فروری کے سیشن میں جب آپ کا یہ آئین Discuss (زیر بحث) ہو رہا تھا تو اس میں بھی غلامی کا انسداد ایک شق ہے، اس میں آپ کی جمعیت العلماء کے ایک رکن مولوی نعمت اللہ صاحب نے وہاں کھڑے ہو کر یہ تقریر کی تھی کہ اگر آپ لوگ اس قسم کا یہ بل دھاندلی سے پاس کرنا ہی چاہتے ہیں تو کم از کم اتنی اجازت دیدی جائے کہ ایک لونڈی تو رکھ سکیں۔ اسمبلی میں آپ کے ہاں تقریر موجود ہے۔ یہ کل<sup>2</sup> کی بات ہے۔

1 تفہیم القرآن

2 1973ء کے فروری کے سنٹرل پارلیمنٹ اسمبلی کے سیشن میں۔

عزیزانِ من! یہ آپ کے ہاں تفسیر میں لکھا جا رہا ہے۔ یہ آپ کے ہاں علما کی طرف سے ڈیمانڈ ہو رہی ہے حالانکہ عربی زبان کا مقتدی بھی جانتا ہے کہ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ کا ترجمہ ہوتا ہے کہ ”جس کے دائیں ہاتھ مالک ہو جائیں“۔ یہ عربی کا ایک محاورہ ہے۔ جہاں جہاں قرآن میں ملکیت کا یہ لفظ آیا ہے۔ یہ Past Tense (زمانہ ماضی) میں آیا ہے ماضی کے صیغے میں آیا ہے کہ جب پہلے سے ان کے ہاں کوئی غلام اور لونڈیاں بن چکے ہوں یہ ان کے متعلق ہے جو کہا جا رہا ہے۔ ہر جگہ یہ کہا گیا ہے۔ آئندہ کے لیے تو اس نے ایک آیت میں کہہ دیا کہ تم غلام اور لونڈیاں بنا ہی نہیں سکتے۔ اب قرآن کریم میں کہا گیا تھا کہ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَفْئِدَتِهِمْ حَافِظُونَ (23:5) مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قوم اپنی جنسی توانائیوں کو Preserve (محفوظ) رکھے گی تاکہ دنیا میں اس قوم کے تمدن اور تہذیب کے یہ دعوے بلندی تک پہنچ جائیں۔ جسے یہ کہا گیا تھا آج اس کی کیفیت یہ ہے کہ جی ٹھیک ہے عصمت کی حفاظت ہم کرتے ہیں لیکن چونکہ قرآن نے کہہ دیا ہے کہ بیویوں کے اوپر اور بیویاں لائی جاسکتی ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کی حدود شمار ہی نہیں یہ تو پوری کی پوری لونڈیاں ہیں۔

آپ کے ہاں کی تاریخ میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ جن سلاطین کو جنہیں آپ ”خلفا“ کہتے ہیں جیسے خلفائے عباسیہ وغیرہ (656-132 AH بمطابق 750-1258 AD) ان میں سے بھی وہ جنہیں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بڑے متقی و پرہیزگار تھے مثلاً ہارون الرشید (193-170 AH بمطابق 786-809 AD) اور مامون الرشید (208-170 AH بمطابق 786-809 AD) ان میں سے ایک ایک کے محل میں تین تین ہزار لونڈیاں تھیں۔ اب آپ سوچئے کہ جنسی توانائی کی حفاظت کرنے کی تاکید جس قوم کو کی گئی تھی اس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو شریعت کی رو سے اپنے ہاں جائز، حلال اور طیب قرار دے رہی ہے تو کیا اس سے جنسی توانائی محفوظ رہے گی؟

### جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھنے کی بجائے تین تین ہزار لونڈیاں

آپ ایک بار پھر انون (J.D. Unwin) ہی کے الفاظ پر آجائیے اور یہاں آ کر تو پوچھو نہیں کہ وہ کیا کچھ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس قوم کی کیفیت یہ ہو کہ وہ عملاً جنسی توانائی کو محفوظ نہ رکھے سنیے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس قوم میں علم و بصیرت تو ہوتی ہے، لیکن وہ اپنے معاملات کو طے کرنے کے لیے کبھی علم اور بصیرت سے کام نہیں لیتی۔<sup>①</sup> یہ جنسی توانائی ایک شدید ترس جذبہ ہوتا ہے۔ جب اس کو

① ڈاکٹر انون (Unwin) کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

The People possess the power of reason, but they do not apply it to the world of their experience. Thus they do not inquire into the causes of things; they accept without question that assembly of activities which we call Nature (P.345).

اپنے اعصاب پہ سوار کر لیا جائے تو اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں وہ ساری کی ساری قوم ہی جذباتی ہو جاتی ہے۔ آپ کے ہاں مسلمان کی قوم اس قدر جذباتی قوم ہو گئی ہوئی ہے۔ آپ ہر طرف دیکھتے ہیں کہ کسی کے قریب جائیے وہ شاٹ (Shot) مارتا ہے اور پھر ان کو بھڑکانے والی وہ شعلہ افزا تقریریں ہیں جو آپ کے ہاں کی جاتی ہیں۔ سب سے بڑا لیڈر وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ مشتعل کرنے والی تقریر کر سکتا ہو۔ قوم پہلے ہی بالکل گرمیوں کے زمانے کا سوکھا ہوا ایندھن ہے اور اب اس پہ پٹرول لگا کر ذرا سی ایک دیاسلائی دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

### آج مسلمان قوم کی حالت اور تو اہم پرستی کا نتیجہ

یہ کچھ ہو جانے کے بعد پھر انون (Unwin) کہتا ہے کہ اُس میں علم و بصیرت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات کے طے کرنے میں کبھی علم و بصیرت سے کام نہیں لیتی۔ وہ واقعات کے اسباب و علل یعنی Causes and Effects کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے آنکھیں بند کر کے اسی پر چلتی جاتی ہے ہر معاملے میں تو اہم پرستی ان کے ہاں مذہب بن جاتی ہے۔ ابتدا میں وہ دم دروڈ تعویذ گنڈے دھاگے کی طرف آ جاتی ہے اور جب انہیں یہ تعویذ دینے والے مرجاتے ہیں تو ان کی قبروں پہ جا کر اپنے معاملات کا حل تلاش کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! سوچیے یہ کون لکھ رہا ہے۔ اُس نے دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے غیر مہذب Primitive (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس زاویہ نگاہ سے کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ہے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکا کا ہے تو دوسرا قطب شمالی کا ایک آسٹریلیا کا ہے تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے۔ اس طرح دنیا کے قبائل، مہذب اور غیر مہذب کی زندگیوں کا ذاتی مطالعہ کیا ہے۔ ان پر تحقیق کرنے کے بعد وہ کہتا ہے کہ

اس قسم کے معتقدات، اکابر پرستی، قبر پرستی، تعویذ پرستی، اس قوم میں نسلاً بعد نسل متواتر چلے آتے ہیں اور زمانے کا امتزاج بھی ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا:

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی ادھر ہے

وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے

وہ کہتا ہے کہ زمانہ کہیں سے کہیں چلا جائے وہ قوم اس معاشرے میں اپنی اسی روش کہن پہ چلتی چلی جاتی ہے۔ کیا بات ہے! عزیزانِ من! یہ کچھ کوئی قرآنی مومن نہیں لکھ رہا، بلکہ ان کی اصطلاح میں ایک کافر لکھ رہا ہے کہ ”اس معاشرے میں انسان پیدا ہوتے ہیں اپنی

خواہشات کو پورا کرتے ہیں، اور مر جاتے ہیں اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں، اسی طرح جیسے ایک حیوان نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔<sup>1</sup> سوچتے ہیں یہ لوگ، جنہوں نے جنسی توانائی کے Preserve (محفوظ) کرنے کی تحقیق کی ہے، وہ کیسے درخشاں نظر آتے ہیں! وہ بتاتا ہے کہ اگر اس جنسی توانائی کو بغیر Preserve (محفوظ) کیے یونہی بہا دیا جائے تو قرآن کے الفاظ میں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ آپ کے ہاں تو کبھی اس پہلو پر تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی، لیکن اگر اس طرف اس پہلو پر تحقیق ہو بھی، تو کوئی اس پر کبھی آپ کے ہاں توجہ ہی نہیں دیگا۔

### قوم کی جذباتی کیفیت کی وجہ جواز

برادران عزیز! یہ قوم جو اتنی زیادہ جذباتی ہو گئی ہے اس کا ایک بنیادی سبب اس جنسی توانائیوں کا ضائع کرنا ہے اور جسے انہوں نے خود فریبی سے یعنی اپنے آپ کو فریب میں رکھ کر کھدیا ہے کہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے، دراصل یہ اسی کا ہی فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ قوم یکسر جذباتی ہو جاتی ہے۔ وہ کسی معاملے کو Rationally (عقل و فہم و بصیرت سے) نہ سوچتی سمجھتی ہے، نہ اس کا حل دریافت کرتی ہے۔ یا تو وہ اشتعال میں آ کر قانون شکنی پہ اترتی ہے اور اگر وہ Passive (غیر فعال) ہوتی ہے تو گنڈے، تعویذ، قبر پرستی، اکابر پرستی پر چل پڑتی ہے۔

عزیزانِ من! اب اسکے بعد آپ سوچیے کہ قرآن نے کیا کہا کہ کون ہے وہ قوم جسے ہم نے مومن کہا ہے، جن کے اعمال، جن کے کام، جن کی جدوجہد، جن کی کوششیں، نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں، ثمر بار ہو سکتی ہیں، جن کی کھیتیاں پروان چڑھ سکتی ہیں؟ وہ کہ جو اپنی جنسی توانائی کو Preserve (محفوظ) رکھتے ہیں اور وہ اسے صرف تولید کے مقصد کے لیے صرف کرتے ہیں۔ لہذا قرآن حکیم نے اس مقصد کے لیے اس زمانے کی جماعتِ مومنین کو مخاطب کیا کیونکہ معاشرے میں اس زمانے میں ابھی غلام اور لونڈیاں موجود تھیں۔ قرآن نے ان کا ذکر اس انداز سے کیا اور ہر مقام پہ یہ کہا کہ ان کو تو رفتہ رفتہ آزاد کرتے چلے جانا۔

ازواج کے متعلق قرآن نے وحدتِ زوج کے اصول کو قانوناً بنیادی طور پہ رکھا اور اسمیں یہ ایک کلیہ مستثنیٰ رکھا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں اور پھر یہ بھی رکھا کہ اس میں بھی ہر فرد کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے شادیاں کرتا چلا جائے۔ اس کے لیے بھی کہا

1 ڈاکٹر انون (Unwin) کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

In such a society human beings are born; they satisfy their desires; they die. And, when their corpses have been disposed of, they are forgotten. (P.346)

ان تمام باتوں کے لیے ڈاکٹر انون کی کتاب کے صفحات 345-346 از حد کارآمد ہیں۔ وہ ان توہمات کی خوب عکاسی کرتا ہے۔

کہ معاشرہ بیٹھ کر یہ فیصلہ کرے گا کہ حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ جہاں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے تاکہ عورت کو Protection (حفاظت) دے دی جائے۔ لہذا وہاں بھی Protection (حفاظت) دینے کا سوال ہے۔ یہاں آپ کی شریعت میں یہ چیز عام ہوتی ہے اور قرآن نے جو کہا کہ جو بھی اس کے علاوہ کوئی دوسری شکل اختیار کرے خواہ وہ اس کا نام جائز شریعت کا قانون رکھ لے تو وہ اس توانائی کو ضائع کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے کہا کہ **أُولَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ** <sup>①</sup> (23:7)۔ یہاں لفظ **الْعَادُونَ** میں ساری بات کہہ دی کہ یہ قوم سرکش ہو جائے گی، بیباک ہو جائے گی، یہ قوم حدود و فراموش ہو جائے گی، یہ کناروں کو توڑ دے گی، تو اس قوم کا دریا دریا نہیں رہے گا بلکہ سیلاب بن جائے گا۔

### عصمت کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا انداز باریک بینی

عزیزانِ من! یہاں جنسی توانائی کی حفاظت آیا ہے۔ دراصل قرآن کریم میں ”فروج“ کا لفظ آیا ہے۔ اس کی اہمیت آج کے دور کے سائنٹسٹ (سائنسدان)، سوشیالوجسٹ (ماہر سماجیات)، یا سائیکالوجسٹ (ماہر نفسیات) کی جو تحقیقات ہیں ان سے جا کر پوچھیے کہ قرآن اس باب میں کیا کہہ گیا تھا۔ یہ وہی ہے جسے قرآن کریم نے ”حافظوں“ اور ”محصنین“ کہا ہے۔ قرآن کی باریکیوں کی بات درمیان میں آ جاتی ہے۔ عزیزانِ من! اسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا کروں! ذرا سا غور طلب ہے۔ میں نے کہا کہ ایک لفظ ”احسان“ بھی ہے۔ وہ مولوی کے الفاظ میں حلوے والی ح سے ہے، چوہدری جی کے الفاظ میں حقہ والی ح سے ہے۔ یہ وہی ہے جسے وہ ”تثج“ والی ح کہتے ہیں اور آگے ص ہے۔ اس لیے میں نے کہا ہے کہ ایک تو ”احسان“ ہوتا ہے لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے ”احسان“ کا لفظ کہا ہے یعنی عصمت کو محفوظ رکھ لینا۔ یہ اس کے لیے لفظ ہے۔ اس طرح ”محصنین“ مردوں کے لیے محصنت ص کے زیر کے ساتھ عورتوں کے لیے ہے اور ایک ہے محصنت ص کے زیر کے ساتھ۔ کہیں یہ ص زیر کے ساتھ آیا ہے کہیں یہی ص زیر کے ساتھ آیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا اور یہ عربی زبان پتہ نہیں کیا زبان ہے! عام طور پہ ان کے ہاں یہ جو ”محصنت“ ہے اس کے معنی ہیں ”حفاظت کرنے والی“ اور وہ جو ”محصنت“ ص کے اوپر جو زبر ہے اس کے معنی ہیں ”جس کی عصمت کی حفاظت کی گئی ہو“۔ یہ جو وہ محصنت تھی وہ شادی شدہ باعصمت عورت ہے۔ یہ لفظ اس کے لیے بولتے تھے۔ اس کے برعکس جو محصنت ہے یہ جو غیر شادی شدہ (Un-married) یعنی کنواری ہوتی تھی اس کے لیے بولتے تھے۔

① وہ قانون شکنی ہوگی اور حدود خداوندی سے تجاوز (جو سنگین جرم ہے) (24:2) (پرویز: مفہوم القرآن ص-744)

ایک زیر زبر میں 'عزیزان من'! پوچھو نہیں کہ قرآن نے کیا بات بتادی ہے۔ غیر شادی لڑکی کہا، وہ اپنی عصمت کی حفاظت آپ کرتی ہے اور جب وہ شادی شدہ ہو جاتی ہے تو اس کی جو شادی ہے وہ اس کی حفاظت کر دیتی ہے، وہ محسن ہو جاتی ہے۔ وہ حفاظت کی گئی والی بات آپ کی سمجھ میں یوں آئے گی۔ آپ اپنے ہاں کی یا ہمارے ہاں کی لڑکیاں جن کے ہاں ابھی عصمت کا یہ تصور ہے، آپ دیکھیں گے کہ جو (Un-married) غیر شادی شدہ لڑکیاں ہیں، وہ تنہا کبھی مارکیٹ تک نہیں جاتیں۔ خواہ اتنے سے آپ کے چھوٹے بھائی کو بچے کو ساتھ کیوں نہ لے جائیں، کبھی تنہا نہیں جاتی۔ اس لڑکی کی شادی کر دیجیے تو شادی کے بعد اس کے اندر خود اتنی جرأت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تنہا چلی جاتی ہے۔ یہ عورت پر Psychological Effect (نفسیاتی اثر) ہوتا ہے۔ جو شادی شدہ عورت ہے اس کے اندر یہ ایک تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ میری عصمت محفوظ ہے، کوئی میری طرف نگاہ بد سے نہیں دیکھ سکتا، کوئی آنکھ اٹھا نہیں سکتا یعنی کچھ اندر تبدیل ہوتی ہے۔ ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ مردانوں تے ساڈے احساس ای اے نہیں ہو سکتا ایسا کہ محفوظ تے غیر محفوظ ہوندی کی ہنگی اے۔ اے تے سارے ای لٹیرے نیں۔<sup>1</sup> ہمارے ہاں کی عورتوں، لڑکیوں میں ابھی یہ بات ہے، بیٹیوں میں ہے۔ یہ جو غیر شادی شدہ بچی ہے وہ اپنے آپ کو عصمت کے اعتبار سے غیر محفوظ سمجھتی ہے، اس لیے وہ اپنی حفاظت کا خود انتظام کرتی ہے۔ اس کے لیے حصّہ کا لفظ آیا ہے۔ اور جب اس کی شادی ہو جاتی ہے تو پھر حصّہ ہوتی ہے یعنی شادی نے اس کی عصمت کی حفاظت کر دی۔

عزیزان من! میں یہ کہہ رہا تھا کہ عربی زبان کو دیکھیے اور قرآن کے الفاظ کو دیکھیے۔ بہر حال بات جنسی توانائیوں کے Preserve (محفوظ) رکھنے کی تھی۔ اس کا ایک ہی مصرف تھا اور وہ ہے تولید، حیوانات کے اندر فطرت نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ وہ جو ز حیوان ہوتا ہے، وہ مارتا بھی کیوں نہ ہو، فطرت نے خود اس کے ہاں وہ Lasers (روشنی کے تابش) لگا رکھے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اس کا استعمال ہی نہیں کر سکتا۔ وہ تو جب فطرت کا اشارہ ہوتا ہے، جب Mating Season (جنسی اختلاط کا وقت) آتا ہے، صرف اس وقت یہ چیز بیدار ہوتی ہے اور وہ اس کو صرف Creative Purpose (تخلیقی مقصد) کے لیے استعمال کرتے ہیں یعنی وہی جسے میں نے Procreation (تولید) کہا تھا۔ جب فطرت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں، فطرت یہ پھانک نہیں کھولتی، اس کو جھنڈی نہیں دکھاتی، وہ سارا سال گائے اور بیل ایک گلے (Herd) کے اندر چرتے پھرتے رہتے ہیں، کوئی بیل گائے کو نظر بد سے دیکھتا ہی نہیں، نہ وہ اس کو آنکھ مارتی ہے۔ وہاں فطرت ان کا انتظام کرتی ہے کیونکہ انہیں صاحب اختیار وارادہ نہیں بنایا۔ صرف انسان کو صاحب اختیار وارادہ بنایا ہے تو اب پوچھو نہیں کہ ان کے اوپر کیا ذمہ داریاں عائد کیں۔ اس کے برعکس وہ گائے وہاں کے اشارے کا انتظار کرتی ہیں۔ ان کو اس

1 ہمارے ہاں کے مردوں میں تو یہ احساس ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ محفوظ غیر محفوظ ہونا ہے کیا؟ یہ تمام ہی لٹیرے ہیں۔

پہ اختیار ہی نہیں ہوتا۔ اس کی توانائیاں محفوظ رہتی ہیں۔ نقص یہ ہے کہ وہ حیوانات ان توانائیوں کو تخلیقی Purpose (مقصد) کے لیے استعمال نہیں کر سکتے کہ تخلیق حیوانات کا منصب نہیں ہے، یہ انسان میں آکر ہونا تھا اور یہ بڑی حقیقت تھی جسے غالب<sup>1</sup> اپنے انداز میں بیان کر جاتا ہے۔ ”چاک مت کر جیب بے ایام گل“۔ اس کا بڑا ہی حسین انداز ہوتا ہے۔ ان کے ہاں تو یہ ہے کہ بہار کا موسم آتا ہے تو پھر ان کا جنون ابھر آتا ہے۔ چاک دامانی کے معنی یہ ہیں۔

یہ عرب زبان کے لحاظ سے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ان عربوں کے ہاں جو یہ لفظ ہے جسے اب ہم ”فرج“ کہتے ہیں عربوں کے ہاں چاک دامانی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ وہ اس طرح سے اس کے یہ معنی جو کچھ ہم شرمگاہ وغیرہ کرتے ہیں وہ لوگ بھی حالانکہ وہ جاہل بدو تھے وہ ایمائیت (Suggestiveness) اور اشارے کے اعتبار سے ”چاک دامانی“ کہتے تھے۔ اس لفظ کو غالب (1797-1869) نے وہیں سے لیا۔

چاک مت کر جیب بے ایام گل

کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

تو جنسی توانائی کا عزیزان من! یہ مصرف قرآن نے بتایا ہے۔ یہ اس کی تاکید تھی۔ یہ اس کی اہمیت تھی اور پھر ہمارے ہاں جب یہ چیز ارباب شریعت کے ہاں آگئی تو پھر آپ نے دیکھ لیا کہ وہ کیا کیا دروازے کھلے ہیں! آیات تو آج 3 ہی آئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں یہ سوال اتنا اہم تھا جس کا مکمل جواب آگیا۔

سورة المؤمنون کی آیت 7 تک آگئے 8 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط





## تیسرا باب: سورة المؤمنون (آیات 8 تا 11)



عزیزانِ من! آج اپریل 1977ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 8 سے ہو رہا ہے: (23:8)۔

گزشتہ سے پیوستہ

اس آیت کے آغاز سے ہی مومنین کی خصوصیات بتائی جا رہی ہیں۔ اس سورة کا آغاز تو اس سے ہوا تھا کہ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (23:1) وہ مومن ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں، جن کی کوششیں بار آور ہوتی ہیں، اور اس کے بعد بتایا تھا کہ ان کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں۔ پہلی پانچ آیات میں ان خصوصیات کا جامع طور پر ذکر تھا۔ جیسا کہ قرآن کا انداز ہے بتایا تھا کہ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (23:2) وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہیں لیکن میکا کی طور پر یا رسی طور پر نہیں، محض قانون کی شق پورا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے دل کے جھکاؤ کے ساتھ۔ یعنی یہ چیز ان کے اپنے دل کا ارادہ اور خواہش ہو جاتی ہے، اس کا تقاضا ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ان فرائض کو پورا کرتے ہیں۔ پھر کہا تھا کہ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (23:3)۔ لغو سے اعراض برتنے کے سلسلہ میں، میں ان تمام امور کی تفصیل پہلے درسوں میں بتا چکا ہوں، اس لیے ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اگلی دو آیات میں کہا تھا کہ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ. وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (23:4-5)۔ وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں جس سے تمام نوع انسانی کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے اور اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

امانات، معاہدات اور عالمگیر ضابطہ اخلاق کے مروجہ تصورات

اس کے بعد اب ہمارے سامنے اگلی خصوصیت آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وَالَّذِينَ هُمْ لِمَنْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ

رَاعُونَ (23:8)۔ اس آیت کا عام ترجمہ عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عہد یا معاہدہ یا وعدے کی پاسداری کرتے ہیں اور امانات کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ کسی سے جب کوئی وعدہ کیا جائے تو اس وعدے کا ایفا کیا جائے اسے نبھایا جائے۔ کوئی شخص اگر کوئی امانت تمہارے پاس رکھ جائے تو اس امانت کی حفاظت کی جائے اس میں خیانت نہ کی جائے۔ ٹھیک ہے انفرادی طور پر یہ چیزیں بھی ہونی چاہئیں اور معاشرے کے لیے وعدے کی پابندی امانت میں خیانت نہ کرنا ضروری ہیں لیکن بات اس سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کی جو اخلاق کی پابندیاں قرآن نے بتائی ہیں ان کے لیے کہا جائے گا کہ یہ تو دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں انہیں تو Universal Ethics (عالمگیر ضابطہ اخلاق) کہتے ہیں مثلاً یہ چیز کہ جھوٹ نہ بولو، سچ بولو، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، دغا نہ دو، فریب نہ کرو، دھاندلی نہ کرو۔ یہ چیزیں ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں تمام مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ مذاہب چھوڑ کر جتنی بھی مہذب سوسائٹیاں کہلاتی ہیں ان سب میں یہ پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ وحشی قبائل میں بھی ان میں سے بہت سی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ انہیں Universal Ethics (عالمگیر ضابطہ اخلاق) کہا جاتا ہے۔

یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ میں یہ بتاتا کہ یہ جو اس قسم کی خصوصیات یا ضوابط اخلاق ہیں Originally (ابتداءً) یہ بھی وحی پر ہی مبنی تھے۔ وحی کا رشتہ رابطہ اور نسبت تو پھر گم ہو گئی مگر یہ چیزیں باقی رہ گئیں۔ یہ عالمگیر اس لیے ہیں کہ قرآن کی رو سے دنیا کی ہر قوم میں ہر زمانے میں خدا کی طرف سے نبی آتے رہے وحی کی رو سے وہ ان ضوابط کو عام کرتے رہے اور وحی کی تعلیم میں بعد میں بہت سی آمیزش ہوئی، تحریف ہوئی لیکن یہ جو بنیادی ضابطے یعنی اخلاق کی چیزیں تھیں یہ ان اقوام میں ان معاشروں میں باقی رہیں اور یہ متواتر چلی آرہی ہیں۔ اس اعتبار سے تو یہ وہی ہیں جو عام طور پر پائی جاتی ہیں مثلاً اگر کہا جائے کہ قرآن نے کہا کہ جھوٹ نہ بولو، تو کہا جائے گا کہ یہ چیز تو ساری دنیا میں موجود ہے۔ قرآن بھی یہ کچھ کہتا ہے۔ یہ جسے آپ عالمگیر اخلاق کا ضابطہ کہتے ہیں قرآن بھی کہتا ہے کیونکہ وہ بھی تو وحی کی چیز ہے اور یہ وحی کی بات ہے اور ہونی چاہیے لیکن وہ اس سے آگے بھی جاتا ہے۔ اس سے بھی آگے نہ جانے کا جو تصور تھا وہ مولانا ابوالکلام آزاد<sup>1</sup> جو آج مرحوم ہو چکے نے دیا<sup>2</sup> تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر

① احمد محمدی الدین ابوالکلام آزاد (1888-1958)

② اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے:

پائی جاتی ہیں۔ میں اس سے زیادہ نہیں کہتا کہ ان کے ذہن نے غلطی کھائی جو یہ کہا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ وہ عالمگیر سچائیاں یہی تھیں جو جی نے دی تھیں اور جنہیں Universal Code of Ethics (عالمگیر ضابطہ اخلاق) کہا ہے۔ وہ تمام مذاہب میں ہی نہیں بلکہ جہاں مذاہب نہیں ہیں وہاں بھی یہ چیزیں ہیں۔ اگر انہی چیزوں کو Repeat (دہرانے) کرنے کے لیے قرآن آیا تھا تو یہ چیز کہ یہ ایک واحد منفرد مختص مخصوص غیر متبدل ابدی مکمل قیامت تک تمام نوع انسانی کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں ضابطہ حیات ہے تو یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور اگر یہ وہی ہے جو چند اخلاقی ضوابط ہیں انہی کا اعادہ ہی صرف مقصود ہے جن پہ میں زور دے رہا ہوں تو یہ تو وہی چیز ہے اس کے بعد اس سے آگے تو کچھ نہیں ہے۔

### قرآن حکیم وحی کی بنا پر ایک عالمگیر ضابطہ حیات ہے

برادران عزیز! یہی وہ مقامات ہیں جہاں یہ چیزیں عالمگیر ضابطے کے طور پر آتی ہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔ دراصل قرآن تو اپنے ہاں خصوصیت کی بہت بڑی چیز بھی بیان کر گیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ بھی ان الفاظ پہ غور کیجیے ذہن اس سے آگے جاتا ہی نہیں ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عہد کی پابندی کرتے ہیں اور امانات میں خیانت نہیں کرتے۔ اس پر انسان مطمئن ہوتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے۔ یہ بڑی اچھی خصوصیت ہے جس کے اندر بھی پیدا ہو جائے لیکن بات اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ انسانی تمدن کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جب سے تاریخ کا پہلا دور ہمارے سامنے آیا ہے اس دور سے یہ سوال وجہ پریشانی بنا رہا کہ قبائل کے معاشرے میں نظام حکومت کس قسم کا ہو اور خدا کی وحی نے اس کے متعلق کیا کچھ کہا؟ وہ تو پہلی جتنی بھی وحی آئی تھی وہ اب اپنی منزہ شکل میں کہیں باقی نہیں رہی اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا چیز آئی تھی لیکن یہ جو انسانی کوششوں کی تاریخ ہے وہ بتا رہی ہے کہ اس میں انسان بڑا ناکام و سرگرداں چلا آ رہا ہے۔

### اصل مسئلہ تو صحیح نظام حکومت کا ہے

اصل میں صحیح نظام حکومت ہی ایسی چیز ہے جس سے معاشرے (Society) میں امن و امان ہی نہیں بلکہ فلاح و فوز بھی پیدا ہوتی ہے انسان روزمرہ کی سرگردانی اور پریشانیوں سے محفوظ و مطمئن ہو کر کسی بلند مقصد کی طرف گامزن کیے قابل ہوتا ہے۔ یہ جو صحیح نظام زندگی ہے جسے آج کی اصطلاح میں نظام حکومت کہیے وہ تو قرآن کے الفاظ میں انسانی زندگی کا صحیح خطوط پہ متشکل کرنا تھا جو ایک بنیادی تقاضا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی تلاش میں نوع انسانی کا یہ قافلہ صدیوں سے مارے مارے پھرتا ہے اور اس نے اس کے لیے جو طریق بھی تجویز کیا ناکام ثابت ہوا پھر اسے چھوڑا پھر کوئی دوسرا طریق تجربہ اختیار کیا چنانچہ Trial & Error (سعی و خطا) کا یہ سلسلہ اب

تک مسلسل و متواتر چلا آ رہا ہے۔ انسان کی کوشش ہائے ناتمام ان تجربات کی بالآخر ناکامیوں اور نامرادیوں کی سرگزشت ہے۔ یعنی یہ آخری کوشش جو اس سلسلہ میں ہوئی اور جس پر انسان نے یہ کہا کہ بہر حال یہ حل قابل اطمینان ہے اور ابھی تک اس حل میں مزید Improvement (بہتری) نہیں ہوئی ہے، وہ انقلاب فرانس (1789) کے زمانے میں پیدا ہونے والا نظریہ میثاق<sup>1</sup> ہے جسے Theory of Contract کہا جاتا ہے۔ انسان نے اسے انسانی تاریخ میں ایک سنگ میل اور معرکہ آرا نظریہ قرار دیا ہے۔ Theory of Social Contract (سماجی نظریہ میثاق) یہ ہے کہ حکومت یا اربابِ نظم و نسق اور اس ملک کے جو دوسرے باشندے ہیں، ان دونوں کے مابین ایک معاہدہ (Contract) ہوتا ہے۔ اس معاہدے (Contract) کی رو سے یہ جنہیں آپ عام الفاظ میں رعایا یا ملک کے باشندے کہتے ہیں، وہ اپنے کچھ حقوق اربابِ نظم و نسق حکومت کے سپرد کر دیتے ہیں اور یہ اس کے معاوضے میں ان کے ساتھ کچھ معاہدہ کرتے ہیں کہ تم یہ کچھ ہمیں دیدو یہ کچھ Surrender (حوالے) کر دو یہ چیزیں Pay (ادا) کر دو یہ چیزیں تمہاری Responsibility (ذمہ داری) ہو گئیں جسے آج کی اصطلاح میں Obligations (فرائض) کہتے ہیں تو اس کے مقابلے میں یہ تمہارے Rights (حقوق) ہو گئے جنہیں ہم پورا کریں گے۔ اس Theory (نظریہ) کی رو سے یہ جو دو Parties (جماعتیں) بن جاتی ہیں، ان میں یہ پارٹی جو نظم و نسق کی ذمہ دار ہوتی ہے، وہ یہ کہتی ہے کہ تم اپنی ان چیزوں کو Surrender (حوالے) کر دو، ہمیں دیدو ہمارے حوالے کر دو اور ہم اس کے مقابلے میں تم سے معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم یہ کچھ کریں گے۔ گویا جو کچھ انہوں نے ان کو دیا تھا، وہ یوں ان Rights (حقوق) کی شکل میں ان کی طرف لوٹاتے ہیں جس کا وہ عہد و معاہدہ کرتے ہیں۔ یہ ذرا غور طلب چیز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس قسم کی آیت کے سلسلے میں یہ چیز پہلی بار آپ کے سامنے آئی ہوگی۔

یہ جو حکومت میں Theory of Social Contract (معاشرتی نظریہ میثاق) ہے، اس پر جمہوریت کے سارے نظامِ عمارت کی بنیاد استوار ہو رہی ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اب تک کی انسانی کوششوں میں یہ آخری اور بہر حال بڑی کامیاب کوشش ہے۔ یہ کامیاب ہے، یا نہیں اس کو تو چھوڑیے لیکن یہ کہا گیا ہے کہ ابھی تک اس سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا نظام انسانی کوششوں نے ایجاد نہیں کیا۔ نظام وضع کرنے کے سلسلے میں یہ انسان کی آخری کوشش بتائی جا رہی ہے۔ فرانس کا جو انقلابی تھا اس کا شمار دنیا کے عظیم فلاسفروں میں ہوتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ نظریہ یونانِ قدیم سے چلا آ رہا تھا لیکن اٹھارویں صدی میں یورپ میں انہوں<sup>2</sup> نے اسے پہلی دفعہ فروغ دیا اور یہ پہلی بار

1 اسکی مکمل وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005، ص 350-363 مع انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

2 ہابز (Hobbes: 1588-679)، لاک (Locke: 1632-1704) اور روسو (Rousseau: 1712-1778)۔ یہ سرفہرست ہیں۔

کی چیز اس لیے کہی گئی ہے کہ انسانی تاریخ تو ان کے سامنے تھی مگر قرآن ان کے سامنے نہیں تھا۔ اس میں ان کا کیا قصور ہے کہ یہ ہم نے اس انداز سے ان کے سامنے پیش ہی نہیں کیا۔ اب بھی وہ مشکل ہی ان کے سامنے پیش کی ہے۔ موجودہ جمہوریت کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے۔

### چودہ سو سال پیشتر قرآن کی طرف سے پیش کردہ نظریہ میثاق کے خدو خال اور اس کی ضمانت

عزیزانِ من! یہ Theory of Social Contract (معاشرتی نظریہ میثاق) چودہ سو سال پہلے قرآن کریم نے پیش کیا تھا اور ان جامع الفاظ میں پیش کیا تھا کہ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ<sup>①</sup> (9:111)۔ مومنین سے ان کا مال اور جان خرید لیتا ہے یہ اسے دیدیتے ہیں۔ ایک سائیڈ سے کنٹریکٹ کی یہ بات آگئی۔ اس کی دوسری سائیڈ بھی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ کنٹریکٹ (Contract: معاہدہ) اس کے عوض میں کیا دیتا ہے۔ وہ تو مومنین کی مال اور جان لے لیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن نے کہا کہ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111)۔ وہ اس کا عہد کرتا ہے کہ میں اس کے عوض تمہیں الجنتہ دیدونگا۔ ہمارے سامنے دو Parties (جماعتیں) آگئیں۔ ان کے مابین یہ ایک معاہدہ (Contract) یہ ایک میثاق ہوا ہے۔

میں متعدد بار یہ چیز عرض کر چکا ہوں کہ قرآنی تصور کی رو سے جہاں یہ ذمہ داریاں خدا کے لفظ سے آتی ہیں کہ خدا یہ کر دے گا قرآن نے خود بتایا ہے کہ خدا تو تمہارے سامنے براہِ راست نہیں آئے گا، تم اس کے ساتھ یہ معاہدہ بھی نہیں کرو گے، وہ نظام جو خدا کے ان قوانین اور احکام کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوتا ہے، تم اس کے ساتھ یہ معاہدہ (Contract) کرو گے۔ جو نظام خدا کے قوانین و احکام کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوتا ہے قرآن اسے ”اللہ اور رسول“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ خدا کا وہ نظام ہے جو اس کے رسول ﷺ کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا اور رسول اللہ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد وہ نظام اسی سلسلے میں آگے چلتا ہے۔ وہ جنہیں جانشینانِ رسول کہا جاتا ہے وہ اس نظام کے ارباب حل و عقد ہیں۔ یہ وہ نظام ہے جو خدا کے قوانین و احکام کو عملاً نافذ کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے۔

① اس معاہدہ (Contract) کی رو سے کہا گیا ہے کہ خدا مومنین سے ان کا جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے۔ یہ معاہدہ (Contract) محض ذہنی اور اعتقادی نہیں کہ آپ نے دل میں کہہ دیا کہ میں نے اپنا جان و مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیا اور خدا نے آپ کو جنت دے دی۔ یہ معاہدہ محسوس شکل میں نظام خداوندی سے کیا جاتا ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہ نے متشکل فرمایا تھا اور جسے حضور کے بعد آپ کے جانشینوں کے ہاتھوں قائم اور مستحکم رہنا تھا۔ اس دنیا میں جنتی زندگی کا وعدہ بھی اسی نظام کے ہاتھوں پورا ہوتا تھا۔ (اخروی زندگی کی کیفیت اور ہے)۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے 48:10 (پرویز: مفہوم القرآن، ص 449-450) (فٹ نوٹ 1)۔

## اسلامی حکومت کی شرط اول

اس نظام میں خدا کے قوانین و احکام کو عملاً نافذ (Implement) کرنا ہے۔ اب اس نظام کی اس شرط اول کو سامنے رکھیے اور سوچیے کہ ہر حکومت یہ نہیں ہے، خواہ آپ اس کا نام اسلامی حکومت رکھ لیں یا مسلمانوں کی سلطنت رکھیں، وہ نظام یہ نہیں ہے۔ یہ تو وہ نظام ہے جو خدائی قوانین و اقدار و اصول اور احکام کو عملاً نافذ کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے۔ قرآن کریم نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں نازل ہوا تو آپؐ نے اس نظام کو متشکل کیا۔ اسے اللہ اور اس کے رسول کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور حضورؐ کے بعد پھر جب یہ نظام آگے چلے گا تو اس نظام کے لیے یہ اصطلاح تھی جو استعمال کی گئی۔

قرآن نے خود یہ کہا ہے کہ مومن خدا کے ہاتھ اپنا مال اور جان بیچ دیتے ہیں۔ خدا تو سامنے نہیں آتا، خریدار ہی سامنے نہیں آتا، تو یہ جو بیچ دیں گے یہ پھر کیسے بیچیں گے، یہ اسے کیسے منتقل کریں گے؟ جان کو تو چھوڑ دیجیے کہ جب ضرورت پڑے گی مانگ لی جائے گی، قرآن اَمْوَالَهُمْ (9:111) بھی تو کہتا ہے۔ خریدار ہی سامنے نہیں ہے تو یہ بیچیں گے کیسے؟ اور جب خریدار ہی نہیں ہے تو یہ بیچا ہی نہیں گیا، اس نے Take over (حوالے) نہیں کیا تو وہ جو اس کی طرف سے دوسرا عہد (Contract) ہے جس کے لیے کہا ہے کہ بَانَ لَهُمُ الْجَنَّةَ ① (9:111)۔ وہ کون پورا کرے گا؟

آپ خدا کے ”مرجہ تصور“ کو ذہن میں رکھیے تو ان آیات کا عملی مفہوم ہی کچھ نہیں رہتا: نہ خریدار وہ چیزیں لیتا ہے نہ وہ جو عہد ہوتا ہے، اس کے متعلق یہ کبھی ہوتا ہے کہ وہ پورا کیسے کرے گا کیونکہ سودا ہی نہیں ہوا۔ یہ ہے وہ تصور جو مذہب کی دنیا میں ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! دین میں یہ تصور نہیں ہے۔ دین تو نظام کا نام ہے۔ اب مذہب کے اس مردوبہ تصور میں ہر شخص مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ چیز کئی دفعہ ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ان سے پوچھیے تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم تو مالک نہیں ہیں، مالک ہر شے تو اللہ ہے۔ وہ جو بڑے بڑے ایوان اور عمارات ہوتی ہیں ان کے باہر سنگ مرمر کی بھی ایک تختی لگا دیتے ہیں: اس پہ لکھا ہوتا ہے کہ ”در حقیقت مالک ہر شے خدا است۔ ہمارے پاس تو صرف یہ امانت کے طور پر رکھا ہے، مالک تو وہ خود ہے اور وہ جو مالک ہے نہ وہ خود کبھی Possession (قبضہ) لینے کے لیے آئے نہ بسنے کے لیے آئے نہ خود کسی کو کرائے پہ دے نہ خود لے۔ یہی کرائے پہ دیں، یہی اس کو بیع کریں، یہی اپنی وراثت میں دیں، مگر ”مالک ہر شے در حقیقت وہی خدا ہے۔ ہم تو صاحب! اس کی طرف سے واقع ہوئے ہیں، ہمارے ہاتھ میں امانت ہے۔“ یعنی جو مالک ہے اس کو کوئی عمل دخل ہی نہیں ہے اور یہ جو اس کے امین ہیں اس کے اندر سارا عمل دخل صرف ان کا ہے۔ کیا یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ خدا خرید لیتا

① اس کے معاوضہ میں وہ انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دیدیتا ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 449)

ہے تو بس یہ اسی کے لیے تھا کہ تم اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کر لو کہ خدا نے خرید لیا ہے اور خریدنے کے بعد پھر ہمارے ہی پاس چھوڑ دیا ہے کہ اس نے تو ہمارے پاس امانت رکھی ہے اور پھر جتنا جی چاہے اس ملکیت میں بڑھاتے چلے جائیں اور ذہن میں عقیدہ یہ رکھیں کہ صاحب مالک حقیقی خدا ہی ہے، ہم تو صرف امین ہیں۔ عزیزان من! سب کچھ انہی کے پاس رہتا ہے: نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی۔ یہ ساری جائیداد تو اپنے قبضے میں رکھی، پھر مرنے کے بعد اولاد کو منتقل ہو گئی۔ اب یہ جائیدادیں بیچی جا رہی ہیں۔ بس یوں کہو جیسے کرائے پہ دی جا رہی ہیں۔ جو کچھ جی میں آئے کرتے رہتے ہیں لیکن کہتے یہی ہیں کہ مالک حقیقی وہی ہے اور طرفہ تماشایہ ہے کہ مالک وہ ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ جی! وہ تو لامکان ہے، یعنی اپنا گھر بار ہی کوئی نہیں۔“

آپ غور کیجیے، عزیزان من! یہ قرآن اس طرح آپ کو ذہنی فریب دہی کے لیے نہیں آیا کہ جس طرح جی چاہے آپ اپنا اطمینان کر لیں تو اس کا منشا پور ہو گیا۔ وہ تو آپ کو ٹھوس حقیقتیں پیش کرتا ہے۔ اب آپ کے سامنے اشتراکی والی یہ آیت (9:111) ہے۔ اس میں خریداری کی بات کہی ہے۔ یہ یونہی نہیں ہے کہ یہ کوئی ذہنی سودے ہیں جو آپ کر لیں اور اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ اس سودے کے متعلق سورۃ الفتح میں دیکھیے صلح حدیبیہ<sup>①</sup> کے زمانے میں وہ وقت آیا جب نبی اکرمؐ صحابہؓ کے ساتھ گئے۔ مکے والوں نے انہیں باہر ہی روک لیا، حج کی بھی اجازت نہیں دی اور یہ نظر آ گیا کہ یہ آپ ﷺ پر پورش کر رہے ہیں مگر یہ تو صرف حج کرنے کے لیے آئے تھے۔ مکے والوں کی نیت خراب ہو گئی۔ افواہ پھیل گئی کہ جو صحابہؓ مکے میں ان لوگوں کے پاس گئے تھے انہوں نے انہیں پکڑ لیا ہے۔ وہاں رشتہ داریاں تھیں ان کی عزیز داریاں تھیں۔ وہ آپس میں رہتے سہتے تھے۔ حضرت عثمانؓ (573-656AD) کے متعلق خاص طور پہ مشہور ہو گیا کہ انہیں گرفتار کر کے شہید کر دیا ہے تو پھر حضور ﷺ نے صحابہؓ کو کہا کہ لو بھئی! عہد کا وہ وقت آ گیا۔ مال تو آپ لوگوں نے دے رکھا تھا۔ قرآن کی رو سے مال تو کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زائد رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ تو عملاً خریدا ہوا ہوتا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ قرآن نے کیسے یہ بتایا؟ حضور ﷺ نے کہا کہ لو بھئی! وہ جو اللہ کے ساتھ تم نے خریداری کا معاملہ کیا ہوا ہے، جانیں بیچی ہوئی ہیں اب اس کا وقت آ گیا ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ رسول اللہؐ نے کہا، جیسا کہ اس زمانے کا طریقہ تھا کہ آؤ اس معاہدے (Contract) کے اوپر ہاتھ پہ ہاتھ رکھیں: نیچے ہاتھ اوپر ہاتھ۔ ہمارے ہاں اب بھی یہ طریقہ رائج ہے۔ جو کوئی بات بھی ہوتی ہے، یہ اسے ”پکی کرنا کیندے میں“<sup>②</sup> کہ لاؤ ہاتھ لاؤ اور پھر ہاتھ پہ یوں ہاتھ رکھتے ہیں تو سودا پکا ہوتا ہے۔ ان عربوں کے ہاں بھی یہی دستور تھا۔

① ذیل عقدہ 6ھ

② اسے عہد پختہ کرنا کہتے ہیں۔

## سنگِ اسود کے اوپر ہاتھ رکھنا دراصل عہد پکا کرنے کا ہی معاملہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو کعبے کے سنگِ اسود پر جا کر ہاتھ رکھنا ہوتا ہے یہ وہی پکے سودے کی شرط ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ لو بھی! وہ جو تمہاری بیع و شری تھی یعنی خرید و فروخت کا معاملہ تھا اب عملاً اس کا وقت آ گیا۔ اب آؤ اس کا معاہدہ (Contract) کریں۔ اب ان صحابہ ؓ کا ہاتھ آتا تھا تو رسول اللہؐ ہاتھ کے اوپر ہاتھ رکھتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کو بتادو کہ ان کے ہاتھ کے اوپر یہ رسول کا ہاتھ نہیں خدا کا ہاتھ ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ وہ سودا کنکریٹ (محسوس) شکل میں سامنے آ گیا۔ وہ خریدار جس کے Behalf پر<sup>1</sup> اس نے یہ معاملہ کرنے کی اتھارٹی دے رکھی تھی وہ سامنے آ گیا۔ اب یہ ذہنی چیز نہ رہی صرف نظری اور اعتقادی چیز نہ رہی۔ تم مطمئن ہو گئے کہ سودا کرنے کے بعد خریدار آ گیا اس نے ان چیزوں کا Possession (قبضہ) لے لیا۔ یہ تو وہ امانات تھیں جو انہوں نے اس کے سپرد کر دیں اور ادھر سے عہد (Contract) ہے جس کے لیے کہا کہ یہ بَانَ لَهُمُ الْجَنَّةَ<sup>2</sup> (9:111) ہے۔ جب ہمارے ہاں یہ خرید و فروخت ذہنی ہوتی ہے تو الجنتہ مرنے کے بعد چلی جاتی ہے کیونکہ خرید و فروخت تو Actually (حقیقت میں) ہوتی ہی نہیں ہے۔ جب یہ ہوا ہی نہیں تو یہ معاہدہ بھی ذہنی ہوا اور اسی طرح یہ الجنتہ بھی۔ اب اس ذہنی الجنتہ کے متعلق بھی یہی ہے کہ یہ قیامت میں جا کر ملے گی۔ ارے! ملے گی کیسے؟ تم نے تو یہ جان و مال Hand-over (حوالے) ہی نہیں کیا۔ تم نے ان چیزوں کا قبضہ ہی نہیں دیا تو اس کے معاوضے میں الجنتہ کیسی؟ کہا کہ جی! ہم نے تو ساری عمر اسے امانت کے طور پر اپنے پاس رکھا۔ ہم نے تو اپنے آپ کو اس کا مالک ہی نہیں سمجھا۔ اگر وہ لینے کے لیے آتا ہی نہیں ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ لیکن وہ جو اس نے قرآن کریم میں کہا ہے کہ جان و مال کے بدلے میں جنت دیں گے تو وہ تو دینی پڑے گی۔ پوچھا کہ شیخ جی یہ کیسے؟ کہنے لگے کہ جی ہم تو ہر وقت انتظار میں رہے۔ آپ نے غور کیا کہ یہ بات کیا بنی؟

عزیزانِ من! قرآن تو عملی زندگی کا ضابطہ ہے۔ یہ ذہنی اطمینان کا ضابطہ نہیں ہے۔ ذہنی اطمینان تو جس طرح سے بھی کسی کا جی چاہے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ اپنا ذہنی اطمینان ہوتا ہے۔ اسے خواہ آپ فریب نہ بھی کہیں تو بھی یہ جھڑپ اپنے طریق پر گردوارہ<sup>3</sup> میں جا

1 جس کی جانب سے

2 اس کے معاوضہ میں نظام خداوندی انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔ (یعنی اس دنیا میں ان کی تمام ضروریات زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما کے تمام وسائل و اسباب کی فراہمی اس نظام کے ذمے ہو جاتی ہے) (20:118)۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 449 تا 450)

3 سکھوں کا دھرم شالہ



کر ہو جاتا ہے مندر میں ہو جاتا ہے یہ عیسائی گرجوں میں کر لیتے ہیں یہودی اپنے صومعہ میں کر لیتے ہیں۔ اگر اپنا ہی اطمینان کرنا ہے تو یہ تو بھنگڑ اور ملنگ اپنے ہاں سوٹے<sup>1</sup> لگا کر بھی کر لیتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہ زندگی کا عملی ضابطہ ہے۔ یہ الحجۃ یہاں سے اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بیع و خرید کا معاملہ یہاں ہوتا ہے۔ خدا نے انہیں اتھارٹی دے رکھی ہوتی ہے جو یہاں اس کا نظام نافذ کرتے ہیں۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ یَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ط قُلِ الْعَفْوَ (2:219) وہ پوچھتے ہیں کہ اس کے عوض میں وہ جو الحجۃ ملنی ہے اس کے لیے کتنا دیدیں اس کی کیا قیمت دیں؟ کہا کہ صرف اپنی دال روٹی کے لیے رکھ لو اور باقی جو سارا کچھ ہے اس کے عوض دیدو۔ پھر اس کے بعد انہیں بتانا چاہیے تھا کہ وہ Actually (حقیقت میں) کیسے دیدیں؟ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) ضرورت سے زیادہ جو کچھ ہے اسے دے دو۔ لہذا پکی بات ہو گئی اب یہ ذہنی چیز نہ رہی زندگی کی ٹھوس حقیقت بن گئی۔ عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ اس کے عوض وہ نظام کیا دیتا ہے؟ کہا کہ وہ (اس دنیا میں) ”الحجۃ“ دیتا ہے۔ آخرت کی جنت پہ ہمارا ایمان ہے اور وہ حقیقت ہے لیکن وہ جنت یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اس الحجۃ کی پہلی چیز ہے اور اس نظام کی یہ وہ جنت ہے جس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2:38) کسی قسم کا خوف اور حزن باقی نہیں رہتا۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ قرآن کی یہ آیت بنیادی چیز ہے۔ اس میں امن مل جاتا ہے۔ لفظ امانت اور ایمان کا تو مادہ ہی امن (امن) ہے۔ یہی آیت ہے جس میں کہا ہے کہ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ<sup>2</sup> (9:111)۔ پھر وہ مال کیسے دیتے ہیں؟ کہا کہ اس طرح ان سے وصول کر لو۔ اس کے بعد جہاں تک جان کا معاملہ ہے تو اس کے متعلق یہ کہا ہے کہ يُفَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (9:111) جب وقت آ جاتا ہے پھر وہ سر بکف کفن بدوش میدانِ جنگ میں آ جاتے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد حق کی حمایت کے لیے جانیں ہتھیلی پہ ہوتی ہیں پھر یا تو وہ لڑتے لڑتے وہیں جان دیتے ہیں یا بطور غازی واپس لوٹتے ہیں۔ یہاں آپ نے یہ دیکھا کہ وہ جو Actually (حقیقت میں) جان امانت تھی وہ انہوں نے کیسے دی۔

## حاکم اور رعایا کا قرآنی مفہوم

یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں معاہدے (Contract) کی بات کہہ رہا تھا کہ یہ ایک Contract Theory (نظریہ میثاق) ہے۔ اس مملکت کا نظام اس میثاق کے نظریے پر قائم ہوا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ادھر یہ کہا ہے کہ تم یہ کچھ جو ضرورت سے زائد ہے دیدو۔

1 کش لگانا

2 اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 449)

اب اس ”دیدو“ کے اندر بھی ایک بڑی چیز موجود ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسے بھی یہاں ہی واضح کر دینا چاہیے یعنی یہ جو ہمارے ہاں ”رعایا“ کا لفظ ہے اسے انگریزی زبان میں Subject کہتے ہیں۔ اس لفظ میں زیادہ ”استبداد“ ہے۔ یہ جسے Subject کہتے ہیں یہ مستبد زمانے کا لفظ ہے یہ استبداد کے زمانے کی باتیں ہیں Subject (رعایا) کا یہ لفظ ہی حکومت میں آتا ہے جب کہ قرآن یہ لفظ استعمال ہی نہیں کرتا۔ وہ میثاقی نظام کے تحت ان دو میں (یعنی رعایا اور حاکم میں) فرق ہی کچھ نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ کچھ یہ لوگ ہیں جو وہ ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیتے ہیں جو خدا نے اپنے اوپر لی ہوئی ہیں۔ مثلاً خدا نے یہ ذمہ داری لی ہوئی ہے کہ وَ مَا مِنْ ذَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11:6) کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا کے اوپر نہ ہو۔ تو یہ ذمہ داری براہ راست تو پوری نہیں ہوتی۔ یہ جو خدا کے نظام کو نافذ کرنے کے لیے یہ ایک مملکت قائم ہوتی ہے حکومت قائم ہوتی ہے یہ ذمہ داری وہ اپنے سر لے لیتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو ہر بار دہرائی جاتی ہے۔

حضرت عمر ♦ (581-644/45AD) کا وہ قول ہے کہ ”دجلہ کے کنارے کوئی کتابھی بھوک سے مر گیا تو مجھ سے اس کا بھی مواخذہ ہوگا۔“ یہ انہوں نے اپنے اوپر خدا کی وہ ذمہ داری لی ہوئی ہوتی ہے۔ خدا تو براہ راست وہ ذمہ داری پوری نہیں کرتا یہ لوگ وہ ذمہ داری پوری کرتے ہیں۔ میں اسے پھر دہرا دوں کہ وہ جو حضرت عمر ♦ (581-644/45AD) کے اس قسم کے اقوال ہیں وہ قیامت تک کے لیے مشعلِ راہ ہیں: جتنی بھی نظام مملکت اور حکومت کی ذمہ داریاں ہیں یہ اقوال ان کے لیے راہنما اصول ہیں۔ ان کے ہاں کی وہ مشہور چیز ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ میں خلیفۃ المسلمین امیر المؤمنین یا نظم و نسق کا سربراہ ہوں تو کیا تمہیں پتہ ہے کہ میرا فریضہ کیا ہے؟ میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ جب میں نے پہلی دفعہ اسے دیکھا تھا یقین مانے کہ میں بالکل چکرا گیا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ انہی کی سمجھائی ہوئی بات پھر سمجھ میں آئی۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ میرا فریضہ یہ ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک نہ پہنچنے دوں۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیا کہا؟ آپؐ نے فرمایا: ٹھیک ہے کہ دعائیں اس وقت ہی خدا سے مانگو گے جب تمہارا کوئی کام رکا ہوا ہوگا اور اگر وہ کام یہیں ہو جائے تو پھر وہاں درخواست دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ قرآن نے اور صحبت نبویؐ نے وہ کیا لوگ پیدا کر دیئے تھے عزیزانِ من! اور آگے یہ کہا کہ بھائی! یہ بات بھی سن لو کہ خدا تک تمہاری دعا کے پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ میرے خلاف وہ تمہاری شکایت ہوگی کہ میں نے یہ کام پورا نہیں کیا، ہمیں وہاں اوپر جا کر اپیل کرنی پڑی۔ ارے بابا! خدا کے لیے مجھے معاف کرو۔ ایسی صورت تو نہ پیدا ہونے دو! آکر مجھ سے کہا کرو خدا تک جانے کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی کہ میں ایسے حالات پیدا ہونے دوں۔“ لہذا ”میرا تو منصب یہ ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک نہ پہنچنے دوں، یہیں ان کا معاملہ صاف کر دوں۔“ میرے خدا! یہ تھی وہ Theory of Social Contract (نظریہ میثاق

معاشرت) عزیزان من! یہ تھا وہ معاہدہ جو کر رکھا تھا۔ انہوں نے خدا کی طرف سے یہ معاہدہ (Contract) پورا کرنا تھا۔ اب یہ عہد سینے۔ میں اس آیت کو سامنے لے آیا ہوں جس میں کہا تھا کہ خدا نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کی جان اور مال۔ کیوں؟ اس لیے کہ **بَانَ لَهُمُ الْجَنَّةُ** <sup>①</sup> (9:11)۔ ان سے یہ عہد (Contract) کیا۔ یہ جان و مال انہوں نے جنت کی زندگی کے عوض دے دی۔

### امانات لوٹانے کا قرآنی مفہوم

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس آیت **وَالَّذِينَ هُمْ لَا مُنْتَهِيَهُمْ وَعَهْدُهُمْ رَاعُونَ** (23:8) اور یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں (Contracts) کا پاس رکھا۔ اس آیت میں لفظ ”امانت“ دیدیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ بس ٹھیک ہے دیدیا ہے۔ جی اے ہن تہاڑا ہویا۔ <sup>②</sup> قرآن تو مال و جان ان کے پاس بطور امانت رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنا معاہدہ (Contract) پورا نہیں کرتے تو انہیں اس میں سے ایک پائی بھی لینے کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ یہ تو امانت تھی۔ وہ یہ معاہدہ (Contract) پورا کریں گے تو اس وقت اس میں سے کچھ لے سکیں گے جو انہیں دیا ہے۔ ان لوگوں کی طرف سے یہ جو امانتیں ان کے پاس آئی ہیں یہ ان امانتوں کی حفاظت کریں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ ان امانتوں کی کیسے حفاظت کریں گے؟ کہا کہ وہ جو ان کے ساتھ معاہدہ کیا تھا یہ اس معاہدے کو پورا کرتے چلے جائیں گے۔ میثاق کی قرآنی Theory (نظریہ) کے تحت ایک ذمہ داری (Responsibility) کو پورا کرنے سے ایک حق Establish (ثبت) ہوتا ہے Approve (منظور) ہوتا ہے۔ اس وقت کسی کا حق صحیح معنوں میں Right (حق) بنتا ہے جب وہ پہلے اس ذمہ داری کو پورا کرے۔ انہیں مومنین کے جان و مال کو لینے کا حق نہیں پہنچتا، تاوقتیکہ یہ اپنے اس عہد (Contract) کو پورا نہ کر دیں۔ یہ جان و مال لے کر رکھتے ہیں تو امانت کے طور پہ لے کر رکھتے ہیں۔ حضرت عمر ♦ (581-644/45AD) نے دیکھا کہ ایک یہودی آ رہا ہے۔ آپؐ نے کہا: کہاں جا رہے ہو؟ یہودی تھا، غیر مسلم تھا، کہنے لگا: جی! وہ جو مملکت کا Due (واجب الادا) ہوتا ہے وہ خزانے میں دینے جا رہا ہوں۔ کہنے لگے: یہاں تم کب آئے تھے؟ اس نے کہا: جی وہ کچھ دن ہوئے ہیں ابھی حال ہی میں آیا ہوں۔ فرمایا کہ ابھی جب اس حکومت نے تمہارے لیے کچھ کیا ہی نہیں ہے تو اس حکومت کو تم سے کچھ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ پہلے یہاں سال بھر رہو اور جب یہ تمہارے لیے اتنا کچھ کر دیں گے تو اس کے بعد پھر جا کر یہ Due (واجب الادا) دینا۔

① اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص-449)

② کہ بس اب یہ تمہارا ہوا۔

عزیزانِ من! جب (عربوں نے) ملک<sup>①</sup> فتح کیا ہے تو وہاں کے اعتبار سے ان لوگوں سے جزیہ لینا تھا۔ یہ جسے آپ جزیہ کہتے ہیں، اور جسے اب اتنا بدنام کر دیا ہے، اس کے تو معنی ہوتے ہیں: ”ان کی جان و مال، عزت اور آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری کے سلسلہ میں ان سے کچھ لینا“۔ اس لیے ان کو کہا جاتا تھا کہ اس کے معاوضے میں کچھ تھوڑا سا خرچہ وغیرہ ادا کرو۔ اس چیز کو ٹیکس کہنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ دراصل وفاداری کی علامت (Symbol) کے طور پر ان سے کچھ تھوڑے سے پیسے لیے جاتے تھے جو زیادہ سے زیادہ بارہ روپے سال کے ہوتے تھے۔ اب جب یہ ملک<sup>①</sup> فتح ہوا تو انہوں نے ان کی سال بھر کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وہاں چھاؤنی ڈال دی۔ چھ ہی مہینے کے بعد اس چھاؤنی کو وہاں سے اٹھ کر کہیں دوسری جگہ چلے جانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ یہ عیسائی تھے اور اس سے پہلے بھی یہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد بھی عیسائیوں کی یعنی بازنطینیوں کی حکومت پھر اسی طرح سے مسلط ہو جاتی تھی۔ ان مسلمان مجاہدین کی اس واپسی پر وہ عیسائی باشندے رورہے تھے ان کا پلا پکڑ رہے تھے کہ خدا کے لیے نہ جا بیٹے عیسائی پھر آ جائیں گے لیکن انہیں بتایا گیا کہ ہمیں تو بہر حال جانا ہے اور جاتے وقت انہوں نے وہ سال بھر کا جولیہ ہوا تھا، لیکن چھ مہینے کے بعد یہ واپس گئے تھے تو ان کا جو آدھا تھا، یہ کہتے ہوئے ان کو واپس دیدیا کہ جب ہم تمہاری حفاظت ہی نہیں کریں گے تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم سے کچھ لیں، یہ تو ہمیں اس وقت حق پہنچتا ہے جب ہم اپنے عہد کو پورا کریں۔

برادرانِ عزیز! یہ کچھ امانت اور عہد (Contract) کے متعلق ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ لہذا یہ الفاظ جن کو ہم یونہی سمجھتے رہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ بھئی! کوئی امانت تمہارے پاس رکھ جائے تو اس میں خیانت نہ کیا کرو، اسی طرح واپس دیدیا کرو اور جب کسی سے وعدہ کیا کرو تو پورا کیا کرو۔ یہ بات اتنی سی نہیں ہے۔ یہ تو بہت آگے جانے والی بات ہے۔ اب آپ یہ دو الفاظ (امانت اور عہد) دیکھیے کہ ان کے اوپر کتنی بڑی عمارت استوار ہو رہی ہے۔

اس پورے نظامِ مملکت کی آیت کے الفاظ آپ نے سن لیے۔ کہا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111)۔ خرید لیتا ہے خدا مؤمنین سے ان کی جان اور مال۔ اس کے معاوضے میں ان سے عہد کرتا ہے کہ ہم تمہیں جنت دیدیں گے۔ جنہوں نے یہ بیچا، اس آیت میں اس کی عملی شکل بتادی۔ یہ نہیں ہے کہ ذہنی طور پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بیچ دی جان بھی، اور مال بھی۔ کہا کہ واقعی جب وہ وقت آتا ہے تو وہ میدانِ جنگ میں جان دینے کے لیے آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اب

① بازنطین (روم)۔ اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء، ص

اس عہد (Contract) کا دوسرا حصہ رہ گیا۔ خدا کے ذمے جو عہد قرآن کریم نے کہا تھا، عزیزانِ من! سنئے وہ عہد کیا ہے۔ یہاں وہ لفظ آیا ہے۔ دیکھیے یہ لفظ کہاں آتا ہے۔ کہا کہ **وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ** <sup>1</sup> (9:111)۔ خدا سے زیادہ بہتر عہد پورا کرنے والا کوئی نہیں۔ ہم نے تم سے کہا کہ ہم وہ عہد پورا کریں گے لہذا ان لوگوں سے یہ کہہ دو کہ وہ اپنا ضرورت سے زائد مال اور جان اس سودے کے عوض ہمیں دے دو۔ جان تو بہر حال ایک دن جانی ہی ہے اب تم نے یہ دیدیا ہے تو یہ یقین رکھو کہ **وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ** (9:111)۔ خدا نے یہ عہد کیا ہوا ہے اور خدا سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا تو کوئی اور نہیں ملے گا۔ جب صورت یہ ہو جائے کہ جان و مال کی ریاتی چھوٹی سی قیمت دیں تو اللہ یہ عہد پورا کرے کہ انہیں اس کی طرف سے الجتہ ملے اور جس کی طرف سے یہ عہد (Contract) ملے اسی کی طرف سے یہ یقین دہانی بھی کرائی جائے کہ اس سے زیادہ عہد پورا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کتنا اچھا سودا ہے!

عزیزانِ من! انہی الفاظ کے فوراً بعد کہا کہ **فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ** (9:111) تم اپنے اس سودے پر جشن مناؤ جو تم نے کر لیا ہے۔ عزیزانِ من! میں Contractual Theory of Quran (میشاق نظریہ قرآن) پر ہی آرہا ہوں۔ Theory (نظریہ) کے اعتبار سے تو اس <sup>2</sup> نے واقعی بہت بڑی بات کہی لیکن اس نظام اور قرآن کریم کے اس نظام میں فرق ہے۔ یہ جو ان کی طرف سے اس نظام کو یا حکومت کو دینا ہوتا ہے آپ وہ بھی بات چھوڑ دیجیے آپ دیکھیے کہ پچھلے درس میں **خَاشِعُونَ** (23.2) کا لفظ آیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ ان قوانین و احکام کی پابندی دل کا تقاضا ہو جائے، تمہارا یہ عمل بطیب خاطر ہونا چاہیے۔ اطاعت کے لفظی معنی یہ ہوتے ہیں لیکن اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ یہ نظام یا حکومت تو یہ سب کچھ وصول کر لے مگر اس کے عوض اس نے ان کے ساتھ جو Promises (وعدے) کیے ہوئے ہیں، معاہدے (Contracts) کیے ہوئے ہیں، وہ پورے نہ ہوں تو پھر اس سودے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کہ اچھا! پھر ہم بھی کچھ کوشش کریں گے کہ اس میں کچھ تھوڑا بہت ڈنڈی ماریں۔ یہ جو حکومت کے ٹیکس کہتے ہیں کہ ”صاحب! قاعدے قانون کے مطابق یہ بنتا ہے اور پھر اس سے نکلنے کے ہزار طریقے نکالتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ طریقے یہ لوگ کیوں نکالتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے سودے پہ **تَوْفَا سَتَبَشِّرُوا** (9:111) تمہیں جشن منانے چاہئیں۔ اس قسم کے سودے میں یہ سوگ کیوں منارہے ہیں کہ ادھر جو ان کی قیمت تھی، وہ تو ادا کر دی گئی، وصول کر لی، اور وہ جو ادھر سے معاہدہ کیا تھا، عہد کیا تھا، وعدہ کیا تھا، وہ پورا نہیں ہو رہا۔

<sup>1</sup> اس عہد (Contract) کا پورا کرنا اللہ نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کوئی نہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 450)

<sup>2</sup> ہابز (Hobbes: 1588-1679)۔ اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء، ص 350 اور 351 کے فٹ نوٹ 3 اور 1 (ص 351)

اب آپ نے غور فرمایا کہ جو کچھ انہوں نے ان کو دیا تھا، اسے قرآن نے ”امانت“ کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا ہے؟ کیوں وہ ان کے پاس امانت کے طور پر رہ سکتا ہے؟ یہ اس لیے کہ معاہدہ پورا کرو تو پھر اس پہ تمہاری یہ مشیت یا حق Establish (ثبت) ہو جائے گا، تم As of Right (بطور حق) نہیں لے سکتے۔ یہ کچھ تمہارے نظام مملکت سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارا بھی Right (حق) اس صورت میں Approve (منظور) ہوگا جب تم وہ جو معاہدہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے، جس میں تمہاری Obligations (فرائض) ہیں، Responsibilities (ذمہ داریاں) ہیں کہ ان کو پورا کرو اور عزیزان من! پھر جب یہ صورت ہو جائے کہ اتنا سادے کراتنا کچھ مل رہا ہو اور اتنا یقین ہو کہ جو معاہدہ ہوا ہے وہ یقیناً پورا ہو کے رہے گا اور پورا ہوتا چلا جائے گا تو اس سے زیادہ جشن مسرت کا مقام دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ پھر میں یہ بتا دوں کہ مولانا<sup>1</sup> کا وہ شعر فوراً ذہن میں آ جاتا ہے۔ جب نیلام ہوا تو زلیخا نے یوسف خرید لیا۔ مولانا<sup>1</sup> اس میں کہتے ہیں۔ سہیلیوں نے پوچھا کہ کتنے میں خریدا؟ اس نے کہا: کیا پوچھتی ہو، اُس کے مقابلے میں کہ میں نے اس کے لیے کتنا دیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ زلیخا نے کہا کہ:

دراہم چند دادم جاں خریدم

تعالی اللہ عجب ارزاں خریدم

اور کچھ تھوڑے سے چاندی کے سونے کے یادہات کے، سکے جمع کر کے، ان کے عوض میں نے جان خرید لی، خدا کی قسم! یہ تو میں نے آج بڑا ہی سستا سودا کیا ہے۔ ان سے کہو کہ وہ کہیں کہ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمْ (9:111) تم اس سودے پر خوش ہو جاؤ۔ اللہ کی قسم! بڑا سستا خریدا ہے۔ اس معاشرے میں، عزیزان من! جو کچھ نظام خداوندی کو دیا جاتا ہے تو ادھر سے جو کچھ اس کے عوض میں ملتا ہے اس پر ہر شخص محسوس کرتا ہے: ”بڑا ہی سستا سودا تھا۔“

خدا تعالیٰ کی طرف سے نظام ربوبیت کا وعدہ جماعت مومنین کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے

عزیزان من! اب پھر سورۃ المؤمنون کی 8 ویں آیت پر آ جائیے۔ اس کے دو الفاظ یہ آئیے: وَالَّذِينَ هُمْ لَا مُنْتَهٰی لَہُمْ وَعٰہِدِہُمْ رَٰعُوْنَ<sup>2</sup> (23:8)۔ یہ دو الفاظ ”امانات اور عہد“ ہیں۔ مومنوں کی جماعت، ان کا معاشرہ، ان کا نظام، ان کی مملکت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ امانات اور اپنے معاہدوں کی بڑی پاسداری کرتے ہیں۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ یہ بات انفرادی طور پر کسی کے ساتھ

1 مولانا نور الدین عبدالرحمن جامی اور ان کی مثنوی کا نام ہے: مثنوی یوسف زلیخا۔

2 یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا (4:58) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 774)

وعدہ کر کے یا امانت رکھ کے واپس دینے کی نہیں ہے۔ یہ تو ایک بہت بڑا نظام حکومت ہے اور نوع انسانی کو قرآن یہی کچھ سکھانے کے لیے آیا تھا۔ وہ تو اقوامِ عالم کو مخاطب کرتا ہے کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ نظام حکومت کیا ہوتا ہے۔ خدا کے متعلق متعدد مقامات میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (3:9) وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ وہ اپنے ہر وعدہ کو پورا کرتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ جب خدا یہ کہتا ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے تو مذہب میں آ کر تو اس کے وعدہ کے پورا ہونے یا کرنے کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! بات بڑی سیدھی سی ہے لیکن گستاخی معاف، مثلاً یہ کہ اگر ہم کہیں کہ خدا نے کہا ہے کہ ہر جاندار کے رزق کا ذمہ ہمارے اوپر ہے یعنی خدا کے اوپر ہے تو آج کے حالات کے مطابق بھی دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی رات کو بھوکے سوئی ہوئی ہے اور جب قحط پڑتا ہے تو ایک ایک قطرے کے اندر لاکھوں کی تعداد میں لوگ بھوک سے مر جاتے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ جب یہ کچھ کہا گیا ہے تو پھر کہاں ہے خدا کا وہ وعدہ؟ وہ ذمہ داری؟ خدا کی یہ ذمہ داری کیسے پوری ہوتی ہے؟ اس ذمہ داری کے پورے کرنے کا طریق وہ ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ لہذا اگر اسے دین کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ذمہ داری کیا ہے۔ دراصل وہ جماعت، وہ لوگ جو خدا کے نام پر اسلامی نظام کا لفظ استعمال کرنے کے بعد اس نظام کو متشکل کرتے ہیں، وہ قرآنی نظام حکومت کی ساری ذمہ داریاں اپنے اوپر لیتے ہیں۔ یعنی اس طرح وہ ذمہ داریاں جو خدا نے اپنے اوپر لے رکھی تھیں، وہ ان کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہیں اور جنہیں ہم خدا کے Dues (واجب الادا تو م) کہتے ہیں وہ ان کو ادا کرنے ہو گئے، یہ معاہدہ ان کے درمیان ہوگا۔ لہذا جس طرح یہ کہا گیا ہے کہ خدا اپنا وعدہ ہمیشہ پورا کرتا ہے کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا، اسی طرح یہ جو نظام ہے اس کے اوپر ذمہ داری عائد ہو جائے گی کہ وہ کوئی معاہدہ، کوئی وعدہ ایسا نہ کرے جس کی وہ خلاف ورزی کرے۔ جو نبی وعدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے، عزیزانِ من! سارا بھروسہ Confidence ٹوٹ جاتا ہے۔ انفرادی طور پر کبھی کوئی شخص آپ سے وعدہ خلافی کرے تو آپ دیکھیے اس کے بعد کبھی آپ اس کا اعتبار ہی نہیں کرتے۔ جو اعتماد ہے اس کی بنیاد اس پر ہے کہ آپ کو یقین ہو کہ یہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ یہ اعتماد جو اس قسم کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کبھی ایسا نہیں کرے گا، اسے عربی زبان میں ”توکل“ کہتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہاں تو آؤے گا آواہی بگڑا ہوا ہے۔ قرآن کا کوئی لفظ بھی لائے، قرآن کی کوئی اصطلاح بھی لائے، اس کے بعد دیکھیے کہ اس کا کیا مفہوم باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح توکل کا لفظ جس میں کہتے ہیں کہ توکل بخدا بیٹھے ہیں صاحب اللہ توکل کرؤ جی۔ عزیزانِ من! توکل اس بھروسے کو کہتے ہیں جو اس طرح سے حاصل ہو کہ اس نے جو کہہ دیا ہے، وہ ضرور کرے گا، یقین ہے مجھے اس پر اور جب یہ آپ کو کسی کے اوپر بھروسہ یا توکل ہو جائے کہ یقیناً یہ ایسا کرے گا اور پھر جو آپ کے ذمے ہوگا، آپ بھی بطیب خاطر وہ کچھ کریں گے تو یہ نظام یوں قائم ہوگا اور اس طریق پر امانت اور عہد دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔ یعنی اس طرح یہ جو دیتے ہیں اور وہ جو لیتا ہے، وہ بطور امانت لیتا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ اپنا عہد (Contract) پورا

کرتا چلا جاتا ہے۔

### خدا تعالیٰ سے بھی اس کے کیے گئے وعدہ کے متعلق پوچھا جاسکتا ہے

عزیزانِ من! قرآن حکیم کی کون سی آیات ہیں جو ابھراؤ نکھر کر اس کی شہادت نہیں دیتیں۔ لاریب یہ خدا کا ہی کلام ہے، یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ جب اس نے خدا کے متعلق کہہ دیا ہے کہ ہم اپنا عہد (Contract) پورا کرتے ہیں تو اس کا سوال ہی نہیں کہ ہمیں اس میں ذرا سا بھی شبہ گزرے کہ وہ اپنا عہد پورا نہیں کرے گا۔ بہر حال اس کے باوجود اس کی یقین دہانی کے لیے سنیے کہ خدا تعالیٰ نے کیا کہا؟ لیکن اس کے لیے پہلے تو ذہن میں یہ رکھیے کہ ہمارے ہاں خدا کے متعلق تصور یہ ہے کہ اس سے تو کسی بات کے متعلق پوچھا ہی نہیں جاسکتا، وہ تو کسی قاعدے قانون کا پابند ہی نہیں۔ اس لیے اللہ الصمد<sup>①</sup> (112:2) کا ترجمہ ”اللہ بے نیاز ہے“ کیا جاتا ہے بلکہ الصمد کے معنی ہوتے ہیں: بے پرواہ، یعنی وہ لا پرواہ! اوتھے کہیے پرواہ! اوتھے بے پروائیاں، پھڑ لئے عملاں والیاں نوں چھڈ دیئے اوگن ہارنوں<sup>②</sup>۔ جیہو جئے اتھے ساڈے نظام اوہو جیا اوتھے اسی تے خدا نوں عرش تے بٹھا رکھیا ہویا اے<sup>③</sup> تو اس (خدا) سے تو پوچھا ہی نہیں جاسکتا۔ یقیناً یہ بات اس کے برعکس ہے اس کا جو واقعی مقام ہے، ہم جب اسے دیکھیں اس پر ہمارا ایمان ہو کہ وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرے گا، تو اس سے پوچھنے کا سوال ہی نہیں ہے لیکن آپ یہ دیکھیے کہ وہ اپنے متعلق کیا تصور دیتا ہے؟

عزیزانِ من! یہ ہے وہ آیت جو میں کہہ رہا ہوں۔ کہا کہ جب وہ الجحہ کا وعدہ کرے گا جو اس نے تمہیں دی ہوئی ہے تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ لَہُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ (25:16) جو آرزو ہوگی پوری ہوگی، جو خواہش ہوگی پوری کی جائے گی، جو مانگو گے وہ ملے گا۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اور آگے ہے کہ كَانَ عَلَى رَبِّكَ وَعْدًا مَسْئُولًا (25:16) یہ وہ وعدہ ہے کہ اگر بفرض محال پورا نہ ہو تو

① اس کے مکمل مفہوم و تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006 (سورۃ الاخلاص - 112 ویں سورۃ)

راقب کا یہ شعریوں ہے:

② اوتھے کہیے پرواہ! راقب اوتھے بے پروائیاں پھڑ لئے عملاں والیاں نوں چھڈ دیئے اوگن ہارنوں

(اے راقب! خدا بڑا بے پرواہ ہے۔ اس کی بے پروائیوں کا عالم یہ ہے کہ وہاں نیلو کار پکڑے جاتے ہیں اور گنہگار چھوٹ جاتے ہیں) (حوالہ پرویز: کتاب التقدير ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) لاہور 1986، ص 332)

③ اس کے ہاں کوئی پرواہ نہیں ہے، وہ بے پرواہ ہے، کوئی قاعدہ قانون نہیں ہے۔ جیسے یہاں ہمارا نظام ہے ویسا ہی وہاں ہے۔ ہم نے تو خدا کو عمل سے عاری عرش پہ بٹھا رکھا ہے۔



تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ تم نے یہ وعدہ کیا تھا، وہ کیوں پورا نہیں کیا؟ ”تم خدا سے یہ پوچھ سکتے ہو!“ میں نے کہا کہ یہ جو اس طرح خدا کے متعلق مفہوم آتا ہے، وہ سمٹ کر اس دنیا میں خدا کے نام پہ نظام قائم کرنے والوں کے ذمے آتا ہے تو ان کا ہر یہ وعدہ مسئول ہوتا ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا یہ اس لیے کہ یہ قرآن کے تصور کے مطابق ہے۔ آئین<sup>1</sup> یا نظام کے مطابق جسے Sovereign Authority (اقتدار مطلق) کہتے ہیں وہ یہی ہے، وہ خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ Constitution (آئین) کی اصطلاح کے مطابق یہ Sovereign Authority یا Sovereignty (مطلق اقتدار) وہ ہوتی ہے جس سے پوچھا نہ جاسکے جو ہو Accountable to none (کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو)۔ یہ Sovereignty (مطلق اقتدار) اس کی ہوتی ہے۔ By Definition (تعریف کی رو سے) وہ کسی کو Accountable (جواب دہ) نہ ہو اس نے کسی کو حساب نہ دینا ہو، کوئی اس سے پوچھ نہ سکے۔ ہمارے ہاں تو یہ Sovereignty (مطلق اقتدار) ایسے ہی بکس میں ہے جس طرح ہم خط کے اوپر 786 لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے آئین میں یہ چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو چیز ہے کہ اس سے سوال نہیں کیا جاسکتا، پوچھا نہیں جاسکتا، صحیح نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ كَانَ عَلَى رَبِّكَ وَغَدًا مَّسْئُولًا (25:16) خدا بھی جو وعدہ کرتا ہے، اگر بفرض محال وہ پورا نہ ہو تو اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کیوں پورا نہیں ہوا؟ غور فرما رہے ہیں کہ عَهْدِهِمْ رَاعُونَ<sup>2</sup> (23:8) کے کیا معنی ہوئے؟ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ بات تو دو طرفہ ہے؟ بیع و ثریٰ کا سودا دونوں طرف سے ہوتا ہے اور دونوں طرف سے وہ شرائط پوری کرنا ہوتی ہیں۔ یہاں ایک طرف ”امانت“ کہا ہے اور دوسری طرف ”عہد“ کہا ہے۔ دوسرے مقام پہ دونوں ہی طرف سے ”عہد“ کہا ہے کہ تم کچھ دینے کا عہد کرتے ہو، ہم بھی اس کے عوض ”کچھ دینے کا عہد“ کرتے ہیں کہ ہم یہ کچھ تمہارے لیے کریں گے۔ یہ تمہارے Rights (حقوق) ہو گئے اور یہ ہماری Obligations (فرائض)۔ تم عہد کرتے ہو تو یہ تمہاری ذمہ داریاں ہو گئیں۔ اب دیکھیے کہ وہ شرط کس طرح رکھی ہوئی ہے؟ اَوْفُوا بِعَهْدِيْ اَوْفِ بِعَهْدِكُمْ (2:40) تم اپنا عہد پورا کرتے چلے جاؤ اور ہم اپنا عہد پورا کرتے چلے جائیں۔ اب خدا کی طرف سے عہد کا پورا کرنا مشروط ہو گیا کہ ادھر سے جو بھی عہد ہے، اس کی پابندی کی جائے گی۔ جو نہی دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی کی طرف بھی یہ بات آگئی کہ اس نے عہد کو پورا نہیں کیا، تو سودا کٹ گیا۔ اس سودے کا نام ہی ایمان ہے۔

1 آئین کی قرآنی تفصیل کے لیے دیکھیے:

Parwez, G.A: Quranic Constitution in an Islamic State Compiled by Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque (2000). Lahore: Idara Tolu-e-Islam (Regd)

2 وہ اپنے معاہدوں (Contracts) کا پاس رکھتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ نظام جو کچھ ان سے وصول کرتا ہے، یہ کہتا ہے کہ وہ اسے امانت کے طور پر اپنے پاس رکھتا ہے۔ اب یہ جو چیزیں امانت کے طور پر اپنے پاس رکھتا ہے، تو ان کے عوض یہ تمہارے Rights (حقوق) پورے کرے گا۔ اس لیے کہا ہے کہ ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اس عہد (Contract) کو پورا کریں گے۔ ہم سے جب ایک عہد پورا ہوتا ہے تو اس کے عوض میں جو کچھ بطور امانت لیا ہوا ہوتا ہے پھر وہ ہماری ملکیت میں آسکتا ہے پھر وہ ہمارا ہو سکتا ہے اس سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ اب دیکھیے کہ کیسے جامع اور حسین الفاظ ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ (4:58) خدا تمہیں یہ حکم دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ کیا حکم دیتا ہے؟ وہ حکم دیتا ہے کہ اَنْ تُوَدُّوا الْأَمْنَتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (4:58) یہ جو چیزیں انہوں نے تمہیں بطور امانت دی ہوئی ہیں ان کے مالک وہی رہتے ہیں۔ جب تم اپنا ایک عہد پورا کرتے ہو تو اس حصے تک ان کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ تمہاری طرف آتی ہے۔ اس کو کہا گیا ہے کہ امانت کو لوٹا دینا۔ عہد پورا کرتے چلے جاؤ تو یہ امانت جو انہوں نے تمہارے پاس رکھی تھی یہ پوری ہوتی چلی جائے گی۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ امانات کو جو ان کے اہل ہیں ان کی طرف لوٹاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ امانات کو کیسے لوٹاؤ؟ میں نے کہا ہے کہ قرآن کوئی چیز محض نظری (Theoretical) یا Academic (تعلیمی) نہیں رکھتا۔ وہ تو انسانی زندگی کے نظام کا ضابطہ ہے۔ جو عملی زندگی (Practical Life) ہے اس میں اس کا نفاذ ہونا ہے۔ کیسے لوٹاؤ؟ سنئے! وہ کیا حکم دیتا ہے؟ اس طرح کہ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (4:58) جب ان کے معاملات کے فیصلے کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ پہلی چیز یہ ہوگئی۔ اور دوسری طرف ان سے یہ کہا کہ یہ نظام وہ ہے جو عدل کے ساتھ ہر معاملے کا فیصلہ کرے گا۔ میں اگر قرآن کے عدل کی Definition (تعریف) یا تشریح میں جاؤنگا تو دوسری طرف نکل جاؤنگا۔ دوسرے درس میں یہ چیز عرض کرونگا کہ عدل کیا ہوتا ہے۔ جب وہ یہ کچھ کریں تو اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ<sup>1</sup> (4:59)۔ یہ عدل (Justice) کرو۔ لہذا جب بھی کسی معاملے میں تمہیں کوئی اختلاف ہوا کرے تو فوراً ”اللہ اور رسول“ کی طرف رجوع

1 اے جماعت مؤمنین! تم اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو جسے قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے رسولؐ نے قائم کیا ہے اور اس نظام کے مرکز کے مقرر کردہ نمائندگان حکومت (افران ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان افسران ماتحت میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس کے لیے مرکز کی طرف رجوع کرو۔ یعنی افسران ماتحت کے فیصلوں کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو جو اس معاملے کا قوانین خداوندی کے مطابق فیصلہ کر دے گی۔ (42:10) مرکزی اتھارٹی کے فیصلہ کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ اس کا فیصلہ آخری ہوگا اور چونکہ وہ فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق ہوگا جس پر تم ایمان رکھتے ہو اس لیے اس فیصلے کو بطیب خاطر تسلیم کرو۔ اس کے خلاف دل میں بھی کوئی گرائی محسوس نہ کرو (4:65) (پرویز: مفہوم القرآن ص-197)

کیا کرو؟ ان کے فیصلے کی اطاعت کیا کرو۔ اب یہ ان کے فیصلے کی جو اطاعت ہے، وہ ان کے اوپر لازم آئی۔ وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ یہ فیصلے عدل کے ساتھ کریں گے۔ پھر وہی عہد اور امانت کا جو قصہ تھا وہ آپ کے سامنے آگیا، یعنی امانت میں خیانت نہ کرنے کی بات ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمْنِيَكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** (8:27) اے جماعتِ مؤمنین! یہ خدا کے نام پر جو نظام قائم ہوا ہے اس کے قوانین کو احکام کو نافذ کرنے کے لیے اسے جو کچھ تم نے سونپنا ہے اس کی سپردگی میں دینا ہے اس میں خیانت نہ کرنا۔ اسے یاد رکھو۔

### نظامِ ربوبیت کی تشکیل کے دوران کچھ مشکل گھاٹیوں کا ذکر

اب سوال یہ ہے کہ خیانت کی طرف مائل کرنے والی چیزیں کیا ہیں؟ یہ قرآن ہے، یہ کوئی بھی چیز ادھوری یا مبہم یا ذمہ داری نہیں، اسے وہیں کا وہیں صاف کر دیتا ہے۔ کہتا ہے یاد رکھو! اس راستے میں کچھ تھوڑی سی رکاوٹیں آئیں گی۔ اس میں دو چار ذرا سخت مقام آتے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ وہ پھسلنی گھاٹیاں ہیں جہاں انسان لغزش کھاتا ہے۔ کہا کہ **وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ** (8:28) یاد رکھو! لغزش کی یہ گھاٹیاں اولاد اور مال و دولت کی ہوس ہے۔ یہ لغزش کی گھاٹیاں بنا کرتی ہیں۔ یہ انسانوں کو خیانت پر مائل کرتی ہیں اس بات کا بہت خیال رکھنا۔ اب اس طرح، عزیزانِ من! یہ جو مملکت، سلطنت، حکومت بنتی ہے، اور خداوندی نظام کی حکومت ہے، یہ ملتی کیسے ہے؟ ایک تو چنگیزی<sup>1</sup> انداز سے ملتی ہے۔ وہ چنگیزی انداز کیا ہوتا؟ یہ دھاندلی کا لفظ تو ہمارے ہاں عام ہے۔ کبھی کسی نے کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں کہ دھاندلی کے معنی کیا ہیں؟ ایک بات جب کسی مسلمہ قاعدے اور قانون کے مطابق کی جائے، وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کوئی بھی قاعدے قانون مقرر کیے جائیں یہ الگ بات ہے۔ جب آپ نے ان کو **Accept** (قبول) کر لیا ہے تو جو چیز اس کے مطابق کی جائے وہ باقاعدہ ہو جائے گی، جو اس کی خلاف ورزی میں کی جائے اسے بے قاعدہ یا لا قانونیت کہیے۔ اسے آجکل کی اصطلاح میں دھاندلی کہتے ہیں۔ سلطنتیں بھی جب دھاندلی سے حاصل کی جاتی ہیں، تو اسے چنگیزیت کہتے ہیں۔ کسی قاعدے قانون کے مطابق نہیں، قوت کے بل بوتے پہ۔ قوت کا تو یہ ہے کہ جس کے پاس کم قوت ہو، وہ کمزور ہو جاتا ہے۔ زیادہ قوت والا اپنی بات منوالیتا ہے۔ یوں جب مملکت حاصل ہوتی ہے تو اس کے لیے اصطلاح ہے جسے چنگیزیت کہا ہے۔

① اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء، ص 310 (فٹ نوٹ 2)

## علامہ اقبال کے نزدیک چنگیزی کا مفہوم

عزیزانِ من! اس دھاندلی کی وضاحت کے لیے اقبالؒ (1877-1938) نے یہ اصطلاح استعمال کی ہے جو بڑی صحیح ہے کہ

جدا ہودیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

نہیں جی! پھر پہلا مصرع بھی تو سن لیجیے کہ اس میں بات اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ شخصی حکومت ہو، ملوکیت ہو۔ یہ وہ ہے جو آپ کے اپنے ذہن میں نہیں ہے:

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہودیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جب قاعدہ اور قانون الگ ہو جائے اور پھر جب ہم دین کہیں گے تو قاعدہ اور قانون تو وہ ہوگا جو خدا کا مقرر کیا ہوا ہو اور جب وہ الگ ہو جائے تو پھر باقی دھاندلی رہ جاتی ہے۔ آپ کی زبان میں ترجمہ یوں ہو گیا: یہ چنگیزی قسم کا نظام ہے۔ لہذا قرآن اس طرح حاصل کی ہوئی مملکت کو دھاندلی قرار دیتا ہے اس کو فرعونیت سے تعبیر کرتا ہے۔

خدا اپنا وعدہ یا اپنا عہد کس طرح پورا کرتا ہے؟

کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ نظام مملکت جسے نظام خداوندی یا قرآنی مملکت کہا جاتا ہے کیسے حاصل ہوتی ہے؟ اس کے لیے (24:55) ایک بڑی مشہور آیت ہے۔ اسمیں کہا ہے کہ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (24:55) خدا نے صاحبِ ایمان اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔ اب اس آیت میں خدا کا وہی معاہدہ وہی عہد وہی وعدہ آگیا۔ خدا کے وعدے کے معنی ہوتے ہیں کہ اگر یہ چیز یوں ہو جائے تو یقیناً وہ بات پوری ہو جائے۔ اسی کو عزیزانِ من! سمجھنے کی اصطلاح میں قانون (Law) کہا جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہے میں نے کئی دفعہ قانون کی یہ Definition (تعریف) آپ کو بتائی ہے۔ یہ مسلمہ Definition (تعریف) ہے۔ جسے آپ (قانون) Law کہتے ہیں، جنہیں Laws of Nature (قوانینِ فطرت) بھی کہتے ہیں تو ان کے لیے آپ کے ذہن میں آتا ہے کہ اگر آگ جلاؤ گے تو پانی گرم ہو جائے گا، اتنے درجے تک کی (Heat) (گرمی) ہو جائے گی تو جوش مارے گا یعنی ابل (Boil) جائے گا۔ یہ کوئی ہنگامی بات نہیں ہے کہ کبھی یہ کچھ ہو جائے اور کبھی نہ ہو۔ جب بھی ایسا کرو گے یہ ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہوگا۔ آپ کو یاد ہے اور آپ نے وہ الفاظ بھی لکھ رکھے ہونگے جو اسکی Definition (تعریف) کے لیے کہے جاتے ہیں: if یعنی اگر یہ کرو گے then یعنی پھر یہ ہوگا اور Always یعنی یہ ہمیشہ ایسا ہوگا۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ خدا کا یہ وعدہ

ہے کہ ”یہ کرو گے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ یہ ہو جائے گا“ تو یہ ہے قانونِ خداوندی کا ترجمہ۔ عزیزانِ من! یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ قانونِ خداوندی یہ ہے کہ اگر تم آگ جلا کر اس کے اوپر پانی رکھ دو گے تو گرم ہو جائے گا۔ جب بھی ایسا کرو گے ایسا ہو جائے گا: وَلَكِنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا<sup>①</sup> (48:23) اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ عزیزانِ من! وہاں Law (قانون) ہوتا ہے۔ Law (قانون) کے بعد آرڈیننس (Ordinance) نہیں ہوتا۔ یہ Law (قانون) غیر متبدل ہے اسی لیے کہا کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ<sup>②</sup> (6:34)۔ اس کا Law (قانون) کیا ہے؟ کہا کہ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (24:55)۔ ایمان یہ ہو کہ یہ جو خدا کے قوانین ہیں اس کی طرف سے جو عائد کردہ شرائط ہیں ان کی صداقت پر تمہیں یقین محکم ہو پورا پورا بھروسہ ہو نیز وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (24:55) یہ یقین محکم ہو کہ جب بھی آگ جلائی پانی رکھا، وہ گرم ہو جائے گا۔ پھر کہا کہ اس کے بعد آگ بھی تو جلاؤ پانی بھی تو اوپر رکھو۔ یہ جو اگلی چیز ہے اُسے عملِ صالح کہتے ہیں۔ یہ اس قانون کا عملاً نتیجہ برآمد کرنے کے لیے ضروری ہے لیکن مذہب میں صرف یہ ہوتا ہے کہ ”چولہا دی ہوندا اے تے لکڑیاں وی ہوندیاں نیں تے دگچی وی اتے رکھی ہوندی اے۔ ماچس نہیں ہوندی او ناں کول“<sup>③</sup>۔

جب بھی تم ایمان کے بعد یہ چیز کرو گے تو کیا ہوگا؟ اس کیلئے کہا کہ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ (24:55) ان سے خدا کا عہد ہے کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (24:55) ہم انہیں اس دنیا میں اس زمین پر استخلاف، تمکن، مملکت، حکومت، سلطنت، جو بھی نام رکھ لو عطا کریں گے۔ ان کو یہ کچھ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں دیں گے۔ چنگیزیت نہیں محض کمزور کود با کر نہیں قوت کے بل بوتے پہ نہیں بلکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ<sup>④</sup> ہوگا۔

میں نے کہا ہے کہ قرآن کی کوئی بھی بات سامنے لائیے خواہ ہمارے ہاں اس موجودہ معاشرے میں ہو یا موجودہ مذہب کے اندر ہو تو پھر وہاں کوئی بھی اصطلاح اور کوئی بھی ایسا لفظ نہیں ہے جس کا ہم نے مفہوم نہ بدلا ہو۔ یہی کچھ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ کے معنوں میں ہوا۔ اس ”خلافت فی الارض“ کے معنی وہ خلافت نہیں ہے جو ہمارے ہاں ذہن میں آگئی ہے یعنی خلافتِ راشدہ۔ وہ تو چلی گئی۔ اب یہ خلافت کیسی؟ آپ نے کبھی پڑھا ہوگا کہ جو حضرت صاحب ہیں وہ تشریف لے گئے یا ان کی زندگی میں ہی فلاں کو انہوں نے

① خدا کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 1200)

② خدا کا قانون اٹل ہے۔ اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 293)

③ چولہا بھی ان کے پاس ہوتا ہے لکڑیاں بھی ہوتی ہیں چولہے کے اوپر رکھی ہوئی دگچی بھی ہوتی ہے مگر ان کے پاس دیا سلائی نہیں ہوتی۔

④ انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے۔

اپنا مجاز یعنی خلیفہ مقرر کر دیا: تمہیں خلافت دیدی گئی ہے۔ اس دور میں جب یہ خلافتیں یوں بٹا کرتی تھیں، تو تین مملکتوں کی خلافتیں تو آپ کے اس ایک درویش<sup>1</sup> کے پاس بھی تھیں لیکن کوئی زمین نہیں، روحانیت کے عالم میں ہے۔ رہن نون مکان وی ہے نہیں۔ گورنمنٹ کو آرٹر ایج رینڈے نیس<sup>2</sup>۔ اب یہ خلافت روحانیت کی طرف بدل گئی، ذہنی ہوگئی۔ وہ عطا کرنے والا، روز اپنے دو دوتین تین خلیفے بناتا چلا جاتا ہے۔ خلافت مل گئی لیکن قرآن تو بھاگے نہیں دیتا۔ میری بچی نے پوچھا تھا کہ کچھ اس خلافت کے متعلق بھی تو کہو۔ تو میں نے کہا تھا کہ یہ تو زمین پہ نہیں تھی، یہ عالم روحانیت میں ہوتی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ لَیْسَتْ خُلَفَئُهُمْ فِی الْأَرْضِ (24:55) اس زمین میں حکومت عطا کریں گے۔

عزیزانِ من! اپنے آپ کو فریب نہ دے لینا۔ انہیں پتہ تھا جو کچھ وہ پہلے کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ مملکت یہ تھی مگر ہمارے ہاں وہ بے ملک نوابی خلافتیں مل رہی ہیں اور رہنے کے لیے مکان تک بھی نہیں ہے۔ اس زمین پہ تو کچھ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالباً کچھ کرنے کے لیے انہوں نے حجام کو بھی خلیفہ کہنا شروع کر دیا۔ ”اے تے الگ بات ہے۔ اوناں اپنی خلافت چھڈ کے ہیئر کنگ سلون بنادتا۔ لیکن اوتے نائی ہوندا سی۔ اوناں خلیفہ کیندے ہوندے سی۔ اوساڈا بڈھانا نائی ہوندا سی امام بخش۔ اسی اوناں خلیفہ کیندے ساں۔ سانوں تین خلافتاں سن۔ اوخلیفہ ای نہیں سانوں کہن دیندا سی: نہ کسی نہ لئی، نہ کسی نے دتی، اوتاں وراثت وچ ملی<sup>3</sup>۔ قرآن کہتا ہے کہ لَیْسَتْ خُلَفَئُهُمْ فِی الْأَرْضِ (24:55) ہم انہیں اس زمین پر حکومت عطا کریں گے اور پھر یہ بات اس ذہن میں آجائے گی کہ یہ اسی طرح ہوگی کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (24:55) جس طرح پہلی اقوام کی اس دنیا میں مملکتیں، سلطنتیں، حکومتیں ملی تھیں، یہ بھی اس طرح کی حکومت اس زمین پر ملے گی کہ جس کی کئی ایک مثالیں تاریخ میں پہلے سے موجود ہیں۔ لہذا یہ ہے وہ مملکت جسے کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ کہا اور مزید کہا کہ وَلَیْمَكْنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی (24:55) یعنی جب مملکت اپنی ہوگی تو پھر وہاں دین کا تمکن ہوگا۔ وہ مملکت یہ تھی۔

① یہ اشارہ پرویز کا اپنی ہی طرف ہے۔

② رہنے کو مکان نہیں، صرف گورنمنٹ کو آرٹر میں رہتے ہیں۔

③ یہ تو الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنی ”خلافت“ چھوڑ کر ہیئر کنگ سلون بنالیا، مگر وہ تو حجام ہوتا تھا۔ اسے خلیفہ کہا کرتے تھے۔ وہ ہمارا بوڑھا حجام امام بخش ہوتا تھا۔ ہم اسے ”خلیفہ“ کہتے تھے۔ ہمیں تین خلافتیں تھیں مگر وہ ہمیں یہ ”خلیفہ“ نہیں کہنے دیتا تھا: وہ خلافت تو اس نے نہ کسی سے چھینی، نہ کسی سے لی، نہ کسی نے دی، وہ تو محض وراثت میں ملی تھی۔

## علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے نزدیک مملکت کے حصول کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ وہ بنیادی آیت ہے جس کی بناء پر تحریک پاکستان میں ہماری ان کے ساتھ جنگ ہوا کرتی تھی۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے یہ نظریہ پیش کیا اور پھر قائد اعظم محمد علی جناحؒ (1876-1949) ہمیشہ یہ چیز پیش کیا کرتے تھے کہ قرآن کی رو سے دین کا تمکن تو ”استخلاف فی الارض“ کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ غیروں کی حکومت میں تو دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا بات تھی اس جنگ کی! عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں کہ جب ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں جو تمکن فی الارض حاصل ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے! اس نتیجے کی پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ وَلَيَسِدْلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (24:55) وہاں ہر قسم کا خوف ختم ہو جاتا ہے، امن نصیب ہو جاتا ہے۔ یہی تو ایمان کا نتیجہ ہے، یہی تو امانت کا نتیجہ ہے جس کو امن کہا ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ تمکن فی الارض اس لیے ضروری ہے۔ اس کے فوراً بعد اب پھر وہی یَعْبُدُوْنَنِي (24:55) کا لفظ آ گیا۔ یہ ایک اصطلاح پھر آ گئی جس کا ترجمہ عبادت سمجھ لیا، اس کو پرستش کہہ دیا۔ یعنی تاکہ یہ میری عبادت کر سکیں، اور پھر عبادت کے معنی ہو گئے، پرستش۔ اب سوال یہ ہے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ کے لیے اپنی مملکت کی ضرورت کیا ہے؟ یہی تو ہمارے خلاف وہ دلائل پیش کیا کرتے تھے کہ صاحب! قرآن نے کہا ہے کہ تاکہ ”تم میری پرستش کر سکو“ تو وہ تو یہاں ہو رہی ہے ہندوؤں کی مملکت کے اندر ہو رہی ہے، کر رہے ہیں۔ ہم انگریز کے زمانے میں بھی کر رہے تھے۔ صاحب! اس کے لیے تو الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ تھی وہاں لڑائی۔ وہ کہتے تھے کہ اس کے لیے اپنی مملکت کی ضرورت نہیں، لیکن عزیزانِ من! اگر یَعْبُدُوْنَنِي قرآن سے پوچھیے تو اس کے معنی یہ ہیں ”تاکہ وہ صرف میری حکومت اختیار کر سکیں“۔ لہذا ظاہر ہے کہ وہ تو اپنی ہی مملکت کے اندر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اس مملکت کا تو مقصود ہی یہ ہے کہ یہاں صرف خدا کی حکومت اختیار کی جائے اور یہ اس طرح کی جائے کہ لَا يُشْرِكُوْنَ بِیْ شَيْئًا (24:55) انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ اگلے الفاظ ہیں عزیزانِ من! وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَاُولَئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (24:55) یہ سب کچھ قرآن میں آنے کے بعد سمجھنے کے بعد کر چکنے کے بعد بھی جو اس سے انکار کر جائے تو اس سے بڑا فاسق کوئی نہیں ہو سکتا ہے!

## قرآنی نظریہ میثاق کی بنیاد پر قائم ہونے والی مملکت کا حاصل

عزیزانِ من! آپ کے سامنے دو ٹکڑے آ گئے۔ ایک ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لَا مٰنِيَّتِهِمْ وَعٰهَدِهِمْ رَاعُوْنَ (23:8) اور وہ یہ ہیں، جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا۔ جماعتِ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس کی بنیاد Theory of Social Contract (سماجی نظریہ میثاق) پر ہے۔ قرآن کے الفاظ میں نظریہ میثاق کے اوپر بابِ نظم و نسق اور ان لوگوں میں معاہدہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جن کے ساتھ وہ یہ کچھ معاہدہ کرتے ہیں تو یہ مملکت خدا کے احکام و قوانین و اقدار کو قائم و نافذ کرنے

کے لیے ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے جان و مال اس غرض کے لیے ان کے پاس بطور امانت رکھ دیتے ہیں۔ وہ ان سے معاہدہ (Contract) کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں (Responsibilities) خدا نے لی تھیں ان کے عوض میں وہ سب ہم پوری کریں گے اور اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ<sup>1</sup> (2:38)۔ خوف (Fear) بیرونی خطرات کو کہتے ہیں اور حزن (Anxiety) وہ ہوتا ہے جو دل کے اندر ہر وقت ایک دھڑکا لگتا ہے۔ یہ چیز ہوتی ہے کہ اکثر اوقات تو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ تو کچھ یوں ہوتا کہ

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں  
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

وہ تسکینِ خاطر بھی اسی قسم کی ہوتی ہے اس پہ بھروسہ نہیں ہوتا۔ حزن (Anxiety) کے اندر یہ کیفیت ہے: ”مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے“۔ یہ حزن کہلاتا ہے۔ غلط معاشرے کے اندر غیر شعوری طور پر فضا میں ایسے اثرات ہوتے ہیں کہ بظاہر آپ کو اس وقت کوئی خطرہ نہ بھی محسوس ہوتا ہو پھر بھی آپ محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ کوئی خطرہ ہے اور جب Actually (حقیقت میں) محسوس طور پر وہ خطرہ پیدا ہو جائے تو وہ ”خوف“ ہوتا ہے اور جب یہ چیز Anticipatory (متوقعانہ) ہوگئی یعنی یہ ہوگئی کہ پتہ نہیں کچھ چیز ہے کہ ”نا معلوم کیا ہو“ تو یہ ”حزن“ (Anxiety) ہوتا ہے۔ سو قرآن حکیم نے پہلی چیز یہ بتائی تھی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2:38) خوف بھی نہیں اور حزن بھی نہیں۔ یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! اس نظام میں جہاں ایک طرف Contract (ميثاق) کی ایک پارٹی ہے عوام اپنی ان چیزوں کو بطور امانت اس کے سپرد کر دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ پارٹی اس کے معاوضے میں ان کے Rights (حقوق) پورے کرنے کا عہد اور معاہدہ کرے کہ وہ ان کے ساتھ اپنے اس عہد کو پورا کرتے چلے جائیں گے تو یہ ہے سارا قصہ۔ وہ نظام حکومت یہ ہے وہ اسلامی نظام یہ ہے۔ یہ ہے مملکت کا وہ نقشہ جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ میں خود Theory of Social Contract (معاشرتی نظریہ ميثاق) کے دینے والے ان لوگوں<sup>2</sup> کی قدر کرتا ہوں کہ وہ تنہا عقل کے زور پر فکر کے زور پر مطالعہ کے زور پر بھی اس نتیجے پر پہنچے۔ یہ بڑی چیز تھی لیکن یہ نظریہ ميثاق آگے جا کر فیل ہو گیا۔ وہ نہیں چل سکا کیونکہ یہ کچھ تو انہوں نے نظری طور پر (Academically) لے لیا، لیکن یہ عملاً کیسے تشکیل

1 ان کے لیے نہ خوف ہوگا نہ حزن

2 ان لوگوں کے نام اور تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء ص 351، 350 کے فٹ نوٹ 3 اور 1 (ص 351)



پائے گا، وہ کونسے جذباتِ محرکہ ہونگے جو ان کو یہ سب کچھ دینے پر آمادہ کریں گے؟ دوسری طرف ان سب کو اس عہد کو پورا کرنے کے لیے کیسے آمادہ کریں گے؟ انہیں یہ جذباتِ محرکہ کہیں نہیں ملے اور پھر یہ چیزیں میکانیکی طور پر بھی نہیں ہو سکتیں۔ اسی لیے جمہوریت 'اقبال' (1877-1938) کے الفاظ میں، محض تماشہ بن کر رہ گئی۔ تماشہ بھی نہیں بلکہ:

دیوانستہ جمہوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

[اقبال: بانگ درا (سلطنت)]

## قرآن حکیم پیکر کی تبدیلی کے لیے جذبہ محرکہ عطا کرتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو چیز ہے کہ صرف پیرا ہن بدلتا ہے، اس میں پیکر نہیں بدلتا، اس کے لیے قرآن وہ جذباتِ محرکہ دیدیتا ہے جن سے یہ چیزیں دل کا تقاضا بن جاتی ہیں۔ دل کے تقاضے کی مثال میں نے یہ دی کہ پیاس لگتی ہے تو پانی پینا آپ کے دل کا تقاضا ہو جاتا ہے جب تک وہ پورا نہ کریں اس تقاضے کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ اتنی سی بات ہے کہ ایک چیز قانونی طور پر حاصل کر لی جائے اور اس میں نفسیاتی تغیر نہ ہو تو نیا قانون مکینکی طور پر کبھی چل ہی نہیں سکتا۔ قانون تو صرف ان استثنائی چیزوں کے لیے ہوتا ہے تاکہ ایسے لوگوں کے لیے جو مختلف طریق سے سوسائٹی کے لیے خطرہ بن رہے ہیں، اس قانون کے تحت یہ سوسائٹی ان کے ہاتھوں سے محفوظ رہے۔ لہذا اس قسم کے لوگوں کے لیے قانون ہوتا ہے ورنہ تمام معاشرے کا پورا نظام ان جذباتِ محرکہ پر چلتا ہے جو اس کے اندر ہوتے ہیں۔ اس لیے امانات اور عہد کی یہ چیز ہے کہ اس کی پوری پوری رعایت برتنا پاسداری کرنا۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ **الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ**<sup>1</sup> (23:2)۔ صلوٰۃ ان تمام فرائض کے لیے جامع اصطلاح ہے جو خدا کی طرف سے عائد کیے جاتے ہیں۔ کہا کہ ان فرائض منصبی کی ادائیگی دل کے جھکاؤ کے ساتھ کرنا۔ یہاں مومنوں کی چار پانچ خصوصیات بتائی ہیں۔ اس کے بعد آخر میں کہا ہے کہ **وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ**<sup>2</sup> (23:9)۔ یہاں صلوٰۃ کہا ہے اور جمع کے صیغے میں بھی کہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جتنی چیزیں ان کے ذمے عائد کی جاتی ہیں، یہ ان کی محافظت کرتے ہیں۔

① وہ دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ خدا کے قانون کے پیچھے پیچھے چلتے رہے یعنی اسکی رو سے جو فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں انہیں بطیب خاطر سرانجام دیتے رہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 773)

② (مختصر یہ کہ کامیابی و کامرانی کی زندگی ان کی ہے) جنہوں نے خدا کے مقرر کردہ نظام صلوٰۃ کی پوری پوری محافظت کی۔ یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں اُن کا قدم قانونِ خداوندی کے اتباع میں اٹھا۔ (24:41)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 774)

یہ پوری کائنات بطور عطیہ انسان کو مل سکتی ہے لیکن جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

آپ نے اس آیت یعنی (23:9) میں یہ دیکھا کہ یہ ”یما فظون“ کی چیز ہے یعنی یہ ان کی محافظت کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ**<sup>①</sup> (23:10)۔ اب پوچھتے ہو کہ جنت کس کو ملے گی؟ تو سنو! **الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ**<sup>②</sup> (23:11) وہ لوگ فردوس کے وارث ہونگے اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا بات ہے ایک لفظ وارث کھدینے کی! اس کی جو وسعت ہے وہ سامنے آ جاتی ہے۔ کہا کہ یہ جنت یونہی رہنے کے لیے نہیں دیدی خیرات کے طور پر نہیں دیدی کرا یہ دار کی حیثیت سے نہیں دیدی کہ جب جی چاہے نکال دیا جائے۔ ان کو وارث بنادیا ان کو اس کا مالک بنادیا اب کسی کا احسان نہیں رہا۔

اس تصور کے مقابلے میں ہمارے ہاں وہ تصور ہے جس کے متعلق کئی دفعہ بات آچکی ہے کہ یہ جنت بخشش کے طور پر دی ہوئی ہوگی اور ہماری تو انتہائی دعا یہ ہوتی ہے کہ دعا کرو اللہ کسی طرح بخش دے یعنی بخشش ہو جائے جب قوم یہاں پہنچ جاتی ہے تو وہ اعمال کے بدلے میں کوئی چیز نہیں لیتی وہ خیرات پہ اتر آتی ہے۔ یہاں بھی ہم خیرات مانگتے پھرتے ہیں۔ انفرادی طور پہ بھی اور اجتماعی طور پہ بخشش ہی مانگتے پھرتے ہیں۔ یہاں سے آگے جانے کے بعد اللہ کے ہاں سے بھی وہ جنت بخشش کے طور پہ مل جائے۔ وہ کہتا ہے کہ ہاں بھی! وہ جو جنت خیرات کے طور پر بخشش کے طور پر اس سے لیتا ہے وہ تو باعثِ ذلتِ انسانیہ ہے اگر اعمال کا فطری نتیجہ ہے تو وہ یہ جنت ہے۔ اس لیے اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ یہ باہر کی چیز نہیں ہے بلکہ تیرے خون جگر کا نتیجہ ہے:

جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

عزیزانِ من! قرآن کریم کی آیت میں یوں آیا ہے کہ **الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ**<sup>③</sup> (23:11)۔ انہیں وارث بنادیا۔ اگر کسی کو خیرات میں کچھ دے کر اس سے کہدیا جائے کہ اچھا بھئی! میں یہ کچھ واپس نہیں لوں گا اسے یہ جائز جائیداد میں بھی دیدی جاتی تو کیا یہ وراثت اس طرح سے ملی جس طرح قرآن نے کہا ہے؟ عزیزانِ من! یہاں **الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ** (23:11) آیا ہے۔ لفظ

① یہی وہ لوگ ہیں جو زندگی کی سعادتوں اور کامرانیوں کے وارث ہوں گے۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 774)

② یعنی اس دنیا میں بھی ایسی زندگی کے مالک جس میں ہر طرح کی وسعتیں اور فراخیاں، سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں اور آخرت میں بھی اسی قسم کی زندگی کے وارث۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے (72:43:43:7)۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 774)

③ اس دنیا میں بھی ایسی زندگی کے مالک جس میں ہر طرح کی وسعتیں اور فراخیاں، سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں۔ اور آخرت میں بھی اسی قسم کی زندگی کے وارث۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 774)

”یرثون“ فعل ہے۔ یعنی یہ وہ ہیں جو اس کے مالک بنیں گے۔ وہ یونہی نہیں بنا دیئے جائیں گے۔ پہلے تو یہی چیز لیجئے کہ وہ کیسے مالک بنیں گے؟ کیا انہیں جنت کا قبضہ دے دیا جائے گا اور وہ اندر چلے جائیں گے؟ کہا کہ نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔ انہیں آواز دی جائے گی کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنا دیئے گئے ہو اور یہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (7:43) تمہارے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔ ہم نے تو کچھ بھی نہیں دیا۔ اس میں تو وہ اپنا بھی احسان نہیں رکھتا حالانکہ وہ اتنے بڑے احسانات کا مالک ہے۔ جنت جیسی چیز کا وارث قرار دیتا ہے آواز دیتا ہے کہ یہ جنت بھیک کے کلڑے نہیں ہے۔ یہ ان کی محنت کا نتیجہ ہے خیرات میں نہیں ملی ہے۔ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنے ہو۔ کیسے بنے ہو؟ اس کے لیے کہتا ہے کہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (7:43)۔ ارے بھئی! یہ تو تمہارے اپنے ہی کاموں کا معاوضہ ہے جو تم نے کیے تھے اور یہ تمہیں اس کے بدلے میں ملی ہے۔ ہم نے تو اس میں کچھ نہیں دیا۔ یہ ہے: الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ ۖ<sup>①</sup> (23:11)۔ جنت کا لفظ عام طور پر قرآن میں آتا ہے مگر یہاں ”فردوس“ کا لفظ آیا ہے۔ ہے تو یہ جنت ہی! لیکن عربی زبان کی رو سے ”فردوس“ کے اندر وسعتیں اور فراخیاں آتی ہیں۔ عرب اسے ان معنی میں استعمال کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس لفظ میں وسعتیں اور فراخیاں، سر بلندیاں اور سرفرازیاں، سرسبزیاں اور شادابیاں، یہ ساری چیزیں ایک جگہ جمع ہوں تو اسے فردوس کہتے ہیں۔ عزیزان من! یہ تھا وہ عہد (Contract) جو خدا نے تمہارے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنْ لَّهُمُ الْجَنَّةَ (9:111)۔ جان اور مال ان کا خرید اور یہ جو انہوں نے دیا ہے تو اس کے بدلے میں اسکی قیمت کے عوض جو انہوں نے ادا کی چیز ان کی ہوگئی، ان کو جنت کا مالک بنا دیا۔

اس جنت کی تفصیل تھوڑی سی تشریح چاہتی ہے۔ معاف رکھیے گا، معلوم نہیں آپ احباب کہتے ہو گئے کہ میں آجکل وقت زیادہ لے لیتا ہوں۔ جی ہاں! یہاں یہ الفاظ آئے ہیں: هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ (23:11)۔ تمہیں پھر وہاں سے کوئی نہیں نکالے گا۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ ایک جنت مفت میں ملی تھی جو آدم کی جنت تھی؟ وہ عمل کے بدلے میں نہیں تھی۔ پھر یہ ہوا کہ ایک لغزش ہوئی جنت سے نکال باہر کیا، مگر یہ جو جنت ہے یہ اعمال کے بدلے میں ہے اور اس کے لیے کہا ہے کہ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ (23:11) تمہیں وہاں سے کوئی نہیں نکالے گا، تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔ یہ ہیں ان مومنین کی صفات و خصائص جو کامیابیوں کی زندگی بسر کریں گے۔ صفات و خصائص کی یہ چیزیں پہلے کہی گئی ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری چیزیں ہیں اس کے بعد کامیابیوں کی یہ کیفیت ہوگی۔ اب اگلی چیز یہ ہوئی کہ یہ بات صرف کھانے پینے تک ہی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں؟ اگر معاملہ کھانے پینے کا ہی تھا تو حیوان اور انسان میں فرق نہیں ہے۔

① اس دنیا میں بھی ایسی زندگی کے مالک جس میں ہر طرح کی وسعتیں اور فراخیاں، سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں۔ اور آخرت میں بھی اسی قسم کی زندگی کے وارث۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 774)

عزیزانِ من! اگلی آیت میں یہ بات تمہیں بتائیں گے کہ یہ بات انسان کے متعلق ہو رہی ہے انسان اور حیوان میں فرق کیا ہے کہ انسان کی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں ہے۔ یہ حیوانی زندگی کے مراحل طے کرنے کے بعد منزل انسانیت میں پہنچا ہے اور اب انسانی زندگی کے مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ پھر تمہیں یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ یہ نظام کیوں ضروری تھا اور یہ جنت ہوتی کیا ہے؟ یہ بات اگلی آیت میں ہمارے سامنے آئے گی۔

عزیزانِ من! سورۃ المؤمنون کی آیت 11 تک ہم آئے 12 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



## چوتھا باب: سورۃ المؤمنون (آیات 12 تا 14)



عزیزانِ من! آج مئی 1977ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 12 سے ہو رہا ہے: (23:12)۔

للہ الحمد قریب ایک ماہ کے نانغہ کے بعد تجدیدِ درس کا ہمیں پھر موقع ملا۔ 17 اپریل کی اتوار کو آخری درس ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ جو ملک میں سیاسی ہنگامے برپا ہوئے ان کی وجہ سے حالات سازگار نہ رہے، ہمیں بھی درس کو معطل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس کے لیے کہوٹکا کہ اجازت پہلے سے لے لی تھی لیکن کرفیو کے حالات ایسے تھے کہ اس میں صبح کے وقت یہاں اکٹھا ہونا مشکل تھا بلکہ بعض اوقات ناممکن تھا۔ اس لیے مجبوراً اس سلسلے کو ملتوی کرنا پڑا۔ یوں تو اب گنتی میں آیا تو چار ہی درس نانغہ ہوا یا ایک ماہ لیکن وہ جو (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1797-1869) نے کہا تھا کہ ”شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں“ تو اس نانغہ سے جو احساسِ محرومی تھا اس کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پتہ نہیں کتنے عرصے کے بعد پھر یہ سلسلہ شروع ہوا۔ احباب اس دوران میں جس کرب و اضطراب کے ساتھ اس کے متعلق دریافت کرتے رہے اس سے مجھے احساس ہوا۔ وہ نہ بھی ہوتا تو خود دل پہ جو گزری وہ تو میں ہی جانتا ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ پھر

ہم آج جمع ہوئے ہیں۔

آج مئی کی 22 تاریخ ہے اور یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ ایسی آیت پہ درس کا آغاز ہو رہا ہے جو درحقیقت دین اور سیکولر ازم میں ہی نہیں بلکہ انسان اور حیوان میں بھی خط امتیاز ہے۔ بڑی اہم چیز ہے، یوں تو کوئی چیز اہم نہیں ہے لیکن بعض چیزیں اپنے عقائد کے اعتبار سے بڑی ہی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

اس سورۃ کی پہلی آیات میں بتایا گیا تھا کہ مومن وہ ہیں جن کی یہ خصوصیات ہیں: لغو سے معترض رہتے ہیں، صلوٰۃ قائم کرنے والے ہیں، نوع انسانی کی نشوونما کی ذمہ داریاں لینے والے ہیں، جنسی اختلاط میں پابندیوں کو پورا کرنے والے ہیں اور جو امانات اور عہد ہیں ان کی رعایت رکھنے والے ہیں۔ ان آیات میں یہ چیزیں گنتائی گئی تھیں۔

### دین خداوندی اور سیکولر ازم کا بنیادی فرق

یہاں سے یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ جو خصوصیات بتائی گئی ہیں، یہ جو پابندیاں گنتائی گئی ہیں، وہ کیوں ضروری ہیں؟ حیوانات پر تو وہ پابندیاں ہیں جو فطرت نے ان کے اندر رکھ دی ہیں، جیسے میں ہر درس میں عام طور پر مثال دیا کرتا ہوں کہ بکری کے اوپر پابندی ہے کہ وہ گوشت نہیں کھا سکتی یعنی وہ اس کے لیے رزق حرام ہے اس کے لیے تو اس کے اندر ایک ایسی پابندی ہے کہ وہ رزق حرام کھا ہی نہیں سکتی، شیر کے لیے وہی گوشت رزق حلال ہے، گھاس رزق حرام ہے، وہ رزق حرام کی طرف آ ہی نہیں سکتا۔ اگر انسان بھی اسی سطح کے اوپر ہے جس سطح کے اوپر حیوان ہوں تو اس کے لیے بھی حرام اور حلال کا کوئی فرق نہیں ہو سکتا، نہ ہونا چاہیے لیکن جن چیزوں کو پہلے گنایا گیا ہے قرآن میں تو ان دونوں میں فرق کیا گیا ہے۔ یہ جو فرق کرنے والی چیز ہے انہیں اقدار یا Values کہتے ہیں۔ حیوانات میں Values (اقدار) نہیں ہوتیں، یہاں Necessities (ضروریات) ہوتی ہیں، یہاں صرف ایک حیوان کی جسمانی پرورش کا سوال ہوتا ہے۔ اس کے لیے فطرت کی طرف سے اس کو قاعدے ضابطے دیئے گئے ہیں، یہ ضابطے ان کے اندر ہوتے ہیں۔ یہاں Value (قدر) نہیں ہوتی۔ جیسا میں مثال میں کہا کرتا ہوں ایک بھوکے بیل نے اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ وہ نکلتا ہے، اپنے مالک کے گھر سے سیدھا چلا جاتا ہے جو کھیت سامنے آتا ہے، اس میں اپنا منہ مارتا ہے، اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔ اس بیل کے لیے رزق حلال اور حرام کا سوال نہیں ہے۔ اس کے لیے پیٹ بھرنے کا سوال ہے۔ وہ چیز کہ وہ گھاس ہی کھا رہا ہے، یہ تو ایک چیز تھی جو اس کے اندر رکھ دی گئی تھی۔ گھاس کس کے کھیت سے وہ چر رہا ہے، حیوان کے درجے تک یہ تخصیص نہیں، یہ تمیز نہیں۔

## انسان کی خصوصیت صرف Values (اقدار) کی بنا پر ہے

وہ جو چیز ہے کہ اپنے ہی کھیت سے کاٹ کر کھائے، دوسرے کے کھیت سے نہ کھائے، اسے Value (قدر) کہتے ہیں۔ یہ الگ پیمانہ ہے جسے ہم قدر کہتے ہیں، اس کی جمع اقدار ہے Values اس کا ترجمہ کیا ہے جبکہ عربی زبان میں قرآن کریم ایک اگلی چیز بیان کرتا ہے، میں بتاؤنگا کہ اسے اقدار کیوں کہا گیا ہے۔ ماپنے کا پیمانہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ جو امتیاز کی چیز ہے کہ تم نے اپنے کھیت سے ہی کھانا ہے، اس کی اجازت کے بغیر یا آپس میں رضامندی کے بغیر دوسرے کے کھیت سے کاٹ کر نہیں کھانا، یہ Value (قدر) ہے۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے، حیوان کی نہیں۔ اب حیوان اور انسان کے اندر کونسا خط امتیاز ہے کہ وہ انسان ہے اور یہ حیوان ہے۔ تو ہم تو آسانی سے کہیں گے کہ ہمیں پتہ ہے کہ یہ حیوان ہے، یہ بکری ہے، یہ بیل ہے، یہ بھیڑ ہے اور ہم انسان ہیں۔ شکل و شباهت سے نظر آ جاتا ہے۔ سوال شکل و شباهت کا تو ہے نہیں۔ شکل و شباهت کے اعتبار سے تو آپ نے سینکڑوں انسان دیکھے ہونگے، جو حیوانات سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق کیا ہے؟

یورپ میں 19 ویں صدی میں یہ جو فزیکل سائنس یا ہیومن بائیالوجی وغیرہ والی سائنس ہے، وہ جو زوال و جی والی سائنس ہے، ان کے ذریعے قریباً 19 ویں صدی میں یہ وہاں تک آئے۔ یہ انسانیت کی بڑی بد بختی تھی کہ وہاں کی جو مذہبیت تھی، جو کلیسائی مذہبی پیشوائیت تھی، اُس نے ان پر زندگی تنگ اور گراں کر رکھی تھی۔ اس کا ایک رد عمل شروع ہوا۔

## انسان اور گدھے کی طبعی مشینری میں کچھ فرق نہیں

عزیزانِ من! اس کے بعد تو وہ جو کہتے ہیں کہ رسائڑا کر بھاگے، وہ واقعی رسائڑا کر بھاگے۔ بد قسمتی سے وہی وہاں سائنٹفک ریسرچ کا دور تھا۔ وہاں بھی انہوں نے انسان کے جسم کو چیرا پھاڑا، جیسے آج بھی یہاں میڈیکل کالج میں انسانوں کی جولاہ ہے، اس کی ٹکا بوٹی کرتے ہیں، چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہاں ایک پوسٹ مارٹم کالج ہے، وہاں انہوں نے میز پر ایک ”گدھا“ لٹایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ لڑکے انسان کی لاش کو چیر پھاڑ رہے ہوتے ہیں، وہ ”گدھے“ کی لاش کو چیر پھاڑ رہے ہوتے ہیں۔ ان دونوں نے اس کے اندر دیکھا کہ جو اس کے اندر ہے وہی کچھ اُس کے اندر ہے، یعنی اسی ترتیب کے ساتھ اسی نظام کے ساتھ ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ بڑا جانور ہے، تو اس کے بڑے اعضا ہونگے، چھوٹا جانور ہے، چھوٹے ہو گئے، لیکن یعنی دونوں میں انہیں ایک ہی چیز نظر آئی۔ تو اس تشریح یا اناٹومی سے یہ سائنسدان اس نتیجے پہ پہنچ گئے کہ صاحب! یہ تو انسان اور حیوان میں فرق ہی کچھ نہیں، دیکھ لو آ کر کوئی فرق ہے تو بتا دو، ہمیں فرق والی چیز دکھا دو۔ یاد ہے آپ کو شعر:

کسے بتائے کوئی خون آرزو کیا ہے  
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

(ریاض خیر آبادی)

انہوں نے وہاں رنگ و بو دیکھ کے فیصلہ کر دیا کہ انسان اور حیوان میں فرق ہی کوئی نہیں۔

انسان کو معاشرتی زندگی کی خاطر سوسائٹی کے قانون کی لازمی ضرورت ہوتی ہے

یہ جو وہاں سوشیالوجی والے تھے انہوں نے کہا کہ کیا کہتے ہو؟ یہاں مل جل کے رہنا ہے۔ یہاں اگر تم نے کہہ دیا کہ انسان اور حیوان میں فرق ہی کچھ نہیں ہے تو معاشی دنگل ہو گیا، پھر تو جینا محال ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس کے لیے سوسائٹی سے قوانین مقرر کر لینا، ان قوانین کی پابندی ان سے کراؤ بس۔ وہ جو چلا آتا ہے کہ

Man is a Social Animal<sup>①</sup>

وہ یہ چیز ہے کہ یہ ہے تو Animal (حیوان) ہی لیکن چونکہ اس نے سوسائٹی میں رہنا ہے، اس واسطے سوسائٹی کچھ قوانین مقرر کر لے۔ جس قسم کے قوانین وہ چاہیں مقرر کر لیں، مقصد یہی ہے کہ ذرا امن چین سے آپس میں رہیں، کوئی ہلڑ بازی نہ ہو، کوئی دھاندلی نہ ہو، کوئی تعدی نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ سوسائٹی کے Laws (قوانین) کے ذریعے باہمی امن قائم کیا جائے۔ انسانوں نے مل جل کے تو رہنا ہے، مگر ہیں یہ حیوان ہی۔ تو پہلی چیز تو سوسائٹی کے Laws (قوانین) کی آگئی۔ یعنی وہاں حیوان انسانوں کے اس مقام سے آگے چلا گیا کہ وہاں وہ بکری اس قانون سے تجاوز کر نہیں سکتی، خلاف ورزی کر نہیں سکتی جو اسکے لیے مقرر کیا گیا ہے اور یہاں جو حیوان شہروں کے اندر رہ رہا ہے جسے انسان کہا جا رہا ہے، قانون تو اس کے لیے بھی ہے لیکن اس کا جب جی چاہے اس کو توڑ سکتا ہے۔

انسان کا وقار تو قانون کے احترام ہی میں ہے

قرآن نے جو پہلے کہا تھا کہ اُولَئِكَ كَانُوا لِنِعْمِ اللَّهِ قَوْمًا (7:179) یہ انسان نہیں، حیوان ہے، وہیں کہا تھا کہ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) ان سے بھی بدتر ہے۔ وہ قوانین توڑ نہیں سکتا، یہ توڑ سکتا ہے۔ توڑتے وقت کیفیت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لیے کہا ہے کہ جاہل بھی ہے، ظالم بھی ہے۔ اس میں اور حیوان میں کچھ ذرا سا فرق پڑتا ہے۔ یہ اس چوراہے کے اوپر دائیں طرف جانے کے لیے کھڑا ہے اور بائیں طرف جانے سے اسے جس سڑک پہ جانا ہو وہ سائیکل پر ہو، اس کی سڑک اگر دائیں کو جانے والی سڑک سے ذرا پہلے آتی ہے اور وہ چکر ذرا بڑا ہوتا ہے، اسے دو پاؤں زیادہ مارنے ہوتے ہیں، تو ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ پہلے دیکھ لے کہ وہ لال گپڑی والا سپاہی تو

① انسان ایک سماجی حیوان ہے۔



نہیں کھڑا، اگر ٹوپی والا نہیں ہے تو وہ یوں دندناتا ہوا، سیٹی مارتا ہوا، قانون توڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ سوسائٹی کے Laws (قوانین) کو توڑنے کا جذبہ اس کے اندر ہوتا ہے۔ یہ تو میں نے چھوٹی سی مثال دی۔ یہاں قرآن نے کہہ دیا کہ مومن اپنے وعدے کے پابند ہوتے ہیں۔ وعدہ تو دو انسانوں کے درمیان ایسا ہوتا ہے کہ جن میں ایک قانونی گرفت بھی کوئی نہیں ہوتی، سوسائٹی میں بھی کوئی اس کے لیے قانون نہیں بنایا ہوا ہوتا۔ تو اگر سوسائٹی کا جو Law (قانون) ہے وہی صرف پابندی ہے تو وہ اس پر کیوں پابند رہے گا؟ تو کوئی بھی وعدے کا پابند آپ کو نہیں ملتا۔ اس نے کہا ہے کہ مومن امانات کی رعایت رکھتے ہیں۔ گھر میں بیٹھے ہوئے خاموشی سے دوسروں سے الگ، آپ کے پاس کوئی امانت رکھ دیتا ہے، جبکہ کوئی دوسرا دیکھنے والا بھی نہیں ہوتا، وہ امانات کی رعایت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی مکر جائے تو سوسائٹی کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو اس کو اپنی گرفت میں لے لے۔ لہذا ہم اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ یہ جنہوں نے انسان کو حیوان قرار دیا اور سوسائٹی کے Laws (قوانین) کو ہی پابندیاں قرار دیا تو سوسائٹی کے Laws (قوانین) منوانے کے لیے انہیں کس قدر تنگ و دو اور دردمول لینا پڑا ہے۔

### سوسائٹی کے غلط نظام کے باعث انسانی فکر کی ناکامی اور اس کی مشکلات

یہ کتنی بڑی سپاہ پولیس ہے، پھر وہ ریز پولیس ہے اور وہ جانباز ہے، پھر ان کے اوپر رینجرز ہیں، ان سے کام نہیں چلا، پھر وہ آرمی والے ہیں، وہ عدالتیں ہیں، وہ جیل خانے ہیں۔ یعنی اتنی بڑی آبادی نہیں ہوتی، وہ لوگ نہیں ہوتے جن سے قانون منوانا ہوتا ہے، جتنا ان منوانے والوں کی تعداد ہوتی ہے۔ اس کے باوجود سب سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں کہ صاحب! قانون نہیں مانے جاتے۔ یہ سوسائٹی میں جو کچھ ہوا ہے وہ عالمگیر ہے۔ اس وقت بھی ساری دنیا کے اندر قوانین توڑنے کی یہ چیز ہے، کہیں چھوٹے پیمانے پہ ہے، کہیں بڑے پیمانے پہ ہے۔ ”جہد ادا لگدا اے گھٹ کوئی نہیں کردا۔ تے گھٹ کون کردا اے“، ”عصمت بی بی از بیچارگی، جیہڑا کچھ کرن جوگا نہیں نا ہوندا۔“<sup>①</sup> یہ Situation (سماں) عالمگیر ہے۔ یہاں والے بھی چیخ رہے ہیں بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ کیا کیا جائے؟

### انسانی عقل کے نزدیک مصائب و آلام کا تجویز کردہ حل

کیا یہ کیا جائے کہ پولیس تھوڑی ہے، نفری اور زیادہ بڑھادی جائے؟ سربراہ مملکت ایک اور قسم کی بھی ریزرو فورس بنا لیتا ہے، آرمی کے اختیارات کچھ اور زیادہ کر دیتا ہے۔ ان کے لیے اسلحے بڑھادیے گئے۔ وہ دن رات اس میں غرق ہیں۔ کبھی کسی نے سوچا نہیں کہ اس

① جس کا داؤ لگتا ہے وہ اپنا کام کر گزرتا ہے، کمی کوئی نہیں کرتا۔ جو یہ کچھ کرنے کے لائق ہی نہیں ہوتا تو وہ بس عصمت بی بی از بیچارگی ہے یعنی وہ تو بس بے سرو سامانی کی وجہ سے پارسا بنا ہوا ہے۔

کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان کو حیوان تصور کیا گیا ہے وہ حیوان جس کے اندر روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے یہ حیوان سے بھی بدتر ہے۔ ارے اگر حیوان یہی تھا تو اس کے اندر کوئی چیز رکھ دی جاتی تو یہ سارا دردِ سر تو نہ ہوتا۔ ساری قیامت برپا ہوئی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک نقطے کے اوپر آ کر بات رکتی ہے۔ وہ ہے اصل چیز۔ اس بنیاد کو تو لیتے نہیں اور اس کے اوپر جو عمارت چلی جا رہی ہے ردے پر ردہ رکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہی ہے جو سعدی<sup>1</sup> نے کہا تھا: ”تاثریامی رود یوار کج“، یعنی اگر بنیاد کی اینٹ غلط رکھی گئی ہے آسمان تک وہ دیوار ٹیڑھی کی ٹیڑھی جائے گی۔ چلی جا رہی ہے یہ دیوار ٹیڑھی۔ اس بنیاد پہ نہیں آئے۔ آپ نے مسئلہ کی اہمیت کو دیکھ لیا کہ یہ مسئلہ یہ پر اہم کتنی بڑی ہے لیکن عام طور پر اس طرف نگاہ نہیں جاتی کہ یہ ہوا کیا؟

### انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل وحی کی روشنی میں موجود ہے

اب آئیے دیکھیں قرآن کیا کہتا ہے؟ یہ مقامات ہیں عزیزانِ من! جہاں قرآن کی عظمت سامنے آتی ہے۔ جسے معجزہ کہتے ہیں ساری دنیا عاجز آئی ہوئی ہے۔ اس وقت اس مسئلے کے حل میں تو معجزہ وہی ہوتا ہے جہاں انسانی عقل عاجز آ جائے اور وہاں وہ حل بتائے۔ قرآن کریم پیچھے سے اقدار (Values) دیتا ہوا چلا آ رہا تھا وہ انسانیت کا خاصہ جو میں نے ابھی عرض کیا۔ سوال یہ ہوا کہ یہ کونسا انسان ہے جس کا یہ خاصہ ہے؟ یہ ہے جسے ہم Values (اقدار) کہتے ہیں۔ اور پھر کہا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن میں ربط نہیں نظر آتا۔ یہ ٹھیک ہے ان بیچاروں کو ربط کیا نظر آئے گا؟ کہ جی پیچھے سے چلا آتا ہے کہ **هُم عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ** (23:9) اور **الَّذِينَ هُمْ لَا مُنْتَهِيَهُمْ وَعَهْدِهِمْ رُغْوَنَ** (23:8) اور اس کے بعد آیت آتی ہے کہ **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ** (23:12) انسان کو ہم نے مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔ ملا بیچارے کی سمجھ میں کیا بات آئے گی کہ صاحب! معاہدے عہد اور امانات، عصمت اور عفت سی ان خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد یہ کیوں کہا کہ انسان کو ہم نے مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا؟ ان میں ربط کیا ہے؟ یہ اسے نظر نہیں آ سکتا۔ ربط اسے نظر آئے گا جس کو یہ بات سمجھ میں آئے کہ ان دونوں یعنی انسان اور حیوان میں قرآن نے کیا فرق کیا ہے۔ قرآن نے انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کرتے ہوئے ان آیات میں انسان کی پیدائش کا وہ حصہ دیا ہے جسے جنین کہتے ہیں اور وہ جو رحمِ مادر کے اندر ہوتا ہے وہ پہلے بیان کیا ہے۔ پہلے تو میں یہ عرض کروں کہ یہ چھٹی صدی عیسوی کی بات ہو رہی ہے۔ اس وقت علمی یا سائنٹفک ریسرچ کے اعتبار سے زمانے کی منج سے بھی وہ کتنا پیچھے ہے۔ پھر اس دور میں آپ دیکھیے کہ سائنس کی ریسرچ، بالخصوص انسان کے متعلق دیکھیے ٹھیک اس مقام پہ چھٹی صدی عیسوی کا جتنا بھی وہ انسانی تحقیق کا علم ہے اس کو سامنے رکھیے بات سمجھ میں آ جائے گی۔ قرآن سمجھنے کا یہ طریقہ بھی ہے کہ انسان کے سامنے اس کے اپنے دور کی فکر موجود ہو۔

## نزول قرآن کے وقت دنیاۓ عرب کی علمی سطح اور رحم مادر میں جنین کے متعلق قرآنی انکشافات

عزیزانِ من! یہ جو Embryology ہے، یعنی جو جنین کے متعلق معلومات، اس دور میں جہاں بھی انسانی علم یا تحقیق پہنچی تھی، وہ محفوظ ہے۔ اسے سامنے رکھ لیجیے۔ یہ عرب جیسا خطہ ہے، جس میں نہ سائنس ہے، نہ تحقیق ہے، نہ فکر ہے، لکھنا پڑھنا نہیں ہے۔ عرب میں مکہ کی پٹیل سٹی ہے، اور ویسے بھی بہت مشہور سٹی اس تمام دائرے کا مکہ ہی تھا۔ بہت بڑی کاوش کی ہے تو معلوم ہوا ہے کہ مکے میں سترہ افراد ایسے ملے ہیں، جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے یعنی Educated نہیں۔ یہ وہی ہے جسے آپ عام خواندگی کہتے ہیں۔ اور ان میں ایک ایسا شخص تھا، جو وہ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔ تقابل کر کے دیکھیے، پھر قرآن سمجھ میں آتا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں، اس دور میں، ایمر یا لوجی (Embryology) کے متعلق یعنی جنین کے متعلق، جو تحقیقات تھیں، انہیں سامنے رکھ لیجیے عزیزانِ من! ہم عقیدے کی بنا پہ کچھ نہیں کہتے۔ میں تو کم از کم یہ بات عقیدے کی بنا پہ نہیں کہتا۔ یہ بات علیٰ وجہ البصیرت ہونی چاہیے۔ ایمر یا لوجی (Embryology: علم الجنین) کے متعلق اس دور کی جو تحقیقات ہیں، ان میں جو بڑی سے بڑی تحقیقاتی چیزیں ہیں انہیں سامنے رکھ لیجیے۔ دوسری طرف اس ملک کے اندر جتنے پڑھے لکھے لوگ تھے، ان کے پڑھے لکھے ہونے کے علم کی جو سطح تھی، اس سے مقابلہ کر لیجیے اور ان کے ہاں کی خواندگی (Literacy) کو بھی دیکھ لیجیے۔ اس میں بھی آتا ہے وہ ایک شخص اتنا بھی نہیں جانتا مگر یہ دیکھیے کہ وہ ان دو آیتوں کے اندر کیا کچھ بیان کر گیا ہے حالانکہ وہ جو اس زمانے کی جنین کے متعلق تحقیق تھی وہ قیاسات پر مبنی تھی، بعد کی تحقیقات نے اس وقت آ کر ان کو مردود قرار دیا ہے، باطل قرار دیا ہے، اس کی تردید کر دی ہے اور غلط قرار دیا ہے اور یہ جو اس تاریک ترین خطہ کے اندر ان پڑھ آدمی، اس دور میں، جو موضوع وہ بیان کر رہا ہے، وہ آئینے کی طرح ہے جو اس وقت انکشاف ہوا ہے۔ آج چیر پھاڑ کے بعد اور ایمر یا لوجی (علم الجنین: Embryology) کے علم کی جو انتہا ہے، وہ اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ میں اس کو صرف جنین تک لا رہا ہوں۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ رحم مادر میں، کسی عورت کے رحم کے اندر انسان کی یا بکری کے رحم کے اندر جو حیوان کی اسٹیج ہے، دونوں مشترک چلی آرہی ہیں لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ اتنے میں بھی قرآن کریم جو بیان کر گیا ہے، علمی ریسرچ اس کی تصدیق کر رہی ہے اور اسی Contemporary (معاصر) دور میں، معصروں کے ہاں کا اس دور کا علم جو انتہا پہ پہنچا ہوا تھا، اس سے بھی اس کی تصدیق ہو رہی ہے۔

## قرآن حکیم کا تو ایک ایک لفظ اپنی جگہ سائنٹفک ریسرچ کی انتہا ہوتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ (23:12)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اب یہ تو وہ آیتیں

آگئی ہیں، عزیزانِ من! جن کے لیے واقعی جی چاہتا ہے کہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے اسٹوڈنٹ کو میں سامنے بٹھاتا اور ان کو بتاتا۔ یہ ان کے بتانے کی چیز تھی اور ان کے اساتذہ کو بتاتا، مغرب کے ریسرچ اسکالر کو بتاتا۔ قرآن کے دولفظ ہوتے ہیں، سائنٹفک ریسرچ کی جواہر ہوتی ہے، بات وہاں دولفظوں میں پہنچ جاتی ہے۔ ہم نے تو اس کا ترجمہ کر دیا ”مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔“ کیا پتہ ترجمہ کرنے والوں کو کہ مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا تو یہ کیا پیدا کیا؟ اور پھر وہ جو عام مفہوم ہمارے پاس ہے، وہ سامنے ہے کہ مٹی کا بابا آدم کا ایک پتلا بنایا۔ وہ سیدھی سی بات ہے کہ جی، وہ مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا۔ ”جس طرح کہہار مٹی نوں گوند اہیگا نا اوہدے وچوں وٹے لکھ کڈ دینا ہے نا صاف ستھری مٹی لیندا اے نا“<sup>1</sup> اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہ آدم کا پتلا بنایا۔ مطلب یہ ہے۔ اب انہیں کون بتائے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے؟

### تخلیقِ آدم کے سلسلہ میں سائنسی انکشافات

سائنس کے انکشاف کی انتہا اس پہنچی ہے کہ زندگی کی نمود کیسے ہوئی۔ قرآن نے یہ کہا کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (23:30) پہلے بات یہ سوچ لو کہ اس کی نمود کے لیے بنیاد پانی ہے۔ جب تک کسی چیز کو پانی نہیں ملتا تو زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ میں بار بار لفظ ”نمود“ استعمال کر رہا ہوں۔ قرآن کی رو سے وہی کرنا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کرتے کہ زندگی پیدا نہیں ہوتی، وہ تو پیدا کرنے والے نے پتہ نہیں کس شکل میں پیدا کر رکھی تھی۔ اس کے ہاں کی وہ پیدا ہوئی جو چیز ہے کسی خاص شکل میں اس کی نمود ہوتی ہے Manufacturing ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ نمود کی پہلی شرط پانی ہے اور پانی کے ساتھ دوسری شرط خالص مٹی کی ملاوٹ قرار دی۔ یہ دو چیزیں ملتی ہیں تو زندگی کی اولین نمود ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ زندگی کی اولین نمود یہ جو جو ہڑتالاب ہوتے ہیں ان کے کنارے پر جہاں پانی اور مٹی ملتی ہے اور اس میں کچھ حرارت پڑتی ہے تو زندگی کا اولیں جرثومہ جسے لائف سیل کہتے ہیں وہ اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن نے پانی کہا، طین کہا، مٹی کہا، اور ایک آیت میں طین لازم کہا۔ جب مٹی اور پانی دونوں مل جائیں تو اسے طین لازم کہتے ہیں۔ لیکن اس نے سلسلہ کہا کہ وہ مٹی کے اندر کوئی اور چیزیں ملی ہوئی نہ ہوں۔ اگر یہ ملی ہوئی ہوں تو اس سے یہ فرسٹ لائف سیل نہیں پیدا ہوتا۔ یہ ساری کثافتیں اس میں سے نکل جائیں اس کے بعد وہ مٹی اور یہ پانی دونوں ملیں۔ اس لیے کہا کہ پھر سورج کی حرارت کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو یہ جو چیز ہے اس سے زندگی کے پہلے جرثومے یعنی لائف سیل (Life cell) کی نمود ہوتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ انسان کی ابتدا جو ہے یعنی جو بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ (32:7) ہے وہ خَلْقَ الْإِنْسَانِ کی بات نہیں ہے وہ

1 جس طرح کہہار مٹی کو گوندھتا ہے پھر اس میں سے پتھر کے ریزے اور تیکے نکال دیتا ہے۔ صاف ستھری مٹی لیتا ہے۔

بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ (32:7) کی بات ہے یعنی زندگی کے اوّلیں جرثومے سے انسان کی پہلی ابتدا ہوئی کی بات ہے۔

### انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہمارے ہاں صدیوں سے پائے جانے والے تصورات

اب وہ جو ہمارے ہاں Pre-formation (ساختِ اولین) کا تصور ہے تو وہ بھی یہ ہے کہ بنا بنایا ہوا انسان کا ایک پتلا تھا جو اللہ تعالیٰ وجود میں لے آیا، وہ کیسے بنا جی؟ کہا کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ ٹھیک ہے ”اوکمہیا رجنکم وی نہیں کر سکا“؟<sup>1</sup> بنا کے رکھ دیا۔ اب آگے بات نہیں چل رہی۔ اکیلا آدمی تو ایک بنا تھا۔ بابا آدم اگر کروڑ بھی مرد بنا دیئے جائیں آگے تو بھی بات نہیں چلتی۔ عزیزانِ من! یہ جو ذہن میں مروجہ چیزیں ہیں ان کو کھنا پڑتا ہے ورنہ میرا جی نہیں چاہتا کہ اس مقام پہ آ کر میں ان کو دہرایا کروں۔ ارے بھئی! جس نے یہ بنا دیا تھا، اسی قسم کی ایک عورت کو بھی ساتھ کیوں نہ بنا دیا؟ وہ اس کے ساتھ نہیں بنائی، وہ یوں بنایا کہ اس کی پسلی چیری۔ اس میں سے عورت نکالی لیکن میں نے کہا ہے کہ ان بچاروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ محرفِ تورات نے جو قصے دیئے ہیں وہاں سے انہوں نے مانگ لیے۔ وہ افسانوں کی یہ کتاب ہے اور قیامت یہ ہوئی کہ افسانوں کی کتاب قرآن کے ساتھ تھوپ لی گئی۔

### رحمِ مادر میں قدم قدم پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ

قرآن کہتا ہے کہ سُلَلَةٍ مِّنْ طِينٍ (32:12) انسان کی زندگی کی پہلی ابتدا یہاں سے ہوئی۔ اور اس کے بعد قرآن نہایت مختصر الفاظ میں یہ Stages (مراحل) گنارہا ہے جو رحمِ مادر کے اندر تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، جنہیں اُس صدی میں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا، ریسرچ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ساری Stages (مراحل) وہ ہیں جو آج کی تحقیق کے مطابق پوری اتر رہی ہیں۔ کہا کہ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِی قَرَارٍ مَّكِينٍ (32:12)۔ اور میں کیا عرض کروں! جی، مجھے آگے بڑھنا ہی چاہیے ایک ایک لفظ پہ کونگا تو ایک ایک درس چاہیے۔ یہ قَرَارٍ مَّكِينٍ اُس نے کیا چیز کہی ہے؟ جب چلنے والی کوئی چیز کسی مقام پہ آ کر ٹھہر جائے، تو اسے قرار کہتے ہیں۔ وہ جامد نہیں ہوتی۔ پہلے یہ حرکت ہے۔ یہ جو Pregnancy (حمل) ٹھہرتا ہے اس کا آج کی ریسرچ والوں سے پوچھیے کہ کس طرح سے یہ جو مادہ منو یہ ہوتا ہے جو اس کا جرثومہ ہوتا ہے وہ Travel (سفر) کرتا ہے وہ آگے چلتا ہے وہ وہاں عورت کے رحم پہ جا کے کہیں چپک نہیں جاتا، وہاں ایک خلیہ سا ہوتا ہے وہ اس کے اندر جا کر حرکت سے رکتا ہے اسے قرار اور مکین کہا۔ اب وہ مقام ہے جہاں وہ اس کے اندر جا کے رک گیا ہے۔ خیر مجھے یہاں جلدی سے بڑھنا چاہیے میں نے کہا ہے کہ ان چیزوں کا صحیح مقام وہ لوگ ہیں جن کی یہ Branch of Knowledge (علم کی شاخ) ہے۔ وہ سامنے ہوتے تو میں قرآن کے دیگر مقامات سے بھی انہیں بتاتا کہ وہ کیا کیا کرتا ہے۔ ان کے

1 کیا وہ کہہ رہا تھا کام بھی نہیں کر سکتا؟

نقشے کے اوپر میں بتاتا کہ دیکھ لو قرآن نے جو Stages (مراحل) گنائی گئی ہیں ان پہ نگاہ رکھو۔ ان سے کہتا ہے کہ میں قرآن کی یہ آیات پڑھتا جاتا ہوں اور تم دیکھتے چلے جاؤ کہ کس طرح سے شہادت ملتی ہے۔ **ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً** (23:14) وہ یونہی لوٹھڑا سا جسے ہم کہتے ہیں، ہوتا ہے۔ لوٹھڑا تو پھر بھی اس کے لیے صحیح لفظ نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کے لیے لفظ لوٹھڑا ہی ہے۔ اس لوٹھڑے میں پھر بھی گوشت کا کچھ تصور آتا ہے مگر یہ جس کو پلازمہ (Plasma) کہتے ہیں یہ ہوتا ہے۔ اب وہ پلازمہ تو جس طرح سے وہ جالی سی ہوتی ہے وہ چیز ہوتی ہے۔ یعنی علق جالی سی ہوتی ہے، یونہی کسی چیز کے ساتھ چپکی ہوئی، پلازمہ کی شکل میں ساتھ یوں لگی ہوئی۔ **فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً** (23:14) وہ جو جالی سی تھی اب اس کے اندر تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس میں کچھ گوشت ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن وہ گوشت کا ٹکڑا بھی بن جائے تو آگے بات نہیں چلتی۔ آگے کہا کہ **فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا** (23:14) گوشت کے اس ٹکڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ **فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا** (23:14)۔ عظام<sup>1</sup> خاص طور پر ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں اور یہ وہیں سے عظیم کا لفظ ہے۔ عظیم شے ہی وہ ہوتی ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ہو۔ جو Invertebrates<sup>2</sup> (غیر فقاری) ہوتے ہیں ان کو ”عظمت“ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ان میں ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں ہوتا۔ یہاں کہا ہے کہ پھر وہ جو ہڈیاں تھیں انہیں ڈھانچے کی صورت میں ابھار دیا۔ **فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا** (23:14) پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہہ چڑھادی۔ جلدی جلدی میں پاس ہو رہا ہوں کہ موضوع تو آگے ہے۔ ہر حیوانی جنین ان Stages (مراحل) سے گزرتا ہے انسانی جنین بھی انہی سے گزرتا ہے۔

## آج کی سائنٹفک ریسرچ کا آخری مقام

عزیزانِ من! انیسویں صدی کی سائنٹفک ریسرچ کا آخری مقام یہی ہے۔ حیوان کی مادہ (Female) کے رحم سے بھی ایک بچہ نمودار ہو جاتا ہے انسان کی مادہ (Female) کے رحم سے بھی ایک بچہ نمودار ہو جاتا ہے اور انہی Stages (مراحل) سے پاس ہوتا ہے۔ حیوان وہاں آ کر ختم ہو گئے وہ مراحل ان کے لیے آخری بات تھی اس سے آگے نہیں بڑھے۔

<sup>1</sup> عَظْمٌ ہڈی کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ عَظْمُ الْفَدَّانِ کسان کے بل کی اس چوڑی لکڑی کو کہتے ہیں جس کے آگے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے۔ بل میں اس لکڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ عَظَمَاتُ الْقَوْمِ قوم کے سرداروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اساسی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ عَظْمُ الطَّرِيقِ راستے کے کشادہ حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ راستہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ عَظْمَةُ کے بنیادی معنی تکبر و غرور، بڑائی نیز عزت و حرمت کے بھی ہیں۔ الْعَظِيمَةُ سخت پیش آنے والی بات یا حادثہ (تاج العروس)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بڑا ہونے اور قوی ہونے کے ہیں۔ (پرویز: لغات القرآن (جلد سوم) ادارہ طلوع اسلام لاہور 1961ء ص 1175)

<sup>2</sup> Invertebrates have no backbone or simple column.

## اس مادی جسم کے بعد انسان اور حیوان میں ایک خط امتیاز کھینچ دیا گیا

سینے عزیزانِ من! کہا کہ یہاں تک تو جو چیز ہوگی وہ تم حیوانی اور انسانی جنین میں مشترک پاؤ گے۔ اور آگے ایک لفظ ہے۔ کیا بات ہے صاحب! کوئی لفظ اس کو ادا نہیں کرے گا۔ کہا کہ **ثُمَّ اَنْشَاْنُهُ خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14) اسے ایک بالکل نئی قسم کی مخلوق کی شکل میں نمودار کر دیتے ہیں۔ ”لیہدے بعد کچھ ہوردا ہورای ہو گیا“<sup>①</sup>۔ اس ”آخر“ کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ عربی زبان کا جو یہ لفظ ہے اس کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ جو پیچھے سے کڑی در کڑی سلسلہ چلا آ رہا ہے اب ذہن میں یہ تھا کہ اس مسلسل چلے آ رہے کی اگلی کڑی کچھ ایسی ہی ہوگی، جیسی پچھلی کڑی آ رہی ہے انہی میں کچھ تھوڑا سا اور لیا، اور وہ ترقی کرتا چلا جائے گا بنیادی اعتبار سے تو وہی ہوگا لیکن کہا کہ نہیں اب اس کے بعد تو وہ کچھ اور سے اور ہو گیا۔

## آخر کے لفظ کا مفہوم

عزیزانِ من! جو آخر کا لفظ ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ”کچھ اور کا اور ہی ہو جانا۔“ آخرت کی زندگی تو آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہے؟ اب یہاں سے آپ سمجھ لیجیے کہ بات کیا ہوئی؟ کہا کہ **ثُمَّ اَنْشَاْنُهُ خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14)۔ حیوان میں تو یہ بات نہیں۔ وہ تو وہاں ختم ہو گیا، جہاں تک آیا تھا۔ اس نے پہلے یہ کہا کہ وہاں اندر سے بچہ تیار ہو گیا اور اس کے بعد کہا کہ **ثُمَّ اَنْشَاْنُهُ خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14) اور اس کے بعد بس کچھ اور سے اور ہو گیا۔ یہ ہے جی وہ Stage (مرحلہ) جہاں قرآن حیوان اور انسان میں خط امتیاز کھینچتا ہے۔ اگر وہاں تک ہی رہے جو پچھلی Stages (مراحل) گنائی گئی ہیں تو اس سٹیج تک اگر انسان کا تصور ہے تو وہ تو پھر حیوان ہے۔ وہ ٹھیک ہے جو کچھ انہوں نے کہا۔ وہ وہاں رکے ہوئے ہیں اور پھر ”اس حیوان“<sup>②</sup> کے متعلق جو مصیبتیں پیدا ہو رہی ہیں کہ وہ جنگل میں نہیں رہتا، شہروں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتا ہے اس کی ساری مصیبتیں یہاں بھگت رہے ہیں کیونکہ وہ وہاں کھڑے ہو گئے۔ اب یہ جو اتنا سا اگلا ٹکڑا ہے یہ کیا ہے؟ کہا کہ **ثُمَّ اَنْشَاْنُهُ خَلْقًا اٰخَرَ** (23:14)۔ یہ ان سائنسدانوں کے ہاں نہیں آیا۔ بات ساری اس خَلْقًا اٰخَرَ کی ہے عزیزانِ من! آئیے دیکھیں کہ یہ خَلْقًا اٰخَرَ کیا ہے؟ کس چیز سے یہ کچھ اور بنتا ہے؟

عزیزانِ من! مجھے اب درس کے آخری ادوار میں زور سے یہ کہنا پڑا کہ خدا کے لیے قرآن کے نسخے اپنے ساتھ لایا کیجیے۔ یہ چھوٹے چھوٹے سے نسخے ملتے ہیں جو آپ کے پاس جیب میں آ جاتے ہیں۔ یہ ناظرہ بھی اگر آپ پڑھنا جانتے ہونگے تو آپ کے

① اس کے بعد وہ کچھ اور ہی بن گیا۔

② یہ اشارہ انسان کی طرف ہے۔

سامنے وہ لفظ آئے گا تو آپ Appreciate (پسند) کریں گے کہ یہ کیا بات ہے جو اب تک آپ زبانی سنتے رہتے ہیں۔ یونہی آپ کے ذہن میں کوئی ایک تصور سا آتا ہے، میری باتوں سے قرآن کا وہ لفظ سامنے نہیں آتا۔ بات تو ساری یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ وہاں یہ حیوان تھا۔ یہ بات ہوئی تھی کہ **بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ** (32:7)۔ اس میں میں نے کہا تھا کہ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا کہا ہے یعنی یہ Pre-formation (ساختِ اولین) کا تصور نہیں ہے کہ یہ بنا بنایا ہوا انسان آ گیا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ انسان کی تخلیق کی ابتدا تھی۔ وہ جو ہمارے ہاں کا تصور ہے کہ خدا نے مرد انسان کا ایک پتلا بنادیا، وہ بعد آ<sup>1</sup> کے خلاف جاتا ہے۔ وہ تو یہاں سے ابتدا کی۔ جہاں سے ابتدا کی جاتی ہے تو وہ تو Physiologically (طبعی طور پر) وہاں تکمیلی سطح تک نہیں ہوتا، وہ تو مختلف کڑیاں گزرتا ہے، تو وہاں سے آخر میں جا کر پھر وہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ ایک لفظ بعد آنے بات کہاں سے کہاں پہنچادی۔ تو یہ Pre-formation (ساختِ اولین) کا تصور نہیں ہے، یہ پہلے سے بنی ہوئی کوئی چیز نہیں ہے کہ ایک Accomplished Finished Form (مکمل تیار شدہ ہیئت) کے اندر لیکھت پتلا کھڑا کر دیا۔ یہ تو یہاں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ اور پھر آگے وہی طین آیا ہے کہ **مِنْ طِينٍ** (32:7) اس کا آغاز اُس بے جان مادہ (Inorganic Matter) سے ہوا۔ اس بے جان مادہ یعنی **طِينٍ لَا زَبٍ** (37:11) کے ساتھ پانی کی آمیزش ہوئی تو اس میں زندگی کے اولین جرثومہ (Life Cell) کی نمود ہوئی۔ اس کے بعد یہ کاروانِ حیات مختلف مراحل طے کرتا ہوا اُس وادی میں آ پہنچا جہاں کہا کہ **ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ** (32:8) افزائشِ نسل بذریعہ تولید (Procreation) یعنی نر اور مادہ کے اختلاط سے ہوتی ہے۔ یہ سارا کچھ وہ گنا تا چلا جاتا ہے۔ اب آئیے خلیقِ آخر کے اوپر۔ کہا کہ یہاں تک تو یہ جو انسان اور حیوان ہے اس کا جنین انہی مراحل سے گزرتا ہے، دونوں یکساں مراحل میں سے گزرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے روح خداوندی کا لفظ انسان کے اختیار ارادہ کی قوت کے عطا ہونے کا نام ہے

یہاں جو خلیقِ آخر کہا ہے اس میں کہا ہے کہ **نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ** (32:9)۔ وہ سارا مکینکل پروسیس (میکانکی عمل) ہو رہا تھا، مادی ہو رہا ہے، فزیکل ہو رہا تھا لیکن یہاں پہنچ کر اس نے کہا کہ اب اس میں یعنی انسان کے اندر ہم نے خالص خدا کی جو ایک قسم کی قوت

<sup>1</sup> **بَدَأَ بِهِ**۔ **بَدَأَ** و **اِبْتَدَأَ**۔ کسی چیز کے ساتھ شروع کرنا۔ **بَدَأَ الشَّيْءُ** اس چیز کو شروع کر دیا۔ اس نے پہل کی۔ **فَلَأَنِّ مَا يُبْدِي** وَمَا يُعِيْدُ۔ فلاں آدمی نہ از خود کوئی بات کرتا ہے۔ (Initiate کرتا ہے) اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیتا ہے۔ (پرویز: لغات القرآن (جلد اول) ادارہ طلوغ اسلام لاہور)



تھی وہ اسکے اندر پیدا کی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جَعَلَ لَكُم السَّمْعَ وَ الْبَصَارَ وَ الْإِفْئِدَةَ (32:9) یہ صاحبِ ہوش و حواس، بصارت والا، بصیرت والا، فکر والا، علم والا، صاحبِ ارادہ، انسان بن گیا۔ حیوان میں ارادہ نہیں ہوتا، حیوان اس پابندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے جو اسکے اندر رکھ دی گئی ہے۔ یہ جو اس نے کہا ہے کہ اس میں ”خداوندی توانائی“ (Divine Energy) پیدا کی تو میں نے عرض کیا ہے کہ اس لفظ کا ترجمہ نہیں ہو سکتا، کچھ مفہوم سمجھانا ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تو روح خداوندی ایک چیز لے آئے اور کہا کہ: صاحب! پھر خدا کی ایک روح ہو گئی پھر اس روح میں سے تھوڑی تھوڑی ہر انسان کو ملی، اور تصوف کی ایک عمارت بنی، کہ ہاں یہ تو خدا کی روح میں سے اتنی اتنی اتنی جو ہے وہ ہر ایک کے اندر ڈال دی۔ ”اودے اچ باقی کی بچیا ہونا چکھے“ اوبھورا بھوراوی لئی ہووے اودے وچوں کی نہ ہووے گی تے کم از کم تھوڑی بہت گھٹ تے گئی ہووے گی۔“ <sup>1</sup> میں کیا عرض کروں کہ کیا چیزیں ہمارے ہاں آگئیں۔

### ہمارے ہاں روح خداوندی کے متعلق پائے جانے والے غلط تصورات کا نتیجہ

عزیز! اس روح خداوندی میں سے کچھ حصے اُسے نہیں دیئے گئے۔ وہ جو خداوندی ایک خصوصیت ہے جو اس کائنات میں انسان کے سوا کہیں اور نہیں تھی کہ خود دیکھ کر، سن کر، سمجھ کر، کسی چیز کا کسی چیز میں فرق کرنا، فیصلہ کرنا، اس کو اختیار کرنا، اس کو چھوڑنا، یہ اسے دیا گیا۔ اسی طرح یہ جو ارادہ ہے وہ اسے دیا گیا۔ یہ ارادہ ہے اصل میں جو اسے دیا گیا۔ یہ اختیار و ارادہ سماعت، بصارت، قلب، سمجھ سوچ کے اوپر مبنی ہو تو تقلید ختم ہو گئی۔ تقلید تو حیوانی درجہ ہوتا ہے۔ ہر حیوان مقلد ہوتا ہے۔ ہر بکری کا بچہ اُسی طرح چلتا ہے، وہی کچھ کرتا ہے جو اس سے پہلی بکری کر رہی ہوتی ہے۔

### مقلد کا قرآنی مفہوم اور تقلید پرستی کا نتیجہ

یہ تو جو لفظ تقلید ہے، بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ جی، ہم مقلد ہوتے ہیں۔ انہیں یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اسکے معنی کیا ہیں۔ یہ مولیٰ کے، حیوان کے، گلے میں جو وہ رسی ڈالتے ہیں اور اس رسی کو پکڑ کے اگلا چلتا ہے، اس کو قلد کہتے ہیں۔ تقلید یہاں سے ہے۔ ”گلے دی رسیاں اونانے بندھیاں ہوئیاں نیں“ لے کے تری جا ریا اے۔ <sup>2</sup> اور پھر یہ بھی نہیں ہے کہ وہ گڈ ریا یا چرواہا جو ایک نیل کی رسی کو پکڑ کر لیے جا رہا ہے، وہ تو ان کے ہاں یوں ہے جیسے آپ نے قطار دیکھی ہے، وہ ایک کو کوئی آگے چلانے والا ہوتا ہے پیچھے ہر اونٹ کی دم کے

<sup>1</sup> اس میں باقی کیا بچا ہوگا!! اگر اس میں سے ذرہ ذرہ کر کے بھی لیا ہوگا تو اگر وہ ختم نہیں ہوئی ہوگی تو بہت حد تک کم تو ضرور ہو گئی ہوگی۔

<sup>2</sup> انہوں نے گلے کی رسیاں باندھی ہوئی ہیں۔ یہ اسے لے کر چلا جا رہا ہے۔

ساتھ پچھلے اونٹ کے ٹکیل کی رسی باندھی ہوئی ہوتی ہے۔ بس چلا جا رہا: پہلی قطار کا اونٹ ہو دوسری قطار کا اونٹ ہو، کوئی پتہ نہیں ادھر کیوں چلے جا رہے ہیں صاحب! وہ یہ حیوانی سطح ہے۔ اس حیوانی سطح کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پچاس لاکھ سال پہلے کے بھی جو کسی بکری کے یا بھیڑ کے ہڈیوں کے ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں بالکل اسی قسم کی یہ بکری اور بھیڑ ہے جیسی آج بکری اور بھیڑ ہے۔ تقلید میں ہوتا یہ اسی قسم کا ہے اور آج بھی بکری کا بچہ پیدا ہوتا ہے بکری کا ہی بچہ رہتے ہوئے مر جاتا ہے۔ یعنی کسی قسم کی Improvement (بہتری) نہیں کسی قسم کی ترقی نہیں، کوئی تبدیلی نہیں۔ جیسے پیدا ہوا اسی قسم کا ہی مر جاتا ہے۔ یہ ہوتا ہے مقلد۔

### کائنات کی کسی شے کو بھی اختیار و ارادہ کی یہ قوت (روح) عطا نہیں کی گئی

یہاں جسے روح خداوندی کہا گیا ہے میں نے عرض کیا ہے کہ اب میں تو انائی کے سوا اس کا ترجمہ اور کیا کروں۔ کہا یہ ہے کہ یہ روح خداوندی چیز تھی وہ قوت تھی وہ تو انائی تھی جو انسان کو دی اور اس سے وہ حیوانات سے الگ ہو گیا۔ اب یہ جو کہا ہے کہ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (23:14) تو وہاں پہنچنے کے بعد ہم نے اسے کچھ کا کچھ بنادیا۔ یہ ہے وہ چیز جو حیوانات میں نہیں ہے تمام مخلوق میں کسی اور میں بھی نہیں ہے۔ قرآن میں کسی جگہ اور کسی مخلوق کے لیے یہ چیز نہیں آئی ہے۔ یہ صرف انسان کے لیے ہے۔ یہاں یہ چیز ہے جسے یہ کہا گیا ہے اور کس حسین انداز میں کہا گیا ہے کہ خَلْقًا آخَرَ (23:14) کچھ اور ہی بنادیا۔ تو میں آپ احباب سے یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کم از کم قرآن کے نسخے رکھیے اور یہاں پہلی چیز یہ بھی ہے کہ اس سے پہلی نسل کو کچھ فارسی بھی آتی تھی، مگر یہاں تو یہ بھی نہیں ہے۔ وہاں سے میں جو سمجھانے کے لیے نیچے اترتا ہوں تو اقبالؒ (1877-1938ء) ہی سامنے آتا ہے۔

### علامہ اقبالؒ کی زبانی ”خَلْقًا آخَرَ“ کی تفسیر

ہماری اس دور کی خوش بختی ہے کہ اس میں ایک ایسا شخص<sup>1</sup> پیدا ہوا جس کی قرآن پہ عمومی نگاہ اتنی بڑی تھی اور پھر بات کرنے کا ایسا حسین سلیقہ تھا کہ شعر اور ادب کے ساتھ جن کا کچھ لگاؤ ہے دلچسپی ہے وہ Appreciate (پسند) کریں گے کہ یہ کیا شخص تھا! یہ ہے وہ چیز خَلْقًا آخَرَ کہ کچھ اور بنادیا:

ز آب و گل خدا خوش پیکرے ساخت

ٹھیک ہے خدا نے پانی اور مٹی سے ایک بڑا اچھا پیکر بنادیا، بابا آدم نہیں، یعنی وہی حیوانی سطح پر جو انسان ہے وہ آب و گل سے ایک پیکر تراشا ہوا خوش پیکر ساخت بنا ہوا اسے حیوان سے ذرا اچھا بنادیا:

1 یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

ز آب و گل خدا خوش پیکرے ساخت

جہانے از ارم زیبا ترے ساخت

اور وہ کائنات جو اس نے بنائی، ٹھیک ہے، ہم مانتے ہیں لیکن یہ تو سارا جہان آب و گل ہے۔ اس کی زیبائی اور رعنائی میں بھی کچھ فرق نہیں کچھ اختلاف نہیں ہے صاحب! بہار کے موسم میں دیکھیے کہ یہ آب و گل کیا کرتی ہے

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

ایک ایک بوند اس کی، ایک ایک پتی اس کی، رعنائیاں اس کی، زیبائیاں اس کی، جاذبتیں اس کی، پوچھو نہیں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے یہاں تک یہ کچھ بنا دی ہم مانتے ہیں کوئی شبہ نہیں۔ انداز یہ ہے کہ خدا خوش پیکرے ساخت۔ ٹھیک ہے

ولے ساقی باں آتش کہ دارد

اس کے بعد میرے ساقی نے اس آتش شعلے کو جو اس کے پاس تھا اس نے اس سے

ز خاک من جہان دیگرے ساخت

میری اسی مٹی سے باہر کی دنیا بنا ڈالی، اس کو روشن کر دیا، اُسے منور کر دیا۔

نفس انسانی کی بنیاد پر انسان کا مقام بلند

عزیزان من! شعر کی دنیا میں پوچھیے کہ شعر کی جو انتہائی خوبی ہوسکتی ہے اور میں کہوں گا کہ تغزل کی جو خوبی ہوسکتی ہے اس پر پرکھ کے دیکھیے، بڑے سے بڑا بھی عیش عیش کراٹھے گا۔ اور کتنی بڑی چیز ہے کہ خلقتِ آخر کو جہانِ دیگرے کہا اور کس انداز سے باں آتش کہا کہ یہ وہی ہے جسے نفع فیہ من روحنا کہا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا، مگر اس شخص نے کس خوبی سے ترجمہ کیا کہ ٹھیک ہے خدا نے یہ سارا کچھ بنا دیا لیکن میرے ساقی نے اس آگ کے شعلے کو جو اس کے ہی پاس تھا، کسی اور کے پاس نہیں تھا، اسی آب و گل کے ہیولے سے ایک نئی دنیا تخلیق کر دی۔ یہ ہے وہ خلقتِ آخر۔

لفظ اطوار کا مفہوم اور انسانی ذات

عزیزان من! بات چلی ہے تو پھر آگے بھی چلنی چاہیے۔ قرآن نے کہا ہے کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا (71:13)۔ یہ میں بعد میں بات کروں گا، پہلے یہ سنیے کہ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (71:14)۔ طور کا یہ لفظ تو ہمارے ہاں ہے اگرچہ وہ بھی کچھ صحیح مفہوم نہیں دیتا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ کسی اور طور پہ یہ بات کر دی، کچھ اس کے طور بگڑے ہوئے تھے آج، ہم یہیں تک پہنچے ہیں۔ لیکن بات تو غزل

کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ”طور“ کے سمجھانے کے لیے اس کے معنی عام طور پہ تو یہ ہوتا ہے ”ایک طور سے دوسرا طور“ اب میں یہ کیا عرض کروں کہ وہ محسوس کرنے کی بات ہے کہ یہ اطور کیا چیزیں ہیں، کیا کیا کیفیتیں بدلتی ہیں جس کو کہا جاتا ہے۔ ایک تو وہ ہے کہ Physical Changes (طبعی تغیرات) ہوتے ہیں، ایک Physical Change (طبعی تغیر) کے علاوہ اس نے کہا کہ ہم انسان کو اس درجے کے اوپر پہنچانے کے لیے اس کے اندر کچھ کیفیتیں بدلتے گئے جب جا کر وہاں سے یہ آخری بات وہ ہوئی۔

یہ ہے وہ چیز جس کو یہ کہا کہ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (71:14) ہماری تخلیق کا یہ جو سلسلہ چلا تھا، اس میں اطوراً کیفیات بدلتی گئیں، طور ترا بدلتا گیا۔ میں نے کہا تھا کہ شعر تو وہ عام غزل کا ہے بس بات وہی سمجھا سکتا ہے:

بدلے کچھ ایسے طور سے بے طور ہو گئے  
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

’یہ کچھ اور ہو گئے‘ یہ جو چیز ہے الفاظ میں سمجھائی نہیں جاسکتی۔ ’کچھ اور ہونا‘ یہ ہوتا ہے طور سے بے طور ہونا۔ یہاں اطوراً آج قرآن نے کہا ہے: یوں کیفیات بدلتی ہیں، تبدیل ہوتی ہوئی چلی جائیں، تبدیل ہوتی ہوئی چلی جائیں، اور اس کے بعد اس کے اندر ایک ایسی چیز دی، یہ ہے، عزیزانِ من! کہ جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے، قرآن اس کے لیے نفس کہتا ہے، اقبالؒ (1877-1938) خودی کہتا ہے۔ اگرچہ یورپ کی زبان میں ابھی اس کے لیے لفظ نہیں ملا، انہوں نے اس کے لیے Personality کہا۔ Personality کا عام مفہوم جو تھا وہ آپ کو معلوم ہے: آج کیا ہو گیا ہے کہ اس کی بہت اچھی Personality ہے۔ وہ صرف کوئی اس کا پیکر ہوتا ہے اس کے متعلق بات ہو گئی، تو یہ لفظ پامال ہو گیا۔ انہوں نے Self کہا۔

### تصوف کی دنیا نے خودی کا چہرہ ہی مسخ کر دیا ہے

وہ جو تصوف والا Self تھا وہ ہمارے ہاں بھی فقیری میں خودی کا بدتمیز لفظ ہے۔ ہمارے ہاں ہے کہ ”خودی خدا داویر“<sup>①</sup>۔ سارا تصوف خودی کو مٹانے کے لیے ہے۔ وہاں بھی Self کا لفظ انہوں نے تلاش کیا لیکن اس سے جو Selfish کا لفظ ہے اس کا مفہوم بدترین ہو گیا یعنی اب یہ کسی کا بدترین کیریئر ہوتا ہے، وہ اس کا Selfish ہونا ہے اور اس کے برعکس بڑی خوبی Selfless ہونا ہے۔ وہی تصور Self کو مٹانے کا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جو الفاظ کا ترجمہ اور اس کے مفہوم کی تبدیلیاں ہیں، یہ بڑی ضروری چیز ہیں۔ یہ بیان ہی تو ہے جس سے انسان حیوان سے متمیز ہوتا ہے۔ گویائی بات کرنا ہی تو ہے۔ Semanticism (علم المعانی لسانیات) ان کے ہاں نئی

سائنس ہوئی ہے: الفاظ کے اندر کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ تو میں نے کہا کہ ان کے ہاں Self کا لفظ آیا تھا۔ تصوف آگیا اس نے تو بنادیا سب سے بڑی خوبی Selfless (ہونا)۔ چل بھی! Self ہی ختم ہو گیا کیونکہ Self کے معنی Selfish کے ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاں بھی تصوف میں جو خودی ہے ”اودے پچھے ڈنڈائی پھر دے ہیگے نیں“<sup>1</sup> وہ تو ہمارے ہاں اس شخص<sup>2</sup> نے آ کے مفہوم بدل دیا، اس نے انسان کا جو انتہائی معیار بتایا ہے وہ اس خودی کے لفظ کے اندر پرو دیا۔ قرآن نفس کہتا ہے اسے ذات بھی کہا گیا ہے۔ اب آیا یہ فلسفہ۔ تو یہاں سے ہم ہٹے تھے۔

### خودی کے لیے Personality کے لفظ کی بجائے Psyche کا لفظ بھی مکمل نہیں

ہمارے ہاں نئی برانچ نفسیات والوں نے Self یا Personality کا لفظ نہیں رکھا۔ یہ اپنے ہاں Psyche<sup>3</sup> کا لفظ لائے ہیں جس سے Psychology آیا ہے۔ وہ کچھ کوشش کر رہے ہیں کہ اس کا کچھ مفہوم بن جائے۔ مفہوم بنے گا نہیں جب تک وہ قرآن کے اندر آ کر نہیں دیکھیں گے کہ وہ اس کے لیے کہتا کیا ہے؟ وہ ہوتا کیا ہے؟ قرآن کہتا یہ ہے کہ ہر انسانی بچے یعنی جنین میں جب آخری اسٹیج آتی ہے تو اس میں یہ ایک چیز پیدا ہوتی ہے جو اس کو حیوانی بچے سے متمیز کر دیتی ہے اور یہ ہے وہ جسے آپ توانائی<sup>4</sup> کہیے۔ تو یہ اس قسم کا خدا ہی کا خاصہ تھا کہ اس نے اس کو صاحب ذات، صاحب خودی بنا دیا۔ میں نے اپنی بہت سی کتابوں میں اس پر بحث کی ہے خاص طور پہ اس کو میں نے مطالب الفرقان کی دوسری جلد<sup>5</sup> میں سمنٹا کے رکھ دیا ہے۔ یہ

1 اس کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔

2 یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

3 آج کل اسے کچھ ان معنوں میں لیا جا رہا ہے:

The mind functioning as the center of thought, feeling and behavior, and consciously or unconsciously adjusting and relating the body to its social and physical environment (Ref. Reader's Digest (1990).

Universal Dictionary. London: the Reader's Digest Association Limited, P.1241).

4 اسے Divine Energy کہتے ہیں۔

5 پرویز: مطالب الفرقان جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1983ء، ص 16 تا 32۔

Potentiality<sup>1</sup> امکانی طور پر ہر انسانی بچے کو ملتی ہے۔

## انسانی زندگی کا اصل مقصد نفس انسانی کی نشوونما کرنا ہے

اب سارا پروسیس (عمل) یہ ہے کہ یہ جو انسانی بچے کو Undeveloped Form (غیر نشوونما یافتہ شکل) کے اندر ایک صورت ملتی ہے اس کو Develop (نشوونما) کیا جائے۔ ہم نے جو لفظ کا Development (نمود) لفظ استعمال کیا ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ اس سے محکم ہو جاتی ہے، مستحکم ہو جاتی ہے اس کو ثبات مل جاتا ہے یہ Integrated (یک جا مستحکم) ہو جاتی ہے۔ یہ سارا دین کا نظام ہے یہ پروسیس (عمل) ہے۔ اب اس کے لیے بات اقدار کی آئی۔ اقدار کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو یہ جو Self یا انسانی خودی Undeveloped Form (غیر نشوونما شکل) کے اندر ملی ہے یہ Develop (نشوونما) ہو جاتی ہے، یہ محکم ہو جاتی ہے، مستحکم ہو جاتی ہے۔

## نفس یا خودی کی نشوونما کے لیے اقدار کی ضرورت لازم ہے

یہ انسانی جسم بطور Material (مواد) ملتا ہے کیونکہ لائف یا زندگی کی اس موجودہ سطح پر انسانی ذات کی Development (نشوونما) اس مادی پیکر کے اندر ہی رہتے ہوئے ہو سکتی ہے۔ اس لیے انسان اگر Values (اقدار) کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس کی یہ ذات اس کا یہ Self مستحکم ہو جاتا ہے Develop (نشوونما پانا) ہو جاتا ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ اس کا پروسیس کیا ہے؟ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کا ہر ارادہ ہر نیت ہر خیال اس کی ذات پر اپنا ایک نقش (Print) چھوڑتا ہے اپنا ایک اثر اس کے اوپر مرتب کرتا ہے۔ اب آپ یہ دیکھیے کہ سوسائٹی نے جو ان پابندیوں کا اپنا نظام بنایا تھا تو بات اس سے بالکل ہٹ گئی۔ اب بات یہ ہوئی کہ کوئی سپاہی ہو یا

① یہی وہ ”میں“ ہے جس سے انسان فی الحقیقت انسان کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ سورہ السجدۃ کی آیات 7 تا 9 میں انسانی تخلیق کے اُن مراحل (Stages) کا ذکر ہے جن میں انسان اور حیوانات دونوں شریک ہیں۔ ان میں انسان کے لیے غائب کی ضمیر (Third Person) لائی گئی ہے: ”نسلہ“ سواہ فیہ۔ اس کے بعد ہے کہ ”وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهِ“ (32:9) ”خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی“ اس طرح ”وَجَعَلْ لَّكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ“ (32:9) ”خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے۔ یہاں ضمیر غائب کی جگہ مخاطب (کلم) (Second Person) لائی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر اس ”نَفَخَ“ روح خداوندی“ کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان مخاطب کے قابل ہو گیا۔ یعنی اب یہ مخلوق انسان کہلانے کی مستحق قرار پا گئی۔ اور یہ ”تم“ وہ ہے جو ہر آن بدلنے والے انسانی جسم کے ساتھ بدلتا نہیں رہتا۔ جب آپ کسی سے کہتے ہیں کہ تم نے دس سال پہلے یہ کہا تھا تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ تم آج بھی وہی شخص ہو جو دس سال پہلے تھے۔ (ماخوذ از پرویز: مطالب الفرقان جلد دوم ادارہ طلوع اسلام لاہور 1983ء، ص 16 تا 17)

نہ ہو دیکھنے والا ہو یا نہ ہو عدالت ہو یا نہ ہو جیل خانہ ہو یا نہ ہو، جو بھی اس نے کام کیا، حتیٰ کہ کام کرنے کا جو ارادہ بھی اس نے کیا، اس نے اپنا ایک نتیجہ مرتب کر کے اس کی ذات پہ ایک اثر چھوڑ دینا ہے۔ اگر وہ عمل کسی قدر یا Values کے مطابق یا اس کے تحفظ میں ہے تو وہ اثر انسانی ذات کو محکم کرتا ہے، اگر وہ Values (اقدار) کے خلاف ہے تو وہ اس کو کمزور کر دیتا ہے۔ یہ جو محکم شدہ ذات ہوتی ہے، Developed Personality (نشوونما یافتہ شخصیت) ہے، وہ اپنے ان نقوش اور تاثرات کو لے کر مرنے کے بعد آگے جاتی ہے۔ جسم کے ساتھ انسان ختم نہیں ہو جاتا لیکن جسم آگے نہیں جاتا۔ یہ جو ذات یا نفس ہے، یہ موت کے ساتھ مرتا نہیں ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ

زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی  
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گھر کر نہ سکے

انسانی جسم کے فنا ہونے سے انسانی ذات ختم نہیں ہوتی

کیا بات ہے اس کی تشبیہات کی! قرآن کے حقائق سامنے ہوں اور اس اقبالؒ کا طرز بیان ہو تو عزیزانِ من! انسان کو وجد آ جاتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ یہ موتی بنتا کس طرح سے ہے؟ بہار کے موسم کو نیساں کہتے ہیں، کہا یہ جاتا ہے کہ بہار کے موسم میں ایک خاص بادل آتا ہے، سمندر سے اوپر آ کر سپیاں اپنا منہ کھول دیتی ہیں، اس کا ایک قطرہ سپی کے اندر چلا جاتا ہے، وہ منہ بند کر لیتی ہیں اور نیچے چلی جاتی ہیں اور وہاں جا کر پھر اس سیپ کو گردشیں ملتی ہیں۔ اس کو جتنی زیادہ صحیح گردشیں ملتی چلی جاتی ہیں، وہ جو پانی کا قطرہ ہے، اس میں وقار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، اس کے اندر ثبات پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، وہ محکم ہوتا چلا جاتا ہے تاں کہ پانی کا قطرہ موتی بن جاتا ہے:

زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی  
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گھر کر نہ سکے  
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی

اگر اس میں یہ خودنگر و خودگر و خودگیر کی سی چیزیں پیدا ہو جائیں تو

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے<sup>1</sup>

1 اقبالؒ: ضربِ کلیم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996ء، ص 53۔ (حیاتِ ابدی)

## ذاتِ انسانی کا جو قطرہ موتی بن جائے تو پھر وہ سمندر کا حصہ نہیں بنتا

اگر سیپ کو توڑ دیجیے تو وہ جو پانی تھا وہ تو سمندر میں مل کر ختم ہو گیا۔ اگر وہ پانی موتی بن گیا ہوا ہے تو لاکھوں تلاطم خیزیوں ہوں، سمندر کی موجیں ہوں، اس موتی کا بگڑنا کچھ نہیں ہے۔ ”اوہ دودھ اچوں مکھن بن گیا ہوندا ہیگا۔ اے سارا دن چائی اچ پائی رکھو پانی اچ اوہدا کچھ نہیں بگڑدا۔“<sup>①</sup> یہ جو اس کو استحکام حاصل ہوتا ہے اس سے Integration پیدا ہوتی ہے۔ یہ جو Integration ہے تو اس کے لیے اب میں آپ کو پیچھے لے جاؤں گا۔ میں نے کہا تھا کہ میں پہلی آیت یعنی (71:13) بعد میں لوں گا۔ وہاں کہا ہے کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا (71:13) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم للہ وقار کی تَرْجُون (آرزو) نہیں کرتے اور اس کے فوراً بعد کہا کہ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا (71:14) تمہیں ہم نے ایسے پیدا کیا تھا کہ تم میں تبدیلیاں ہوتی چلی جاتی تھیں، تبدیلیاں ہوتی چلی جاتی تھیں، تم ان تبدیلیوں میں سے ضرور گزرو۔

## خدا تعالیٰ تو انسانی ذات کو مقامِ بلند پر فائز کرنا چاہتا ہے

اس گردشِ بہم میں سے گزر رہے گزرنا بڑا ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تم ان تبدیلیوں میں سے کاہے کے لیے گزرو؟ کہا کہ یہی منزل مقصود نہیں ہے کہ یہ جو مادی بیکر کی زندگی ہے اس میں گردشِ افلاک کے نیچے یہی گردشیں ہوتی ہوئی چلتی جائیں اور اس کے بعد تم ایک دن ختم ہو جاؤ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا سے ”وقار“ نہیں چاہتے۔ وقار تو ہمارے ہاں لفظ ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وقار یا وقار کے معنی ہوتا ہے کہ ”کوئی چیز جو متحرک ہو وہ کسی مقام کے اوپر آ کر اتنی مستحکم ہو جائے کہ پھر اس میں کوئی Disintegration (انتشار) نہ ہو اسے عربی زبان میں وقار کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ تم کو کیا ہوا، تم چاہتے کیوں نہیں کہ ان اطوار میں سے ان ادوار میں سے ان گردشوں میں سے گزرنے کے بعد تمہاری ذات کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ محکم ہو جائے اسے وقار مل جائے۔

## ذاتِ انسانی کو مستحکم کرنے کی خاطر ارادے کا محکم ہونا لازم ہے

اور یہ جو ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا (71:13) ہو۔ اس کے معنی یہ ہو گئے کہ وہ از خود ہی محکم نہیں ہو جاتی۔ اس کی وجہ لا ترجون ہے، تمہیں اس کے لیے آرزو کرنی چاہیے، تمنا پیدا کرنی چاہیے، خواہش پیدا کرنی چاہیے، ارادہ پیدا کرنا چاہیے۔ تم کیوں نہیں اس قسم کا ارادہ کرتے، کیوں نہیں آرزو کرتے کہ تمہاری اس خودی کو جو وہ قطرہ نیساں کی طرح پانی کے قطرے کی

① وہ دودھ سے مکھن بن چکا ہوتا ہے۔ اگر اسے سارا دن لسی کے برتن میں رکھو اس کا پانی میں کچھ نہیں بگڑتا۔ (وہ مکھن کا مکھن ہی رہتا ہے۔)



طرح ہے وہ محکم ہو کر گہر تا بدار بن جائے۔ تم کیوں نہیں اس کی خواہش کرتے۔ تو گویا نظر آیا کہ اس میں انسان کا خواہش کرنا ضروری ہے اس پانی کے قطرے کو موتی بنانے کے لیے اس کی اپنی آرزو ارادہ اور عمل ضروری ہے۔ کہا کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ پانی کا ایک قطرہ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے ”اوہ ہر ایک داپانی دا قطرہ موتی بن جائے۔ ایہڑی وڈی متاع حیات کی ہو رہو سکدی اے!“<sup>1</sup> تم یہ کیوں نہیں چاہتے؟ کیا انداز ہے بات کہنے کا کہ تم سوچو تو سہی کہ اس میں تمہیں کتنا بڑا فائدہ ہے کیوں نہیں تم چاہتے کہ اس یونہی بننے والے پانی میں وقار پیدا ہو جائے اور وہ موتی ہو جائے۔ تصوف نے کہا کہ جی آپ جو کہتے ہیں وہ سارا کچھ غلط ہے زندگی کا حاصل یہ ہے ہی نہیں کہ یہ پانی کا قطرہ موتی بن جائے اور پھر اپنی ہستی کو برقرار رکھے۔ تصوف والوں کے نزدیک مقصد حیات ہی یہ ہے کہ ”عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا“ یعنی اس کی اپنی ہستی ہی ختم ہو جائے۔

### دنیاۓ تصوف نفس انسانی کے مقامِ بلند کی سوچ سے بہت بعید ہے

سارا تصوف یہ ہے کہ یہ جو کسی طرح سے یہاں سے روح کا حصہ آ گیا ہے کسی طرح سے پھر ایسا کر کے کہ یہ باقی تمہارے پاس الگ نہ رہے ”اوتھے چلا جائے تے اوہدے اچ جا کے جذب ہو جائے۔“<sup>2</sup> ”عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا“۔ اس کے لیے کہتے ہیں کہ فنا فی اللہ ہو جا۔ اور وہ جو مقام ہے جو قرآن دیتا ہے ”عزیزانِ من!“ وہ ہے وقار کا مقام: پانی کے قطرے کا موتی بن جانا۔ یہ شخص اقبالؒ یہاں تک لے جاتا ہے۔ وہ جاوید نامے میں کہتا ہے کہ آخر الامر وہ تمام اطوار طے کرتا ہوا منزل طے کرتا ہوا گردشوں اور کیفیات میں سے فلک در فلک افق در افق چلتا ہوا آخر میں جا کے وہ حضورِ کمال میں خدا کے سامنے جا پہنچتا ہے۔

### اقبالؒ کے الفاظ میں عظمتوں کے اس مقام پر ایک احتیاط کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا

وہاں پہنچنے کے بعد سنیے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وہاں پہنچ گیا تو احتیاط برتنا:

بخود محکم گذر اندر حضورش

بڑا سخت مرحلہ آ گیا ہے اس میں بڑی تپش ہے اس کے اندر بڑا سلاطم ہے۔

بخود محکم گذر اندر حضورش

مشو ناپید اندر بحرِ نورش<sup>3</sup>

1 وہ ہر ایک کا پانی کا قطرہ موتی بن جائے۔ اس سے بڑی متاعِ حیات اور کیا ہو سکتی ہے!

2 وہاں چلا جائے اور اس میں جذب ہو جائے۔

3 پرویز: مجلس اقبال حصہ دوم، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور، 1997ء، ص 30۔

اؤ تمہارے سامنے نور کا سمندر ہے۔ دیکھنا کہیں وہاں یہ نہ ہو جائے کہ تو اس کے اندر جا کر اپنی ہستی کو کھودے، ختم کر دے وہاں بھی اتنی احتیاط برتنا۔ سمندر ہے اس میں تو مدوجزر ہوتا ہے اپنی ہستی کو قائم رکھنا۔ میں نے کہا ہے کہ اگر آپ اس کے ایک شعر کا بھی تجزیہ کرتے چلے جائیے تو عجیب چیز ہوتی ہے کہ کنارے پہ تو کھڑا ہے، ٹھیک ہے احتیاط برتنا، نور کا سمندر ہے، یونہی تو اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں دور کھڑا ہوں، میری Entity میری Personality، میرا الگ تشخص قائم ہے۔ کہنے لگا کہ ذرا احتیاط برتنا، اس میں مدوجزر بھی ہوتا ہے، اؤ چھل مار کے باہر وی آ جا ندا ہوندا ای۔ بہا کے نہ کتھے لے جائے، بڑی احتیاط ورتیں،<sup>①</sup>

کیا ہے یہ جو کچھ کہہ گیا ہے؟ یہ کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا (71:13) اس زندگی کی آرزو کیوں نہیں کرتے کہ اس کے بحر نور کے کنارے بھی جا کر کھڑے ہو تو اس میں جذب نہ ہو تمہاری ہستی وہاں بھی قائم رہے صاحب! اور یہ جو قائم رہے تو اس قائم رہنے کا کوئی آخری مقام قرآن نے نہیں بتایا، عزیزانِ من! قرآن تو یہ کہتا ہے کہ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ (84:18) چاند بھی اس طرح اطوار بدلتا، کیفیات بدلتا، گردشوں میں گزرتا، بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پہلے دن کا چاند آخر تک وہ مکمل بن جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کے بعد پھر اس کے اندر زوال شروع ہو جاتا ہے، گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ کہا کہ تمہارے بڑھنے کی مثال یہ نہیں ہے۔ تمہارے بڑھنے کی مثال یہ ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) چاند کی سی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ وہاں ہو تو وہاں یہ نہ ہو کہ تم پیچھے ہٹ کے گھٹنا شروع کر دو، بلکہ اور بڑھتے چلے جاؤ، بڑھتے چلے جاؤ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں  
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

انسان کو تو درجہ بدرجہ بلندیوں کی ہی طرف بڑھتے جانا ہے

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کیا الفاظ ہیں صاحب! طبقاً بلندیوں کی طرف جانا۔ یہ چاند کے ادوار ہیں۔ یہ ایک مقام پہ جا کر رکتا ہے۔ جب بھی رکتا ہے تو کہیں کوئی شخص یہ نہ سمجھ لے کہ وہ وہاں کھڑا ہو سکتا ہے۔ رک جانا خود ضعف کی علامت ہے۔ دیکھنا، کہیں رک نہ جانا۔ کیا مثال ہے قرآن کی کہ چاند منزلیں طے کرتا ہوا، ایک مقام پہ جا کر مکمل بن کر، کیوں گھٹنا شروع ہو جاتا ہے وہ وہاں رک جاتا ہے، ترقی نہیں کرتا۔ یہاں کہا کہ رک نہ جانا کیونکہ:

مگر کوتاہی، ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری  
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے

① وہ لہروں کے ذریعے باہر بھی آ جاتا ہے۔ دیکھنا، وہ کہیں تمہیں بہا کر ہی نہ لے جائے۔ بڑی احتیاط برتنا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) بڑھتا چلا جا، انتہا کوئی نہیں۔ کوئی بتا نہیں رہا کہ یہ انتہا کیا ہے۔ اس کا خوبصورت انداز ہے:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

میرے نزدیک تیرے عشق کی انتہا وصال نہیں ہے۔ وصال تو اس تصوف کی رو سے ہے۔ جس میں ”عشرتِ قطرہ“ ہے۔ ”دریا میں فنا ہو جانا“۔ میں تو تیرے بحرِ نور کے کنارے کھڑے ہو کر بھی وصال نہیں چاہتا، اُن کے عشق کی یہ انتہا ہوگی، میرے عشق کی یہ انتہا نہیں ہے۔ ہوں تو سادہ سا، مگر بات تو میں نے ایسی کی ہے کہ: تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں، میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں تو وہ جو اس کے عشق کی انتہا ہے وہ اپنی ذات کا فنا ہو جانا نہیں ہے بلکہ اس کا محکم سے محکم تر ہوتے چلے جانا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ **ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ** (23:14) پھر ہم نے تمہیں کچھ اور بنادیا۔ اور یہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو کچھ اور بننا ہے یہ وہ چیز ہے جسے انسانی ذات، انسانی نفس، انسانی خودی، Psyche، اگر انگریزی کا لفظ لینا ہے تو Personality (شخصیت) کہتے ہیں۔

حقیقی عملِ خدا پرستی نہیں بلکہ احکامِ خداوندی کی اطاعت ہے جس سے انسانی ذات میں پختگی آتی ہے

اب آئی وہ ساری بات جس کے لیے ہمارے ہاں کا ایک لفظ ”خدا پرستی“ لیا گیا ہے وہ پرستی کا لفظ تو فارسی کا ہے۔ پوجا پاٹ کے معنی ہیں۔ یہ بڑا ہی غلط معنی ہے۔ عبد تو پرستش نہیں ہے، وہ خدا کی Worship (پرستش) نہیں ہوتی۔ وہ تو ہمارے سامنے اپنی ذات کے پختہ کرنے کے لیے ذاتِ خدا کا ایک Standard (معیار) ہے اور:

"The most developed complete form of personality" ہے۔

ذاتِ خدا کی جو صفات گنائی گئی ہیں، وہ اس کے Various Attributes یا Facets ہیں۔ جتنی انسانی ذات پختہ ہوتی چلی جائے گی، اس میں وہ جو صفاتِ خداوندی ہیں، وہ علیٰ حدِ بشریت منعکس ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ وہ Standard (معیار) ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ خدا کے ساتھ ہمارا یہ تعلق اس جیسا ہوتے جانا ہے: اس کے لیے قرآن کی بڑی خوبصورت تشبیہ ہے: **صِبْغَةَ اللَّهِ** (2:138)۔ یعنی اللہ کے رنگ میں رنگے جاؤ۔

اب انسان میں کیا کیفیات آتی ہے، میں ان میں سے کیا کیا بیان کروں اور کسے چھوڑوں! کتنے دھبے کپڑے پہ ہوں، کتنے مختلف رنگ کپڑے کے اوپر ہوں، ایک جو گہرا رنگ ہے، وہ اس میں دے دیجیے، وہ سارے پہلے اختلافات جو آپ کے ہیں، مٹ جاتے ہیں جیسے

ابھی پیدا ہوا۔ یک نگہی کی خاطر ایک ملت کی تشکیل ایک نظریہ حیات کی متقاضی ہے۔ اگر تیری جماعت کے کپڑے اس رنگ میں رنگے گئے ہوں تو یہ یک نگہی اور یک رنگی، ایک ہی رنگ میں رنگے جانے کی مثال ہے۔

چست ملت اے کہ گوئی لا الہ

قرآن سے لا الہ کہنے والے! تمہیں پتہ ہے کہ لا الہ کہنے والے جب اجتماعی شکل اختیار کرتے ہیں تو وہ کیا ہوتا ہے۔

با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

آنکھ کی تو خوبی یہ ہے عزیزانِ من! کہ آپ کو چیزیں ایک نظر آتی ہیں حالانکہ یہ دو آنکھیں ہیں۔ ان دو آنکھوں میں سے جو نظر نکلتی ہے وہ اگر کبھی آخر تک الگ الگ رہے تو ساری چیزیں دو دو نظر آئیں، تو آپ ایک قدم نہیں چل سکتے۔ یہ جو اس کے اندر فطرت نے انداز پیدا کیا ہے کہ یہاں سے دو نگاہیں نکلتی ہیں آگے چل کر ایک ہو جاتی ہیں وہاں سے دو آنکھوں میں ایک شے آتی ہے الگ الگ اس کا اثر ہوتا ہے اندر اس قسم کا اس نے بنا دیا ہے کہ وہ دونوں جا کر یککھت ایک نقطہ میں مل جاتی ہیں۔ تب یہ چیزیں آپ کو یوں ایک نظر آتی ہیں۔ اور اگر ”با ہزاراں چشم بودن یک نگہ“ لاکھوں آنکھیں ہوں اور آگے جا کر وہ ایک نصب العین کے اوپر جم جائیں، کہتا ہے کہ جب افراد میں یہ کیفیت پیدا ہو تو اسے جماعت یا ملت یا قوم کہا جاتا ہے۔ بہر حال خدا کے ساتھ تعلق یہ ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے عطا کردہ نظریہ حیات کو نہ اپنانا، خدا کو فراموش کرنا ہی نہیں، بلکہ اپنی ذات کو بھی

بھلا دینا ہے

دو لفظوں میں عزیزانِ من! یہ عرض کر دوں کہ جسے ہم خدا کا ذکر یا خدا کو یاد کرنا کہتے ہیں وہ بات تو میں کرونگا۔ وہ کہتا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ (59:19) ان جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا۔ جیسے خدا کو فراموش کر دینا کہتے ہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فَانْسِلْهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19) وہ خود فراموش ہو جاتے ہیں ان کی جو ذات ہے وہ بھول جاتی ہے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے یہ حیوانات کی سطح پہ آ جاتے ہیں یورپ کے ریسرچ اسکالرز کی سطح پر کہ انسان حیوان ہے۔ خدا فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی ہے۔ جو نبی انسانی ذات کا تصور آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہوا، سمجھ لیجیے کہ آپ خدا کو بھلا بیٹھے ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938ء) پھر یاد آ جاتا ہے۔ اس کے بغیر میرا تو چارہ ہی نہیں ہو سکتا۔

منکر حق نزد ملا کافر است

ٹھیک ہے ملا کی شریعت کی رو سے خدا کا منکر کافر ہے لیکن

منکر خود نزد ما کافر تر است

میرے نزدیک جو اپنے آپ کو بھول جاتا ہے وہ کافر تر ہے۔ خدا کو بھول جانے والا خدا کا منکر ہے۔ خدا کا منکر تو کافر ہوتا ہے لیکن ”منکر“ خود نزد ما کافر تر است۔“ <sup>1</sup> اقبالؒ (1877-1938ء) انسان سے کہتا ہے کہ

شاخ نہالِ سدرہ خار و خس چمن مشو

تجھے پتہ بھی ہے کہ تو کس شجر طیب کی ایک شاخ ہے۔ وہ جو کہا تھا کہ خدا نے کہا ہے کہ میں نے اپنی توانائی کا شمع دیدیا ہے، کس خوبصورت انداز میں اس کو بتاتا ہے کہ

شاخ نہالِ سدرہ خار و خس چمن مشو

سدرہ اس طرح ہے۔ بہر حال ذاتِ خداوندی سے تعلق کی بات آئے گی تو عرض کرونگا۔ تو تو اس شجر طیب کی ایک شاخ ہے تو اپنا یہ مقام پہچان اپنے آپ کو اس دنیا کے باغ کا خار و خس نہ سمجھ لے۔ ”شاخ نہالِ سدرہ“، تو تو اس شجر طیب کی ایک لہلہاتی ہوئی شاخ ہے اپنے آپ کو خار و خس چمن کیوں سمجھ رہا ہے۔ اگلے مصرعے میں کہتا ہے کہ

منکر او اگر شوی، منکر خویشتن مشو

اگر تمہیں کبھی مغالطہ ہو گیا ہے اس کا انکار بھی کر بیٹھا ہے تو اپنا انکار نہ کر۔

اپنی ذات کا انکار خدا کی ذات کے انکار سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے

”اپنا انکار نہ کر۔“ یہ ہے عزیزانِ من! انسان ہونے کا مقام یہ ہے خدا کے ماننے کا مقام یہ ہے ایمان یہ ہے کفر اور ایمان کا فرق۔ یہ قطرہ نیساں یہ پانی کا قطرہ گہرا اور موتی بنتا ہے۔ اسی دنیا کے تلاطم خیزیوں کے اندر چکر کاٹتا ہے۔ یہ مقصد ہے اس دنیا کی زندگی کا انسان کے لیے وہ ہے ہی یہ سارا مقصد کہ اس کی ذات جو اسے غیر نشوونما یافتہ صورت (Undeveloped Form) کے اندر ملی ہے وہ Develop ہو جائے وہ جو اس کے اندر پانی کی سی کیفیت ہے یونہی ہر شے میں جذب ہو جانا اس میں وقار پیدا ہو جائے اس میں ثبات پیدا ہو وہ محکم ہوتی چلی جائے اور کہیں جا کر اپنا الگ تشخص نہ کھودے۔ یہ ہے مقصد اس دنیا کی زندگی کا۔ ایک اور شعر آ گیا۔ وہ پوچھ رہا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ پھر کہتا ہے:

مقام پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن  
نہ سیر گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

1 میرے نزدیک اپنے آپ کو بھول جانا کافر تر ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! چلتے چلتے ذرا سیر ہی کرتے چلیں۔ کہتا ہے کہ یہ تو مقصد نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

(اقبال: بال جبریل)

ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (23:14) پھر ہم نے تمہیں کچھ سے کچھ بنادیا۔ اور اس کے بعد ہے کہ فَتَبَرَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (23:14) خدا کا خالقین میں سے احسن ہونا، یہ بات ہے کہ تمہیں کچھ سے کچھ بنادیا، اس سے نیچے درجے کا مکینکل فارم کا حیوان تو شاید یہ اور بھی بنا چھوڑے۔ یہاں خالقین کہا ہے۔ یہاں اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس کو مانتا ہے کہ خالق اور بھی ہو سکتے ہیں، ایجادات کر سکتے ہیں۔

میں عرض کر دوں کہ فاطر اور خالق میں فرق کیا ہوتا ہے؟ خدا نے اپنے آپ کو فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ کہا ہے۔ فاطر وہ ہوتا ہے جو پہلے کسی میٹرل کے بغیر کوئی چیز وجود میں لے آئے اور عام طور پر خالق وہ ہوتا ہے جو پڑے ہوئے میٹرل کے اندر کچھ ترتیب، کچھ Proportion (تناسب) وغیرہ ادھر ادھر کر کے کوئی نئی چیز بنادے جسے ایجاد کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ احسن الخالقین ہے۔ خالق اور بھی ہو سکتے ہیں جہی تو خالقین کہا ہے کہ ہو سکتے ہیں لیکن وہ احسن الخالقین نہیں ہو سکتا۔ اور وہ جو خلقت کا احسن مقام ہے وہ کیا ہے؟ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (23:14) یہ انسانی ذات، انسانی خودی ہے، جب یہ دی ہے تو کہا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ<sup>①</sup> (95:4)۔ دیکھیے یہاں بھی احسن ہے اور کتنا خوبصورت لفظ ہے! حسین ترین بھی اگر اس کا ترجمہ کر دیا جائے تو بڑی عجیب چیز ہے۔ تو حسن انسانی اس آب و گل کے پیکر سے نہیں ہوتا، اس کا حسن اس کی اس ذات کی رعنائیوں اور زیبائیوں کا نام ہے عزیزانِ من! اور اعمالِ حسنہ یا حسنات وہ ہیں جو انسان کے اندر وہ حسن پیدا کریں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 14 تک آگئے۔ آئندہ ہم 15 ویں آیت سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



① اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، پارہ 30 مکمل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2006ء

## پانچواں باب: سورة المؤمنون (آیات 15 تا 22)



عزیزانِ من! آج مئی 1977ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 15 سے ہو رہا ہے: (23:15)

**کفر اور اسلام کا مدار انسانی ذات یا خودی کے صحیح تصور پر ہے**

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں موضوع زیرِ نظر انسانی ذات یا نفسِ انسانی تھا جسے میں نے کہا تھا کہ اقبالؒ (1877-1938) نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اُسے Self بھی کہا جاتا ہے۔ الفاظ اس کے لیے مختلف ہیں۔ میں یہ عرض کر دوں کہ یہ Self یا نفس یا ذات کی بات محض ایک Academic Question (علمی سوال) نہیں ہے، کوئی علمی یا نظری بحث ہی نہیں ہے۔ سائیکولوجسٹ کے نزدیک تو یہ بات نظری سی ہے اور اگر وہ اس طرح سے اس سے آگے چلتے ہیں تو اسے طب یا میڈیسن یا ڈاکٹری تک لے جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں طب ہے Medicine ہے ڈاکٹروں کا ایک میدان ہے وہ اسے یہیں تک لے کر آئے ہیں۔ ہمارے ہاں تو آج تک کبھی کسی نے غور ہی نہیں کیا۔ میں عرض کروں کہ جنہوں نے اس پہ غور کیا ہے انہوں نے اس کا ستیاناس کر دیا۔ اصل چیز یہ ہے کہ یہ وہ اہم سوال ہے

جس پر کفر اور اسلام کا مدار ہے۔

### خدا کے صحیح تصور کے بغیر مسلم اور کافر کا فرق متعین نہیں ہوتا

محض خدا کے ماننے سے کوئی شخص مومن یا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ساری دنیا بھری پڑی ہے، انہیں چھوڑ دیجیے جو خدا کی ہستی کا انکار کرتے ہیں، باقی ساری دنیا خدا کا اقرار کرتی ہے۔ خدا ہی کا اقرار اگر انسان کو مومن یا ہماری اصطلاح میں مسلمان کر دیتا ہو تو پھر غیر مسلم تو کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ یہ جن کے ساتھ سب سے پہلے تصادم ہوا یعنی عرب میں قریش کے ساتھ، مکہ والوں کے ساتھ، حجاز والوں کے ساتھ، عرب کے ساتھ، ساری دنیا کے ساتھ، وہ سب خدا کو مانتے تھے اور اہل کتاب تو خدا کے علاوہ انبیائے کرام کو بھی مانتے تھے، کتابوں کو بھی مانتے تھے۔ خود یہ جو قریش تھے، جو سب سے زیادہ مقابل پہ آ رہے ہیں، اور ہم سمجھتے ہیں کہ سب سے اشد ترین درجے کے وہ کافر اور مشرک تھے، قرآن اس کے لیے شاہد ہے کہ جب ان سے پوچھو کہ وہ زمین آسمان کس نے بنائے، وہ کہیں گے خدا نے بنائے ہیں، وہ خود خدا کے قائل تھے۔ تو کیا بات تھی کہ پھر ان کو اس قدر انتہائی درجے تک وہ لے گئے۔ ساری عمران کے ساتھ تصادم رہا۔ یہ کس چیز پہ تھا؟ بات ذرا گہرے دل سے سوچنے کی ہے۔ وہ نفس انسانی کا انکار تھا۔ خدا کا انکار نہیں تھا۔

### آج دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ابتری کی وجہ جواز اور اس کا حل

میں پھر یہ عرض کر دوں کہ آج بھی اگر یہ طب میں یا ادویات میں آئے ہیں تو آپ اس کو سائیکولوجی (Psychology) کا یا سائیکی (Psyche) کا ہی مسئلہ نہ سمجھ لیجیے گا، یا وہ نفس ہی کا نہ سمجھ لیجیے گا۔ یہ اگلی بات ہے اور بڑی اہم چیز ہے۔ آج دنیا میں جس قدر ابتری پھیلی ہوئی ہے غیر مسلم ہوں یا مسلمانوں کا ملک ہو، وہ ساری اس چیز کے اوپر ہے کہ قرآن نے جو تصور انسانی ذات کا دیا ہے، اس کا انکار ہو رہا ہے۔ ہر جگہ انکار ہو رہا ہے۔ مسلمان کے ہاں بھی انکار ہو رہا ہے، غیر مسلم کے ہاں بھی انکار ہو رہا ہے اور انسان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے جب تک کہ اس چیز کے اوپر یقین محکم نہ ہو جائے۔

یہ چیز کیا ہے؟ میں نے کچھ دفعہ عرض کیا تھا؟ قرآن کا جو دیا ہوا تصور ہے، اسے ذرا غور سے سمجھیے تو بات کچھ سمجھ میں آ جائے گی۔ میں نے یہ جو قرآن کی آیت ہمارے زیرِ درس تھی، اس میں بتایا تھا کہ حیوانات کی سطح تک انسان اور حیوان وہی مدارج طے کرتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ رحمِ مادر کے اندر بکری کا بچہ بھی وہی مدارج طے کرتا ہے، جو انسان کا بچہ یعنی جنین طے کرتا ہے، بجز اس کے کہ آگے جا کر جو قرآن نے کہا تھا کہ وہ خلقتاً آخر ہو جاتا ہے یعنی یہ کچھ اور مخلوق بن جاتا ہے، اس سے پہلے تک تو یہ دونوں یہی مدارج طے کرتے ہوئے باہر آتے ہیں۔



## حیوان ہمیشہ ہر جگہ مکمل شکل میں دنیا میں آتا ہے جبکہ انسان کی یہ کیفیت نہیں ہوتی

انسان اور حیوان میں فرق کیا ہوتا ہے؟ بکری کے بچے نے جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ بن چکا ہوتا ہے۔ اسے غور سے سمجھیے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ اس نے جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ بننا بنایا ہی آتا ہے اس کو صرف پرورش کی ضرورت ہوتی ہے یہ کھانے پینے کی چیزیں آخری عمر تک دیتے چلے جائے جب تک اس نے جینا ہے بکری کی بکری رہے گی۔ اور وہ آج کا بچہ نہیں بکری کا وہ لاکھ سال پہلے کا بھی جو کبھی بکری کا کہیں سے ڈھانچہ نکلتا ہے یورپ کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ وہی ہوتا ہے جو آج کی بکری کا ہوتا ہے۔ یہ جو Animals (حیوانات) ہیں وہ Complete Form (مکمل شکل) کے اندر دنیا میں آتے ہیں۔ یہ ان کی Pre-formation<sup>1</sup> (اولین ساخت) ہوتی ہے۔ یہ بن چکے ہیں جو کچھ انہوں نے بننا ہوتا ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ کچھ بننے کے لیے ایک ہیولا سا ہوتا ہے ایک میٹرل ہوتا ہے یوں سمجھیے کہ وہ چاک پہ بیٹھے ہوئے کمہار کے پاس مٹی کا ایک تھوہہ سا ہوتا ہے۔

## حیوان کے مد مقابل انسان کے سامنے زندگی کا ایک عظیم مقصد ہوتا ہے

آدم کے معنی ہیں: ”گوندھی ہوئی مٹی“۔ بنایا ہوا تو یہ حیوان ہوتا ہے۔ اسے آخری عمر تک سامان پرورش دیئے چلے جائے یہ حیوان کا حیوان ہی رہے گا لیکن انسان میں کچھ اور بننے کی صلاحیت ہے۔ حیوان سے وہ جو کچھ اور بننا ہے اس پر سپس (عمل) کا نام اسلام ہے یہ کچھ بن جانے کا نام مومن ہے۔ اس بات پر ایمان کہ جو کچھ میں پیدا ہوا ہوں یہ میرا منتہا نہیں ہے بلکہ کچھ بن جانا میری زندگی کا مقصد ہے۔ یہ کچھ بن جانے والی جو بات ہے یہ ہے وہ انسانی ذات یا نفس پر ایمان۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ یہ جسم نہیں کچھ بنتا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے حیوان کا جسم اور انسان کا جسم ایک ہی ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں اس کے لیے کوئی موزوں لفظ نہیں ہے غالب<sup>2</sup> نے کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی امتیاز کی چیز سامنے لاؤں کہ

<sup>1</sup> یہ حیاتیاتی نظریہ کہ کسی عضویہ کی نشوونما مکمل طور پر اس کے سائز میں ہی ہوتی ہے کیونکہ جرم خلیہ میں تمام اجزاء مُصَغَّر موجود ہوتے ہیں یا زیادہ بہتر انداز میں یہ کہ

A biological theory that all parts of a future Organism exist completely formed in the germ cell and develop only by increasing in size (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited, p.1216).

<sup>2</sup> مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869)

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اچھا کر گیا ہے ہمارے لیے۔ یہ لوگ کام کی بات کر جاتے ہیں۔ اس نے جو یہ دو لفظ کہہ دیئے ہیں کہ یہ پیدا ہوتا ہے تو وہ آدمی ہوتا ہے اور اس نے انسان بننا ہوتا ہے اس لیے کہا کہ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اب یہ جو کچھ اس نے کہا ہے میں اس کو ہیولا کہتا ہوں۔ وہ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ مٹی کا تھوبہ ہو گیا۔ اس سے ذہن میں ذرا ٹھیک تصور آ جاتا ہے کہ چاک پہ چڑھنے سے پھر اس کے بعد وہ کچھ سے کچھ بنتا چلا جاتا ہے۔

قدرت صرف آدمی پیدا کرتی ہے انسان اس نے خود بننا ہوتا ہے

وہ جو میں نے کہا تھا کہ خَلَقًا آخَرَ (23:14) یہ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ یہ ہے اصل چیز۔ جتنی تگ و تاز دنیا میں ہو رہی ہے یہ انسانی جسم کے کچھ کرنے کے لیے ہو رہی ہے خواہ وہ چاند پر بھی کیوں نہ اٹھ کر چلا جائے۔ یہ جو کچھ سے کچھ اور بننے کی بات ہے یہ ہے جو اسلام نے پروگرام دیا اور قرآن نے اس کا Process (عمل) بتایا ہے اور یہ ہے اس کے اندر وہ شے جو جس میں کچھ بننے کی صلاحیت ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ یہ بنانا نہیں ہے۔ کچھ بننے کی صلاحیت کے متعلق تو قرآن نے کہا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (95:4)۔ یہ اس چیز کا قوام کیا بنا ہوا ہوتا ہے؟ انسان بننے کی صلاحیت کے متعلق یہاں کہا ہے کہ اس میں ایک ایسی چیز رکھی ہے جو ایک حسین ترین چیز ہے۔ وہ اسے دیدی گئی ہے جس سے اس نے خود کچھ بننا ہے۔ اور خود بننے کے متعلق کہا کہ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ<sup>①</sup> (95:5)۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اسی سامان سے اسی مٹی سے چاہے تو بدترین قسم کا یہ کچھ بن سکتا ہے اور اسی سے چاہے تو پھر یہ پوچھو کہ کہاں چلا جاسکتا ہے۔ کچھ بن جانے اور بگڑ جانے کی صلاحیت اس میں ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ یہ بنانا ہوا نہیں ہے بڑی اہم ہے۔ پھر میرے سامنے وہی اقبالؒ (1877-1938ء) آ جاتا ہے اور پھر وہی دشواری آ جاتی ہے کہ شعر فارسی میں ہے اور پھر اتنا اہم مسئلہ ہے۔ لیکن جس طرح سے وہ بات کر جاتا ہے کوئی دوسرا اس انداز کا ہے نہیں جہاں میں اس سے بدل سکوں۔ ہمارے ہاں اردو کے متعلق بھی تو اتنا ہوتا تھا۔ اقبالؒ کی جو بھی اردو ہے وہ اس میں بھی کہیں کہیں اس مقام تک پہنچ جاتا ہے لیکن جیسا (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1797-1869) نے کہا تھا کہ فارسی بھی اہم ہے اسی طرح اقبالؒ (1877-1938) کے ہاں بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

یکے در معنی آدم نگر! از ما چہ می پرسی

① اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص-1463)۔

میں نے کہا تھا کہ آدم کا ایک معنی گوندھی ہوئی مٹی بھی ہوتا ہے۔ تو اس کے معنی وہ ہیں کہ کچھ بننے کے لیے مضطرب و بیقرار تڑپ اس کے اندر ہو۔ اب دیکھیے کہ اس کا استعارہ کتنا خوبصورت ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ یوں سمجھیے کہ ایک شاعر کے ذہن میں ایک خیال دل افروز ہے:

یکے در معنی آدم نگر! از ما چه می پرسی

ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

شعر کا مفہوم تو ذہن و قلب میں آ گیا ہے، لیکن ابھی وہ مصرع موزوں نہیں بنا، خیالات کی شکل میں ہے، اس کے لیے کچھ موزوں الفاظ ہیں ان کی تلاش ہے۔ وہ آ بھی جاتے ہیں تو پھر وہ موزوں ہیں۔

### خلد کا قرآنی مفہوم

خلد کا یہ لفظ تو ‘عزیزانِ من! اللہ آپ کو ذوق بخشے‘ تو پتہ چلے گا کہ یہ بات کیا کر جاتا ہے! اس کے لیے بیسیوں الفاظ آ سکتے تھے ”ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے“۔ کچھ بننے کے لیے بتاتی ہے۔ اب یہ شاعر بتا سکتا ہے کہ ذہن میں خیال آیا ہوا ہو اور کچھ الفاظ ملیں، کچھ نہ ملیں اور وہ مصرع موزوں نہ بن رہا ہو، تو وہ جو اس کی کیفیت ہوتی ہے، جو اس کی خلش ہوتی، وہ ہے ”ہنوز اندر طبیعت می خلد“ اور ”چنان موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں رادل از تاثیر او پر خوں شود روزے“۔ یہ مضمون تو ایسا ہی ہے جیسا شاعروں کے سامنے بھی ہوتا ہے ”پیش پا افتادہ“ کچھ نہ بھی بنا ہوا ہو تو کیفیت یہ ”چنان موزوں شود“ اور اس طرح سے موزوں ہوگا۔ ”کہ یزداں رادل از تاثیر او پر خوں شود روزے“۔<sup>1</sup>

### خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کے فرشتے مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں

یہ جس نے اس کو یہ صلاحیتیں دی تھیں وہی جب اس کو دیکھے گا تو کہے گا کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56) ”او صدقے تیرے کی بن گیا اے توں! خدا اور اس کے فرشتے تحسین و تبریک کے پھول نچاؤ کرتے ہیں۔ لیکن خدا صرف ایک ذات کے اوپر اکتفا نہیں کرتا کہ یہ وہی ہے جو کچھ بن گیا۔ هُوَ الَّذِیْ یُّصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلَائِكَتُهُ (33:43) اور جماعتِ مومنین! تم آدمی سے انسان بن گئے ہو، تو خدا اور اس کے فرشتے تم پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے صرف نبی پر درود و سلام بھیجنے کی بات نہیں کہی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ هُوَ الَّذِیْ یُّصَلِّیْ عَلَیْکُمْ<sup>2</sup> (33:43)۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک اچھا شاعر سننے سے زبان پر بے ساختہ بات آ جاتی ہے، کتنی خوبصورتی سے اقبالؒ نے یہ کہا کہ

1 او میں تیرے قربان جاؤں تو کیا سے کیا بن گیا!

2 قوانینِ خداوندی کی برکات سے تم پر تبریک و تہنیت کے پھول برسریں گے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-977)۔

چنان موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے  
کہ یزداں رادل از تاثیر او پر خوں شود روزے

## قرآن حکیم نے اپنے ہاں آدم اور انسان میں واضح فرق بیان کیا ہے

یہ مقام انسان آدم سے انسان بننے کے لیے ہے۔ آدم کے متعلق تو قرآن نے کہا ہے کہ اس کی ابتدا سُلَلَةٍ مِّن طِينٍ (23:12) سے کی اور پھر یہاں سے گزرا اور یہ مراحل طے کیے۔ یہ سارے حیوانی مراحل ہیں۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ<sup>①</sup> (95:4)۔ یہاں آدم نہیں کہا، انسان کہا ہے۔ تو یہ بنایا ہوا Complete (مکمل) نہیں آیا۔ اگر یہی صورت ہو کہ جیسا یہ پیدا ہوا ہے، ویسا ہی مرجائے یعنی بڑا ہوا، توانا ہو گیا، تندرست ہو گیا، امیر ہو گیا، یہ سب کچھ کر لیا، چاند پہ بھی چلا گیا، مگر وہ حیوان کا حیوان ہی رہتا ہے لیکن جو انسان بننا ہے، یہ ہے جو اس کے اندر Changes (تغییرات) واقع ہوتی ہیں۔ یہ وہ اطوار آہیں جو میں نے کہا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ اطوار آپیدا کیا۔ ”طور“ جو ہوتا ہے وہ اندورنی کیفیات کا نام ہوتا ہے، بیرونی طور پر تو وہی ہوتا ہے، اس میں کیا تبدیلی ہوگی۔ اس کے اندر جو تغیرات ہوتے ہیں، ان سے وہ طور سے بے طور ہوتا چلا جاتا ہے، اطوار آہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ وہ تدریجاً ہوا ہے۔ اس طرح سے اطوار کی کیفیت ہوتی ہے، کچھ اور ہوتا جاتا ہے کچھ اور بننا چلا جاتا ہے۔ اب یہ جو ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ<sup>②</sup> o ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ<sup>③</sup> o إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا<sup>④</sup> (95:4-6)۔ اس بدلنے میں یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے اندر Integration (محکمیت) اور Disintegration (انتشار و خلفشار) ہے۔ حیوانی سطح سے آگے اس کے اندر دونوں طرح کے امکانات ہیں۔ Disintegration- (انتشار و خلفشار) بھی تو اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کہیں اس میں جمود آ جائے تو چاک کی وہ گردشیں ہیں، اسے کچھ سے کچھ بنادیتی ہیں، ویسے اگر آپ مٹی یہاں رکھ دیجیے تو اس میں سے کچھ نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ<sup>⑤</sup> (95:5)

① ہم نے انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ یہ اپنی ذات کی نشوونما کر کے حسن کا رانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کرے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1463)۔

② ہم نے انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ یہ اپنی ذات کی نشوونما کر کے حسن کا رانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کرے لیکن اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں۔ حیوانی زندگی کے اس پست مقام سے انسانیت کی بلند سطح پر آنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان توازن خداوندی کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو جائے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1463 تا 1464)۔

③ حیوانی زندگی کے پست مقام پر چلا جاتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1463)۔

ہی رہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جو قرآن کہتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے اور یہ کہ اس میں اس کے امکانات رکھے ہیں کہ یہ کیفیات بدلتا چلا جائے، یہ ہوگا کیسے؟

### قرآن حکیم کی تعلیم کا بنیادی مقصد انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرنا ہے

انسان نے جو کیفیات بدلی ہوں اس کی کچھ سمت بتائی ہے کہ یہ کس طرح سے کیا ہوگا کہ پستی کی طرف چلا جائے گا؟ کہا کہ سنو لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) وہ درجہ بدرجہ طبقاً عن طبق ہوا۔ لَتَرْكَبُنَّ کیا بات ہے! صاحب! بلند ہوتا چلا جائے گا، اوپر چڑھتا چلا جائے گا۔ یہ ہے قرآن عزیزانِ من! میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کا بنیادی عمودی موضوع انسان کو اس کے مقام سے آشنا کر دینا ہے۔ آدمی کی سطح کے اوپر تو وہ جیسے پیدا ہوتا ہے، کھاتا پیتا ہے، مرجاتا ہے، معاملہ ختم ہو گیا، لَتَرْكَبُنَّ کہاں ہوا؟ نہ اطوار بدلے نہ وہ کیفیت ہوئی۔ قرآن کہتا ہے کہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ جسے انسا الیہ راجعون کہتے ہیں، یہ اس کی طرف جانے والی بات ہے۔ جس کی طرف جانے والی بات ہے اس کو ابتدا سے اس نے ”ذی المعارج“ کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا۔ سیڑھی کے ہر ڈنڈے کے اوپر آپ چڑھیں گے تو پہلے سے آپ اونچے ہو جائیں گے۔ قرآن کے کیا الفاظ ہیں! ہر قدم اوپر جائے گا۔ یہ ہے لَتَرْكَبُنَّ۔

### قرآنی اقدار پر عمل پیرائی کا نتیجہ ہر قدم پر رفعت کی شکل میں سامنے آتا ہے

انسان کی ذات کے اندر یہ جو Changes (تغیرات) آتے ہیں یہ ہیں جو اسے قطرے سے گوہر بنا دیتے ہیں، یہ ہیں جو اس میں یہ کیفیات پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا چلا جائے۔ یہ انسانی ذات یا انسانی نفس کے اندر جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں، یہ ہے وہ پروسس (عمل) جسے آپ اسلامی زندگی کہتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے ان اقدار یا Values کے مطابق زندگی بسر کرنے سے جو قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ پیمانے ہیں، سطح زندگی کے لحاظ سے، پیمانے بدلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہیں وہ جنہیں اعمالِ صالحہ کہتے ہیں۔ خدا نے قرآن کریم میں کہا ہے کہ اس کے اندر ہم نے Undeveloped Form (غیر نشوونما حالت) کی صورت میں، صلاحیتیں دی تھیں وہ اسے Develop (نشوونما) کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اعمال ان کی صلاحیتوں کو Develop (نشوونما) کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ کچھ سے کچھ بنتا چلا جاتا ہے لیکن کچھ سے کچھ بننے کا معیار لَتَرْكَبُنَّ ہے یعنی پہلے درجے سے یہ ایک درجہ اوپر جائے گا، اور اس طرح سے چڑھتا چلا جائے گا۔

### نیک و بد اعمال کے نتائج انسانی ذات پر نفسیاتی اثرات کی شکل میں مرتب ہوتے ہیں

یہ پروسس (عمل) کیا ہے؟ جسے اب میں انسانی ذات کہوں اس میں جو تغیرات ہوتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ اب

یہاں قرآن کی رو سے دیئے ہوئے نفسِ انسانی کے تصور میں اور یہ جو Academically (علمی لحاظ سے) ہمارے ہاں سائیکولوجیکلی (نفسیاتی طور پر) یا Personality (شخصیت) کے متعلق کہا جاتا ہے سے یہ فرق پڑ گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس کے دو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہم تو انہیں نیک اعمال اور بد اعمال کہتے ہیں اچھے اور برے کام کہتے ہیں۔ اچھے اور برے اپنے اپنے معاشرے میں تواضانی سی چیز ہوتی ہے۔ لیکن قرآن جو کہتا ہے وہ ہے اصل شے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال بھی دو قسم کے اثرات پیدا کرتا ہے: ایک وہ ہوتے ہیں جس سے انسان کی جو Personality (شخصیت) ہے وہ پختہ ہوتی ہے Develop (نشوونما) ہوتی ہے یہ قطرہ نیساں پختگی حاصل کر کے تھوڑا سا گوبہ بنتا ہے۔ یہ وہ اعمال ہیں جنہیں وہ حسنات کہتا ہے ان میں توازن پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ Balanced Personality (متوازن شخصیت) کا لفظ ان (Psychologists) (ماہرینِ نفسیات) کے ہاں آیا تھا۔ وہ تو قرآن بتاتا ہے کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے ثُمَّ سَوَّكَہ (18:37)۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ Balance (توازن) ہے کہ وہاں جب اس میں تغیر پیدا ہوتا ہے اس کی ذات کے اندر پختگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے وہ Balance (متوازن) ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری قسم کے وہ اعمال ہیں جن کے اثرات سے ذات نا پختہ ہوتی ہے کمزور ہوتی ہے مضلل ہوتی ہے۔ کچھ تھوڑا سا بنا ہوا یہ انسان پھر ان کے ہاں واپس آ جاتا ہے۔

### انسانی ذات پر مرتب ہونے والے اثرات دو قسم کے ہوتے ہیں

عزیزانِ من! میں نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ قرآن کی رو سے انسان کا ہر عمل اس کا ہر ارادہ اس کی ذات یعنی اس کے نفس پر ایک اثر پیدا کرتا ہے اور یہ اثرات دو قسم کے ہوتے ہیں: جن سے یا تو وہ ذات پختہ ہوتی ہے اوپر جانے کے قابل بنتی ہے اور یا وہ کمزور ہو جاتی ہے وہ نیچے گر جاتی ہے۔ یہ پروسیس (عمل) پوری عمر اس پہ جاری رہتا ہے۔ یہ جو تصور ہے یہ جو نظریہ ہے اس پر ایمان ہے کہ میں اپنے ہر عمل سے اپنے آپ کو کچھ بنا رہا ہوں: یا تو انسانیت کی سطح سے نیچے گر رہا ہوں یا اسے اوپر لے جا رہا ہوں۔ یہ وہ نظام ہے جس میں اس پر ایمان ہوتا ہے کہ میرے ہر عمل کا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

### جسمانی موت کے بعد زندگی کا اگلا پروسس مزید ارتقائی منازل کی طرف

اب اس کے بعد عزیزانِ من! آج کے درس کی یہ پہلی آیت آگئی کہ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُونَ (23:15) یہ پروسس (عمل) جاری رہتا ہے تاکہ جو جسم تمہارا ہے وہ ایک دن Disintegrate (منتشر) ہو جاتا ہے۔ اگر تو یہ حیوانی سطح ہے تو دونوں ختم ہو گئے خواہ آسمان پہ جائے خواہ وہ چاند پہ جا کر ختم ہو جائے یا یہاں کہیں زمین پہ ختم ہو جائے۔ اگر وہ آدمی کی سطح کے اوپر ہے تو وہ جسم تو

موت سے ختم ہوا لیکن اگر وہ دوسری سطح یعنی انسان کی سطح پہ ہے تو تُمْ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ تُبْعَثُونَ<sup>1</sup> (23:16)۔ یہاں تبعثون کا لفظ آیا ہے۔ اس کا عام ترجمہ ہمارے ہاں یہ کیا جاتا ہے کہ تم اٹھائے جاؤ گے۔ سمجھانے کے لیے یہی ہوتا ہے کہ قبروں میں انسان لیٹا ہوا ہوتا ہے وہاں سے تم اٹھائے جاؤ گے حالانکہ تَبْعَثُونَ کا یہ لفظ بعث ”بعث“ سے ہے۔ اس ”بعث“ کے معنی ہوتے ہیں ”کسی کے راستے میں جو رکاوٹ ہے اس کو Remove (ہٹانا) کر دینا“ اس کو ہٹا دینا۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ عراق میں بعث پارٹی ہے۔ عربی جدید میں بھی یہ لفظ ”آزادی“ کے معنی میں آتا ہے۔ حکومت اور غلامی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہوتی ہیں ان کو ہٹا دیا جائے تو آزادی آ جاتی ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ جو انسان کے راستے میں کچھ رکاوٹیں آ رہی تھیں زندگی کی اگلی سطح شروع ہو گئی یہاں تو ایک خاص درجے تک یہ کچھ بن سکتا ہے۔ اس سطح زندگی میں اس کا یہ سارا جتنا پروسیس (عمل) ہے یہ جس قدر ارتقا ہے جو کچھ بننا ہے اس مادی پیکر کے اندر ہی بننا ہے اس کی Limitations (حدود) ہیں اور وہ ہیں جنہیں آپ کہتے ہیں کہ یہ جو موت ہے اس سے یہ Disintegrate (منتشر) ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ یہ جو تمہارے راستے میں کچھ رکاوٹیں آ رہی تھیں جن سے ”تم کچھ اور نہیں“ بن رہے تھے ہم نے ان رکاوٹوں کو دور کر دیا۔ چل بھی میدان اور وسیع ہو گیا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں (اقبال)

اب نئے میدان میں آؤ۔ یہ نئی آماجگاہ نئی رزمگاہ آگئی چلتے جاؤ۔ یہ جنت بھی انسان کا آخری مقام نہیں ہے۔ وہ تو زندگی کا ارتقا ہے ایک درجہ ہے۔ وہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہمیں توازن بدوش راستے دکھا، اس کو اور تیز کر دے اس کے آگے راستے ہیں۔ وَ أَنَّ إِلٰهَ رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی<sup>2</sup> (53:42)۔ اس کو تو چھوڑ دیجیے کہ قرآن منتہا کی کیا بات کہتا ہے اسے دیکھیے کہ یہاں تو یہ بات کہی ہے کہ عزیزان من! جو منتہا و مقصود ہے وہ نفس انسانی یا انسانی ذات کے اوپر وہ چیز ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اب یہ بات آپ کی سمجھ میں آگئی کہ یہ جو شاعر<sup>3</sup> کہہ گیا تھا وہ کیا ہے کہ

1 (وہ کچھ اور، جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے جسمانی موت سے فنا نہیں ہو جاتا۔ وہ آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ) تم قیامت کے دن اٹھا کر کھڑے کر دیئے جاؤ گے (84:19) (پرویز: مفہوم القرآن ص 775)۔

اس کھڑے کر دیئے جانے کا مفہوم اوپر متن میں لفظ بعث کی تشریح کر کے دیا گیا ہے۔

2 انسانی زندگی کا منتہی و مقصود یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نظام ربوبیت کا قیام ہو جائے اور انفرادی طور پر ہر فرد کی ذات میں صفات خداوندی (Divine Attributes) کی نمود (اعلیٰ حد بشریت) ہوتی جائے اور زندگی کے ہر معاملے کا فیصلہ قوانین خداوندی کے مطابق ہو (79:44) (پرویز: مفہوم القرآن ص 1245)۔

3 علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء)

منکر حق نزد ملا کافر است

خدا کا منکر ملا کے نزدیک ٹھیک ہے کافر ہے۔ میں بھی جانتا ہوں لیکن

منکر خود نزد من کافر تر است

میرے نزدیک جو اپنی ذات کے تصور کا انکار کرتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ کافر ہے۔

انسان کے لیے ذات کے تصور سے انکاری ہونا سب سے بڑا کفر ہے

اس کفر کو آسانی سے بدلا جاسکتا ہے خدا پہ ایمان لے آئیے: امنت باللہ کہیے مومن ہو گیا۔ یہ ہے اصل چیز جو اس نے کافر تر کہا ہے۔ یہ تو زندگی کے سارے تصورات کے بدلنے کی بات ہے مقاصد حیات کے بدلنے کی بات ہے، نصب العین حیات کے بدلنے کی بات ہے Purpose of Life & Destination کے بدلنے کی بات ہے، ہر عمل یا ہر ارادہ قرآن کہتا ہے کہ نگاہ کی خیانت اور دل میں گزرنے والے خیالات تک کا اثر اس کے اوپر پڑتا ہے۔ ہر وقت محاسبہ خویش کیے چلے جانا، اس لیے اس نے کہا ہے کہ تمہارا اعمال نامہ کہیں باہر نہیں ہے وہ تو تمہاری گردن میں لٹکا ہوا ہے۔ یہ دیکھتے چلے جانا کہ یہ لستر کبن میں اگلی سطح پر جانے کے قابل ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ جو میں نے ابھی عرض کیا تھا آپ بھی اب اس پہ غور کیجیے کہ قرآن کی رو سے وہ جو اسے ایمان کہتا ہے اس قسم کا انسانی ذات کے متعلق یہ تصور (Concept) آپ کو کہیں نہیں ملتا۔

خدا کے متعلق موجودہ سائنسٹسٹ کا تصور ہمارے ہاں کے تصور سے زیادہ علی وجہ البصیرت ہے

وہ جو صرف خدا کو ماننے والے ہیں جیسے وہ عرب والے کہتے تھے کہ یہ زمین و آسمان اسی نے بنائے بارش وہی برساتا ہے یہ آپ کے ہاں کے سائنسٹسٹ جتنے بھی مغرب کے ہیں وہ ان میں سے تو ہر ایک اسے مانتا ہے۔ وہ ہم سے زیادہ بہتر طریق سے علی وجہ البصیرت مانتے ہیں کہ واقعی یہ کائنات کا خالق ہے اور یہ سارا کچھ وہی ہے اور انسان کو بھی اس نے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہی ہے وہ مقام جہاں انکار ہوتا ہے۔ اس کے لیے مذہب کی دنیا کی طرف آجائیے۔ یہاں تو بہر حال ہمارے ذہن میں ہے کہ بھئی! یہ تو ماننے والے لوگوں میں سے ہیں ایمان والے لوگوں میں سے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں مذہب کی جو عام سطح ہے اس میں وہ جو اعمال یا جنہیں آپ احکام کہتے ہیں ان کا تصور کیا ہے؟ کہ یہ کرو۔ کیوں کرو؟ کہ جی خدا کا حکم ہے۔ آپ اس بات سے دیکھتے ہیں کہ ”یہ کرو خدا کا حکم ہے“ اب سوال یہ ہے کہ میں یہ کیوں کروں؟ یعنی میرا اس میں کچھ نہیں کسی کا حکم ہے اور مجھے کرنا ہے صاحب! یہ تو ابتدا ہی خوف سے ہوتی ہے: نہیں کرو گے تو جہنم میں ڈال دے گا۔ خوف سے تو انسان کی Personality (شخصیت) نہیں رہتی۔ مومن کے متعلق تو



وہ کہتا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ<sup>①</sup> (2:38)۔ یہاں تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ پوچھا جائے گا کہ کیوں کیا جائے تو یہ ہوگا کہ صاحب! اس سے اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔

## آج کے نوجوانوں کی پریشانی

میرے پاس عزیزانِ امن! نوجوان آتے رہتے ہیں۔ میں ان کا استقبال کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ان کے دل میں تڑپ ہے جس کے لیے وہ آتے ہیں۔ ان کے دل میں اعتراضات کیا اٹھتے ہیں، میں وہ پیش کر رہا ہوں۔ جس زمانے تک تو انسان سوچ نہیں رہا تھا اس زمانے تک تو یہ بات چلتی تھی کہ خدا کا حکم ہے اسے مانو۔ وہ نوجوان اب سوچتے ہیں کہ صاحب! یہ سب تو محض حکم منوانا ہے۔ یہاں تو آپ ڈکٹیٹر کے متعلق روز ہمیں وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ یہ بدترین فارم ہے اور وہ اس قسم کی آپ ایک شکل ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ اس نے حکم دیا ہے تم مانو۔ کیوں مانو؟ یہ پوچھنے کی جرأت ہی نہیں ہے۔ نوجوان مجھ سے یہ کہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیوں مانیں؟ میں ان کو کہتا ہوں کہ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، بلا تامل کہیں کیونکہ پھانس نکل نہیں سکتی جب تک آپ نہیں بتائیں گے کہ پھانس کہاں ہے۔ جب تک وہ نکل نہ جائے آپ سو ہی نہیں سکتے۔ ہوتی تو وہ پھانس بڑی چھوٹی سی ہے، مگر تڑپائے رکھتی ہے رات بھر۔ ہماری نئی نسل کے قلب کے اندر شکوک کی یہ پھانسیں چھبی ہوئی ہیں۔ یونہی نہ ان کو لتاڑ دیا کرو۔ ان کا تصور نہیں ہے۔ یہ جو ساری پھانسیں ہیں یہ ہماری چھوٹی ہوئی ہیں۔

کہتے یہ ہیں کہ صاحب! جی، حکم ماننے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ وہ نوجوان کہتے ہیں کہ صاحب! ذرا سوچے کہ میں اپنے آپ کو مشقتوں میں ڈالوں، مصیبتوں میں ڈالوں، یہ کرتا رہوں آخر کا ہے کے لیے؟ کہ جی وہ خوش ہو جائے، تو مجھے کیا ضرورت ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے خدا کا تصور بادشاہوں کے تصور سا اپنے ذہن میں لیا ہوا ہے۔ انسان کا محدود ذہن اس سے آگے جا نہیں سکتا تھا۔ سب سے اونچا، صاحب اختیار، صاحب قدرت ہمارے ہاں بادشاہ ہوتا ہے۔ کہنے کو تو ہم نے یہ کہا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض یعنی بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ تو پہلی بات تو یہی ہے کہ کیا اللہ کے اس سائے سے کچھ پتہ چل سکتا ہے کہ وہ یہ کروانے کے لیے ”کیوں“ کہتا ہے؟ اب شہنشاہیت یا جسے آپ بادشاہت کہتے ہیں اور کہتے تھے ہے کیا؟

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہے لات و منات

(اقبال)

① ان کے لیے نہ خوف ہے نہ حزن۔

## بادشاہ کا ذہن اور بچے کا ذہن ایک ہی جیسا ہوتا ہے

ہم نے لفظ ہی بدلے ہیں۔ یہ جو بات ہے کہ ایسا کرنے سے وہ خوش ہو جاتا ہے، ایسا کرنے سے وہ ناراض ہو جاتا ہے تو اب پوری رعایا کا مقصد زندگی کا منشا یہ رہ گیا کہ اسے خوش رکھا جائے۔ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اور ان شہنشاہوں کی کیفیت یہ ہے جو سعدی نے کہا تھا:

گا ہے بہ سلا مے بر خند و گا ہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشد

یہ بادشاہ ہیں ان کی کبھی تو کیفیت یہ ہے کہ سلام کرو تو وہ کہتے ہیں بد تمیز کہیں کا، کبھی یہ ہے کہ گالی دیجیے تو وہ کہتے ہیں آباہا! پھول جھڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں روزمرہ میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو بچہ ہوتا ہے اس کے متعلق ہمارے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ بچے کا ذہن ہے ”بچے کا ذہن تے بادشاہ واذہن اکوجیای ہوندا ہیگا اے“<sup>1</sup> اور آگے چلیں تو ”بھولے بادشاہ“ کے الفاظ آتے ہیں۔ اب پوری رعایا کا فریضہ یہ ہے کہ کسی طرح سے بادشاہ سلامت خوش ہو جائیں۔ اور خوش ہو جائیں تو انہوں نے کام کر دیا، ناراض ہو گئے تو پھر قیامت آگئی۔ ساری کوشش اس میں ہے کہ وہ خوش ہو جائیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ تم اللہ کو خوش کر لو اس کے حکم کی تعمیل کرو۔ کاہے کے لیے؟ اس لیے کہ وہ خوش ہو جائے۔ دیکھتے ہیں آپ کس طرح سے بنیادی تصور بدلنے سے یہ ساری چیزیں کیسے بدل جاتی ہیں۔

قرآن نے یہ تصور نہیں دیا۔ اُس کا تصور تو شہنشاہیت کا ہے ہی نہیں، وہ تو اسے مٹانے کے لیے آیا ہے۔ وہ انسانی بادشاہوں کو ہی مٹانے کے لیے نہیں آیا تھا وہ خدا کے متعلق بھی جو غلط تصور تھا اس کو بھی بدلنے کے لیے آیا تھا۔

## خدا کا تصور قرآن کے آئینے میں

قرآن کہتا یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ خدا کا حکم ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ ایسا کرو گے تو یہ ہوگا، ایسا نہ کرو گے تو نہیں ہوگا۔ دیکھتے ہیں ایک Concept (تصور) کے بدلنے سے کس طرح انسان کی ساری دنیا بدل گئی۔ ایک بات ڈاکٹر بھی کہتا ہے کہ دوائی نہ کھاؤ گے تو بخار ہو جائے گا۔ پہلے میں یہ ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اسے کرو۔ اس میں یہ کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ اس میں میرے کچھ بننے و نسنے والی بات ہے۔ دوسرے میں کہ ”ایسا کرو گے تو یہ ہوگا“ ایسا نہ کرو گے تو نہیں ہوگا“ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں یہ نہ کروں گا تو میرا یہ بگڑے گا۔ جیسے ڈاکٹر کہتا ہے کہ بھئی! دوائی کھا لو گے تندرست ہو جاؤ گے تو اس سے میرا کچھ سنورے گا نہ کروں گا تو میرا کچھ بگڑے گا۔ یہ ہے سارا تصور جو قرآن نے دیا ہے عزیزانِ من! کہ تم مریض ہو، تم تمہیں نسخے دے رہے ہیں، تم تمہیں اقدارِ پیمانے دیدیتے ہیں کہ ایسا کر لو گے تو تم یہ کچھ بن جاؤ گے

1 بچے کا اور بادشاہ کا ذہن ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔

تم اس کے خلاف کرو گے اس طرح سے تباہ ہو جاؤ گے۔ تو یہ تو سارا ہی کچھ میرے لیے ہے۔ اسی لیے اُس نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ یہ ذکر کم (21:10) ہے اور اس میں سب کچھ تمہارے متعلق ہے جو میں کہہ رہا ہوں، ورنہ ہمیں کیا ضرورت ہے۔ یہی چیز ہے جو اس نے کہا کہ

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا  
مگر یہ حرف شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا

قرآن حکیم نوع آدم کا ترجمان ہے وہ انسانی زندگی کی اقدار تو دیتا ہے کسی کو ڈراتا نہیں ہے

یہ میرا ترجمان ہے۔ خدا تو غنی العلمین ہے اُسے کیا ہے کہ وہ اپنا تعارف کراتا پھرے اپنی ترجمانی کراتا پھرے کہ ”اوہا کوئی کم بھنسیا اے ساہڈے ول“۔<sup>②</sup> ہمارا ہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! جسے آپ قرآن کی رو سے ایمان کہتے ہیں۔ بات تو یہ ٹھیک ہے کہ خدا سے بات چلتی ہے جو آپ کہیں گے لیکن وہ اس قسم کے خدا سے بات چلتی ہے کہ جو تمہیں اس قسم کے پیمانے اقدار قوانین دیتا ہے کہ جس سے تمہارا کچھ بنتا ہے خلاف جاتے ہو تو تمہارا بگڑتا ہے۔ یہ ایمان میں پوچھ رہا ہوں کہ کہیں نظر آتا ہے؟ یہ ایمان تو ہر جگہ آپ کو نظر آئے گا کہ سکھیا کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے یہ بات کہ حرام کا مال کھاؤ گے تو ہلاکت ہو جائے گی، نہیں نظر آتی۔ وہ جو حکم کا تصور تھا، وہی ہمارے ہاں چل رہا ہے قانون کا تصور نہیں ہے۔ Keep to the Right , Keep to Left ٹھیک ہے اس کی خلاف ورزی کرو گے تو سپاہی چوک پہ پکڑ لے گا، جرمانہ ہوگا، حوالا ہوگا۔ خارج کا حکم ہے خارج سے اس کی سزا ہے جو میرا اندر ہے اس کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے۔

قرآن کے نزدیک انسانی نفس کی اہمیت

یہ جتنی آپ کے ہاں احکام کی اطاعت کرائی جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی یہ سزائیں وغیرہ دی جاتی ہیں یہ سارا تعلق انسان کے جسم کے ساتھ ہوتا ہے اندر کا تغیر تو اس سے نہیں ہوتا۔ قرآن اس کے اندر کا جو تغیر ہے اس کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ یہ جو کچھ قرآن کریم میں ہے میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں کے یہ جتنے اہل شریعت ہیں ان کے ہاں بھی خدا سے یہ احکام منوانے کی بات چلتی ہے، مان لو گے خدا راضی ہو جائے گا نہ مانو گے خدا ناراض ہو جائے گا۔ سیکولرزم والے یا باقی دنیا والے سائنسٹ، خدا کو خارجی دنیا کا خالق تو مانتے

① یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (1877-1938) کی طرف ہے۔

② کہ اس کا کوئی کام ہمارے ہاں آ پڑا ہے۔

ہیں، انسان کے ساتھ تعلق کو نہیں مانتے۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ جنہوں نے ہمارے ہاں مانا ہے وہ اہل تصوف ہیں مگر ”یہاں نفس‘Self‘ شخصیت ہی غائب ہے۔“

### انسانی ذات کے متعلق اہل تصوف کا نظریہ حیات

سائنسدانوں کے ہاں تو پھر بھی جسم انسانی کا تو کچھ بنتا تھا، اگرچہ وہ خود کچھ نہیں تھا۔ (ان اہل تصوف) نے کہا کہ جی، یہ دنیا، یہ لذات، یہ اس کے حواس، اس کے تعلقات، یہ ساری چیزیں، انسان کا جسم، انسانی زندگی، یہ سارا عذاب ہے۔ انہوں نے خدا کی ذات کے اس حصے کو چھوڑ رکھا ہے جو تمہارے اندر کسی طرح سے آ پہنچی تھی اور مقصد زندگی یہ بنایا ہے کہ یہ ان سارے Cycles (ادوار) کو کسی طرح سے توڑ کے نکل جائے، اور اس طرح جس کی ہے وہاں چلی جائے۔ وہ تو پھر بھی بیچاری خشک لکڑیاں تھیں، جلانے کے تو کام آتی تھیں، یہ ان اہل تصوف کے ہاں تو پانی میں گری ہوئی گلی سڑی لکڑیاں ہیں۔ یعنی جو تصور آپ کے ہاں انسانی ذات کا تھا، وہ کہتے ہیں کہ اہل طریقت کے ہاں تزکیہ نفس کا ایک لفظ ہوتا ہے۔ تزکیہ کے معنی ان کے ہاں Development (نمود) نہیں ہوتا، ان کے ہاں تزکیہ کے معنی ہوتا ہے کہ یہ جتنی آلائشیں، جو اس Material World (مادی دنیا) کی ہیں اس انداز کی ہیں، ان کو الگ کرتے چلے جاؤ۔ میں کاہے کے لیے انہیں الگ کرتا چلا جاؤں؟ بھئی! مجھے بتاؤ میں کیوں کرتا جاؤں؟ کہا کہ صاحب! یہ اس لیے ہے کہ تمہارے اس جسم کے پنجرے کے اندر خدا کی ایک چیز آ کر پھنس گئی ہے اور وہ تڑپ رہی ہے، اس کے دروازے کھول دو تا کہ وہ نکل جاؤ۔ اب ان کے ہاں کی مشقتیں تو پوچھو نہیں، وہ کیلوں والے تخت کے اوپر ساری عمر لیٹے رہتے ہیں اور آگ سامنے جلا کے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ تصور ویدانت سے ہمارے ہاں آ گیا ہوا ہے کہ فلاں صاحب نے ساری عمر کیچڑ میں گزار دی، وہ فلاں تھے جی، وہ نہائے نہیں ساری عمر، وہ فلاں تھے جی، انہوں نے ناخن نہیں ترشوائے ساری عمر۔ آ گیا وہی تصور آپ کے ہاں کہ حضرت صاحب نے کیا کیا؟ کہ جی وہ سات برس تک کنویں میں اٹے لٹکے رہے، ایک جو کا دانہ کھاتے تھے ایک گھونٹ پانی کا پیتے تھے، کھڑے ہوتے تھے تو روتے رہتے تھے، اتنا روئے اتنا روئے کہ جو یہاں کے رخسار تھے ان کا گوشت گل گیا ”تے چڑیاں نے آلزے بنا لیے“۔<sup>1</sup> میں یونہی یہ نہیں کہہ رہا، عزیزانِ من! یہ آپ کے ہاں کے جو بلند ترین اولیائے کرام، صوفیائے کرام گئے جاتے ہیں، یہ ان کے ہاں کی منتہائے زندگی ہے۔ یہ ہے تصور عزیزانِ من! جو آپ کے ہاں آیا۔ یہ جو اس<sup>2</sup> نے کہا تھا کہ

① چڑیوں نے وہاں اپنے گھونسلے بنا لیے۔

② علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء)

یہ ترے مومن و کافر تمام زناری  
مومن اور کافر کے اندر خدا پہ ایمان اور خدا سے انکار کی تو بات کہاں!! دونوں کے متعلق کہتا ہے:  
نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

### قرآن حکیم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ ماسکہ ذات انسانی کا تعارف ہے

عزیزانِ من! قرآن اپنی ذات پہ ایمان کے اس بنیادی نقطے سے اپنی عمارت کو شروع کرتا ہے: اس میں اس چیز پہ ایمان ہے کہ جیسا میں پیدا ہوا ہوں، یہ حیوان ہے، اس نے انسان بننا ہے۔ اسے قرآن کے الفاظ کے اندر مومن کہہ لیجیے لیکن یہ تو ہمارے ہاں ان الفاظ کے معنی اتنے بگڑ گئے ہیں کہ ذہن میں یہ تصور نہیں آتا۔ یہ ہے وہ ایمان جو قرآن پیدا کرتا ہے اگر یہ چیز ہو کہ انسانی ذات پہ آپ کا یہ ایمان ہے تو پھر آپ انسان کے اندر آئے کہ جنہوں نے کچھ بننا ہے۔

### قرآن حکیم کا نظام حیات انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کا درس دیتا ہے

اور یہ جو ہیں کہ جنہوں نے اپنے اندر کچھ بننے کی چیزیں پیدا کی ہیں، تو پھر وہ ان کو کہتا ہے کہ یہ انفرادی چیز نہیں ہے کہ تم اپنی ذات میں کہو کہ میں بن گیا اور ٹھیک ہے مقصد پورا ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو اس طرح سے بنے ہوئے ہیں، اکٹھے ہو جاؤ، اکٹھے ہونے کے بعد اٹھو اور ہماری کائنات کو بھی سنوارو اور انسانیت کو بھی یہ کچھ بناؤ جو کچھ تم بن گئے ہو۔ ”دیکھا ہے جو کچھ تو نے اوروں کو بھی دکھلا دے“: بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ (5:67)۔ بلغ کے معنی ”پہنچا دینا بھی ہیں۔“ آپ کو معلوم ہے پہلے بھی یہ چیز آگئی ہوئی ہے کہ تبلیغ کس کو کہتے ہیں۔ یہ باتیں بار بار درس میں دہرائی چاہئیں۔

### تبلیغ اور احسان کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ بلغ بڑی چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ ہی یہ ہو گیا کہ بس صرف پہنچا دینا۔ یہ بات نہیں ہے۔ عربوں کے ہاں تو ریگستان ہوتا تھا اور پانی کی بڑی کمی ہوتی تھی۔ پانی کی کمی کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ وہاں سے سمندر کے سمندر تیل نکل رہا ہے اور وہ اس قدر تیل والے ہیں مگر پانی کے گھونٹ کے لیے وہ ترستے ہیں۔ وہ بھارت سے، ایران سے، پاکستان سے، پانی منگوا رہے ہیں۔ وہاں تو پینے کا پانی نہیں ہے۔ ایک زمانے میں وہاں کہیں کنویں ہوتے تھے، جہاں نخلستان ہوتا تھا۔ تو کنویں کے اوپر وہ رسی بھی ہوتی تھی، وہاں پانی نکالنے کے لیے کچھ ڈول رکھا ہوا ہوتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں، یہاں ہمارے ہاں بھی یہ جو کنویں ہوتے تھے، جہاں نہریں نہیں ہوتی تھیں، وہاں گرمیوں کے موسم میں پانی بہت نیچے چلا جاتا ہے۔ تو اب معلوم نہیں تھا کہ وہاں پانی لینے کے لیے کس کنویں میں

جائیں اور پانی نکالیں۔<sup>①</sup>

ہمارے ہاں احسان کا بدلہ احسان نہیں دیا ہے تو کہتے ہیں طوطا چشم، نمک حرام، پتہ نہیں کیا کچھ بنا ہے۔ احسان کے معنی ہی یہ ہیں کہ کسی کمی سے اگر اس کی Proportion (تناسب نسبت) بگڑ گئی ہے تو اس کی وہ کمی پوری کر دو تا کہ اس کا حسن پورا ہو جائے اور اس کا بدلہ کیا! اس کا تم نے توازن برقرار رکھنا تھا، توازن برقرار ہو گیا۔ یعنی اس کے عمل سے توازن برقرار ہونا تھا وہ ہو گیا چنانچہ جو تیرا مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ عزیزان من! یہ ہے جو اس قرآن نے، خدا کی کتاب نے دیا ہے یہ ہے جو اس کی مثل کہیں نہیں مل سکتی، یہ ہے جو ساری دنیا سے لازوال ایک دین ہے جس کی کوئی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ (23:15)۔ ٹھیک ہے جسم تمہارا Disintegrate (مضمحل) ہو کے چلا گیا، حیوان ختم ہو گیا، آدمی جو حیوان کی سطح پہ ہے، ٹھیک ہے وہ ختم ہو گیا۔ اگر تم یہی سمجھتے ہو تو جسم کے مرنے سے تم بھی ختم ہو گئے، مگر سنو! إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ تُبْعَثُونَ (23:16) اس وقت وہ موانعات تمہارے راستے میں آ رہے ہیں ایک حد تک بڑھ سکتے ہو آگے نہیں جاسکتے۔ ہم نے ان موانعات کو توڑ دیا ہے اور آگے بڑھو اس لیے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) درجہ بدرجہ اوپر اٹھتے چلے جاؤ۔

اب بات یہاں سے چلی تھی کہ وہ جو اس کی ابتدا کی تھی وہ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ (23:12) سے کی تھی یا یوں کہو کہ وہ وہاں سے جو حیوانی درجہ ہے یہاں تک یہ چلتے آئے اور چلتے آئے۔ اور اس کے بعد ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (23:14) ہوئے اور وہاں کہا تھا فَتَبَرَّكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (23:14) اللہ احسن تقویم میں پیدا کرنے والا ہے اور اس کا نتیجہ یہ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مرنہ سکے<sup>②</sup>

① ان کنوؤں پر ڈول اور رسی رکھی رہتی تھی۔ گرم مقامات کے کنوؤں کا پانی ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتا اکثر نیچے اتر جاتا ہے جس کی وجہ سے ڈول کی رسی پانی کی سطح تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس مقصد کے لیے یہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ رسی کا ٹکڑا رکھتے تھے جسے ڈول کی رسی (الرشاء) کے ساتھ باندھ دیتے تاکہ ڈول پانی تک پہنچ جائے۔ اس رسی کے ٹکڑے کو التبغہ کہتے تھے۔ یہاں سے تبلیغ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے یعنی اگر ایک انسان اپنی ذاتی استعداد کی کمی کی وجہ سے کسی مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا تو اس کی اس کمی کو اس طرح پورا کر دیا جائے کہ وہ اصل مقصد تک پہنچ جائے لیکن اگر وہ (الرشاء) کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہتا تو خالی التبغہ اسے پانی تک نہیں پہنچا سکتی۔ تبلیغ اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی عقل و بصیرت کو بھی کام میں لائے۔ (ماخوذ از پرویز: لغات القرآن: جلد اوّل، ادارہ طلوع اسلام لاہور، 1960ء، ص 347)

② علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کا ضرب کلیم میں حیات ابدی کے عنوان سے یہ پورا شعر یوں ہے:

ہوا اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مرنہ سکے

## انسان کی ہر دو قسم کی پرورش کی اہمیت اور خدا تعالیٰ کی ذمہ داری

اب اس میں دونوں قسم کی پرورش کی ضرورت پڑ گئی۔ اگر ایک بچے کی طبعی (Physical) پرورش آپ نہیں کرتے تو اس کا انسان بننے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے یعنی جب اس کے پاس وہ گھوڑا ہی نہیں جس پہ چڑھ کر اس نے سفر طے کرنا ہے تو منزل پہ پہنچ نہیں سکے گا۔ یہ جسم انسانی تو اس کے لیے سواری کا کام دینے کے لیے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو سواری ہے اس کی پرورش تو بڑی ضروری ہوتی ہے۔ ”ٹانگے والا شام نوں جا کے پہلاں گھوڑے واسطے پٹھے لے اوندائے تے مگروں جا کے اپنے بچیاں دی روٹی دا انتظام کردا اے۔“<sup>①</sup> اس کو پتہ ہے کہ اس کی نشوونما پہ سارا دار و مدار ہے۔ اس لیے جسم کی نشوونما بڑی ضروری ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ربط چلا آ رہا ہے قرآن میں! کہیں یہ ذہن میں نہ آ جائے کہ یہ مادی زندگی، یہ انسانی جسم کی نشوونما، یہ سب کچھ غلط ہے۔ کہا کہ اس کے لیے تمہیں پیدا کیا، اس کے لیے ہم نے خود انتظامات کر دیئے۔

## چودہ سو سال پہلے آسمانی کڑوں کی کیفیت کا بیان

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ (23:17)۔ فضائے آسمانی کے اندر طرائق ہیں۔ طریق کے معنی یونہی راستے کے بھی ہوتے ہیں اور اس کے معنی ہوتے ہیں ”ایک کے پیچھے دوسرا چلنے والا“ ایک کے پیچھے دوسرا چلنے والا۔“ علم الافلاک کے ماہرین اس لفظ طرائق کی داد دیں گے جو قرآن نے کہا ہے۔ اس زمانے میں جب ابھی تصور میں بھی نہیں آتا تھا کہ یہ جو کڑے ہیں، یہ کچھ چلتے بھی ہیں، متحرک بھی ہیں۔ اس زمانے میں ان کڑوں کے لیے طرائق کہنا کہ یہ ایک دوسرے کے پیچھے چلے آ رہے ہیں، محو گردش ہیں، بڑی بات تھی۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ اس لیے بنایا کہ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَفْلِينَ (23:17) یہ نہیں تھا کہ ہم نے پیدا کر دیا تو بس پھر اس کے بعد ہم بے پرواہ ہو کر چلے گئے کہ ”ٹھیک ہے ساڈا کم ایناں ای ہیگا سی“<sup>②</sup> پیدا کر دیا بس اور کیا، یہ غلط بات ہے۔ جو ہم نے پیدا کیا ہے اس کے سامان نشوونما کی طرف سے ہم غافل نہیں ہیں۔ جو پیدا کیا ہے اسکی طرف سے بھی غافل نہیں ہیں اور یہ بھی نہیں ہے کہ جو پیدا کرنا تھا وہ ہم پیدا کر چکے اور اب اس کے بعد کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔

① ٹانگے والا شام کو جا کر پہلے اپنے گھوڑے کے لیے گھاس لاتا ہے پھر اپنے بچوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہے۔

② ٹھیک ہے ہمارا بس اتنا ہی کام تھا۔

## 1913ء میں یورپ کی علمی سطح کی حالت

یورپ میں ایک School of Thought (مکتب فکر) ایسا بھی تھا کہ اس کے مبلغ یہ کہتے تھے کہ Universe (کائنات) Accomplished Form (مکمل شدہ حالت) کے اندر ہے اسے جو کچھ بننا تھا بن گئی۔ خدا کے متعلق یہ تھا کہ جس طرح ساتویں دن چابی دینے والا کلاک ہوتا ہے ایک دفعہ اس کو چابی دے رکھی ہے اور اس کے بعد وہ سو گیا ہے یہ اس کے بدلے میں چل رہی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ جو 1913ء کے اسکولز آف تھاٹ (مکاتیب فکر) تھے زمانے کی تحقیقات نے آہستہ آہستہ انہیں خود ہی مٹا دیا۔ بہر حال وہاں یہ تصور تھا۔ پہلے تو کہا کہ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِينَ (23:17)۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے اس کو چابی دیدی ہے اور یہ خود ہی چل رہی ہے۔ ہم اس کی طرف سے غافل نہیں تھے سامانِ نشوونما بھی ضروری تھا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ کائنات Accomplished Form (مکمل شدہ حالت) یعنی Complete Form (مکمل حالت) کے اندر نہیں بن گئی ہے بلکہ ہم یزیدُ فِی الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (35:1) اس میں نت نئے اضافے کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا اس کی تزئین کے لیے اس کی آرائش کے لیے اس کی تحسین کے لیے اس میں اور اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب<sup>1</sup> اچھے انداز میں بات کہہ گیا ہے کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تو آرائش و جمال سے وہ فارغ نہیں ہے اس طرح وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِينَ (23:17)۔

سامانِ نشوونما کے پیش نظر سمندر کے پانی کو کشید کرنے کی غرض سے سورج کی بھٹی کا انتظام

بہر حال جسمِ انسانی کی پرورش کا پہلا سوال آ رہا تھا۔ اس کے لیے کہا کہ وَانْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ (23:18) اب دیکھو تمہارے لیے یہ سامانِ نشوونما یہ پرورش کا سامان جو ہم نے پیدا کرنا تھا اس کے لیے کتنا بڑا انتظام کیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عرب والے وہاں سے پانی کے جو ٹینکر منگوا رہے ہیں وہ مکے سے تیس میل کے فاصلے پہ جدہ ہے وہاں تو سمندر ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ سمندر کے پانی کا ایک قطرہ بھی پینے کے قابل نہیں ہے۔ اگر اس پانی کا ایک لوٹا کھیتی پہ ڈال دیا جائے تو کھیتی جل جاتی ہے۔ وہ اس قدر Salty (نمکین) ہوتا ہے کہ آدمی پی نہیں سکتا۔ اس کھیتی کا سارا دار و مدار زمین پہ ہے۔ جو کچھ کھانا پینا ہوتا ہے وہ اس سے اگتا ہے۔

① مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869)



اس کھیتی باڑی کے لیے اس افراط سے پانی کا کیا انتظام ہے صاحب! ملاحظہ فرمائیے کہ اسی سمندر سے سورج کی کرنیں پانی کشید کر کے Distilled water (کشید شدہ پانی) دیتی ہیں اور یہ Distillation (عمل کشید) بڑا مشکل امر ہوتا ہے۔ سمندر کے کنارے پانی پینے کو نہیں ملتا۔ وہاں وہ انتظامات کر رہے ہیں کہ وہاں پانی Distillation (کشید) ہو جائے تو جتنے یہ پانی میں گھلے ہوئے مادے ہیں یہ چیزیں وہیں رہ جائیں اور خالص پانی اوپر آ جائے۔ اس پر اتنی Cost (قیمت) آتی ہے کہ ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ اتنے بڑے پیمانے پر جو Distillation (کشید کا عمل) ہے وہ اس قدر Costly (مہنگا) ہے یہ بہت بہت مشکل چیز ہے۔ فلٹریشن (عمل تفطیر) تو بڑی آسان چیز ہے۔ یہ ریت اگر پانی میں گھل جائے تو وہ تو بڑی آسانی سے الگ ہو جاتی ہیں لیکن اگر نمک اس میں ملا ہوا ہو تو وہ Distillation (کشید) کرنا پڑتی ہے۔ سمندر کا پانی جس کی کیفیت یہ ہے اس میں سے یہ آب مقطر کشید کر کے سورج کی یہ کرنیں آپ کے لیے یہ کرتی ہیں کہ اسے اوپر لے جاتی ہیں! وہ بادلوں کے مشکیزے بھر دیتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر ہواؤں کے بھکڑان مشکیزوں کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر لیے پھرتے ہیں۔ اور وہاں دوسرے مقام پر اس ایک آیت میں ایک لفظ ہے وَ قَوْمُوا لِلّٰهِ قَنِینَ (2:238) تم زندگی کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کی اطاعت میں کمر بستہ کھڑے ہو جاؤ۔<sup>1</sup> اس میں قانین ایک لفظ ہے۔<sup>2</sup> شروع میں تو ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ ہم ہر لفظ پر کھڑے ہو کر سوچتے ہی نہیں ہیں حالانکہ قرآن کا ہر لفظ ایک خاص معنی و مفہوم رکھتا ہے۔ آپ سوچیے کہ اگر کسی سقے کی مشک دس جگہ سے ٹپکتی ہو تو جہاں جا کر اس نے پانی گرانا ہے وہ مشک اس سے پہلے ہی خالی ہو جائے گی اور اگر مشک ایسی ہو کہ اس کا منہ ہی آگے سے نہ کھلے تو جہاں پانی چاہیے وہ وہاں جا کر گرائے ہی نہیں۔ قرآن نے اپنی توانائی کی مشک کے منہ کو بند رکھ کر اس مقام پر جہاں اس پر توانائی کی ضرورت ہے اس مشک کے منہ کو کھولنے والے ایسے افراد کے متعلق کہا تھا: قَنِینَ (3:17; 33:35)۔ بات یہ ہے کہ عربوں کے ہاں قَنِینُ اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس کی ادھر ادھر سے سلائی ایسی ہو کہ پانی کا ایک قطرہ باہر نہ گرے اور منہ اس قسم کا ہو کہ جہاں جی چاہے اُسے کھول لیجیے تو سارا پانی باہر نکل جائے۔ کہا کہ انسانی توانائی کے یہ مشکیزے اس قسم کے ہیں۔ انسانوں کے لیے بھی اُس نے یہی کہا ہے۔ مومن کی زندگی کے متعلق بھی ایک لفظ کے اندر یہ ساری بات آگئی کہ بڑی صلاحیتیں

1 پرویز: مفہوم القرآن، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ص 91

2 بقول صاحب تاج العروس سقاء قنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کو اس طرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ لہذا اس کا صحیح مفہوم ہے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ (پرویز: لغات القرآن (جلد سوم)‘

ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1961ء، ص 1390)

اور توانائیاں تمہارے اندر ہوتی ہیں لیکن ایسا نہ کرو کہ انہیں یونہی ہر جگہ بہادؤ انہیں ہر جگہ محفوظ رکھا کرو اور یہ بھی نہ ہو کہ بخل ہو۔ جہاں کہا جائے وہاں ان کا منہ کھول دیا کرو۔ یہاں (23:18) میں بادلوں سے کہا کہ کیا یہ ہو کہ بس جہاں ہو منہ کھول دیا جائے؟ نہیں بقدر ضرورت ان کا منہ کھلتا ہے۔

### رزق کی فراوانی اور زندگی کو زندہ رکھنے کے لیے پانی کے مہیا کرنے کا حیران کن انتظام

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تین دن مسلسل بارش ہوتی رہی، سترہ اٹھارہ انچ بارش ہوگئی۔ وہی بارش جو آیہ رحمت تھی، پھر وہ سیلاب بن جاتی ہے۔ وہ جو وہاں کی قدر ہے وہ جو وہاں کا پیمانہ ہے یہ اس کے مطابق ہوتی ہے۔ ہمارے پیمانے کے مطابق وہ پانی اس سے بڑھ جاتا ہے۔ اور اگر وہاں پیمانہ ہی نہ ہو تو جتنا پانی سمندر کا اوپر جاتا ہے، اوپر جائے وہاں ٹھنڈ لگے اور سارے کا سارا نیچے آگرے۔ یعنی بات تو اس نے ساری یہ کرنی تھی کہ تمہارے جسم کی پرورش کے لیے ہم نے یہ کچھ سامان کیا ہوا ہے، اور وہ جو کیا ہوا سامان پرورش ہے، ذرا دیکھیے کہ اس کے بیان کرنے کا انداز کیا ہے۔ اس کے لیے بقدر کہا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس میں اتنی مقدار کے مطابق ہی پانی اوپر سے نیچے آتا ہے۔ سارے کا سارا، جتنا بادل ہے، ایک ہی جگہ ٹھنڈا ہو کر کہیں ایک ہی جگہ گر جائے تو سیلاب آجائے۔ اور اگلی چیز اور ہے۔ کہا کہ فَاسْكُنْهُ فِي الْأَرْضِ (23:18)۔ اگر صورت یہ ہو کہ پانی جتنا پڑے وہ پڑنے کے بعد زمین اس کو چوسے نہیں آگے بہادے تو کھیتی نہیں ہو سکتی۔ کہا کہ ہم نے زمین کو ایسا بنایا کہ وہ پانی کو چوس کر اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے۔ بِقَدَرٍ فَاسْكُنْهُ فِي الْأَرْضِ (23:18)۔ اس کے لیے یہ کر دیا کہ جتنا اوپر سے زائد ہے وہ بہہ کے آگے چلا گیا اور یہ کچھ اپنے اندر جذب کر لے۔

یہ جو پانی جذب کرنا ہے، کھیتی کا سارا دار و مدار اس کے اوپر ہے۔ جتنی نمی چاہیے اس نے اپنے اندر محفوظ کر لی ہے اور پھر اس کی محفوظیت کی کیفیت یہ ہے کہ مٹی جون کے مہینے میں آپ پانی کسی تھالی میں رکھیے تو سارا اڑ جاتا ہے لیکن زمین کی اوپر کی سطح جو ہوتی ہے وہ تو خشک ہوتی ہے، نیچے جو پانی ہوتا ہے وہ اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے جی تو یہ سارے پودے کھیتیاں بڑے ہوتے ہیں۔ فَاسْكُنْهُ فِي الْأَرْضِ (23:18)۔ کہا کہ یہ ساری چیزیں کون کہہ رہا ہے؟ وَ إِنَّا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهٖ لَقَدِيرُونَ (23:18) ہم چاہتے تو پانی جتنا برسا تھا، سارے کا سارا اڑا کر لے جاتے۔ فَانْشَأْنَا لَكُمْ بِهِ جَنَّتٍ مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ لَّكُمْ فِيهَا فَوَاحٍ كَثِيرَةٌ وَ مِنْهَا تَأْكُلُونَ (23:19) یہ پانی زمین میں جذب ہوا اور وہاں سے پھر کھجوروں کے، انگوروں کے باغات ہوئے۔ اگر یہ قرآن ہمارے ہاں آتا، تو جنت کے پھلوں میں آم کا ذکر پہلے ہوتا۔

قدرت کی طرف سے یہ تمام نعمتیں کسی ایک فرد کے لیے نہیں ہیں بلکہ ”لکم“ (تم سب) کے لیے ہیں عزیزانِ من! یہ باتیں Agriculture (زراعت) کے Process (عمل) کی ہو رہی ہیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ قرآن درمیان میں کر کیا جاتا ہے؟ ایک لفظ لے آتا ہے جس سے اپنا جو بلند مقصد ہے وہ بھی ساتھ کے ساتھ سامنے لے آتا ہے۔ بات تو یہ تھی کہ ہم نے پھر یہ باغات اگائے، انگور کھجور پھل پھول نباتات اگائے۔ ان سب چیزوں کا پروسیس (طریق) تو یہی ہوتا ہے لیکن یہاں درمیان میں ایک چیز اور آ رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَكُمْ (23:19) پوری نوعِ انسانی کے لیے یہ پیدا کیا ہے۔ اور اگر عزیزانِ من! اس لَكُمْ کے اندر کچھ فرق آ جائے تو بات خدا کے پروگرام کے خلاف چلی جائے گی۔ اس نے نخیل و اعناب و فواکہ کہا ہے۔ اگر نوعِ انسانی میں سے ایک فرد بھی ایسا ہے جس کے لیے عام گیہوں کی روٹی نہیں ہے، اگر ایک بھی اس سے محروم رہ گیا ہے تو بات لکم کے خلاف چلی جائے گی۔ کہتے ہیں کہ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے؟ ارے لکم سے پوچھو کہ نظام کیا ہے۔

دنیا کی ساری جنت ’لکم‘ کے ایک لفظ میں پوشیدہ ہے

اس پروگرام کے مطابق جو زندگی ہوتی ہے اسے اس نے یہاں بھی جنت کی زندگی کہا ہے۔ وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورٍ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالذُّهْنِ وَ صَبْغٍ لِّلْأَكْلَيْنِ<sup>①</sup> (23:20)۔ اتنی افراط سے وہاں یہ سب چیزیں اس نے بیان کی ہیں لیکن اس کے بعد آپ دیکھیے کہیں یہ نہیں کہا کہ ایک طبقہ تو ہوگا جس کو یہ کچھ میسر آئے گا اور دوسرا وہ ہوگا جو سارا دن محنت کرے گا۔ کہیں یہ بات نہیں ہے۔ اُس میں طبقات ہوتے نہیں ہیں حتیٰ کہ اعلیٰ درجے کے صوفے، ریشم کے پردے، چاندی اور سونے کے برتن، ظروف بلوری، یہ چیزیں وہاں گنائی گئی ہیں۔ یہ چیزیں جن کو ملاکی شریعت نے حرام قرار دیدیا ہے جنت والوں کے لیے ہیں اور اس جنت میں کہیں طبقات کا ذکر نہیں ہے کہ بعض کو ملے گی، بعض کو نہیں ملے گی۔ وہ اتنا اونچا معیار ہو جاتا ہے کہ اتنی بڑی معیاری زندگی کا اس کے بعد تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا بتاؤں عزیزانِ من! لمبی زندگی ہو، لمبے وقت ہوں قرآن سامنے ہو، وقت گزرنے کا خیال نہ ہو، وہاں جنت میں یہ باتیں کریں گے وہاں یہ ٹائم پیئر نہیں ہوگا۔

① اور اسی طرح (زیتون کے درخت کو بھی) اگاتے ہیں جو سینا کی وادیوں میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ اس سے تیل نکلتا ہے جس سے کھانے والوں کے لیے بہت اچھا سالن تیار ہوتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 776)۔

جسمانی طور پر رزق کا یہ سارا نظام ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے

قرآن کریم نے کہا کہ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ (23:21)۔ وہاں زراعت کی چیز آئی تھی اب قرآن حیوانات کی طرف آ گیا ہے۔ کہا کہ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً (23:21)۔ یہاں قرآن مقام عبرت کہتا ہے۔ یہ لفظ جو عبرت ہے میں ابھی اس کے معنی بتاتا ہوں۔ کوئی بات چھیڑی جائے اس کے متعلق گفتگو کی جائے کہا جائے کہ اس سے نتیجہ کوئی اور ہو جس تک تم نے پہنچنا ہو اُسے تم کہانی کی طرح نہ سنو یہ فزیکل چیزیں جو ہم گنارہے ہیں یہ باتیں Physical World (طبعی دنیا) کی کر رہے ہیں یہ جسمانی نشوونما ہی ہے تمہاری۔ باتیں ہم یہ کر رہے ہیں لیکن اس میں تمہارے لیے عبرت ہے۔ یاد رکھو کہ تم نے اس سے کسی اور نتیجے پہ پہنچنا ہے۔

یہ جو عبرت کا لفظ ہے اسے سمجھیے۔ آپ نے عبور تو سنا ہوگا، دریا عبور کرتے ہیں۔ یہ پل کو کہتے ہیں کہ یہاں سے جو چلے ہو وہ اس کنارے پہ پہنچنا ہے۔ بات یہاں سے تم نے شروع کی پل یہاں سے شروع ہو جاتا ہے لیکن یہی مقصد پل کا نہیں ہے جہاں سے یہ شروع ہوتا ہے۔ یہ آخر تک جاتا ہے۔ جہاں پل کا جو آخری حصہ ہوتا ہے وہاں اسے عبرت کہتے ہیں یہاں سے چل کے وہاں پہنچ جائے۔ اور اگر یہ وہیں کھڑا رہے تو عبور کر ہی نہ سکے۔ عبور کا لفظ یہیں سے ہے۔ کہا کہ زیتون کی اور اعناب کی اور انعام کی حیوانات کی یہ باتیں ہم کر رہے ہیں۔ انہی میں کھو کر نہ رہ جائے تم نے پہنچنا کسی اور نتیجے پہ ہے۔ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا (23:21)۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ یہ ہے کہ کبھی کسی علم حیوانات جاننے والوں سے پوچھو کہ یہ اندر ہوتا کیا کچھ ہے جس سے یہ دودھ بن کے تمہارے سامنے آتا ہے۔ وہاں یہ کہا ہے کہ چیر پھاڑ کر کے دیکھ لیجئے کچھ خون ہوتا ہے کچھ گوبر ہوتا ہے یہ سارا کچھ وہی ہوتا ہے۔ کہا کہ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا (23:21)۔ اجزاء تو یہ ہوتے ہیں اور ان اجزاء میں سے جو کچھ تمہارے لیے نکلتا ہے وہ اس قدر خوشگوار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی میں کہا کرتا ہوں کہ اور کچھ نہیں اگر یہ دودھ سرخ رنگ کا نکلتا تو پینے والے کی طبیعت پہ اس کا کیا اثر ہوتا۔ اب تو ہمیں وہ دودھ میسر ہی نہیں آ سکتا، ورنہ اگر وہ خالص دودھ کہیں سے مل جائے اس میں جو یہ Sugar of Milk ہے آپ کے ہاں جو ہومیو پیتھک میں Sugar of Milk استعمال ہوتی تھی وہ ہوتی ہے یہ بڑا میٹھا ہوتا ہے بڑا لذیذ ہوتا ہے اس میں خوشبو ہوتی ہے۔ کہا کہ کبھی تم نے سوچا بھی ہے کہ اس کے Ingredients (اجزائے ترکیبی) کیا تھے وہ اجزاء کیا تھے جس میں سے یہ کچھ بنا؟ قرآن کہتا ہے کہ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ (23:21)۔ پھر وَلَكُمْ بڑے فائدے کی باتیں ہیں۔ وَمِنْهَا تَكُلُونَ (23:21) جو تم کھاتے ہو۔ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تَحْمَلُونَهَا (23:22) سواری کا کام بھی لیتے ہو اور سواری تو یہ خشکی میں ہے۔ خشکی میں سواری کرتے کرتے آگے سمندر آ جاتا ہے۔ کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں وہاں کے لیے ہم نے تمہارے لیے کشتیاں بنادی ہیں۔ ساری دنیا کا سفر کرو کھاؤ پیو۔

ایک جنین سے جسمِ انسانی، جسمِ انسانی سے نفسِ انسانی، اور اس نفسِ انسانی کی نشوونما کے بعد جہانِ فردا کی کئی ایک نئی اور طویل منازل کی طرف سفر کا آغاز

بات آدمی کی پیدائش کی ہوئی تھی، انسانی بچے کی پیدائش کی ہوئی تھی، حیوان اور انسان کے جنین کے مراحل گنائے، آگے بات چلی تھی کہ اس میں خلقتِ آخر ہے یعنی یہ کچھ اور ہو گیا ہے یہ اور نفسِ انسانی سے ہوتا ہے۔ آگے بات چلی کہ نفسِ انسانی Developed & Accomplished Form (نشوونما یافتہ اپنی تکمیلی صورت) میں نہیں ہوتا، یہ تمہیں Material (مواد) دیا جاتا ہے جس سے تم نے خود کچھ بننا ہوتا ہے۔ بننے کے ساتھ ہی یہ بات آئی کہ اسے تصوف والا نہ سمجھ لینا۔ انسان کے جسم کی پرورش نہایت ضروری ہے اور اس کے لیے ہم نے ساتھ سامان دیا ہے۔ جسم بھی ہم نے بنایا ہے اور تمہاری ذات کے لیے ہم نے ہی پیدا کیا ہے۔ جسم کی پرورش کا بھی خیال ہے اور جسم کی پرورش کے لیے ہم نے یہ جو سلسلہ ہے یہ یہاں تک کا ہے۔ تو اب بات یہاں والا کوئی بھی سائنسٹ ہوتا تو ختم کر دیتا کہ ان چیزوں کو ایسے کھاؤ، ایسے پیو، سب کچھ کرو لیکن اس کے بعد جو یہ عبرت چیز ہے کہ اس سے بات چلی ہے کہ پہنچنا کہیں اور ہے، یہ تو عبور کرنے کے لیے ہے۔ اس کے لیے قرآن کریم نے تاریخ سے مثال دی ہے کہ **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ (23:23)** اس کہیں اور پہنچنے کے لیے ہم نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا۔ انبیاء اس لیے بھیجے تھے کہ وہ جو تمہارا انسان بننے کا حصہ زندگی ہے اس کے لیے بھی پروگرام دینا، Direction دینی، سامان دینا، ہمارے ذمے تھا۔ یہ تو غلط ہوتا کہ آدمی کو پیدا کرتے اور صرف جسم کی پرورش ہوتی۔ اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہم نے دی ہے۔ جسم کی پرورش کا ہی سامان ہم صرف دیتے تو وہی رہ جاتا جو سیکولر ازم کے اندر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی انتظام کیا کہ اس کی ذات کی نشوونما، جس طریقے سے، جن ذرائع سے ہوتی ہے، وہ بھی ہم نے ہی پیدا کیے، ہم نے ہی مہیا کیے اور اس کے لیے اس نے انبیاء کرام □ کا سلسلہ شروع کیا۔

قرآن کریم میں انبیاء کرام □ کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس کی ابتدا حضرت نوح ♦ سے ہوتی ہے۔ کہا کہ **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ (23:23)** اب سلسلہ رشد و ہدایت کی بات شروع ہوئی۔ اسے ہم اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ سورۃ المؤمنون کی آیت 22 تک ہم آگے 23 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



## چھٹا باب: سورة المؤمنون (آیات 23 تا 26)



عزیزانِ من! آج جون 1977ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 23 سے ہو رہا ہے: (23:23)۔

### انسان کی زندگی کی دو سطحیں: حیوانی اور انسانی

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں بات یوں چلی آرہی تھی کہ انسان کی ایک تو حیوانی زندگی ہے یعنی فزیکل یا طبعی زندگی ہے اور یہ حیوانی زندگی وہی ہے جو دوسرے حیوانات کی بھی زندگی ہے۔ اس میں صرف جسم کی پرورش مقصود ہے۔ موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن علاوہ ازیں اس کی ایک انسانی زندگی بھی ہے جبکہ حیوانات میں یہ دو زندگیاں نہیں ہوتیں۔ حیوان پیدا ہوتا ہے تو حیوان ہوتا ہے مرتا ہے تو حیوان ہوتا ہے۔ انسان میں ایک دوسری زندگی کے بھی امکانات (Possibilities) رکھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اس زندگی کو

اپنا نہیں چاہتا تو یہ بھی دیگر حیوانات کی طرح پیدا ہوتا ہے تو مر جاتا ہے، فزیکلی حیوان ہوتا ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دوسری زندگی تو اس سے ایک اونچی زندگی ہے جسے اپنا لینے کا اس میں امکان (Possibility) ہے۔ وہ از خود فطرت کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اس کی صرف امکانی شکل اس کو ملتی ہے، اس کی صلاحیت اس کے اندر ہوتی ہے<sup>①</sup>۔ یہ وہ چیز ہے جو Values (اقدار) سے ملتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ Values (اقدار) کا یہ Concept (تصور) حیوانات میں نہیں ہوتا۔ یہ انسانی سطح زندگی پر ہوتا ہے: جائز اور ناجائز کا امتیاز، حلال اور حرام کی تمیز وغیرہ۔ زندگی کی یہ حیوانی سطح نہیں ہے، انسانی سطح زندگی ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن کریم جیسا کہ اس کا عام انداز ہے کہ وہ اپنے ہاں تاریخ سے شہادت پیش کرتا ہوا، تاریخی طور پر وہ سلسلہ رشد و ہدایت کے چشموں کو سامنے لاتا ہے یعنی وہ اطاعت کی روشنی میں، وحی انبیائے کرام کا ام سابقہ میں آنا، ان کی سرگزشتیں، ان کا مآل اور ان کا انجام بیان کرتا ہے۔ قرآن حکیم اس سلسلے کو حضرت نوحؑ سے شروع کرتا ہے۔

### نوع انسانی کی جانب سلسلہ نبوت جاری کرنے کی غرض و غایت کیا تھی؟

قبل اس کے کہ میں حضرت نوحؑ کی اس کڑی سے بات شروع کروں ایک بڑی اہم چیز آپ کے سامنے لانی ہے۔ جن حضرات کے پاس قرآن کریم کے نسخے ہیں وہ ان میں نشان زد کر لیں جو میں عرض کرنے لگا ہوں اور اگر نہیں ہیں تو کسی جگہ اسے نوٹ کر لیں، شاید دوبارہ سامنے نہ آ سکے۔ یہ اتنی اہم چیز ہے کہ اسکے بغیر دین کی غایت، لم، منہا اور مقصود و مطلوب سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا۔ سوال یہ ہے کہ سلسلہ وحی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ انبیائے کرام کو کیوں بھیجا گیا؟ دین کی غایت کیا تھی؟ کائناتی زندگی میں ہی نہیں بلکہ انسانوں کی زندگی میں یہ بہت بڑی انقلابی چیز ہے کہ خاص طور پر خدا کی طرف سے ایک علم دیا جائے اور پھر ایک منتخب ہستی کو دیا جائے، وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچائے۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ یہ اتنی Exceptional (استثنائی) چیز ہے کہ دنیا کا کوئی دوسرا غیر از نبی انسان اسے حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ اب جب نبوت کا خاتمہ ہو گیا ہے تو اسکے بعد اس کا علم پہنچ ہی نہیں رہا۔ یہ کتنی بڑی چیز تھی۔

سوال یہ ہے کہ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد کیا تھا؟ دین کی غایت کیا تھی؟ یہ وحی کا سلسلہ کیوں جاری ہوا؟ گویا آپ بھی اپنے ذہن سے ہی سوال کر کے دیکھیے تو سہی کہ اس کا کیا جواب ملتا ہے۔ اس کا عام جواب تو آپ کو یہی ملے گا کہ وہ انسانوں کو یہ بتانے کے لیے آئے تھے کہ انسانوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، فریب نہیں دینا چاہیے، دغا نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وعظ و نصیحت کی باتیں ہمارے ہاں

① اس کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورہ حج، ادارہ طوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005ء، ص 185 (فٹ نوٹ 1)

ہیں۔ ٹھیک ہے یہ سب اپنی جگہ بجا اور درست لیکن عزیزانِ من! یہ تو Universal Ethics (عالمگیر اخلاقیات) ہیں۔ یہ تو جو لوگ خدا کو بھی نہیں مانتے، وہ بھی ان چیزوں کو مانتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے آج کل اس دور کی میکاؤلی (1527-1469ء) کی سیاست کو اپنا ایک الگ پیشہ بنایا لیا ہے۔ دنیا کے ملحد بے دین اور خدا کو نہ ماننے والوں سے بھی پوچھیے تو وہ بھی یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ چوری کرنا بہت اچھا ہے، جھوٹ بولنا بڑی اچھی چیز ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ تو دورِ حاضرہ کی میکاؤلی<sup>1</sup> سیاست ہے۔ جس کی بنیاد ہی جھوٹ اور فریب پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سیاست، جیسا کہ وہ کہتے ہیں، کو اخلاقیات یا مذہب سے الگ کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان کی زندگی دو قسم کی قرار دیتے ہیں: ایک انسان کی پرائیویٹ لائف (ذاتی زندگی) اور ایک اسکی پبلک یا سیاسی زندگی۔ یہ وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ جتنے بھی Universal Ethics (عالمگیر اخلاقیات) ہیں، پرائیویٹ زندگی کے اندر انہیں ان کی واقعی پابندی کرنا چاہیے: جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، فریب نہیں دینا چاہیے، چوری نہیں کرنا چاہیے، لیکن پرائیویٹ زندگی کے علاوہ سیاسی زندگی کے اندر یہ کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں جائز ہیں کیونکہ یہ مقصد کے حصول میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ میرے پیش نظر موضوع اس وقت یہ نہیں ہے۔

میں کہہ رہا ہوں کہ اگر یہ چیز ذہن میں آئے کہ جو اتنی بڑی انفرادی چیز تھی کہ آسمان سے سلسلہ رشد و ہدایت کا حصول اور انبیائے کرام کی بعثت ان لوگوں کے ساتھ ان کا اتنا بڑا ٹکراؤ، تو آخر اس کی غرض و غایت کیا تھی، اس ٹکراؤ کا مقصد کیا تھا؟ آپ نے دیکھا کہ پہلے نبی ﷺ سے لے کر آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی کی اتنی شدید مخالفت کیوں ہوئی ہے کہ میدانِ جنگ تک میں آنا پڑا، وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا۔ اگر وہ یہ کہتے کہ بھئی! جھوٹ نہ بولا کرو، بیچ بولا کرو تو کیا اس سے وہ مرنے مارنے پر یہ کہنے پر اتر آئیں گے کہ یہاں سے نکل جاؤ، ورنہ ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے؟ میں نے کہا ہے کہ یہ Ethics (اخلاقیات) بھی ضروری ہے لیکن یہ تو منتہا نہیں۔ ہم شریعت کی طرف آئیں گے تو یہ کہا جائے گا کہ ہمیں انبیائے کرام کے متعلق یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ نماز پڑھا کرو، روزہ رکھا کرو، حج ادا کرو، زکوٰۃ دو لیکن یہ چیزیں مقصود بالذات (End in itself) تو نہیں ہیں۔ مذہب میں آ کر تو یہ مقصود بالذات ہو جاتی ہیں، لیکن اگر آپ دین میں آئیں گے تو وہاں نظر آئے گا کہ یہ کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ (Means to a High End) ہیں۔ یہ بھی ضروری ہیں۔ دین کے نظام میں مقصد کے حصول کے لیے جو ذرائع ہیں، وہ بھی تو ضروری ہوتے ہیں۔ سفر کرنے کے لیے ٹکٹ خریدنا ضروری ہے لیکن ٹکٹ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔

1 اب کی تفصیل و تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء، ص 95-94 نیز فٹ



بات میں یہ کہہ رہا تھا بلکہ بات یہیں سے چلی تھی اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔ میں نے اسی لیے اس سوال کو دہرایا ہے۔ میں نے جب بھی یہ سوال کیا ہے تو آپ کے ذہن میں بھی کوئی متعین جواب نہیں آیا۔ عام طور پر نہیں آئے گا کہ دین کی غایت کیا تھی؟ انبیائے کرام کیوں آتے تھے؟ کیا کرنے آتے تھے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ سارے پیش پا افتادہ جواب غیر مطمئن ہیں لہذا اگر آپ سوچنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو نظر آئے گا کہ بات تو یہ کچھ ٹھیک سی ہے کہ کیا وہ یہی کہنے کے لیے آئے تھے کہ جھوٹ نہ بولا کرو روزہ رکھ لیا کرو آخر دین کا مقصد اور غایت کیا ہے؟ جب تک یہ نہ متعین ہو عزیزان من! باقی چیزیں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ صبح اٹھ کر سپاہیوں کی لیفٹ رائٹ پریڈ سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک ذہن میں یہ نہ ہو کہ ان کو یہ مشق کیوں کرائی جا رہی ہے۔

### دین کی اہمیت کے سلسلہ میں قرآنی تعلیم کی جامعیت کی ایک روشن مثال

اگر قرآن حکیم کی (2:213) اور (10:19) ان دو آیتوں کو ملائیے تو اس نے اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی ہے کہ انبیائے کرام کو کس لیے بھیجا تھا۔ یاد کر لیجیے یا نوٹ کر لیجیے کہ دین کا سارا پروگرام اس محور کے گرد گھومتا ہے۔ یہی مرکزی نقطہ ہے۔ یہی اس کی عمودی تعلیم ہے اور وہ ہے سورۃ بقرہ کی یہ آیت: (2:213)۔ اب اس میں اتنا حصہ آئے گا، سنئے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (2:213)۔ ابتدا پوری نوع انسانی ایک امت ایک قوم کی شکل میں تھی یعنی امت واحدہ تھی۔ اگلا ٹکڑا سورۃ یونس کی آیت (10:19) ہے۔ آپ ان دونوں کو ملا لیجیے بات سمجھ میں آجائے گی۔ كَانَ النَّاسُ (2:213) میں یہی ہے اور (10:19) میں بھی۔ کہا کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً (10:19) نوع انسان ابتدا میں امت واحدہ یعنی ایک قوم تھی لیکن بعد میں فَاخْتَلَفُوا (10:19) انہوں نے اختلافات پیدا کیے ان میں ایک تفریق پیدا ہوئی اور وہ قوم امت واحدہ نہ رہی یعنی فَاخْتَلَفُوا (10:19) ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہ وہ مشیت خداوندی تھی جو اس پورے پروگرام کی غایت تھی۔ میں دو الفاظ بولا کرتا ہوں: خارجی کائنات کے اندر فطرت کا پروگرام اور انسانی زندگی کے اندر مشیت کا پروگرام۔ یہ بات تو ایک ہی ہے۔ فطرت بھی اسی کی بنائی ہوئی ہے، مشیت بھی اسی کے قانون کا نام ہے لیکن یہ جو فَاخْتَلَفُوا والی چیز تھی یہ مشیت کے پروگرام کے اندر فٹ نہیں بیٹھتی تھی اور اس سے پروگرام Upset (تڑپتر) ہو رہا تھا۔ اس چیز سے انسانوں کے مابین امت واحدہ نہ رہنے سے ان میں اختلافات پیدا ہو جانے سے ان میں تفریق پیدا ہو جانے سے وہ نظام درہم برہم ہو رہا تھا چنانچہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو ایک بڑا انقلابی قدم اٹھانا پڑا جو اس سے پیشتر قطعاً کائنات میں نہیں تھا۔ کائنات میں یعنی باہر کی اشیائے کائنات یا حیوانات کے لیے قطعاً اسکی ضرورت نہیں تھی کہ خدا کی طرف سے خاص طور پر کوئی نبی ان کی طرف آئے اور وہ سوچتے ہوں کہ یہ کچھ کہے۔ اسکی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حیوانات میں کبھی کوئی نبی نہیں آیا۔ کسی نے آکر بکریوں کو یہ نہیں بتایا کہ تم نے گھاس چرانی

ہے، گوشت نہیں کھانا۔ کسی نے شیر سے نہیں کہا کہ گوشت تم پہ حلال ہے، سبزی تم پہ حرام ہے۔ انہیں انبیاء کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ انسانوں میں بھی وہ کہتا ہے کہ جب تک امت واحدہ سے **فَاخْتَلَفُوا** کی بات نہیں تھی، اسکی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ جب **فَاخْتَلَفُوا** (10:19) ہوا یعنی انہوں نے اختلاف کیا، ان میں تفریق پیدا ہوئی، ان میں فرقے پیدا ہوئے تو **فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِينَ** (2:213) اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا۔ یہ ہے عزیزانِ من! دین کی غایت۔ یہ غایت تھی اور ہے کہ نوع انسانی امت واحدہ رہے لیکن ان میں اختلاف پیدا ہوا۔ اب انسان کی اپنی عقل و فکر کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان اختلافات کو مٹا سکتے ورنہ ضرورت نہیں تھی، لہذا ان اختلافات کو مٹانے کے لیے مشیت کو یہ ایک انقلابی قدم اٹھانا پڑا یعنی انبیائے کرام کو بھیجا پڑا۔ آپ **فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِينَ** (2:213) میں اسے دیکھیے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ اس غرض و مقصد کیلئے کہ نوع انسانی کے ان اختلافات و امتیازات کو مٹا کر پوری انسانیت کو امت واحدہ بنا دیا جائے، عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ کہا کہ **فَبَعَثَ اللَّهُ** (2:213) خدا نے انبیائے کرام کو بھیجا۔ وہ آ کر یہ بتاتے تھے کہ **مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ** (2:213) اس اختلافی زندگی کا انجام بڑا بتا ہی ہوگا اور امت واحدہ بن کر رہنے کا نتیجہ بڑا خوشگوار اور سرفرازیوں کا حامل ہوگا۔ کیا یہی بات وہ وعظ کہنے کے لیے آئے تھے؟ اور کیا اس سے انہوں نے آگاہ کر دیا اور اس چیز کی خوش خبریاں دیدیں اور بس؟ کہا کہ نہیں، ایسا نہیں۔ **وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ** (2:213) ہر نبی کے ساتھ ایک ضابطہ قانون بھیجا جاتا تھا جو حق پر مبنی تھا۔ عزیزانِ من؟ میں یہ عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں یہ جو عقیدہ پھیلا یا گیا تھا کہ ”من نیستم رسول“<sup>①</sup> میں تو نبی ہوں، میں تو رسول نہیں ہوں۔ یہ کیا فرق تھا نبی اور رسول میں؟ کہ جی! وہ رسول تو کتاب لایا کرتا ہے اور نبی بغیر کتاب کے آیا کرتا ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے وہ کوئی وحی لے کر نہیں آتا، کوئی ضابطہ قانون لے کر نہیں آتا، کوئی حکم لے کر نہیں آتا۔ خدا کی طرف سے وہ آتا ہے، اتنی بڑی Expectation (توقع) ہو رہی ہے وہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں صاحب! انہوں نے مجھے کوئی کتاب تو دی نہیں، ویسے ہی بھیج دیا ہے۔ اندازہ لگائیے عزیزانِ من! یہ کیا بات ہوئی؟ کئی دفعہ یہ بات آپچی ہے کہ بابا! اس کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوتا تھا اور اپنے ساتھ کتاب لاتا تھا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں علم کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کی ایک آیت ساری عمران کی سمجھ میں نہیں آئی کہ **أَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ** (2:213) تمام انبیاء کو ہم نے کتاب دی اور رسولوں کے متعلق کہا کہ **لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ** (57:25) ہم نے اپنے تمام رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ

① یہ اشارہ غلام احمد قادیانی (1835-1908) کی طرف ہے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے قرآن کریم کی اکملیت و محفوظیت کا تو انکار نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے دعوے نبوت کی ایک اور راہ نکالی۔ یعنی انہوں نے کہا کہ میں رسول نہیں ہوں اس لیے بلا کتاب آیا ہوں۔ ”من نیستم رسول“  
 نیارہ ام کتاب: (پرویز: معراج انسانیت، ص-807)

کتاب نازل کی۔ رسول اور نبی ایک ہی بات تھی یہ ایک ہی منصب کے دونام ہیں<sup>①</sup>۔ سوال ہی نہیں تھا کہ خدا کی طرف سے کوئی آئے اور خدا کا کوئی حکم ساتھ نہ لائے۔ کتاب کے یہ معنی نہیں کہ اتنی بڑی ضخیم مجلد کتاب ہو۔ کتاب کے معنی قانون کے ہوتے ہیں۔ کوئی ایک حکم بھی خدا کی طرف سے لے کر آجائے گا تو وہ نبی کی کتاب ہے۔

میں یہاں اس ضمن میں یہ عرض کر دوں کہ کہا یہ گیا ہے کہ نوع انسان کو امت واحدہ بنانا مقصد عظیم تھا۔ نوع انسان امت واحدہ کی شکل میں رہتی تھی اس میں اختلاف پیدا ہوئے۔ اختلافات مٹانا انسان کے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ یہ کیوں انسان کے بس کی بات نہیں حالانکہ عقل انسانی تو اس کو بہت بڑا ذریعہ دیا گیا ہے جو حیوانات کو نہیں دیا گیا۔ یہ تھا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ نبی بھیجے۔ وہ ان اختلافات کو مٹاتے تھے۔ اس لیے کہا کہ **أَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ** (2:213)۔ ان کے ساتھ بالحق ضابطہ قانون بھیجتا کہ **لِيُحْكَمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ** (2:213) وہ انسانوں کے اختلافی معاملات اس کتاب کے ذریعے مٹا دیں۔ اس سے دین کی غرض و غایت سامنے آگئی۔

عزیزانِ من! اس سے پہلے بھی جن حضرات کی نگاہ قرآن کریم پہ تھی ان کے تو یہ ذہن میں ہوگا لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بات آپ کے ذہن میں تھی کہ دین کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیا کسی نے آج تک آپ کو بتایا تھا کہ انبیائے کرام بھیجنے کی کیوں ضرورت پڑی؟ اس وحی کے ذریعے ایک انقلابی قدم کیوں اٹھایا گیا؟ یہ حضرات کا ہے کہ لیے آتے تھے؟

### قرآنی اقدار کے اس انقلابی اقدام کی غرض و غایت

عزیزانِ من! اب یہ جو کچھ بھی باقی ہے آپ اسے تاریخ کہہ لیجیے۔ یہ وہ اقدار تھیں جو باقی رہ گئیں۔ مثلاً یہ کہ جھوٹ نہ بولے، سچ بولے، فریب نہ دیجیے، روزے رکھیے، نماز پڑھیے۔ یہ سارے اس مقصد کے حصول کے لیے ذرائع ہو جائیں گے کیونکہ اس مقصد کے لیے **فَبَعَثَ اللَّهُ** (2:213) اللہ نے انبیاء کو بھیجا۔ اب باقی جتنے بھی آپ کے ہاں احکام آئیں گے وہ اس مقصد کے حصول کے ذرائع ہونگے۔ اگر یہ مقصد ہی سامنے نہیں یا جس انداز سے آپ ان ذرائع کو اختیار و استعمال کرتے ہیں وہ مقصد ہی نہیں پورا کر رہے تو وہ دین نہیں ہے۔ مقصد تو یہ تھا کہ اس سے اختلافات مٹائیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے کہا کہ **النَّاسُ أُمَّةٌ وَاحِدَةٌ** (2:213) الناس یعنی پوری نوع انسانی ایک امت واحدہ تھی۔ اس عالمگیر انسانیت میں انسانوں نے اختلافات پیدا کر دیئے۔ اس طرح ان میں تفریق پیدا ہوگئی، تفرقہ پیدا ہوگیا، وہ الگ الگ ہو گئے۔ اس لیے اس سارے عظیم انقلابی پروگرام کو وحی کے ذریعے قوانین دینے کی ضرورت پیش

① اسکی مزید تشریح و تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز: معراج انسانیت، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، 1949ء، ص 815-817۔

آئی۔ ایک نبی بھیجنا، اس نبی کا فریضہ قرار دیدینا کہ وہ ان کے اختلافات کو اس کتاب کے ذریعے مٹائے، یہ ہے غایتِ دین۔ عزیزانِ من! آنا تو مجھے اس پر آخر میں چاہیے تھا لیکن کیوں نہ یہیں سے بات شروع کر دی جائے۔ آپ سوچیے کہ یہ ہے دین کی غایت، یہ ہے نبی کا مقصود، یہ ہے وہ کتاب جو خدا نے دی ہے۔ اس کتاب کا یہ مقصد ہے کہ اختلافی معاملات ختم کرے، فیصلہ دے، اختلاف مٹا دے اور انسانیت کو امتِ واحدہ بنا دے۔ عزیزانِ من! وہ قوم یہ مقصد کیا پورا کرے گی جس کے اپنے اندر کہنے کو بہتر (72) اور حقیقت میں بہتر ہزار (72000) فرقے خود موجود ہوں۔ جو قوم ہزار سال میں اپنا یہ اختلاف نہ مٹا سکے کہ نماز میں ہاتھ یہاں اوپر باندھنے چاہئیں یا نیچے، وہ دین کی اس غرض و غایت کو پورا نہیں کر سکے گی۔

### فرقہ بندی کو شرک قرار دینے کی وجہ جواز

قرآن نے فرقہ بندی کو کیوں شرک کہا ہے، اس پر کبھی تو کھڑے ہو کر سوچیے، کبھی تو ان سے پوچھیے، اس لیے کہ یہ انبیائے کرام کے بھیجنے کی بنیادی غایت اور غرض تھی۔ وہ بات تو پھر اس کے خلاف جاتی ہے۔ خدائے واحد کو خدا ماننے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ خدا کو ماننے کا لفظ بھی ہم بول دیتے ہیں لیکن ذہن میں نہیں آتا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ دراصل خدا کو ماننا اس کی اس متعین کردہ غرض اور غایت کو ماننا تھا۔ یہ تھا خدا کو ماننا۔ اور پھر الکتاب کا تو مقصد ہی یہ ہے اور انبیائے کرام اس لیے ہی آیا کرتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ فریضہ اس امت کے ذمے لگایا گیا۔ اس کو وارث کتاب بنایا گیا۔ یہ کام اب اس نے کرنا تھا اور اگر اس امت کے اندر خود یہ اتنے مختلف فرقے پیدا ہو جائیں، تفریقات پیدا ہو جائیں، اور فرقے مذہب کے نہیں بلکہ مملکتوں کی صورت میں بن جائیں، تو اس کا انجام کیا ہوگا! ابھی میں بتاتا ہوں کہ یہ مختلف مملکتیں، یہ سلطنتیں، یہ نسل کی بنا پر مختلف قومیتیں، انہی مسلمانوں کی، اسی امت کی ہیں جس نے عالمگیر انسانیت کو امتِ واحدہ بنانا تھا۔ کیا یہ اس ایک خدا کے بندے کہلا سکتے ہیں؟ آپ نے اسے سوچا نہیں کہ قرآن نے اسے کیوں شرک کہا ہے؟ اس لیے کہ یہ مختلف خداؤں کے بندے ہیں۔ خدائے واحد کا ماننا، جسے توحید کہتے ہیں، ایک ذہنی اور اعتقادی سی چیز نہیں ہے۔ وہ عملاً مشہود ہونے کی چیز ہے اور وہ مشہود اس طرح ہوگی کہ جو بھی توحید کا قائل ہوگا، یعنی ایک خدا کو ماننے والا ہوگا، اسی ایک کتاب کو ماننے والا ہوگا، اور جتنے بھی لوگ اس میں ہونگے ان میں اختلاف نہیں ہوگا، افتراق نہیں ہوگا، فرقہ نہیں ہوگا، تفرقہ نہیں ہوگا۔ اگر اس کتاب کے ماننے والوں کی جماعت امتِ واحدہ نہیں بنتی تو پھر دو ہی باتیں ہوگی: یا تو یہ کہ معاذ اللہ یہ دعویٰ غلط تھا، اس کتاب میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ وہ ان کو ایک کر سکے کیونکہ اس نے تو بتایا تھا جو کتاب ہم بھیجتے تھے، اس کی غایت یہ ہوتی تھی کہ پوری انسانیت کو امتِ واحدہ بنا دے۔ مگر یہ کتاب تو اختلاف نہیں مٹا سکی اور یا یہ چیز تھی کہ صاحب! ہم اس کتاب کو یہ کچھ کرنے والی مانتے ہی نہیں۔ اب دیکھیے بات کہاں چلی جاتی ہے۔ میں نے کہا

تھا کہ اس نکتے کو سمجھ لیجیے کہ دین کی بات کیا ہے؟ اس کی غایت و غرض جو قرآن نے بتائی ہے اور پھر متعین الفاظ میں بتائی وہ کیا ہے؟

انسانی تصورات کو قبائلی طور پر تقسیم کرنے کا ابتدائی عمل کیسے شروع ہوا؟

اب سوال یہ ہے کہ **فَاخْتَلَفُوا**<sup>①</sup> (10:19) کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی۔ قرآن نے تو نوع انسان کو کہا ہے کہ **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** (2:213) یہ امت وحدت تھی۔ پھر اس وحدت میں **فَاخْتَلَفُوا** (10:19) ہوا یعنی اختلاف پیدا ہوئے ان کے اندر تفریق پیدا ہوئی۔ فکر قرآن کا کام تو ان تمام اختلافات کو مٹانا ہے، ہر قسم کی تفریق کو مٹانا ہے۔ محققین علم الاقوام کی تحقیق یہ ہے کہ پورے کرہ ارض کے اُس خطے میں جس کے ارد گرد کے علاقے میں ہمیں سب سے پہلے انسانی آبادی کا سرچشمہ ملتا ہے انسانوں کا ایک گروہ تھا۔ اس میں کوئی تفریق نہیں تھی۔

میں سر دست اس تحقیق میں نہیں جاتا۔ میں نے اپنی کتابوں میں اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ بتا رکھا ہے کہ یہ تو آج ان کی تحقیق ہے کہ ان میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ قرآن تو یہ چیز چودہ سو سال پہلے کہتا ہے کہ **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** (2:213) یہ امت واحدہ تھی۔ عزیزان من! اس زمانے میں کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ انسان کہیں ایسی شکل میں بھی رہتا تھا جہاں اس میں کوئی اختلافی بات نہیں تھی۔ آج یہ تحقیق ہو رہی ہے کہ وہ پہلی بستی یا انسانوں کا گروپ جہاں رہتا تھا ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اب اس کے بعد یہ محققین آگے چلتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ صاحب! انسانوں کا وہ گروہ ایک جماعت یا جمعیت تھی۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ وہ قبائل میں تقسیم ہوئی۔ پہلی چیز اس تفریق کی یہ آتی ہے کہ وہ ایک امت واحدہ قبیلوں کے اندر تقسیم ہوئی۔ قبیلہ بننے کی بنیاد کیا ہے؟ آج تو ہمارے ذہن میں قبیلہ نہیں آتا۔ مجھے معلوم نہیں اردو والے حضرات جانتے ہیں یا نہیں، مگر ”یہ پنجابی والے تو بچے وی قبیلہ بیویوں کیندے ہیگے نیں“<sup>②</sup> تو قبیلہ کی ابتدا اس سے ہوئی تھی۔ وہ جس میں آگے اختلاف نہیں تھا اس سے جتنے بھی بچے پیدا ہوتے تھے Biologically (حیاتیاتی طور پر) تو وہ کسی مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا ہوتے تھے، لیکن ہر روز ان کے ان بچوں کے تشخص (Identity) یا ان کی بنا پے تفریق نہیں پیدا ہوئی تھی، وہ سارے ملے جلے سے اکٹھے ہی رہتے تھے۔ قبیلہ اس وقت بنتا ہے جب ایک باپ کا ایک بیٹا متعین ہو۔ پھر اس بیٹے کی آگے اولاد متعین ہو اور یہ شاخ باقی شاخوں سے اپنے آپ کو الگ کر دے۔ مثلاً یہ نور دین کا بیٹا ہے اور وہ نور دین گبول کا ہے۔ اچھا! یہ گبول ہے! آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بیٹے کو باقی بچوں سے جدا کرنے کا پہلا بیج کیسے بویا گیا۔ یہ شاخ اگر متعین طور پہ باقیوں سے جدا رہے گی، تو تھوڑے سے عرصے کے بعد ایک قبیلہ بن جائے گا۔ ہمارے ہاں ابھی وہ خاندان بنتا

① ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔

② یہ پنجابی زبان والے حضرات تو آج بھی قبیلہ بیوی کو ہی کہتے ہیں۔

ہے۔ یہ وہی سٹی ہوئی سی کچھ شکل ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ زمانے کی ضروریات نے ہمیں قبیلے سے نکال کر نسلی امتیازات (Racial Discrimination) کی نذر کر دیا۔ اس طرح ہمارے ہاں وہ ایک شکل یہ بنی ہے۔ یعنی پہلی چیز جو قبیلے کا امتیاز تھا جو بنیاد تھی وہ اس کا وہی نسلی امتیاز ہے جبکہ فطرت نے نسل میں تو کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ اس طرح ہمارے ہاں میرا بیٹا، اس کا بیٹا، اُس کا بیٹا بنے مگر Biologically (حیاتیاتی طور پر) اس میں یہ سوال ہی نہیں کہ ان میں کوئی امتیاز ہو، لیکن جب آپ ایک خاص گروہ کو ایک خاص پیدائش کے اعتبار سے متعین کر دیں گے تو وہ قبیلہ بن جائے گا۔ یہ ہوئی قبائلی زندگی (Tribal Life)۔ اب ان میں تفریق ہوئی۔

قصہ آدم میں آپ کو یاد ہوگا، اگر نہ یاد ہو تو دہرائیجے وہ تمثیلی انداز ہے۔ قرآن میں یہی ساری چیز ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ وہ ایک آدم کے قصے میں سمٹا کر رکھ دی ہے۔ آدم کی جنت میں تفریق نہیں تھی۔ اس قصے میں یہ ہے کہ ابلیس نے آدم کی ایک دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا۔ آئیے اپنی زبان میں گفتگو کریں۔ آدم دراصل یہی آدمی (The Man) ہے۔ آدمی مرنا نہیں چاہتا، ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ طبعی طور پر تو وہ زندہ رہ نہیں سکتا۔ کتنی ہی لمبی عمر کیوں نہ ہو جائے بالآخر مرنا ہے۔ یہ مرنا نہیں چاہتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم اسے ایک اور طریقہ بتا رہے ہیں کہ حیات جاوید کیسے حاصل ہوتی ہے۔ ابلیس نے اس کے کان میں کچھ اور پھونکا۔ اس نے کہا کہ ”تمہیں میں بتاتا ہوں، اس کی باتوں میں نہ آنا، میں تمہیں بتاتا ہوں“۔ اس نے کہا: ”کیا بات ہے؟“ کہنے لگا: ”اولاد کے ذریعے سے زندہ رہو، یوں حیات جاوید مل جائے گی۔“ آپ دیکھتے ہیں کہ اختلاف انسانیت کی شکل میں یہ پہلا اصول کیسے نمودار ہو رہا ہے۔ کہنے لگا: ”یہ کرو، یوں زندہ رہو گے۔“ پتہ نہیں وہ کب کہا ہوگا۔ تمثیلی بات ہے لیکن آدمی جو انسان کی سطح پر نہیں پہنچا، وہ اس پھندے (Trap) میں آ پھنسا۔

### نام و نمود کے تصور کے تحت زندہ رہنے کا فریب تمنا

آپ کو معلوم ہے کہ میں نے کچھلی دفعہ انسانی سوچ کی دو سطحیں بتائی تھیں۔ وہ آج بھی بدستور قائم و دائم ہیں۔ جب انسان آدمی کی سطح پر، اسی شکل میں زندہ رہنا چاہتا ہے تو پھر اگر اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، تو بڑھاپے میں وہ کچھ زیادہ ہی حریص ہو جاتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ”کوئی اوداناں لیند ا روے۔ لوگ وی کیندے نیں کہ بوٹا لکیر روے جی اگاں نوں۔ اسی تے اے چاہنے ہیگے<sup>1</sup> آں۔“ دیکھو! یہ وہی چیز ہے کہ جب اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اس کے تحت الشعور میں پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ ”میرا یہ بیٹا، میرا نام روشن کرے گا۔“ یہی چیز قرآن کہتا ہے کہ ابلیس نے اس کے کان میں سحر پھونکا تھا۔ یہ چیز ہم سب کے تحت الشعور میں ہے اور پھر باپ کا نام دادے کا نام، پردادے کا نام الغرض یہ تمام سلسلہ قائم و دائم رہتا ہے۔ یہ سب فریب نفس ہے۔ اس کی رو سے مرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ مجھے زندگی مل گئی ہے۔

① کوئی اس کا نام لیتا رہے۔ لوگ بھی کہتے ہیں کہ ”جی! مستقبل میں اس کا ”بوٹا“ لگا رہے۔“ ہم تو یہ چاہتے ہیں۔

## مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہ تھی پہلی چیز، وہ نسلی امتیاز جو قبائلی زندگی کے اندر نمودار ہوا۔ یہ بات اب یوں سمجھ میں آجائے گی کہ یہ شروع تو ذرا سی ہوئی تھی، پھر یہ جو اس نے طول کھینچا ہے تو سارے کرہ ارض کی انسانی مخلوق، نسلوں میں بٹ گئی۔ لہذا نسلی امتیازات کی قسموں (Kinds) کے متعلق آج کسی سے پوچھیے کہ صاحب! یہ کون کون سی ہیں؟ پھر نمایاں طور پہ جو موٹی موٹی تھیں وہ یوں گننا شروع کی جاتی ہیں: آریائی نسل (Arian Race)، سامی نسل (Semitic Race) اور منگولین نسل (Mongolian Race)۔ اس طرح انہوں نے انسانی مخلوق کو ان تین بڑی بڑی نسلوں (Races) میں تقسیم<sup>1</sup> کیا ہے۔ انہوں نے یہاں رنگ کے اعتبار سے بھی یہ امتیاز کیا ہے مثلاً زرد نسل (Yellow Race) سیاہ اور سفید نسل۔ وہی پہلی چیز جو قبیلے کی شکل میں نمودار ہوئی تھی، وہ چھوٹے سے پیمانے سے جو بڑھی ہے تو بڑے پیمانے پر اس نے عالمگیر انسانیت کو تقسیم کر دیا ہے۔ وہ چیز نسلی امتیاز ہے اور پھر نسل کے اعتبار سے فخر شروع ہوا مثلاً وہ عربی النسل کا اور اسی طرح سے وہ ہٹلر کا، ایرین نسل کا تھا۔ اگر آپ نسل کا یہ سلسلہ اوپر کو یعنی ماضی (Past) کی طرف لے جائیں تو آپ اسے کہاں تک کھینچ کر پیچھے کی طرف چلائیں گے۔ پہلے انسان تو یہی تین نہیں پیدا ہوئے تھے مگر تورات نے تو آسان طریقہ بتا دیا کہ حضرت نوعؑ کے تین بیٹے تھے: یافث (Japheth)، حام (Ham) اور سام (Shem)۔ ان تینوں کی اولاد جو آگے چلی تو بقول ان کے تین نسلیں ہو گئیں۔ نسلوں کا تو پتہ نہیں شاید قبیلے ایسے بن گئے ہونگے۔

1 قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا اڈلین سرچشمہ، جھیل کیسپین (Caspian Lake) کے اطراف و جوانب میں واقع تھا۔ اس قیاس کے ماتحت علم الاقوام السنہ کے محققین (Anthropologists) نے اقوام عالم کو مختلف مماثلت و مشابہت کی بنا پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ آریائی (ایرین: Arian) مثلاً ہندی اقوام، ایرانی اور فرنگستانی۔

۲۔ تورانی (منگولین: Mongolian) مثلاً ترکستانی اور چینی

۳۔ سامی (سیمیٹک: Semitic) مثلاً آرامی، عبرانی، عرب، سریانی، کلدانی وغیرہ۔

بعض علمائے انساب نے اقوام عالم کی تقسیم اختلاف رنگ کی بنا پر کی ہے یعنی سفید فام (مثلاً ام سامیہ اور فرنگی) سیاہ فام یا سرخ (مثلاً باشندگان افریقہ) اور زرد فام (مثلاً جاپانی اور چینی وغیرہ)۔

2 قیاس ہے کہ حضرت نوعؑ کا زمانہ قریب 5000 ق م کا ہے۔ اس شجرہ کے لیے دیکھیے: پرویز: (1994ء)۔ جوئے نور، لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ ص 2۔ نیز پرویز نے اپنی تالیف لغات القرآن جلد چہارم کے لیے پہلے ایڈیشن (1961ء) کے ص 1668 میں لکھا کہ ”آج سے قریب کچھ سات ہزار سال قبل حضرت نوعؑ مبعوث ہوئے۔ یہ تحقیق صرف تاریخی ہے۔ قرآن کریم (ان معاملات میں) نہ زمان (Time) سے بحث کرتا ہے نہ مکان (Space) ہے۔ وہ قوموں کی زندگی اور موت کے اصولوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ تاریخی جزئیات سے بحث نہیں کرتا۔

عزیزانِ من! میں کہہ رہا تھا کہ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ فَاسْتَخْلَفُوا (10:19) ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے تو اختلاف کی پہلی بنیاد یہی قبائلی زندگی ہے۔ اس نے جو وسعت کھینچی ہے تو وہ آج نسلوں کے امتیاز میں آپ کے ہاں موجود ہے۔ جب وہ ایک گروپ کی شکل میں رہتے تھے تو قرآن نے اسے جنت کی زندگی کہا ہے۔ وہ جنت کی زندگی اس لیے جنت کی زندگی تھی کہ اس میں ابھی میری اور تیری کا سوال نہیں تھا؛ جنت کی زمین پہ لکیریں نہیں کھینچی گئی تھیں کہ یہ میری زمین اور یہ تمہاری زمین، یہ تمہارے باپ کی زمین ہے۔ یہ چیز نہیں تھی۔ انسان کی وہ ابتدائی زندگی جو گروپ کی تھی اس میں یہ چیز موجود نہیں تھی۔

### ملکیت کے تصور کے متعلق محققین کی موجودہ تحقیق

آج کے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ قبائلی طور پر پرانے قبیلے ابھی تک موجود ہیں۔ آسٹریلیا کے اندر افریقہ کے دور دراز صحراؤں میں امریکہ ساؤتھ امریکہ کے اندر وہ لوگ موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں یورپ کے محققین نے بڑی تحقیق کی ہے۔ پرانے دور کے جتنے قبائلی ہیں ان کی تحقیق کے مطابق ان میں ایک چیز مشترک نظر آئی کہ ان کی زبان میں ”ملکیت“ کا لفظ نہیں ہے بلکہ ”استفادہ“ کا لفظ ہے Property (جائداد ملکیت) کا لفظ نہیں ہے۔ یعنی ابتدائی زندگی کے اندر یہ کیفیت تھی۔ جب آگے بڑھے ہیں تو ابتدائی قبائلی زندگی میں بھی یہی صورت تھی یعنی اب قبیلے اور قبیلے میں تو لکیروں کا فرق پڑ گیا ہے۔ مگر قبیلے کے اندر ابھی یہ فرق نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب لکیریں کھینچیں تو وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ آدم کے دو بیٹوں کے مابین پہلی خون ریز جنگ ہوئی تو یہی تھا وہ ماجرا جو قرآن کریم کے تمثیلی انداز میں بیان کردہ قصہ آدم میں ملائکہ (کائناتی قوتوں) نے بھانپا تھا کہ یہ آدم آگے بڑھے گا تو يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (2:30) یہ تیرے قانون سے سرکشی برتے گا، فساد برپا کرے گا، خون ریزیاں کرے گا۔ ہمیں پتہ ہے۔

آبادی بڑھی تو پھر وہاں سے قبائل نے ادھر ادھر جانا بھی شروع کیا۔ انہیں جہاں کہیں کوئی نخلستان یا پانی نظر آیا، اور پانی پہ تو یہ زندگی ہے، یہ قبیلہ وہیں بس گیا۔ اور آگے چلے تو اب یہ اختلاف جغرافیائی اختلاف ہو گیا یعنی وطن ایک نہ رہا، آج کی اصطلاح میں وطنیت کا اختلاف ہو گیا۔ ان قبائل کے وطن الگ الگ ہو گئے تو دوسرا اختلاف آگیا۔ آپ کے ہاں وطنیت کا اختلاف ہے۔ آج بھی وہی اختلافات وطن ہیں بلکہ انسان کی یہ گھر ہیں اور بھی مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ اس لیے کہ اس نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کی رو سے ان اختلافات کو رفع کرنے کی صورت اختیار نہ کی تو پھر گھر ہیں اور زیادہ مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ وطنیت کے اختلاف سے اب وطن کے اندر بسنے والے لوگوں کو ایک شمار کیا گیا، نیشن (قوم) بنایا گیا۔ یہ نیشن (قوموں) کے اختلافات ہیں جنہوں نے آج دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ وہ اختلافات ایک ہی قوم میں ایک ہی قبیلے کے اندر موجود ہیں۔ جب میری اور تیری کی تمیز ہوئی تو جس کے پاس زیادہ قوت تھی اس کی



وہ قوت اور زیادہ ہوگئی، جس کے پاس کم تھی اس بیچارے کی وہ کم سے کم تر ہوگئی۔ اس سے طبقاتی اختلاف پیدا ہو گیا۔ جس نے زیادہ سیٹی، وہ دولت مند ہو گیا، جس کے پاس کم رہی وہ بیچارہ غریب ہو گیا۔ غریب ہوا تو محتاج ہوا۔ اب جس کے پاس یہ دولت زیادہ تھی اس کا کام کرنے کے لیے یہ محتاج مجبور ہو گیا۔ جو اس کی اپنی تھوڑی سی تھی اس سے تو اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی تھیں تو وہ یہاں زمین سنبھالتا تھا۔ دولت مند نے کہا کہ ٹھیک ہے اب یہ کاشت کرو۔

ابتدائی دور میں یہ انداز غلامی تھا کہ یہ جو محتاج ہو جاتا تھا اسے اس زمانے میں ابھی مزدور نہیں کہتے تھے۔ وہ غلام ہی تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ انسانیت کی تاریخ میں بدترین دن وہ تھا جس دن سب سے پہلے مزدور نے آقا کو اتنا کما کر دیا جو اس سے زیادہ تھا جو اس مزدور پہ صرف ہوتا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی کما کر لاتا جتنا وہ کھا جاتا تھا تو یہ سلسلہ آگے ہی نہ چلتا۔ اس نے اس سے زیادہ کما کر لادیا۔ اب یہیں سے آپ کے ہاں سرمایہ داری کی طرح پڑ گئی کہ محنت اس نے کی یہ بیٹھا رہا۔ جتنا اس پہ صرف ہوتا تھا اس سے زائد وہ لے کر آ گیا۔ جو یہ زائد ہے وہ ہے جس کو آپ Surplus Money (فاضلہ دولت) کہتے ہیں۔ یہ اختلاف اور آگے بڑھ گیا۔ خدا کی طرف سے انبیاء کرام اختلافات مٹانے کے لیے آتے تھے اور جب نبی چلے جاتے تو اس کی طرف سے دیا ہوا دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا اور یہی ہمارے ساتھ ہوا۔

### نوع انسانی میں اختلافات کی نوعیت اور وسعت

قرآن کہتا ہے کہ دین شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ وہ ایک ہی ہونا چاہیے تھا۔ قرآن نے تو انبیاء کرام کا یہ مقصد بتایا ہے کہ وہ انسانیت میں وحدت پیدا کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس کا سوال ہی نہیں تھا کہ وہ الگ الگ دین لے کر آئیں۔ وہ تو ایک دین لے کر آتے تھے وہ ایک ہی کتاب لے کر آتے تھے یعنی اس کتاب کی تعلیم ہر مقام پہ ایک ہی ہوتی تھی لیکن جب وہ نبی چلا جاتا تھا تو دین مذہب میں بدل جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر نبی آتا تھا۔ اب مختلف مذاہب میں تفریق پیدا ہوئی یعنی جس مقصد کے لیے انبیاء آ رہے تھے اُن انبیاء کے جو نام لینے والے تھے وہ اس مقصد کے خلاف رہے۔ اور مذہب کے نام پر یہ تفریق تو کم بخت پہلی تفریقات سے بھی زیادہ سنگین شکل میں نمودار ہوئی۔ جتنی خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے نام پہ دنیا میں ہوئی ہیں کسی دوسرے اختلاف پر اتنی نہیں ہوئیں۔ اس لیے کہ خوں ریزی کو یہ کہہ کر مقدس بنا دیا جاتا ہے کہ یہ مذہب میں ہے یہ شریعت کے حکم کے اندر ہے یہ جہاد ہے اس میں مرنا جان دیدینا شہادت کا مرتبہ پانا ہے۔ باقی اختلافات میں سے اگر کسی اختلاف کو دور کرنا ہو تو اسے کچھ تو دلیل دینا پڑتی ہے۔ یہاں دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے نازک سے جذبات کو ابھارنا پڑتا ہے یعنی صرف مشتعل کرنا پڑتا ہے۔ یہ محض مذاہب کے باہمی اختلافات کی

وجہ سے ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنیاد کیا تھی؟ ہر اختلاف میں کسی مخصوص گروہ کا مفاد آپ دیکھیں گے۔ ایک مخصوص گروہ ہوتا ہے۔ اس کے الگ رہنے میں اس کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کے مفادات الگ نہیں رہتے۔ اگلا سوال یہ ہے کہ قومیں آپس میں جنگ کیوں کرتی ہیں؟ اصل یہ ہے کہ وہ قومیں جنگ نہیں کرتیں، ان کے اوپر ایک گروہ ہوتا ہے جن کا مفاد اس میں ہوتا ہے کہ ایک قوم الگ رہے، اس کی مملکت الگ رہے، اس کی حکومت الگ رہے، حکومت ہمارے پاس رہے۔ اگر انہیں کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یہ کچھ کرنے لگی ہے تو پھر وہ اس مقصد کے لیے اس علاقے کے عوام کو اس کے خلاف تیار کرتا ہے کہ تمہارا ملک چھن جائے گا، تمہارا وطن چھن جائے گا، تمہاری مملکت چھن جائے گی، تمہارا مذہب چھن جائے گا۔ گویا ان کا کچھ نہیں جا رہا، صرف اُن کا چھن جائے گا۔ یہ ہے اختلاف۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میں ان اختلافات کی تعریف اور ان کی تفاسیر میں جاؤں تو ایک ایک اختلاف پر بہت وقت لگے گا مگر یہ چیز ضرور بتانے کی ہے کہ ایک مذہب کے اندر بھی اختلاف ہے۔ وہ مذہب دوسرے مذاہب کے مقابلے میں بھی اختلاف رکھتا ہے۔ اب یہاں مذہب کے اندر فرقے بنے ہوئے ہیں۔ برادرانِ عزیز! اس چیز کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن کس قدر تفرقے کی گرہ مضبوط ہوتی ہے اس کا آپ کو بھی احساس ہے۔

اختلافات آپ نے دیکھے۔ میں نے ان کے اجمالی خطوط آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ یہ محض باہر کی کھینچی ہوئی لائیں ہیں۔ میں تفصیل میں نہیں گیا لیکن وہ یہی بڑے بڑے خطوط ہیں جن میں آج بھی آپ دیکھیں گے کہ انسانیت اسی میں بٹی ہوئی ہے۔ یہی نسل کے اختلافات، وطن کے اختلافات، قومیت کے اختلافات، برادری کے اختلافات، قبیلوں کے اختلافات، خاندانوں کے اختلافات، مذہب کے اختلافات، مذہبی فرقوں کے اختلافات ہیں جنہوں نے نوعِ انسان کو ایک برادری کی شکل میں نہیں رہنے دیا۔

### گھٹا ٹوپ اندھیروں میں قندیلِ آسمانی کی نعمتِ عظمیٰ

عزیزانِ من! اب آئیے قرآن کی طرف۔ قرآن کہتا ہے کہ سَكَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (2:213) نوعِ انسان ایک برادری کی شکل میں رہتی تھی۔ یہ بڑی جنت کی زندگی تھی۔ فَاخْتَلَفُوا (10:19) اختلاف پیدا ہوا۔ جنت چھن گئی۔ آدم مایوس ہو گیا کیونکہ ان اختلافات کو مٹانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب آپ نے سمجھا کہ وہ کیوں مایوس ہو گیا۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو آج بھی دیکھ لے کہ دنیا کے نقشے میں اس جمِ غفیر کے اندر کتنے بڑے بڑے دانشور رہے ہیں، ان کی عقل و فکر کے اوپر غور کیجیے تو انسانِ محو حیرت رہ جاتا ہے کہ صاحب! یہ کتنے بڑے نامی گرامی انسان ہیں، لیکن کس طرح عاجز و ناتواں ہیں۔ ساری دنیا کے دانشور چھوٹے سے چھوٹا اختلاف نہیں

مٹا سکتے، اور ان اختلافات کے جو تباہ کن نتائج ہیں وہ آج دنیا کے سامنے بڑے ابھر کر آ گئے ہیں۔ ساری دنیا چیخ رہی ہے لیکن کوئی ایک اختلاف نہیں مٹ رہا۔ عقل و خرد کی کمی نہیں ہے۔ یہ اسی کے سہارے ہی تو بہت آگے پہنچی ہوئی ہے۔ انسان چاند تک تو جاسکتا ہے لیکن امیر اور غریب کے اختلافات نہیں مٹا سکتا۔ اس کی بین مثال فرانس میں غریب اور امیر ممالک کے اختلاف کا حل سوچنے کے لیے بلائی جانے والی کانفرنس ہے۔ کل شام <sup>1</sup> خبر آ گئی کہ یہ کانفرنس ’’نشست گفتن برخواستن‘‘ نام کا مہم رہ گئی اور وہ سب اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور دوسری خبر یہ تھی کہ مرتخ یا اس کائنات کے باہر گزروں میں پہنچانے کے لیے پیغامات (Messages) یو این او کے سیکرٹری جنرل صاحب نے دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں ریکارڈ کر لیے ہیں۔ یہ پیغامات (Messages) انہیں یہ کہنے کے لیے ہیں کہ بھئی! تمہارا کوئی مسئلہ اٹکا ہوا ہو تو ہمیں بتا دیجیے ہم حل کر دیں گے۔ او بابا! سعدی <sup>2</sup> اتنا عرصہ پہلے کہہ گیا ہے: او پگلیا! پہلے گھر دے مسئلے سے حل کر <sup>3</sup>۔ ہماری دانش و بینش کا بھی یہی فریب نفس ہے کہ ہم تو مرتخ تک یہ پیغام پہنچا رہے ہیں اور خود انہی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ خود اپنے ہاں جائے امن نہیں ہے۔

### انسانی معاملات کے حل کے سلسلہ میں عقل و فکر کی زبوں حالی

آج کے ایک ہی نیوز پیپر میں یہ بھی ایک نیوز ہے کہ وہ فرانس کے اندر کہاں کہاں سے جمع ہوئے ہیں۔ ابھی کئی اور مختلف کانفرنسوں کا تو کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ طرابلس کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ بیت المقدس کا مسئلہ کیا ہے؟ فلسطین کا مسئلہ کیا ہے؟ ارے اپنے ہی گھر کو لے لیجیے، ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ قرآن نے کہا کہ فَاسْتَخْلَفُوا (10:19) اختلافات پیدا ہو گئے۔ پوچھیے ان سے جو مدعی ہیں کہ وحی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، عقل انسانی بہت بڑی چیز ہے، یہ اپنے ہر مسئلے کا حل سوچ سکتی ہے۔ ان سے پوچھیے کہ سب سے سنگین مسئلہ کیا ہے؟ آج تم بھی یہ کہہ رہے ہو کہ یہ مسئلہ انسانوں کے باہمی اختلافات ہیں، انہوں نے اس کڑھ ارض کو جہنم بنا دیا ہے۔ اگر عقل انسانی کے بس کی بات ہے تو مٹا کیوں نہیں دیتے؟ کیا تمہارے ہاں کوئی عقل کی کمی ہے؟ غور کیجیے۔ عزیزان! قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے آدم کو کہا گیا تھا کہ ہم نے اپنی طرف سے نوع انسانی کے لیے صراطِ مستقیم کی نشان دہی کی خاطر کتاب نور عطا کی ہے جو تمام اختلافات کو مٹا دے گی اور حضرات انبیائے کرام نے جو یہاں عملاً نظام قائم کیا، وہ

1 4 جون 1977

2 سعدی شیرازی (1184-1291)

3 ارے پگلی! پہلے اپنے گھر کے مسائل تو حل کر لے۔

(نوٹ: سعدی شیرازی کا یہ مصرعہ تو فارسی میں ہے، مگر اس کا مفہوم پنجابی میں کہا گیا ہے)

ایک بستی میں تھا، چھوٹی سی جگہ میں تھا۔ اس نظام کا مقصد یہ بتانا تھا کہ وحی کے ذریعے ایسا گروپ پیدا کیا جاسکتا ہے کہ ان میں یہ تفریق نہ ہو، کوئی اختلاف نہ ہو۔ وہ امت واحدہ پیدا کر کے جاتے تھے۔ گو وہ محدود ہوتا تھا لیکن وہ چھوٹے پیمانے پر بھی جو کرتے تھے تو وہ یہ بتا دیتے تھے کہ ایسا ہو جانا ممکن ہے۔ یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ یہ کیسے مٹ سکتے ہیں؟ کہ انسان کی زندگی کو صرف آدمی کی زندگی نہ سمجھا جائے، حیوان کی زندگی نہ سمجھا جائے، اس کی زندگی کو انسانی سطح پر لے آئے اختلافات مٹ جائیں گے۔

### آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا<sup>1</sup>

عزیز ان من! اختلاف تو بنی آدم میں پیدا ہوئے ہیں مگر كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (2:213)۔ جو انسان تھا، وہ تو امت واحدہ تھا۔ بات ساری اتنی ہوئی کہ ایک انسان کو آدم کی سطح پر یعنی آدمی کی سطح پر چھوڑ دیا جائے تو یہ سارے اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ خوں ریزیاں، فساد انگیزیاں، فتنے اور کڑھ ارض کا جہنم بن جانا، یہ سب کچھ ہوگا۔ اگر اس آدم کو انسانیت کی سطح پر لے آیا جائے تو یہ امت واحدہ بن جائے۔ انبیائے کرام اور ان کی امتوں کی ساری تاریخ میں یہی ان کی ساری سرگزشت تھی، یہی ان کی ساری غرض و غایت ہے۔ لہذا مذہب کو دین میں تبدیل کرنا انبیائے کرام کی سرگزشت ہے۔ پھر جب یہی بلند سے بلند تر چیز انسانوں کی جگہ آدمیوں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے تو وہ اس کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ وہی دین جو وحدت انسانیت پیدا کرنے کے لیے تھا، وہی دین مذہب میں تبدیل ہو کر مختلف مذاہب کی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن نے ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی تھے۔ ان کی کیفیت دیکھیے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف لٹھ لیے پھر رہے ہیں، ہر روز ایک دوسرے کے ساتھ مناظرے ہیں، سر پھٹول ہے اور قیامت یہ ہے کہ دونوں مدعی ہیں کہ ہم خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب کا اتباع کر رہے ہیں حالانکہ کتاب تو ان اختلافات کے مٹانے کے لیے آیا کرتی تھی، تم اسی کتاب کے ذریعے اختلافات کو اور زیادہ سنگین کر رہے ہو۔ اب آپ کے ہاں مذہب کی بنا پر یہ کچھ ہو رہا ہے۔ آپ کے ہاں کی فرقہ بندی میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ وہ تو ان یہودیوں اور عیسائیوں کو کہہ رہا تھا، یہاں آپ ہر فرقہ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم قرآن کے پیروکار ہیں، اس پہ ہمارا ایمان ہے، اتنی تلاوت ہوتی ہے، ایک رات میں پورا قرآن دہرا دیا جاتا ہے۔ دنیا میں کسی کتاب کی اتنی تلاوت نہیں ہوتی۔ ہر مسجد میں قرآن دہرایا جاتا ہے، ساتھ والی میں بھی دہرایا جاتا ہے، وہ ساتھ والا نمازی یہاں آ کر قرآن نہیں سن سکتا اور یہاں والا وہاں جا کر نہیں سن سکتا۔ دونوں قرآن کے ماننے والے ہیں حالانکہ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ لِيَحْكُمَ

<sup>1</sup> مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797ء) کے اس شعر کا یہ مصرع ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا  
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (2:213) کتاب اس لیے بھیجی جاتی تھی کہ ان میں جو اختلافات پیدا ہو جائیں وہ ان کے لیے حکم بنے۔ بات ساری یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کی کتاب کو حاکم تسلیم کیے بغیر باہمی اختلافات ختم ہو ہی نہیں سکتے

عزیزانِ من! ایک لفظ نے یہ سارے کا سارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ مذہب میں یہ الکتب حکم نہیں ہوتی، یہ حاکم نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے کفر اور اسلام کا جو امتیاز بتایا ہے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ کفر یہ ہے کہ کتاب کو ماننا نہ جائے جبکہ اسلام یہ ہے کہ کتاب کو ماننا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ مَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5:44) جو اس کتاب کو حکم نہیں ٹھہراتا اس کے مطابق حکومت نہیں کرتا، اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ یہی الفاظ یہاں ہیں: لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ (2:213) الناس کے اختلافات مٹانے کے لیے اسے حکم ہونا چاہیے۔ میں قرآن حکیم کی بات کہہ رہا ہوں کہ قرآن حکیم نے دین کی غرض و غایت ہی یہ بتائی ہے۔ یہ بہت بڑا بنیادی مسئلہ (Problem) ہے کہ لفظوں میں ہی معنی کچھ اور استعمال کر لیں۔ یہ Problem (مسئلہ) بہت بڑی Problem (مسئلہ) ہے۔ قرآن اسے حل کر رہا ہے کہ مقصد یہ ہے۔

دین کی حکمرانی میں مذہبی فرقوں کا تصور ممکن ہی نہیں

اب آپ غرض و غایت کے ماتحت انبیائے کرام کی تاریخ کی طرف آئیے۔ ان کی جتنی بھی امتیں گزری ہیں ان کی سرگزشتوں کی طرف آئیے اور یہ دین کی غایت رکھ دیجیے پھر دیکھیے کہ قرآن کیا کیا بیان کرتا ہے، کس کس قسم کے اختلافات کا ذکر کرتا ہے۔ پہلی چیز آئی ہے کہ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ (23:23) ہم نے نوحؑ کو اسکی قوم کی طرف مبعوث کیا۔ اس نے آکر یہ کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! تم صرف ایک خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اسکے خلاف کوئی اور ایسی طاقت صاحبِ اقتدار نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ سو تم بتاؤ کہ تم اُس کے قوانین کی نگہداشت کرنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟ ہم نے مذہب میں عبادت کا ترجمہ پرستش کر دیا۔ اب ہندو اپنے طریق سے پرستش کرتا ہے، مسلمان اپنے طریقے سے کرتا ہے۔ مسلمانوں میں سنی اپنے طریق سے کرتا ہے، شیعہ اپنے طریقے سے۔ سنیوں میں پھر اہلحدیث ہے، وہ اپنے طریق سے کرتا ہے دیوبندی اپنے طریق سے کرتا ہے اور بریلوی اپنے طریق سے پرستش کرتے ہیں<sup>①</sup>۔

① ان اشارات کی مزید تشریح و تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء ص 376-373 نیز ص 374 کے فٹ نوٹ 1 تا 3۔

اگر آپ ایک مملکت میں کسی دوسرے قانون کی حکومت اختیار کریں تو پھر بغاوت ہو جاتی ہے۔ اختلاف مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت اس کتاب (قرآن کریم) کی ہو، حکومت اس کی ہو، تو چھوٹے سے پیمانے کے اوپر بھی اختلاف مٹ گیا۔ آپ دیکھیے کہ جب قانون عمل کی شکل اختیار کرتا ہے تو ملک میں اس کی اطاعت کرائی جاتی ہے۔ اختلاف کیسے مٹتا ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھیے۔ مثلاً قانون ہے کہ Keep to the left یعنی بائیں طرف چلیے۔ اب ہندو مسلمان سب بائیں چل رہے ہیں۔ ابحدیث وہابی، نیم وہابی، رضوی، آرائیں، جاٹ، کمبوہ، شیخ، سید، پٹھان، وہ سب Keep to the left ہیں، بائیں طرف چل رہے، کوئی تفرقہ بیچ میں نہیں رہتا۔ ذرا کسی نے اختلاف کیا، کوئی ذرا Right (دائیں) پہا بھرا، تو پولیس والے نے پکڑا۔ وہ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتا کہ نہیں، میں تو فلاں فرقے سے منسلک ہوں، اس لیے قانون ختم ہو گیا۔ یہاں اس قانون نے ختم نہیں ہونا ہے، جی تو اختلاف مٹ سکتا ہے۔

دین کے نظام کی سب سے زیادہ مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے

اب مخالفت دیکھیے کہ کس کی طرف سے ہوئی۔ بظاہر تو یوں نظر آتا ہے کہ یہ جو ان کے ہاں مذہبی پیشوا تھے، یہ مخالفت ان کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کو بھی آگے لایا جاتا تھا لیکن قرآن یہ بنیاد بتاتا ہے کہ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ<sup>1</sup> (23:24)۔ آپ کو یاد ہوگا، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ الْمَلَأُ قرآن کی ایک جامع اصطلاح ہے، اس پر پورا پارہ<sup>2</sup> ہے۔ وہاں یہی ہے کہ ہر نبی نے یہ بات کہی اور یہ جو سرداران قوم تھے پہلے انہوں نے اٹھ کر مخالفت کی۔ اس اصطلاح کا ترجمہ ”سرداران قوم“ کیا جاتا ہے لیکن یہ بنیادی بات نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ان اختلافات کی گہرائی اس لیے مضبوط کی جاتی ہیں کہ مفادات مختلف ہوتے ہیں۔ مادے کے اعتبار سے لفظ ”ملا“ (مل ا) کے معنی ہوتے ہیں ”وہ جن کے گھروں کے برتن انا جوں سے بھرے ہوئے ہیں، جنہاں دیاں کوٹھیاں وچ دانے ہوں“<sup>3</sup>۔ اس لفظ کی بنیاد یہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے یہ لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟ عربی زبان میں تو سرداران قوم کے لیے ایک ایک بات کے لیے سو سو ہزار ہزار الفاظ مل جائیں لیکن خاص طور پر یہ لفظ کیوں استعمال کیا کہ جس کی بنیاد کے اندر یہ چیز ہے کہ جن کی کوٹھیاں اناج سے بھری ہوئی تھیں، وہ مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ ان کے ذاتی مفاد پہ زبردستی تھی۔ تفریق

1 اُس کی قوم کے اکابرین، جنہیں سامان زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں، اُس کی بات ماننے سے انکار کر دیا (پرویز: مفہوم القرآن، ص 776 تا 777)۔

2 نویں پارہ کا نام ہی قال الملأ ہے۔

3 جن کی کوٹھیاں اناج سے بھری ہوئی ہوں۔

اسوقت مٹی جب تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے<sup>①</sup>۔ بہر حال ان کی طرف سے مخالفت کی پہلی کڑی یہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (23:24) یہ نوحؑ جو اپنے آپ کو خدا کا فرستادہ کہتا ہے، تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ اس میں کوئی امتیازی بات نہیں ہے۔ تمہارے ہی جیسا ہے یعنی ہمارے جیسا بھی نہیں ہے۔ اب سنو کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ (23:24) چاہتا یہ ہے کہ وہ تمہارے اوپر افضلیت حاصل کر لے تمہارے اوپر بڑا بن جائے۔ یہ کہنے کے لیے آیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اپنی بات اس سطح پر لے آئے کہ اس وقت تو یہ ہمارے بندے بنے ہوئے ہیں اور جو بات یہ کہہ رہا ہے اگر یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی تو پھر تو ہم سربراہ نہیں رہ سکتے۔ یہ اس قسم کی امت بنانا چاہتا ہے جسمیں اس قسم کے ہی لوگ ہونگے جو ان میں سے واجب التکریم سمجھے جائیں گے۔ یوں کہیے کہ پھر اس طرح یہ ہمارے ہاں کی سرداری اپنے آپ چھن جاتی ہے۔ پھر یہ ان عوام کی طرف آگئے اور کہا کہ یہ جو کہہ رہا ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے نبوت ملی ہے خدا نے اگر ایسا ہی کچھ کہنا تھا تو وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً (23:24)۔ فرشتے بھیج دیتا، وہ آکر بات سمجھا دیتے۔ وہ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو اپنا پیغامبر کیوں بناتا؟ پھر جو کچھ یہ کہتا ہے وہ بالکل انوکھی بات ہے۔ اس کے لیے دلیل کیا ہے؟ یہ ہے کہ مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ (23:24) ہم نے یہ کچھ اپنے آباؤ اجداد سے کبھی نہیں سنا۔ یہ جو ہمارے ہاں تفریق ہے یہ ہمارے مورث اعلیٰ ہمارے آباؤ اجداد سے چلی آرہی ہے۔ ان میں سے تو کبھی کسی نے یہ بات نہیں کی، اسلاف کے مسلک میں یہ بات قطعاً نہیں ہے، تمہارے اسلاف کے مسلک سے یہ تمہیں برگشتہ کر رہا ہے۔ آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح عوام کو بھڑکار رہے ہیں۔

### معاشرے میں کام کرنے والوں (یعنی کمیوں) پر کام نہ کرنے والوں کی حکومت

اب جو آگے کہا ہے اس کے لیے پہلے یہ سنیے کہ وہ کہا کیا ہے؟ بات غور سے سننے کی آگئی۔ بات آگئی تھی: تفریق کی اختلاف کی تفریق کی۔ میں نے بتا دیا تھا کہ تفرقے کس کس قسم کے ہیں۔ ایک ہی قوم کے اندر یہ جو Division of Labour (یعنی تقسیم کار) ہے اس کی رو سے تو مختلف کام مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کوئی کنکر بناتا ہے، قوم کا کام ہے۔ کوئی لوہے کا کام کرتا ہے، قوم کا کام ہے۔ کوئی دوکانداری کرتا ہے، کنجڑ اسبزی بیچتا ہے، قوم کا کام ہے۔ کوئی کپڑے بنتا ہے لیکن اس تقسیم کار سے یہ لوگ جتنے کام کرتے ہیں ان کے اوپر ایک طبقہ ہوتا ہے جو کچھ کام نہیں کرتا، وہ سب کا حاکم ہوتا ہے اور یہ سارے کے سارے کام کرنے والے ”کمی“ بن کر رہ جاتے

① شکوہ بانگ درا میں اقبالؒ کا یہ شعر یوں ہے:

بندہ و صاحب محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ہیں۔ ”کمی“ کا لفظ اب دیکھیے۔ آپ اب تک اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں۔ ”کمی“ کا لفظ کن معنی میں استعمال ہوتا ہے؟ کام کرنے والے۔ تو گویا معاشرے میں تقسیم کار ایک بہت ضروری چیز ہے۔ اس کے لیے مختلف کام مختلف لوگوں نے سنبھال لیے یا مختلف لوگوں کے سپرد کیے گئے لیکن نظریہ آیا کہ وہ یہ کام ان لوگوں کے لیے کر رہے ہیں جو یہ خود کے لیے کوئی کام نہیں کر رہے۔ خود یہ طبقہ کون تھا؟ یہی جو محنت کر کے نہیں کھاتا۔ اور پھر دوسرا مذہب پرست طبقہ ہے۔ یہ دو ہی طبقے ہیں عزیزان! جو کام کر کے نہیں کھاتے۔ یہ باقی سارے کام کرتے ہیں۔ یہ وہ کام کرنے والے تھے جو آہستہ آہستہ معاشرے کی نگاہوں میں ”کمین“ ہو گئے اور یہ جو کام کر کے نہیں کھاتے تھے یہ معاشرے کے مہذب لوگ بن گئے۔

اب دیکھیں کہ یہ نبی کا ہے کے لیے آیا کرتے تھے؟ حضرت نوحؑ نے آ کر ایک پیغام دیا۔ اس معاشرے کے اندر دو طبقے تھے۔ ایک طبقہ ان ”کمینوں“ کا تھا یعنی کام کرنے والوں کا اور دوسرا طبقہ وہ جن کے برتن ہمیشہ ہمیشہ سے بھرے رہتے تھے۔ ان انبیائے کرام نے آ کر جب یہ آواز دی تو ان ”کمینوں“ سے کہا کہ تمہیں اس طرح سے کمی محتاج اور غریب سمجھنے والے یہ کون ہوتے ہیں؟ خدا نے تمام انسانوں کو ایک جیسا پیدا کیا ہے۔ انسان صرف اس کا حقدار ہے جو کچھ وہ محنت کرتا ہے۔ جو محنت نہیں کرتے وہ تو ایک پیسے کے بھی حقدار نہیں ہیں اور یہ بھی جو تمہارے اوپر سردار ہیں۔ یہ تمہیں ذلیل جان رہے ہیں اور ”کمی“ جان رہے ہیں، کمین جان رہے ہیں، یہ قطعی غلط ہے۔ معاشرے کی یہ تفریق اور تشکیل غلط ہے۔ انسانیت کی سطح پر آؤ۔ یہ تمہارا استحصال (Exploit) نہیں کر سکتے۔

اب یہ سیدھی سی بات ہے کہ جب یہ چیز کہی تو انہوں نے اس اعلان حق کے خلاف آواز بلند کی۔ اب آپ سورہ ہود کو سامنے لائیں۔ اب مخاصمت ہی یہی تھی ان مخالفت کرنے والوں کے ساتھ یہی بات چیت ہو رہی ہے کہ یہ دو گروہ سامنے آئے ہیں۔ فَقَالَ الْمَلَأُ (11:27) اس کی قوم کے بڑے بڑے لوگوں نے، جن کے پاس سامان زبست کی فراوانی تھی، کہا کہ یہ جو تمہارے ساتھ ہیں، یہ تو اَرَا ذُلْنَا بِاَدَى الرَّأْيِ (11:27) ہمارے معاشرے کے کمین اور ذلیل آدمی ہیں۔ دیکھ لیا، عزیزان! من! نبی کا ہے کے لیے آتا ہے؟ دیکھا کہ اعتراض کیا ہو رہا ہے؟ یہ کہ جن کو وہ کمی سمجھتے تھے جن کو کمین سمجھتے تھے، انہیں یہ بتانا چاہتا تھا، کہ ایسا نہیں ہے، جو انہوں نے کہا ہے۔ وہ صاحب ثروت و اقتدار یہ کہتے تھے کہ یہ چاہتا ہے کہ ہمارے اوپر برتری حاصل ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو تمہارے ہاں تمہارا ساتھ دے رہے ہیں، تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں، یہ ہمارے معاشرے کے بڑے ذلیل لوگ ہیں، کمینے لوگ ہیں، باقی رہا یہ کہ انہوں نے تمہاری بات مان لی ہے تو سنو! انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رو سے قبول نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لیے ہیں۔ یہ تو اناج کے محتاج ہیں۔ انہیں کیا عقل! کیونکہ جیہدی کوٹھی اچ دا نے اوہ دے کملہ وی سیانے <sup>1</sup>۔

1 جن کے گھر اناج سے بھرے ہوں ان کے کم عقل بھی صاحب عقل ہوتے ہیں۔



حضرت نوح کے دور میں بھی سب سے پہلا اختلاف دولت کے معیار پر تھا

عقل و فکر تو ان کے ہاں ہوتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ ایک تو یہ کہ یہ لوگ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ درجے (منج قوم) کے لوگ ہیں دوسرا یہ کہ یہ جو کہہ رہے ہو کہ انہوں نے اس دین کو عقل و فکر کی رو سے قبول کر لیا ہے، صحیح نہیں ہے۔ اگلی بات یہ ہے کہ ذرا بتاؤ تو سہی کہ کیا تمہیں رزق اور مال کی رو سے فضیلت حاصل ہے۔ اب برتری اور فضیلت کا معیار یہ ہو گیا۔ روز کی محنت کرنے والا ہمارے پاس آئے اگر ہم اسے نہ دیں تو یہ بھوکا مر جائے۔ اس لیے بتاؤ تو سہی کہ کیا معاشی اعتبار سے تمہیں ہمارے اوپر فضیلت حاصل ہے؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی وجہ کی کڑیوں میں سے یا پہلا رسول، حضرت نوح، کا سب سے پہلا تعارف کس تعلیم پر ہے؟ اس کی پہلی دعوت کیا ہے؟ وہ دعوت کیا کہہ رہی ہے؟ معاشرے کے اندر پہلا اختلاف دولت کو معیار قرار دینا ہے۔ صاحب ثروت و اقتدار لوگ دولت کو معیار قرار دیتے ہیں۔ خدا کے نبی محنت کو معیار قرار دیتے ہیں۔ یہ جو ایک قبیلے کے اندر تفریق ہوئی تھی، اسے مٹانے کے لیے کتاب اتری۔ حضرت نوح نے کہا کہ میری قوم کتنے غلط دلائل اور کتنے غلط معیار لا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ کس کے پاس کتنی دولت ہے۔ سوال تو یہ ہے جو میں پیش کر رہا ہوں کہ صحیح انسانیت کا راستہ کونسا ہے؟ کونسی وہ منزل ہے جو بیسنت پر ہے؟ کون عقل و فکر کی رو سے مانتا ہے؟ کون دعوت دے رہا ہے؟ یہ چیزیں اتنی واضح ہیں کہ اگر تم بھی اپنے جذبات کو الگ کر دو تو بات واضح ہو جائے لیکن تم تو اندھے ہوئے ہو۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ ادنیٰ درجے (منج قوم) کے لوگ ہیں اس لیے ان کی سمجھ میں بات آگئی ہے۔ بات یہ ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ بات اس لیے نہیں آرہی کہ تم اندھے ہو رہے ہو، تمہیں نشہ قوت کی بد مستیاں ہیں جنہوں نے تم سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت چھین لی ہے اور یہ کہہ رہے ہو کہ وہ ماننے والے جو ہیں ان کی عقل و فکر کیا ہے! ان کی عقل و فکر صحیح ہے کیونکہ وہ مدہوش نہیں ہیں، وہ نشہ میں بدست نہیں ہیں، اندھے نہیں ہوئے (11:28)۔ کیا الفاظ ہیں! باقی رہی یہ بات کہ ٹھیک ہے، ہم مانتے ہیں لیکن ہماری دعوت تو یہ ہے کہ ہم جبراً یہ بات نہیں سوچ سکتے۔ اس کے لیے ہمارا دل نہیں مانتا۔ میں دلائل و براہین کی رو سے تمہیں سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔

دین کی تعلیم دینے والا کسی شخص سے معاوضے کا طلب گار نہیں ہوتا

اگلی یہ بات ٹھیک ہے کہ جو دولت تمہارے پاس ہے وہ دولت ہمارے پاس نہیں ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ میں جو تمہیں دعوت دیتا ہوں اگر میری یہ دعوت تمہاری طرح بھی اپنے مفاد کے لیے ہو تو میں باہر کے لوگوں کو اکساؤں اور اندر تم سے کچھ اور کہوں۔ دیکھ رہے ہو کہ میں تو تم سے ایک پائی بھی نہیں مانگتا (11:29)۔ یہ بڑی چیز ہے۔ عزیزانِ من! جو بھی اس دعوت کو لے کر اٹھے گا اس کے لیے پہلی چیز یہ ہوگی کہ وہ اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگے گا۔ جو نبی اس کے معاوضے کا سوال آیا، ہر نبی نے عزیزانِ من! یہ کہا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے

بھی آخر میں یہی کہا ہے، یہ بڑی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا ہے۔ جو روٹی کا محتاج ہو کر اس کی دعوت کے لیے اٹھا اس کی یہ بات کوئی نہیں سنے گا۔ یہ تو پھر اس کے ساتھ ایسا سودا کریں گے کہ پوچھو نہیں صاحب! اسے کہیں کانیں رہنے دیں گے۔ یہ اعلان ہے کہ کچھ نہیں مانگتا۔ بھوکا مر جاؤں گا، میں تم سے معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ میں بلا معاوضہ یہ کچھ کر رہا ہوں۔ بلا معاوضہ تو انسان کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ وہ معاوضہ وہاں سے ملے گا، جس نے اس مشن کے لیے تمہیں مامور کیا ہے (11:29)۔ وہ تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ تم میرے ساتھ بات کرو۔ تم یہ کہتے ہو کہ یہ معاشرے کا ذیل ہے۔ اب اگلی بات یہ آگئی کہ وہ کیا کہنے آئے تھے؟ یہ کہنے آئے تھے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے جو تم کہتے ہو، لیکن اگر ہم تمہاری دعوت پہ آجائیں تو..... یعنی دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دیا جاتا..... تو بھئی! بڑی غلط بات ہے، کوئی تمہارے لیے پوچھتا ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس نہ پیسہ، نہ عقل، نہ فکر، نہ معاشرے میں اس کا کوئی خاص مقام ہے۔ یہ بات ہی کونسی ہے؟ ہم تمہارے پاس آجاتے ہیں مگر ایک شرط ہے کہ انہیں یہاں سے نکال باہر کرو۔ یہی فرق ہے، عزیزانِ من! خدا کی طرف دعوت دینے والے میں اور اپنے مفاد کے حصول میں غرق ہونے والے میں۔ وہ اس مقام پہ یہ گئے گا کہ یہ اچھا چوہدری کا گھر ہے، برادری والا ہے، پانچ سو ووٹ ملے گا، دوسرا تو محض ”کمی“ ہے، کم ہمارے اس سے کیا ملے گا۔ لیکن وہ تو آیا ہی اس اختلاف کو مٹانے کے لیے ہے، وہ تو آیا ہی آدمی کو انسانیت کی سطح کے اوپر لانے کے لیے ہے۔ وہ یہ سودے بازی نہیں کرتا کہ میں انہیں تمہارے کہنے پر دھتکاروں صرف اس لیے کہ غریب ہیں، معاشرے میں اونچا مقام نہیں ہے، یہاں تو خیر یہ مجھے کچھ نہ کہہ سکیں گے کل کو جب یہ اپنے خدا کے سامنے جا کر کہیں گے کہ انہوں نے ہمیں اس لیے دھتکار دیا تھا کہ ان سرداروں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ کم بختو! بتاؤ وہاں میں کیا جواب دوں گا، تمہیں پتہ نہیں کہ یہ کس عدالت میں جا کر مقدمہ دائر کرے گا (11:29)۔

### ہر نبی کی پیش کردہ تعلیم کا مرکزی نکتہ طبقاتی فرق کو مٹانا ہوتا تھا

عزیزانِ من! انسانیت کی اصلاح وہی کر سکتا ہے جسے ہر وقت یہ فکر ہو کہ خدا کے ہاں اس کا مقدمہ دائر ہوگا۔ میں ”وہاں کیا جواب دوں گا“؟ تم انہیں یہ کہتے ہو۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے جیسا کوئی بیوقوف ہے ہی نہیں۔ تباہی کی آگ تمہیں گھیرے ہوئے ہے، میں تمہیں بچانے کی فکر کر رہا ہوں اور تم مجھے یہ کہہ رہے ہو کہ نہیں اس دعوت کو چھوڑ دو، ہمارے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ آگے بھی یہی چیز ہے: یاد رکھو! دولت کو معیار قرار دینا غلط ہے۔ یہ نہیں ہے کہ تم یوں میرے ساتھ آ جاؤ کیونکہ میرے ہاں بڑے بڑے خزانے ہیں، بڑی دولت ہے، قطعاً نہیں (11:31)۔ میں یہ بات تم سے نہیں کہہ سکتا۔ دنیاوی اعتبار سے بھی میرے پاس کوئی دولت نہیں ہے اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں مذہب کی اسٹیج پر یہ دعوت دے رہا ہوں تو سن رکھو! کہ اب یہ مذہب کی اسٹیج نہیں ہے۔ تم نے کہا تھا کہ ہمارے ہی جیسا کوئی

انسان ہے۔ ہاں بالکل تمہارے جیسا انسان ہے۔ اسے غیب کا علم بھی نہیں ہے۔ مذہب کی سطح پہ بھی دنیا سے اوپر نہیں ہوتا (11:31)۔ عزیزانِ من! وہ تفرقہ کچھ اس تفرقے سے کم نہیں ہوتا۔ یہاں تو پھر بھی سامنے بیٹھ کر کچھ جرح ہوتی ہے، معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں تو یہ لوگ مرنے کے بعد بھی اپنی حکومت کو قیامت تک جاری رکھتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ اس تصور کی شہ رگ کاٹ کے رکھ دی۔ یہ کیوں ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی قبروں کو مردہ بدست زندہ رکھتے ہیں؟ ان کے ہاں ایک ہی بات ہوتی ہے کہ یہ جانتے ہیں کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے مگر خدا کا نبی کہتا ہے کہ مجھے غیب کا علم نہیں ہے۔ وہ صرف خدا کے پاس ہے۔ یہاں صرف یہ بات ہے کہ یہ صرف حق کو حق سمجھ کر میرے پاس آئے ہیں نہ دولت میرے پاس ہے نہ روحانیت کا کوئی دعویٰ ہے نہ فرشتے ہونے کا کوئی دعویٰ ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا بات ہے جس کے لیے وہ میرے پاس آئے ہیں؟ ایک ہی چیز ہے جو میں نے ان سے کہی ہے کہ ان کے معیاروں کے اوپر نہ جاؤ۔ خدا کے معیار کے مطابق تم آؤ گے تو تمہیں بڑے درجے ملیں گے اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان سے کہوں کہ یہ بات غلط ہے۔ میں یہ بات تو نہیں کہتا۔ تمہارا جی چاہتا ہے تو آؤ، نہیں جی چاہتا تو نہ آؤ۔ میں تمہیں Force (مجبور) نہیں کرتا۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔

عزیزانِ من! میرے نزدیک تو سارے قرآن کا حاصل یہی ہے۔ اسی کو سورۃ الشعراء میں بھی دہرایا گیا ہے۔ وہاں بھی یہ کہا ہے کہ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ (26:109) میں تم سے اس کے لیے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ صرف تم سے یہ کہتا ہوں کہ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا (26:110) تم صرف تو انین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے میری اطاعت کرو۔ اس پر قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ قَالُوا أَنْتُمْ لَكُمْ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ (26:111) انہوں نے کہا کہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیں اور اس طرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہو جائیں جس میں معاشرے کے وہ لوگ شامل ہیں جو نہایت پست ذلیل اور کمینے ہیں، ادنیٰ درجے کے کام کاج کرتے ہیں۔ کیا ہم اس پارٹی میں شامل ہو کر ان رذیل لوگوں کو اپنا ہمسر بنالیں؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟

### قرآن حکیم کی تعلیم مساوات انسانیت کے سوا کچھ اور نہیں

عزیزانِ من! یہی چیز آج راستے میں حائل ہے۔ کہا کہ قَالَ وَمَا عَلَّمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (26:112) نوحؑ نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ان لوگوں کے پیشے کیا ہیں۔ نہ ہی مجھے اس کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کیا کام کرتے ہیں مگر تم ہو جو بار بار کہتے ہو کہ جی! یہ کنجڑا ہے، یہ موچی ہے، وہ فلاں ہے۔ کہا کہ یہ کام ہے، جو وہ کرتے ہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ یہ کیا کام کرتا ہے۔ ترکھانے کا کام کرتا ہے، لوہارے کا کام کرتا ہے۔ یہ کام ہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ

ان کے دل کس قسم کے ہیں اور یہ نظام خداوندی کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اسی کے مطابق ان کی قدر و قیمت کے پیمانے مقرر ہیں۔ اِنْ حَسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ (26:113) اے کاش! تم اس حقیقت کو سمجھ سکتے کہ انسان کی عزت و تکریم اس سے ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتا ہے (49:13) 'نہ اس سے کہ اس کا پیشہ کیا ہے؟ اے کاش! تم عقل و فکر سے کام لو۔ اگر اس سے انکار ہو جائے، جو خدا کے ساتھ کیا جاتا ہے تو معاشرے میں اس کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ انہوں نے جو خدا کے ساتھ حساب کیا ہے وہ اس حساب سے کہیں بڑا اور اونچا ہے لہذا سن رکھو کہ وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ (26:114) میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتا، جو قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان لا کر میرے رفیق کار بنے۔ میرے نزدیک یہ غریب اور ادنیٰ پیشوں کے حامل، ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ واجب الاحترام ہیں، جو قوانین خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ میں انہیں نہیں دھتکاروں گا اور اس کا جواب یہ تھا کہ قَالُوا لَیْسَ لَمْ تَنْتَه یُنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ (26:116) انہوں نے کہا کہ تم اس ادنیٰ درجے کے لوگوں کو مساوات کی تعلیم دے کر معاشرہ میں فساد برپا کر رہے ہو۔ اگر تم اس روش سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ ہم تمہاری یہ دعوت یہاں نہیں پھیلنے دیں گے یہ بہت بڑا فساد ہے جو تم لے کر آ گئے ہو، بہت بڑا فتنہ ہے جسے تم برپا کرنا چاہتے ہو۔ ہم یہ نہیں کرنا چاہتے۔ انہوں نے کہا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ بِهٖ جَنَّةٌ فَتَرْبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰی حِیْنٍ (23:25) ایسا نظر آتا ہے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ اس لیے اس پاگل کی کسی بات پر کان نہ دھرو۔ تم کچھ دنوں تک انتظار کرو اور دیکھو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ کَذَّبُوْنِ (26:117) نوحؑ نے کہا کہ بارالہا! میں نے اپنی طرف سے ساری کوشش کر کے دیکھ لی۔ یہ میری ہر بات کی تکذیب کیے جا رہے۔ قَالَ رَبِّ اَنْصُرْنِیْ بِمَا کَذَّبُوْنِ (23:26) اس نے اپنے خدا سے کہا کہ اے میرے پروردگار! یہ میری کوئی بات نہیں سنتے، اور بلا سنے سمجھے میری تکذیب کیے جا رہے ہیں تو ان کے خلاف میری مدد کر۔ ان کا معاملہ اب حد سے بڑھ گیا ہے۔ اب تو مجھے بتا کہ اس کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر خدا نے کیا بتایا؟ اسے ہم اگلے درس میں لیں گے، اب وقت ہو گیا ہے۔

سورۃ المؤمنون کی آیت 26 تک ہم آ گئے۔ 27 ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



## ساتواں باب: سورة المؤمنون (27 تا 33)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج جون 1977ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 27 سے ہو رہا ہے: (23:27)۔

انبیائے کرام کی بعثت کا اولین مقصد

سابقہ درس میں پیش کی گئی قرآنی آیات کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ انبیائے کرام کو بھیجے کا مقصد کیا تھا، ان پر کتابیں کیوں نازل کی گئیں اور یہ کیا کرنے کے لیے آتے تھے؟ اب یہ بات آپ کے سامنے واضح ہو گئی ہے کہ قرآن نے کہا ہے وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا

أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (10:19) نوع انسان ایک امت واحدہ ایک عالمگیر برادری کی شکل میں رہتی تھی۔ انہوں نے آپس میں اختلافات کیے اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ (2:213) تو ہم نے اس مقصد کے لیے انبیائے کرام کو بھیجا اور ان کے ساتھ ضوابط قانون بھیجے تاکہ وہ لوگوں سے اختلافات کو مٹا کر پھر سے انہیں ایک عالمگیر برادری بنادیں۔ یہ تھی انبیائے کرام کے بھیجنے کی غرض و غایت۔ اس مقصد کے لیے یہ سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا گیا تھا کہ انسانوں نے جو باہمی اختلافات خود پیدا کر دیئے ہیں اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، فرقوں، پارٹیوں میں، قوموں میں، بٹ گئے وہ ان اختلافات کو مٹا کر انہیں پھر سے ایک عالمگیر برادری بنادیں۔ یہ ہے جو قرآن نے غرض و غایت بتائی ہے۔ وہ اسی کی وضاحت و تشریح میں انبیائے سابقہ کی داستانیں اور اقوام گزشتہ کے قصے بیان کرتا ہے کہ اس قوم میں کس قسم کے اختلافات یا گروہ بندیاں یا طبقاتی امتیازات رونما ہو گئے تھے اور اس قوم کی طرف جو نبی مبعوث ہوا، اس نے ان کو مٹانے کی کیا سوچی تھی۔ یہ ہے ساری داستان اور وہ اس کا آغاز حضرت نوح ﷺ سے کرتا ہے۔

حضرت نوح ﷺ کے دور میں قرآن پہلا اختلاف یہ بتاتا ہے کہ معاشرے کے بڑے بڑے سرداران قوم نے معاشرے میں تفریق پیدا کر دی تھی۔ ”وہ بڑے بڑے سردار اس معاشرے دے کھاندے پیندے لوگ سی“<sup>1</sup>۔ وہ بڑے لوگ معاشرے میں کام کرنے والوں کو کمی اور کمین کہتے تھے، رذیل کہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے محض کاموں کی بنا پر تفریق پیدا کر دی تھی۔ وہ کسی طرح دھاندلی سے کچھ زیادہ اپنے پاس جمع کر کے بیٹھ گئے تھے۔ وہ کوئی محنت نہیں کرتے تھے۔ وہ سردار بن گئے تھے اور یہ جو بیچارے محنت کرتے تھے، ان کے ہاں کے کمی بن گئے تھے۔ پہلے پیغمبر حضرت نوحؑ کا تعارف اس طرح کرایا جا رہا ہے کہ انہوں نے آ کر ان سے کہا ہی یہ تھا کہ یہ تو معاشرے میں تقسیم کار (Division of Work) ہے، مختلف لوگ مختلف کام کرتے ہیں تو معاشرے کا کام چلتا ہے۔ تم اس تقسیم کار کی بنا پر یہ تفریق پیدا کرتے ہو تاکہ یہی تفریق تمہارے لیے وجہ عزت اور وجہ تکبریم ہو جائے۔ یعنی تم جو کچھ نہیں کرتے ہو، تم ہی سب سے زیادہ واجب التکریم رہو اور یہ جو اتنی محنت کرتے ہیں وہ تمہارے ہاں کے رذیل تصور کیے جاتے رہیں۔ یہ بڑی غلط بات ہے۔ وہ لوگ جو کچھ نہ کر کے دوسرے کی محنت پر، دوسروں کی کمائی پر نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے ہیں قرآن انہیں مترفین کہتا ہے۔ وہ اس تفریق کو مٹانے کی اس جدوجہد کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے ان کی مخالفت کی۔ اب مخالفت انتہا تک پہنچ گئی۔

## قوموں کے جرائم کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا انداز بیان

عزیزان من! یاد رکھیے کہ قرآن کریم ان اقوام کا جو ذکر کرتا ہے تو وہ ان کا جو سب سے بڑا جرم ہوتا ہے وہ اسے نمایاں طور پر بیان

1 وہ بڑے بڑے سردار اس معاشرے کے کھاتے پیتے لوگ تھے۔

کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم میں یہی ایک جرم ہوتا ہے۔ دراصل اس قوم کا جو سنگین جرم ہوتا ہے جو جرم کبیر ہوتا ہے وہ اُسے باہر لاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے علاوہ اور جرائم بھی اس معاشرہ کے اندر عام ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی معاشرے میں صرف یہ جو ایک قسم کا جرم ہے وہی ہو اور باقی جو لوگ اس قسم کے مجرم ہیں ان کی زندگی نہایت حسنات میں گزر رہی ہو۔ یہ نہیں ہوتا۔ قرآن تو نمایاں طور پر اُس ایک کا ذکر کرتا ہے جو وہاں زیادہ ابھرا ہوا ہوتا ہے اور بنیادی ہوتا ہے اور اس کے مٹانے کے لیے جو کوششیں کی جاتی ہیں انہی کا زیادہ ذکر کرتا ہے باقیوں کا ذکر نہیں کرتا اور یہ کہ ان میں اور کوئی خرابی ہوتی نہیں ہے۔ اگر اتنی بڑی نمایاں خرابی اس معاشرے میں پیدا ہو جائے کہ جو محنت نہیں کرتے وہ دوسروں کی محنت کو Exploit (استحصا) کریں ان کی محنت سے خوشحالی کی زندگی بسر کریں اور پھر انہیں رذیل اور کمین بھی کہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم یہ چاہتے ہو کہ یہ آئیں اور ہمارے برابر بیٹھ جائیں تو جہاں اوپر کے طبقے کی ذہنیت یہ ہو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں صرف یہ ایک ہی خرابی نہیں ہوگی۔ اس ذہنیت تک آؤ تو سینکڑوں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن ان اقوام کی کسی ایک ایسی خرابی کا ذکر کرتا ہے جو اس معاشرے میں بڑی بنیادی ہوتی ہے اور اس سے پھر وہ بتاتا ہے کہ کس طرح ان کے پورے کے پورے اخلاق پر اس معاشرے کے ہر گوشے پر یہ چیز اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں پھر خرابیاں ہی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ اب ان کی مخالفت جب یہاں تک پہنچ گئی تو قرآن نے کہا کہ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كُنتُ بُون (23:26) اس نے کہا کہ ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ میں ان کے بھلے کی کوئی بھی بات کہتا ہوں تو یہ مجھے کہتے ہیں کہ جا بھئی جا اپنا کام کر ہمیں زیادہ معلوم ہے تم جو کچھ کہہ رہے ہو جھوٹ ہے۔ اب اس مقام پر وہ نصرت خداوندی طلب کرتے ہیں۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔

عزیزانِ من! یہاں انہوں نے خدا سے یہ کہا ہے کہ اس معاملے میں میری کچھ مدد کرو۔ قرآن کا دوسرا انداز یہ یاد رکھیے کہ وہ کسی قصے کی تمام کڑیاں خود ہی بیان نہیں کرتا چلا جاتا اس لیے کہ وہ کوئی ناول نگار نہیں افسانہ نویس نہیں ہے داستان گو نہیں ہے۔ اس نے تو ایک عظیم نکتہ سامنے لانا ہوتا ہے یا اس تک لے جانا ہوتا ہے اور پھر وہ آپ کے ذہن اور شعور کا بھی احترام کرتا ہے۔ آج بھی آپ دیکھیے بہترین ادب وہ گنا جاتا ہے جس میں بچوں کی طرح ہر بات کو بار بار نہیں دہرایا جاتا بلکہ ایک بات کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے انگریزی زبان میں Suggestiveness (ایمانیت) کہتے ہیں۔ ادب اور شاعری میں تو یہ Suggestiveness (ایمانیت) بڑی چیز ہوتی ہے۔ وہ اس طرح بیان کیے جاتا ہے کہ درمیان کی کڑیاں کم کر دی جاتی ہیں انہیں سمجھنے والے کی ذہنی سطح پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر آپ بچوں کی طرح یوں بٹھا کر ایک ایک چھوٹی چھوٹی سی کڑی سمجھنا شروع کریں تو آپ دیکھیں گے اسے ناگوار گزرے گا۔ وہ کہے گا ”کیا مینوں اینا وی پیہ نہیں ہیگا؟“ قرآن کی یہ پہلی عجیب چیز ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ قرآن نے اب

انسان کو بالغ سمجھ لیا ہے، بچہ نہیں سمجھا کہ اس کی انگلی پکڑ کر وہ ساتھ ساتھ چلاتا جائے۔ اس نے ہر دورا ہے کے اوپر بتا دیا ہے کہ اب وہ انسانیت تک پہنچا ہے۔ اب اسے صرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر دورا ہے کے اوپر ایک سائن بورڈ لگا ہوا ہو کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے اور پھر اس کو چھوڑ دیا جائے کہ جاؤ بھئی! یہ سائن بورڈ پڑھ کر خود اپنی منزل پہ پہنچے چلے جاؤ۔ بچے کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے، بچہ ذرا بھی باہر جانا چاہے تو کوئی نہ کوئی ساتھ جاتا ہے۔ یہ کوئی نہ کوئی وہ انبیاء ہوا کرتے تھے جو بچپن میں گزرنے والوں کی راہنمائی کیا کرتے تھے اور قرآن تو انسان کے عہد بلوغت کے لیے ہے۔ اس کے فہم اور شعور کو وہ بڑی اہمیت دیتا ہے، اس کا احترام کرتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ احترام میں ایک یہ اسلوب بھی ہوتا ہے کہ ساری کڑیاں خود نہ بیان کی جائیں۔ ادب آشنایا ہن اس کو Appreciate (پسند) کریں گے کہ یہ بڑا ہی حسین انداز ہوتا ہے۔ مثلاً جب غالب<sup>1</sup> یہ بات کہہ کر گزر جاتا ہے کہ

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی

اٹھا، اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس نے کچھ نہیں کہا کہ کیا ہوا لیکن جو Appreciate (پسند) کرتے ہیں ان کے سامنے وہ ساری کہانی آگئی کہ ہوا کیا ہے۔

### طوفانِ نوح ♦ کے سلسلہ میں کشتی کی تیاری اور مخالفانہ ذہنیت

قرآن کا ایک یہ بھی انداز ہے کہ وہ پوری کڑیاں بیان نہیں کرتا۔ اب یہاں قصہ حضرت نوح ♦ میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ وہ جو انہوں نے اس قسم کا معاشرہ قائم کیا تھا، اس میں حفاظتی تدابیر نہیں اختیار کی تھیں۔ بہبود کی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو وہ معاشرہ ان کی طرف سے خود ہی خود غافل ہو جاتا ہے۔ پہلی چیز وہاں یہ بتائی گئی ہے کہ غالباً اس جگہ پہاڑیوں کے اوپر ایک بستی تھی۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اس کے گرد کچھ جودی<sup>2</sup> (Judi) کا علاقہ ہے۔ یہ اس علاقے کی بات ہے۔ وہاں سخت بارشیں ہوتی تھیں اور یہ انسانوں کا وہ دور تھا جس میں ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے لیے کیا کیا جائے۔

اب دو تین چیزیں ہیں۔ ایک بات تو اس مخالفت کی یہ ہو رہی ہے جو معاشرے کی اتنی بڑی خرابی ہے۔ اس میں اگلی بات یہ ہو رہی ہے کہ حضرت نوح ♦ خدا سے نصرت چاہتے ہیں۔ اس کے بعد درمیان کی کڑیاں پوری نہیں ہیں کہ یہاں ایک تباہی آنے والی ہے جس کی طرف ان کا دھیان نہیں جا رہا اس قسم کا سیلاب آئے گا اور پھر یہ پوری بستی تباہ ہو جائے گی۔ یہاں حضرت نوح ♦ خدا سے مدد طلب

1 مرزا اسد اللہ خان غالب (1869-1797)

2 یہ اس پہاڑی یا ٹیلے کا نام ہے جس پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹھہری تھی (11:44)۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس سلسلہ کوہ میں واقع ہے جو آرمینیا (Armenia) کو میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) سے جدا کرتا ہے۔ (پرویز: لغات القرآن جلد اول ادارہ طلوع اسلام لاہور 1960ء ص 457)۔



کر رہے ہیں۔ اب خدا سے مدد کیسے دی جا رہی ہے؟ عزیزانِ من! قدم قدم پہ آپ دیکھتے چلے جائیے گا کہ مذہب اور دین میں فرق کیا ہے۔ خدا کا نبی مدد مانگ رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ بے پناہ سیلاب آتے ہیں اور اس بستی کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اگر سوال یہی ہو کہ ان کے ہاں کی جو حالات کی خرابیاں تھیں ان کی بنا پہ انہوں نے تباہ ہو جانا تھا تو یہ جو ان کا ایمانداروں اور اچھے اخلاق والوں کا گروہ تھا، اگر انہیں محفوظ رہنا تھا تو اس کے لیے خدا سے مدد کیوں مانگ رہے ہیں۔ خدا ان کے لیے اپنا انتظام کرتا لیکن آپ دیکھیے کہ کیا انتظام کر رہا ہے؟ اور خدا کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کہ **فَاَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنْ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا ۖ وَوَحَيْنَا<sup>۱</sup>** (23:27)۔ اس نے کہا کہ نوح کشتی بناؤ۔ دیکھا، خدا کی مدد کیسے ہوتی ہے؟ صحیح راستے کی طرف راہنمائی یعنی نبی کی بھی مدد مادی اسباب کے ذریعے ہو رہی ہے۔ کیا مشکل تھا خدا کے لیے کہ ان کو وہاں سے ویسے ہی نکال کر لے جاتا لیکن دیکھیے کہ یہ مدد کیسے ہو رہی ہے۔ یعنی طریق یہ ہے کہ انسان نے ہی کچھ کرنا ہوتا ہے۔ قرآن تو صرف راہنمائی دیتا ہے اور یہ راہنمائی ایک نبی کی ہو رہی ہے اور اس کی دعا کے اوپر راہنمائی ہو رہی ہے۔ لہذا کہا یہ جارہا ہے کہ کشتی بناؤ اور کشتی کے متعلق کہا ہے کہ **وَوَحَيْنَا** (23:27) اور ہماری وحی کے مطابق بناؤ۔ نظر آتا ہے کہ دور وہ تھا کہ ابھی انسانوں کو خود کشتی بنانے کا بھی علم نہیں تھا یعنی یہ اس ابتدائی دور کی بات ہے کہ جب کشتی بنانا بھی وہ خود نہیں جانتے تھے اور عقل انسانی ابھی اس قدر ناپختہ تھی کہ اسے خود بھی پتہ نہیں تھا کہ سیلاب آجائے تو اس میں کشتی کے ذریعے بچا جاسکتا ہے اس کے لیے **وَوَحَيْنَا** (23:27) وحی کی ضرورت پڑتی تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم جو وحی کی آخری کڑی ہے، نے یہاں وحی کے تحت کشتی بنانے کی ساری ترکیب بتائی ہے۔

قرآن زندگی کے بڑے اہم اصول دیتا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ عدل کرو مگر عدل کی ساری کڑیاں خود نہیں بتاتا، اتنا ہی کہتا ہے کہ عدل کرو حق کے ساتھ اور جس کو قرآن نے الحق کہا ہے یہ خدا کی وحی ہے۔ کہا کہ اس کے مطابق عدل کیا کرو اور اس عدل کے لیے کہا کہ **أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (42:38) اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کیا کرو۔ وہ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز نہیں کرتا اس لیے کہ انسان بالغ ہو گیا ہے۔ یہاں حضرت نوح ﷺ کے زمانے میں انسان بچپن کے زمانے میں ہے، تو نبی ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ سیلاب سے بچنے کے لیے کشتی بناؤ، لیکن یہاں اُس وقت تک انسان کو کشتی بنانے کا علم ہی نہیں ہے۔ لہذا اب وحی کے ذریعے یہ کشتی بنائی جا رہی ہے۔ چلو کچھ Instructions یا Directions (ہدایات) دیدیں کہ یہ بناؤ لیکن یہاں نظر آتا ہے کہ معاشرہ یا عقل انسانی ابھی اس مقام پہ نہیں پہنچی تھی۔ یہاں صرف وحی نہیں کہا، بلکہ **بِأَعْيُنِنَا** (23:27) کہا ہے

۱ اس پر ہم نے نوح کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بناؤ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 777)۔

کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ٹھیک ٹھیک بنارہے ہو۔ یعنی یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی انسان کو ”کل ٹھوکن داوی پتانئی سی“<sup>①</sup>۔

آپ غور کیجیے عزیزانِ من! کہ یہ قرآن ہے کیا چیز؟ یہ کیا کتاب ہے! نبی ﷺ کہتا ہے کہ رَبِّ انصُرْنِی (83:26) اے میرے پروردگار! تو ان کے خلاف میری مدد کر۔ یہ کہہ کے مدد کی جاتی ہے کہ کشتی بناؤ۔ اب انہیں یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے۔ لہذا کہا کہ صاحب! ہمیں تو پتہ نہیں کہ کشتی کیا ہوتی ہے۔ کہا کہ ہم بتاتے ہیں کہ وہ کیا ہوتی ہے، کیسے بنائی جاتی ہے؟ اب کشتی بنارہے ہیں۔ اوپر کوئی استاد نہیں ہے جو شاگرد کو دیکھے کہ ”اتھکے کل ٹھوک“ اتھکے لکڑی لا“<sup>②</sup>۔ کہا کہ بَاعِیْنِنَا (23:27) ہم دیکھتے جائیں گے اور تمہیں بتاتے جائیں گے کہ اب کیا کرو اب کیا کرو۔ یہ ہے پہلا دور جہاں سے قرآن نے وحی کا آغاز کیا ہے۔ وحی کی تعلیم تو آخری دور کی ہو یا پہلے دور کی، اصولی طور پر وہ ایک ہی ہوتی ہے لیکن وہاں جو معاشرہ مخاطب ہوتا ہے نبی ﷺ کی شخصیت اس کے اعتبار سے ہوتی ہے اور وحی کی Instructions یا Directions (ہدایات) ماحول و حالات کے مطابق دی جاتی ہیں لہذا نبی ﷺ اسی سطح پہ ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے معاشرے کو بلند یوں پہ پہنچاتا چلا جاتا ہے۔ اگر آپ اس اعتبار سے قرآن کا مطالعہ کریں گے تو عجیب عجیب ارتقائی منازل آپ کو نظر آئیں گی۔ اگر آپ حضرت نوح ﷺ سے رسول اللہ ﷺ کے زمانے تک آئیں گے تو مختلف انبیائے کرام ؑ کی طرف جو وحی آئی ہے آپ دیکھیں گے کہ ذہنِ انسانی میں وہ کتنی وسعت پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے نبی کو وحی آرہی ہے کہ کشتی بناؤ۔ اب یہ بات دیکھیے کہ حضرت نوح ﷺ کہہ رہے ہیں کہ یہ ہر بات میں میری تکذیب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ تم یونہی کہہ رہے ہو۔ یہ مجھے مانتے ہی نہیں ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جنہیں بڑے بڑے سردار کہا گیا ہے جو اقتدار یا دولت کے نشے میں بدمست ہو جاتے ہیں پھر وہ ان حضرات کی کسی بات کو بھی Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتے۔ یعنی جو ان کی مخالفت کرے یا جسے وہ اپنی نگاہ میں سمجھیں کہ یہ شخص قابلِ احترام نہیں ہے اس کی کوئی بھی بات ہو وہ اسے Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتے لہذا تباہی وہاں آتی ہے۔ یہ تباہی اس ذہنیت کی وجہ سے آتی ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اپنے آپ کو اتنا خود مکتفی سمجھ لیتے ہیں کہ ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے کسی کی بات سننے کی نہ کسی کی بات ماننے کی اور پھر دوسری چیز یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے مقابلے میں ”کمی“ ہیں اس لیے اس قسم کے چھوٹی سطح کے یہ لوگ کیا جانیں کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ دیکھیے قرآن کس انداز میں اس بات کو بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ (11:38) اب یہ حضرت نوح ﷺ بیٹھے کشتی بنارہے ہیں۔ وہ اور ان کے ساتھی جیسے جیسے Instructions (ہدایات) ملتی جاتی ہوگی وہ بناتے جاتے

① کیل لگانے کا بھی علم نہیں تھا۔

② یہاں کیل لگاؤ اور یہاں لکڑی کا تختہ۔

ہونگے۔ اب اگر ذہن میں یہ بات ہو کہ ذرا Seriously (سنجیدگی سے) لے لیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں، کیوں کر رہے ہیں تو ان کے لیے کیا مشکل تھا کہ اسی قسم کی کشتی خود بھی بنا لیتے، پھر تو ڈوبنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ بچانا تو کشتی نے ہے، لیکن قرآن ذہنیت بتاتا ہے کہ ایسے مواقع پر ان کے دماغ میں خناس سما جاتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کی بات کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے، اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ اس پر غور کیا جائے۔ یہاں کہا ہے کہ **وَيَصْنَعُ الْفُلُكَ** (11:38) چنانچہ وہ کشتی بنا رہا تھا **وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأَ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ** (11:38) وہ قوم کے جو بڑے تھے وہ وہاں سے گزرتے تھے اور مذاق کرتے تھے کہ دیکھو! ان کی مت ماری گئی ہے یہ کیا کر رہا ہے۔

عزیزانِ من! بڑی گہری چیزیں ہیں جو قرآن کہتا ہے۔ یہ حضرت نوح ﷺ اور اس زمانے کے مٹا کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں آج کی باتیں ہو رہی ہیں۔ جس کسی کو کہیں اقتدار اختیار یا دولت اور نشے کی یہ چیزیں آ جاتی ہیں تو پھر وہ کسی دوسرے کی بات کو درخور توجہ ہی نہیں قرار دیتا۔ وہ اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ گزرتے تھے تو دیکھتے تھے کہ کشتی بنا رہا ہے اور مذاق کرتے تھے **قَالَ إِنَّ تَسْخَرُونَ مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ** (11:38) اور اس تمسخر کے جواب میں وہ ان سے کہتے تھے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم آج ہماری یوں ہنسی اڑا رہے ہو، کل ہی تم دیکھنا تقدیر تمہارا مذاق اڑائے گی۔ اس فقرے کے اندر بڑی ادبیت ہے۔ انہی الفاظ کو لوٹا کے لے آنا کہ تم دیکھو گے کہ کیسی تمہاری ہنسی اڑائی جاتی ہے! سوچئے عزیزانِ من! کوئی بات راز کی نہیں ہے، کھلے بندوں یہ بنا رہے ہیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ گزرتے تھے تو یہ سامنے دیکھتے تھے کہ وہ کشتی بنا رہا ہے لیکن وہ مذاق کرتے تھے۔ اس پہ بھی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ وہ ڈوبتے اس وقت ہیں جب ان کی ذہنیت نشے میں اس قدر مدہوش ہو جاتی ہے کہ سامنے دیکھ رہے ہیں کہ اس انداز کی ایک چیز ہو رہی ہے، تو بجائے اس کے کہ اس سے کوئی سبق حاصل کریں یا کھڑے ہو کر سوچیں کہ بات کیا ہے اس سے پوچھ ہی لیں۔ اس نے تو کوئی راز (Secret) نہیں رکھا ہے۔ وہ تو بتائے گا کہ کیا چیز ہونے والی ہے۔ ہر سال سیلاب آتے ہیں، تم تباہ ہو جاتے ہو۔ کیا یہ بھی کوئی بتانے کی چیز ہے، لیکن وہ مذاق کر رہے ہیں۔ ان کی یہ ذہنیت ہے۔

### انسانی ذہنیت میں احترام آدمیت کا جذبہ اور قائد اعظم کا ایک واقعہ

عزیزانِ من! واقعہ تو وہ اسی زمانے کا ہوگا، ذہنیت آج بھی وہی ہے۔ یہ لفظ نہیں سنتے۔ کہا جاتا ہے کہ جن کے دماغوں کے اندر انانیت (Egoism) اور فرعونیت سما جاتی ہے، پھر ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ کسی کی نہیں سنتے اور جب وہ کسی کی نہیں سنتے تو عزیزانِ من! ہم اور آپ تو کچھ شے نہیں۔ وہاں تو اس انسان کو جو حاکم الناس، عالم الناس ہے، علم انسانی کی انتہائی بلندیوں پر ہے، آپ حضور ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ **شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (3:159) معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو ورنہ نبی کا علم اور یہ جو اس پر

ایمان لائے ہوئے ہیں ایک سیکنڈ میں دونوں میں تفاوت نہیں پیدا ہونے دیتا۔ نبی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ان سے مشورہ کیا کرو۔ اس سے ذہنیت میں ایک تبدیلی آتی ہے۔ جب آپ کسی سے مشورہ کریں گے تو انکا احترام آپ کے دل میں پیدا ہوگا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بعض اوقات برسرِ توجہ ہوگی۔ وہ بات تو میں نے اس بزرگ و برتر ہستی کی بتائی ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ جتنے لوگ بھی ایسے ہیں جن کے دلوں میں یہ درد ہوتا ہے یا جن کا کیریکٹر پختہ ہوتا ہے ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ اس کی بات کیوں سنی جائے۔ ہر ایک کی بات پہ کان دھرتے ہیں اور مجھے تو پھر قائد اعظم<sup>1</sup> یاد آتے ہیں جو یہ کچھ اس دور میں دے گئے۔ آپ اس دور کے مورخین سے پوچھیے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ذہنی اعتبار سے جن بلند یوں پر وہ شخص تھا، ایک دنیا اس کی داد دیتی ہے کہ ایسا States man (مدبر) بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس States man (مدبر) کی کیفیت یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو جرات دلائی ہوئی تھی کہ ہر شخص مجھے کچھ نہ کچھ جو اس کے ذہن میں آتا ہے مشورہ دے۔ تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا، جتنی ڈاک (Post) آتی تھی وہ کہتے تھے کہ وہ ساری مجھے سنایا کرو۔ انبار سالگا ہوا ہوتا تھا۔ کسی گاؤں کے پتے (Address) کا ایک کارڈ تھا۔ وہ خط<sup>2</sup> بھی اس کا وہی بچوں جیسا تھا اور اس کارڈ کی تحریر سے وہ علمیت بھی نظر نہیں آتی تھی۔

اس نے لکھا تھا کہ آپ نے یہ بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے لیکن یہ ہندو اور انگریز جن کو شکست ہوئی ہے بڑے کمینے ہیں اس تقسیم کے وقت احتیاط برتتے، پتہ نہیں یہ کیا کر گزریں۔ کارڈ کو سامنے رکھ کر آپ اس بات پہ بیٹھ گئے اور کہا کہ ”میں نے تم لوگوں سے کہا ہوا ہے کہ کسی کی بات کو بھی ایسا نہ سمجھو کہ توجہ نہ دی جاسکے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ گاؤں کا ایک دھقانی ہے وہ کتنی بڑی چیز کہہ گیا ہے کہ جنہیں شکست ہوئی ہے انتقام لیں گے“۔ یہ ہے کہ شَاوِرْهُمْ فِی الْأَمْرِ<sup>3</sup> (3:159)۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ ذہنیت قرآن بتا رہا ہے کہ یہ جو خود پسندی اور رعونت کی وجہ سے فرعون بن جاتے ہیں کسی اور کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے اور عقل کل بن جاتے ہیں یہاں قرآن اس ذہنیت والوں کے متعلق بتا رہا ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ یہ کچھ کر رہے ہیں کہ وہ بتا رہے ہیں یہ ہو رہا ہے اور وہ مذاق کر کے چلے جاتے ہیں کہ جا بے<sup>4</sup>۔ لہذا یہاں یہ بات تھی جو قرآن نے واضح کرنی تھی۔

## قرآن حکیم کے نزدیک اہل کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کہانیاں نہیں کہتا۔ وہ تو ہمیں کچھ سمجھانے کے لیے اس زمانے کی بات کرتا ہے۔ ”دھئے! توں گل سن۔

1 محمد علی جناح (1876-1948)

2 تحریر (Hand Writing)

3 معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو (پرویز: مفہوم القرآن ص 162)۔

4 چل بے چل

نوحہ! توں کن کر<sup>①</sup>۔ یہ قصہ کسی کشتی بنانے کا اور حضرت نوحؑ کا نہیں ہے یہ آج کا بھی قصہ ہے۔ اب ہم آگے چلیں۔ یہاں تو ہم جلدی سے یوں گزر جائیں گے۔ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُورُ فَاسْلُكْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ<sup>②</sup> (23:27) پھر کہہ دیا کہ اس کشتی کے اندر یہ جتنے بھی ادھر ادھر کے تمہارے پاس یہ جانور وغیرہ ہیں ان کے دودو جوڑے اس کے ساتھ رکھ لو۔ نئی جگہ جانا ہے۔ وہاں ابھی نئی آبادی ہوگی۔ وہاں جا کر نئی زندگی شروع کرنا ہوگی۔ اندازہ لگائیے وحی کیا آتی ہے! اس کے ساتھ یہ وحی آرہی ہے۔ اگر وہاں وہ چیزیں نہ ہوتیں اور وہاں تم نے نئی زندگی بسر کرنا ہے تو اس لیے یہ کچھ یہاں سے ساتھ لے جاؤ۔ کہا کہ میں آج یہ کہہ رہا ہوں کیونکہ سیلاب آنے والا ہے یہ کچھ کر لو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اس کشتی کے اندر جو تیرے ”اہل“ میں سے ہیں ان کو بھی ساتھ رکھو۔ وہ بچا لیے جائیں گے۔ یہ اگلی بات ہے جو قرآن کہتا ہے کہ جو تیرے ”اہل“ میں سے ہیں انہیں بچا لیا جائے گا۔ آگے کہا کہ وَلَا تَخَاطَبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُعْرِضُونَ (23:27) اور دیکھنا ایسا کرنے سے تمہارے دل نہ پسچ جائیں کہ جن کے ساتھ ذرا کچھ زیادہ تعلق ہے اس کی بابت کہنے لگ جاؤ کہ یا اللہ! اسے نہ مار۔ یہاں قرآن نے ظَلَمُوا<sup>③</sup> (23:27) کہا ہے۔ سوال ہی نہیں ہے جو بھی ظالم ہے وہ سارے یکساں ہو جاتے ہیں پھر اس کے بعد ایسی بات نہ کرنا اور فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلِكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّيْنَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (23:28) جب تم اس کشتی میں بیٹھ جاؤ اور ان ہچکولوں کے اندر بھی اس کا توازن برقرار ہو جائے تو اس کے بعد پھر یہ کہنا کہ قابلِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے ہمیں اس ظالم قوم کے پنجے استبداد سے نجات دی۔

### کسی چیز سے بچ جانا کافی نہیں ہوتا

یہاں تو صرف یہی چیز ہے کہ وہ اس سیلاب سے بچ گئے۔ یہ حصہ لا ہے۔ بچ جانا ہی کوئی بات نہیں تھی کہ کشتی میں وہاں سے نکل آئے۔ وَقُلْ رَبِّ انْزِلْنِي مُنْزَلًا مُّبَارَكًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ (23:29) اور اس کے ساتھ پھر یہ کہنا کہ یا اللہ! وہاں سے تو نے ہمیں نجات تو دی اب وہاں جا کر اتار جہاں زندگی اس کی ضروریات اور آسائش یہ ساری میسر آ جائیں۔ گویا دو چیزیں ہو گئیں:

① کہے بیٹی کو اور سنائے بہو کو۔

② پھر جب طے شدہ پروگرام کے مطابق پانی کے چشمے جوش مارنے لگیں (اور سیلاب اٹھ آئے) تو کشتی میں ہر (ضروری) شے کے دودو جوڑے ساتھ رکھ لو اور اپنے رفقاء کو بھی اس میں بٹھا لو بجز اس کے جس کے کفر و عدوان نے پہلے ہی سے بتا رکھا ہے کہ وہ تمہاری جماعت میں شامل نہیں ہوگا۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 177)

③ جنہوں نے سرکشی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 177)

ایک تو یہ کہ اس تباہی سے بچ جانا مگر صرف بچ جانا ہی تو کوئی کامیابی کی چیز نہیں ہے۔ اگلی چیز یہ ہے کہ نئی زندگی میں بھی ان ساری آسائشوں کا میسر آ جانا۔ وہ حصہ لاکھا جسے بچ جانا کہا ہے لیکن اگر وہاں بھی یہ چیزیں میسر نہ ہوں تو پھر؟ لہذا ہمیں یہاں یہ کہا گیا ہے کہ کسی عذاب سے بچتے وقت یہ بھی سوچو کہ یہاں سے نکل جانا ہی مقصود بالذات نہیں ہے۔ اس نکلنے کے بعد پھر اگلی مستقبل کی زندگی کس قسم کی ہوگی۔ سو انسان یہاں بھی مار کھا جاتا ہے۔ بعض اوقات آدمی قدم اٹھاتا ہے اور فوری قدم اٹھاتا ہے کہ یہاں سے تو کسی طرح سے چھٹی ہو لیکن اگر آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائے تو پھر یہ کتنی بڑی تدبیر کرتا ہے اس لیے کہا کہ بچنے کی ترکیب تو کرو لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچو کہ اس بچنے کے بعد پھر جہاں جاؤ گے تو وہ مستقبل کس قسم کا ہوگا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا کیا چیزیں کہتا چلا جاتا ہے۔ یعنی یہ سوچنا کہ پہلے کسی چیز کو تباہ و برباد کرو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ یہ ایک غلط تدبیر ہے۔ لہذا غلط کو توڑنے پھوڑنے سے پہلے یہ بھی سوچو کہ اس کے بعد مستقبل کیسا ہوگا۔ سمجھدار انجینئر یا مکان والا وہ ہوتا ہے جو پرانے بوسیدہ مکان کو گراتا ہے تو پہلے نقشہ بناتا ہے کہ جب اس کو گرا لیا جائے گا تو پھر اس خالی زمین پر کیا بنے گا، کیا یہ اس قابل بھی ہوگی کہ اس پر پھر کوئی نئی عمارت بن سکے؟ وہ پہلے یہ سوچتا ہے پہلے اس کا نقشہ بناتا ہے جب وہ پرانی شکستہ عمارت ابھی اس کے اوپر کھڑی ہوتی ہے تو وہ نقشہ بناتا ہے کہ جب اس کو گرا دیا جائے گا تو اس سفید زمین کے اوپر مستقبل کا نقشہ کس قسم کا استوار ہوگا، عمارت کیسی استوار ہوگی۔ یہاں یہ چیز کہی گئی ہے کہ صرف یہی نہ کہو کہ یہ جو تباہی ہے اس سے بچ جانا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہو کہ اس کے بعد جو زندگی ہے وہ کس طرح سے بابرکت گزرے گی۔

### قرآن حکیم میں ”آیات“ کا مفہوم

قرآن حکیم نے یہ بات کہانی کی طرح نہیں کہی جیسے بچے دادی اماں سے رات کو سونے کے لیے کہتے ہیں کہ وہ کہانی سنائے۔ بچے سونے کے لیے کہانی سنتے ہیں مگر وحی خداوندی تو آپ کو جگانے کے لیے سناتی ہے۔ لہذا کہا کہ ان فی ذلک لآیت (30:33)۔ یہ جو ہم نے بات کہی ہے اس میں کہانی کی بات کہیں نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کے عربی زبان کے لفظ ”آیات“ سے کسی ظاہری نشان سے اس کی حقیقت تک پہنچنا ہوتا ہے مثلاً دھواں اس بات کی آیت ہوتا ہے کہ یہاں نیچے آگ ہے اسی طرح صحرا میں کتے کی آواز سے آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بستی ہے کہیں پرندہ اڑتا ہوا نظر آئے تو پتہ چلتا ہے کہ ارد گرد پانی ہے۔ یہ جو چیزیں ہیں جو حقیقت تک پہنچاتی ہیں انہیں عربی زبان میں ”آیات“ کہتے ہیں۔ یہ قرآن آیات دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (13:3)۔ ان سمجھنے سوچنے غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے کتنی بڑی نشانیاں ہیں کہ صحرا میں پرندہ نظر آئے تو دیکھ آئے

کہ یہاں کہیں پانی ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ لَا يَتَّخِذُ الْوَحْشُ الْوَحْشَ وَلَا يَتَّخِذُ الْوَحْشُ الْوَحْشَ (23:30)۔ تمہارے لیے یہ محکم گیری کی نشانیاں ہیں۔ ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ قوموں میں یوں گردشیں آیا کرتی ہیں۔

### نوع انسانی میں نسلی امتیاز کی بنیاد قبیلے کی صورت میں اُبھری اور پاکستان کی مثال

عزیزانِ من! اب یہاں دوسری چیز آتی ہے اور وہ بڑی اہم ہے۔ آپ پھر اس نکتے کی طرف آجائیے کہ نوع انسانی عالمگیر برادری کی حیثیت میں رہتی تھی۔ اسمیں کوئی تفریق نہیں تھی، کوئی تقسیم نہیں تھی، پھر اس میں اختلافات پیدا ہو گئے، تو وہ بٹ گئی۔ قرآن نے کہا ہے کہ پہلا اختلاف قبیلے کی شکل میں آیا ہے۔ اس طرح قبیلہ نسلی امتیاز کی ابتدا ہے۔ اس میں پہلی چیز تو بیٹا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس بیٹے کا بیٹا آتا ہے یعنی اب یہ دو انسان اکٹھے نہ رہے بلکہ یہ اس کا بیٹا ہوا، اور وہ اس کا بیٹا۔ پھر اس بیٹے سے آگے شاخ چلی۔ اسی سے خاندان بنا۔ اسی سے قبیلہ بنا۔ ذرا اس سے آگے کے زمانے میں اسے ہی قبیلہ کہتے تھے۔ اب یہاں نسل کے امتیاز سے ایک دادا ہے۔ وہاں تک تو کوئی تفریق نہیں تھی۔ اب اس کے بعد دو بیٹے (Sons) ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ Biologically (حیاتیاتی انداز سے) اُن کے بیٹے ہونے ہیں لیکن اگر ان کے ہاں جو بیٹے ہوئے ہیں یا آگے، ان بیٹوں کے آگے بیٹے سے جو اولاد چلی، تو یہ دو الگ مستقل انسانیت کی بالذات تفریق ہو گئی۔ یہ ادھر گروہ بن جائے وہ دوسرا ادھر گروہ بن جائے اور پھر ان دونوں کے الگ الگ مفاد ہو جائیں، ان میں تصادم ہو، تو یہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔ یعنی بات تو ایک دادا کے دو بیٹوں کی اولاد سے چلی تھی اور آج یہ ساری دنیا کی قومیں بن گئیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ نسلی اعتبار سے جو قومیں بنیں وہ پہلا قدم ہے۔ آگے قرآن بتاتا ہے کہ وطنی اعتبار سے بھی جو قومیں بنی ہیں، ان کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ انسانوں میں جو پہلی تفریق ہوئی ہے وہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ معاشرے کے اندر طبقاتی امتیاز سے ہوئی ہے۔ یہ جو بڑے بڑے سردارانِ قوم ہیں، جن کے گھر بھرے ہوئے ہوتے ہیں، وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں اور کام کرنے والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ یہ پہلی تفریق ہے۔ دوسری تفریق نسلی آتی ہے۔ اب یہاں سے پہلی وحی کی ابتدا ہوئی تھی۔ انسانیت کی تقسیم یہاں سے شروع ہوئی ہے۔

اب یہ دیکھیے پہلا نمبر ♦ ہے اور پہلی قوم ہے جس کی داستان سنائی جا رہی ہے۔ بات قرآن کریم نے یہ کہنی ہے کہ یہ تفریق نسل کے اعتبار سے ہوئی ہے۔ اسے ہی قرآن نے کہا تھا کہ ابلیس تمہارے کان میں یہ پھونک مارے گا کہ یہ میرا بیٹا ہے، یہ اس کا بیٹا ہے۔ یہ جو کچھ میرا ہے یہ میرے بیٹے کو دو اور وہ جو اس کا ہے وہ اس کے بیٹے کو دو، خواہ تمہارا بیٹا بھوک سے مر رہا ہے۔ اس میں ”تمہارا بیٹا ہے اور یہ میرا بیٹا“ بڑا ہی اہم ہے۔ اس کے بعد آگے یہ شاخ چلی کہ یہ میرا قبیلہ ہے، یہ ان کے ہاں کا قبیلہ ہے۔ یہاں سے بات شروع ہوئی۔

دیکھیے قرآن نے کیسے یہ واضح کیا کہ انسان نے کس طرح پہلے دن سے قومیت کا معیار مقرر کر دیا، اس کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ عزیزان من! آج اس معاملے پر آپ کے ہاں سر پھٹول ہوتا ہے۔ آپ ان کو تو چھوڑ دیجیے جنہوں نے وطنیت اور جغرافیائی تقسیم اور قوموں کا معیار اس طرح خطے کو قرار دیدیا یا نسلوں کو قرار دیا، حالت تو یہ ہے کہ آپ کے ہاں قرآن کی حامل قوم بھی اسی کو معیار قومیت سمجھتی ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران ساری لڑائی اس Issue (مسئلے) پر تھی۔ نیشنلسٹ علما یہ کہتے تھے کہ ایک خطہ زمین ایک Territory (علاقہ) ایک وطن کے اندر رہنے والے مسلم و غیر مسلم ایک قوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مطالبہ پاکستان کے مدعی یہ کہتے تھے کہ اسلام میں یہ بات نہیں ہے۔ اسلام کی رو سے یہ جو ایمان کا اشتراک ہے، یہ جو دین کا اشتراک ہے، اس کی بنا پر قومیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ قرآن آیا ہی اس گروہ کے لیے تھا اور قرآن تو بہت آخر میں آیا۔ عزیزان من! خدا کی طرف سے پہلی وحی یہی کہنے کے لیے آئی تھی اور کس حسین انداز میں یہی چیز بتا رہی ہے۔ یہی کچھ سورۃ ہود اور اس سورۃ میں کہا گیا ہے کہ خدا نے یہ کہا تھا کہ اے نوح! ہم تمہیں اور تمہارے اہل کو بچالیں گے۔

اہل کا یہ لفظ ہمارے ہاں بھی اہل و عیال کے لیے بولا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ”اہل“ میں نسلی امتیاز کے سوا اور کوئی نہیں آتا یعنی میرے اہل و عیال۔ اس کے بعد عیال تو آگے اولاد کے لیے اور اہل بنیادی طور پر بیوی کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بیوی کو اہلیہ کہتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اہل میں کیا تصور تھا۔ ابتداً خدا نے نوح ♦ سے یہ کہا کہ ہم تیرے اہل کو بچالیں گے۔ اب قرآن ایک بڑی اہم بات بیان کرتا ہے کہ حضرت نوح ♦ کشتی میں بیٹھ گئے۔ اپنے ساتھ جماعتِ مومنین کو بھی لاد لیا۔ اب یہ جو آیت (11:41) ہے، اسے اپنے سامنے رکھ لیجیے۔ اس کے بعد ہم آگے چلیں گے۔ پہلے میں (11:42-43) آیات کو ہی پیش کروں گا۔ درمیان میں جو کچھ ہے وہ میں بیان کر جاتا ہوں۔ حضرت نوح کشتی میں تھے۔ بہت تباہیوں والا سیلاب آگیا، آپ نے اپنے بیٹے (Son) کو آواز دی کہ آ جاؤ بیٹے! کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ بیٹے نے جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہتا۔ میں کہیں اور پناہ لے لوں گا۔ انہوں نے کہا کہ او سیلاب بے بہا ہے، اس میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس نے کہا کہ کچھ بھی ہو، میں تمہاری جماعت میں شریک نہیں ہو سکتا، تمہارے ساتھ نہیں آ سکتا۔ اس کا بڑا خوبصورت انداز ہے کہ بیٹے نے یہ بات کہی۔ اس کے بعد نوح کچھ اور ہی کہنے والا تھا کہ وَحَالِ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ (11:43) اتنے میں ایک اتنی بڑی موج درمیان میں حائل ہو گئی کہ بات آگے ہو ہی نہ سکی۔ کیا انداز ہے۔ بات کو ختم کرنے کا صاحب! گفتگو کو Aggressively (جارحانہ انداز سے) ختم نہیں کیا۔ کہا کہ موج حائل ہو گئی، بیٹا جو ڈوبا، قوم بھی ڈوبی، کشتی آگے چلی، کشتی منزل پہ پہنچ گئی، سلامتی سے اتر آئے۔



## بیٹے کے ڈوبنے پر حضرت نوحؑ کے استفسار پر خدا تعالیٰ کا جواب

اب یہاں آپ یہ بات دیکھیے کہ حضرت نوحؑ کے ذہن میں خیال کیا آیا؟ قرآن کہتا ہے کہ وَ نَادَىٰ نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ (11:45) نوحؑ نے اپنے رب سے کہا کہ جراتِ عرضِ معاف ہو تو ایک بات پوچھ لوں کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اے نوحؑ! جو تیرے اہل ہیں، ہم ان کو بچالیں گے اور فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي (11:45) کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میرا بیٹا تو سب سے پہلے میرے اہل میں سے تھا۔ اسے کیوں نہیں بچایا گیا؟ اب آگے یہ بات آئی ہے کہ وَ إِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ (11:45) تیرے وعدے تو ہمیشہ سچے ہوا کرتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوگئی کہ تو نے تو وعدہ کر لیا تھا کہ تیرے اہل کو بچالوں گا مگر وہ تو ڈوب گئے۔ بیٹے سے زیادہ میرا قریبی اہل اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ سامنے ڈوب گیا۔ تیرے وعدے تو سچے ہوا کرتے ہیں پھر یہ کیا ہوا؟ ویسے تو أَنْتَ أَحْكَمُ الْحَكَمِينَ<sup>①</sup> (11:45) ہے۔ میں یہ بات کہہ دیتا ہوں کہ تو سب سے بڑا حکم ہے۔ میں یہ بات پوچھتا ہوں کہ جب تو نے وعدہ کیا تھا، تو وہ وعدہ کیوں نہ پورا کیا۔ پوچھنے کی یہ بات کوئی قابلِ اعتراض نہ تھی۔ قرآن کریم میں خدا نے اپنے وعدوں کے متعلق خود کہا ہے کہ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (13:31) ہم کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے اور ایک جگہ کہا ہے کہ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا (25:16) بفرض محال اگر کوئی ہمارا وعدہ بھی تم دیکھو کہ پورا نہیں ہوا تو تمہیں حق پہنچتا ہے کہ ہم سے بھی پوچھو کہ وعدہ کیا تھا، تم نے اسے پورا کیوں نہیں کیا۔ عزیزانِ من! ”رب بننا اینوں سجدہ ہیگا“<sup>②</sup> کہ جی! آپ نے تو یہ Promise (وعدہ) کیا تھا، اس کے متعلق کیا ہوا؟ کیوں پورا نہیں ہوا؟ وہاں بڑی گستاخی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اور تو اور اگر تمہاری زندگی میں کبھی ایسا ہو کہ خدا کا وعدہ بھی پورا نہ ہو تو تم ہم سے پوچھ سکتے ہو۔

## تشکیل قومیت کا ابتدائی فارمولا اور غیر متبدل اصول

حضرت نوحؑ ♦ نے اس لیے پوچھا تھا کہ آپ نے تو وعدہ کیا تھا۔ سنیے عزیزانِ من! جو میں نے عرض کیا ہے کہ پہلی وحی آرہی ہے پہلانی ♦ ہے، پہلی داستان بیان ہو رہی ہے اور اصول کیا بیان ہو رہے ہیں؟ تشکیل قومیت کا اس زمانے میں اصول بیان ہو رہا ہے، جب نسل کے سوا کوئی دوسری چیز اپنے اور بیگانے کے درمیان ذہن میں نہیں آیا کرتی تھی۔ قبائلی زندگی کی ابتدا ہوئی ہے۔ حضرت نوحؑ کے ذہن میں بھی یہ صحیح خیال آیا تھا کہ میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ بیٹے سے زیادہ بڑا اہل کیا ہو سکتا ہے۔ کہا کہ اے نوحؑ! سمجھنے میں

① اور تیرے اوپر کوئی حاکم بھی نہیں جو تیرے فیصلوں کو بدل دے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 502)۔

② رب بننا اسے ہی چٹا ہے۔

غلطی کر رہے ہو۔ Biologically (حیاتیاتی طور پر) بیٹا ہوتا ہے۔ تیرے ذہن میں اپنے اور بیگانے کا معیار یہ ہے کہ جو حیاتیاتی طور پر تمہارا بیٹا ہے وہ تمہارا اہل ہے لیکن معیارِ خداوندی تو کچھ اور ہے۔ قَالَ يٰنُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ (11:46) کہا کہ اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔ تو سمجھتا ہے کہ بیٹا صرف بیٹا ہونے کی حیثیت سے میرا ہے اور وہ اپنے اہل میں سے ہے جب کہ یہ بات ہی غلط ہے۔ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (11:46)۔ یہاں تو اپنے اور بیگانے کا معیار جو ہے وہ تو عملِ صالح اور عملِ غیر صالح ہے، یہاں معیارِ کفر اور ایمان ہے۔ لہذا جو معیار ہے وہ تو یہ ہے۔ جو اس میں شریک ہو وہ تمہارا ہے۔ یہ سارے جو تمہارے ہاں کشتی میں آگئے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ جو حیاتیاتی طور پر (Biologically) تمہارا اپنا ہو لیکن یہ سارے تمہارے ”اپنے“ تھے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم جو تمہارے اپنے ہیں انہیں بچالیں گے اور یوں لفظ اہل آ گیا۔ تمہارے ذہن میں اپنے اور بیگانے کا جو معیار تھا وہ طبعی معیار تھا۔ ہمارا معیار اس سے مختلف ہے۔ ہمارا معیار تو یہ ہے کہ نوح کا بیٹا بھی اگر ایمان کے اس اشتراک میں نہیں آتا تو اہل میں سے نہیں ہے، ابراہیم کا باپ بھی اگر اس میں نہیں آتا وہ ابراہیم کا اہل نہیں ہے، لوط کی بیوی بھی اگر اس میں نہیں آتی تو وہ اہل میں سے نہیں ہے، محمد رسول اللہ کے حقیقی چچا<sup>①</sup> بھی اگر اس میں نہیں ہیں تو ان کے اہل میں سے نہیں ہیں، حضور کے داماد<sup>②</sup> سے بھی کہہ دیا کہ نہیں، بھئی! بیٹی تمہارے گھر میں ہے، مگر تم میرے اہل میں سے نہیں ہو سکتے۔

عزیزانِ من! آج پوچھا جا رہا ہے کہ صاحب! اسلام نے معیارِ قومیت کیا بتایا ہے؟ معیارِ قومیت یہ بتایا ہے کہ حبشہ کا غلام بلالؓ اپنوں میں سے ہے، حقیقی چچا عباسؓ اپنوں میں سے نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کہتا ہے کہ تم میں اور ہم میں ہمیشہ دشمنی اور عداوت رہے گی۔ حَتَّى تُوْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحَدِّهِ (60:4) تا نکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ اس صورت میں تم ہمارے دینی بھائی ہو جاؤ گے۔ اب اس معیار پر بیٹا اپنا نہیں، باپ اپنا نہیں، بیوی اپنی نہیں، داماد اپنا نہیں، چچا اپنا نہیں۔ اس کے برعکس حبش کا غلام بلالؓ اپنا ہے، روم کا صہیبؓ اپنا ہے، فارس کا سلمانؓ اپنا ہے۔ یہ تو کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ معیارِ قومیت کی یہ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ یہ تو حضرت نوحؑ سے بات شروع ہوئی تھی، جس میں کہا تھا کہ فَلَا تَسْتَلِنَ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (11:46)۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے واقفیت کی بنا پر ایسی بات کر دی ہے۔ یہ حقیقت سمجھ لو کہ اِنِّیْ اَعْظُکَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰہِلِیْنَ (11:46) میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ اس قسم کا سوال پوچھنے سے پہلے ہی یہ پوچھ لیا کرو کہ صاحب! یہ کیوں ہوا ہے؟ یہاں لفظ ”اعظ“ آیا ہے کہ ”میں تمہیں اس بات کی نصیحت کرتا ہوں، جن چیزوں کے متعلق علم نہ ہو اور تم یوں سمجھو کہ یہ ایسا ہے تو پہلے یہ پوچھ لیا کرو کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ جو خدا کے راستے پہ

② یہ اشارہ حضرت عباسؓ کی طرف ہے۔

③ ابو العاصؓ، حضرت زینبؓ کے شوہر تھے۔ حضرت زینبؓ نے جہیز کا وہ قیمتی ہار بھی بھجھا تھا جو 25 برس پہلے حضرت خدیجہؓ کو آپؐ نے دیا تھا۔

میرا اتباع کرتا ہے وہ میرا ہے دوسرے کوئی میرے نہیں ہیں۔ اب آپ دیکھیے گا کہ دوسری کتنی ان گنت بنیادی تفریقات ہیں۔ یہاں ایک قصہ نوحؑ میں پہلی وحی پہلی قوم پہلا نبی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ قوم کیسے مٹ گئی۔ ہم آج تک یہی سمجھتے رہے کہ سیلاب آیا تھا تو کشتی بنائی وہ اس میں بچ گئے۔ مگر قرآن کریم نے انسانیت کی جو دو بنیادی تفریقات تھیں ان کی تو جڑیں کاٹ کے رکھ دیں۔ نسلی امتیاز پر اپنے اور بیگانے کے اندر جو تفریق پیدا ہوئی اس نے انسانیت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

### نسلی امتیاز کے سلسلہ میں ہمارا اپنا باہمی برتاؤ

عزیزانِ من! ہم دوسروں کے ہاں کیوں جائیں کہ انہوں نے اپنے ہاں کیا کیا؟ یہ کہ محض شہر کے گھر میں پیدا ہونے سے ساری عمر شہر، برہمن کے گھر میں پیدا ہونے سے ساری عمر برہمن ہوتا ہے۔ ان پہ تو ہم اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے انسانیت کو ورنوں میں تقسیم کر دیا۔ آپ کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ پتہ نہیں کہ وہ سید تھا بھی یا نہیں، مگر سید کے گھر میں پیدا ہونے والا سید ہے۔ ہم ساری عمر یہ فخر سے کہتے چلے آ رہے ہیں۔ صاحب! کیا فخر ہے اس کے اندر کہ تم اس کے گھر میں پیدا ہوئے؟ کیا اس میں کسی پیدا ہونے والے بچے کی کاریگری ہے کہ وہ اس گھر میں پیدا ہو گیا؟ ساتھ ہی کے گھر کے اندر وہ جولاہا ہے، معاف رکھیے گا میرا مطلب یہ نہیں کہ میں ان کی تضحیک کرتا ہوں، میں عام معیار کے مطابق کہتا ہوں کہ ساتھ ہی کے گھر کے اندر وہ موچی ہے۔ اس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا۔ وہ بچہ ناکردہ گناہ گار ہے۔ ساری عمر پیچا رہا اسی بے عزتی کی زندگی بسر کر رہا ہے، موچی ہے موچی کا پتر۔ کون ہے جی؟ ”اوتے موچی دا پتر اے نا۔“<sup>①</sup> چل بھی! معاملہ ختم ہوا۔ یعنی اب اس کے بعد اس کی اپنی حیثیت کوئی نہ رہی۔ یہ جو آپ سوچ رہے ہیں کہ سید عبدالحکیم صاحب کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! اس میں کوئی ایسی فخر کی بات نہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر جناب موچی کے گھر میں پیدا ہو گئے تو کیا آپ اپنے نام کے ساتھ ساری عمر موچی عبدالحکیم لکھتے ہیں؟ نہیں، کبھی کسی نے نہیں لکھا بلکہ وہ تو چھپاتے پھرتے ہیں۔ کچھ اور نہیں مانا جاتا تو اپنے ساتھ آج بھی وہ قریشی لکھ دیتے ہیں۔ جو کفر ہے، قرآن نے پہلے دن اس کی جڑ کاٹ دی۔

عزیزانِ من! دنیا کی قوموں کو تو چھوڑیے کہ وہ تو جاہل قومیں تھیں۔ اس قوم کو لیجیے جو اس قرآن کے وارث ہونے کی مدعی ہے۔ اس قوم کی بھی آج یہ کیفیت ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے جو تفریق پیدا ہوتی ہے زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتی۔ پھر مجھے اس بات پر اعتراض ہو رہا ہے کہ صاحب! وہ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والے کو برہمن سمجھتے ہیں مگر اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہو رہا کہ سادات کے گھر میں یہ کیا چیز ہے جس کی نسبت سے اپنے آپ کو سید کہا جاتا ہے۔ حضورؐ کو خود صحابہؓ نے ”یا سیدی“ کہہ کر پرکارا، تو آپؐ نے کہا: کیا

① وہ تو موچی کا بیٹا ہے۔

کہہ رہے ہو سید تو صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے، میں تو تمہارے جیسا ایک بشر ہوں، جس کی حیات طیبہ میں حجۃ الوداع کا آخری خطبہ یہ تھا کہ ”یاد رکھو! عجم اور عرب کی تمیز، گورے اور کالے کی تفریق، جنسی تفریق، آج تمام تفریقات میں نے اپنے پاؤں کے نیچے مسل کے رکھ دی ہیں۔ تفریق صرف کفر اور ایمان کی ہے۔“ اس ذات اقدس و اعظم کا فخر سے نام لینے والے اور اپنے آپ کو اس کی اولاد میں سے کہنے والے یہ دیکھیں کہ ان M کی اپنی یہ کیفیت ہے۔ معلوم نہیں آپ لوگوں کو بھی اس کا علم ہے یا نہیں، میرے پاس اب بھی یہ سوالات پوچھنے کے لیے آتے رہتے ہیں کہ صاحب! وہ کہتے ہیں کہ غیر سید، سیدزادی سے شادی نہیں نکاح نہیں کر سکتا ہے، کہیں آپ کے علم میں بھی یہ بات ہوگی۔ ہمارے ہاں گاؤں میں تو اب بھی یہ صورت ہے کہ سیدزادی کی شادی غیر سید کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جی! سیدزادی سے کسی غیر سید کی شادی نہیں ہو سکتی!! ہر شادی کے وقت پہلی چیز یہ دیکھی جاتی ہے کہ ”ذات کیہڑی ہے جی، برادری کیہڑی اے؟“<sup>1</sup> یہ اس قوم کی حالت ہے جس میں خدا نے پہلے نبی سے پہلی وحی میں یہ کھد یا تھا کہ یہ کیا تفریق کہہ رہے ہو۔ عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔ وہاں تو سوال ہی یہ ہے کہ جس نے بھی یہ تسلیم کر لیا، اس صداقت کا اقرار کر لیا، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہہ دیا، اس کے بعد تو تیری درگاہ میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ اس ایک ہونے کے یہ معنی ہیں۔

عزیزانِ من! پہلی تفریق آپ نے دیکھ لی۔ یہ دو چیزیں ہیں جن کے متعلق کہا تھا کہ ہم نے نبی اس لیے بھیجے تھے کہ انسانوں نے جو اپنے اندر اختلافات پیدا کر لیے تھے وہ ان کو مٹائیں۔ پہلے ہی نبی کی یہ دو چیزیں قرآن سامنے لے آیا ہے یعنی نسلی تفریق، جس نے ذاتوں، برادریوں، قوموں اور نسلوں کی شکلیں اختیار کر لیں اور دوسری معاشرے کے اندر دولت کے اعتبار سے طبقاتی تقسیم کو موجب تکریم و تحقیر قرار دیا۔ سو قرآن حکیم نے ان دونوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور آج دونوں ہی چیزیں آپ کے ہاں مثبت ہیں۔ عزیزانِ من! وہ نکاح شادی کی بات ہی نہیں ہے۔ آج بھی آپکے ہاں یہ جو کئی کام کرنے والے ہیں، یہ جو موچی، نائی، کنجڑے اور دھوبی ہیں اور یہ جو دوسرے ان کو اپنے برابر نہیں سمجھتے ہیں، یہ جرم تھا۔ حضرت نوحؑ کی قوم کا بھی تو یہی جرم تھا، جس کے لیے اُسے غرق کر دیا گیا۔ اب غرق کرنے کے بھی قدرت کے طریقے الگ ہوتے ہیں۔ اُس دور میں تو صرف پانی کا سیلاب ہی غرق کرتا تھا۔ آج اس قسم کی تفریق کرنے والی جو قومیں ہیں، آپ دیکھیے کہ آج دنیا میں قوموں کی تو میں ذلت و رسوائی کے سیلاب میں غرق ہیں۔ آپ کی یہ قوم جو خالص ایمان کی بنا پر پاکستان میں ایک قوم بنا کر لائے تھے، اس قوم کے اندر بھی تفریق ہے، جو نوحؑ کے زمانے کی تفریق تھی۔ کہیں نسلی امتیاز، کہیں برادریوں، ذاتوں اور گوتوں کے امتیازات کے اس سیلاب بے پناہ نے آپ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ وہ کشتی کے ذریعے تو سیلاب سے بچ سکتے تھے لیکن

① ذات (Caste) کیا ہے اور برادری کوئی ہے؟

ہم اس سیلاب سے توجہ ہی نہیں سکتے۔ فرق یہ ہے کہ وہ آسان تھا: ایک دفعہ سیلاب آیا بات ختم ہوگئی، لیکن یہ جہنم کا عذاب ہے۔ اس کے متعلق تو قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (20:74) زندگی تو اس میں ہوتی نہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ موت بھی اس میں نہیں آتی۔ آپ سوچتے ہیں کہ کس عذاب میں ہم جی رہے ہیں؟ سوچتے ہیں کہ سیلاب کی وجہ کیا ہے؟ ہر وقفے کے بعد جب بھی آپ کے ہاں کہیں انتخابات ہوتے ہیں، وہ برادریوں کی بنا پر ہوتے ہیں، جتھے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

### پہلی وحی کی اصولی ہدایت اور راہنمائی

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں دوسروں پر تنقید نہ کیجیے۔ اپنے دل میں جھانک کر دیکھیے کہ ہمارے ذہن میں بھی کبھی یہ آتا ہے کہ یہ موچی واجب التکریم پیدا ہوا ہے۔ یہ پہلی وحی ہے۔ قرآن یہ کہنے کے لیے آیا تھا کہ انسان واجب التکریم پیدا ہوا ہے۔ خواہ وہ موچی ہو، کنجڑا ہو، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، سیاہ ہو یا سفید، مرد ہو یا عورت۔ وہ پیدائش کے لحاظ سے قابلِ عزت و تکریم ہے۔

### قرآن حکیم میں کوئی بات بھی مافوق الفطرت نہیں ہے

اب اگلی چیز بڑی اہم ہے کہ یہ سیلاب سے کیوں نہ بچ گئے۔ پہلی چیز تو آپ نے یہ دیکھی کہ جنہیں سیلاب سے بچایا گیا ہے، وہ کوئی فوق الفطرت (Supernatural) بات نہیں کی گئی یعنی یہ جو ایمان والی جماعت تھی اور ان میں ان کا نبی ♦ بھی موجود تھا، تو انہیں کسی اور طریقے سے اس لیے نہیں بچایا کہ یہ بڑے نیک بخت لوگ ہیں۔ ان نیک بختوں کے سربراہ سے کہا گیا کہ سیلاب سے بچنا چاہتے ہو تو کشتی بناؤ۔ کشتی کے ذریعے بچ سکتے ہو۔ فرق اتنا ہے کہ یہ نیک بخت، جنہیں ہم صاحبِ ایمان کہتے ہیں، خدا کی طرف سے دی ہوئی Directions (ہدایات) پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اس کے مطابق کشتی بنانے لگ جاتے ہیں تو ان کی اس میں نجات ہو جاتی ہے۔ اگر یہ اتنی سی بات نہیں ہے تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا تسبیح لی جائے اور دس ہزار مرتبہ روز پڑھا جائے کہ ”کشتی میں بیٹھنے سے نجات ہوتی ہے، کشتی میں بیٹھنے سے نجات ہوتی ہے، کشتی میں بیٹھنے سے نجات ہوتی ہے“؟ اور اگر سیلاب کا عذاب آیا ہوا ہے تو کیا کریں؟ کہ جی! ”کوٹھڑے چڑھ کے بانگیاں دیا کرو“۔<sup>①</sup> اس کے لیے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے علاج یہ بتایا گیا کہ اس سے بچنے کے لیے تم کشتی بناؤ۔ انہوں نے کہا کہ جی، ہمیں کشتی بنانے کا پتہ نہیں؟ ہم نے کہا کہ ہم بتائیں گے کہ کیسے بناؤ۔ مگر کشتی بناؤ، نہیں بناؤ گے تو بچو گے نہیں، ڈوب جاؤ گے۔

① مکان کی چھت پہ کھڑے ہو کر اذانیں دیا کرو۔

## انسانی کوتاہیوں اور بد اعمالیوں کا نتیجہ طبعی اسباب کی شکل میں سامنے آتا ہے

برادران عزیز! یہ بڑا ہی اہم سوال ہے کہ قرآن جرائم تو اس قسم کے گنتا ہے اور ان کے بعد ان کی جو تباہیاں ہوتی ہیں وہ طبعی اسباب کے ماتحت ہوتی ہیں یہ کیوں؟ مثلاً <sup>①</sup> یہاں سیلاب سے ہونیں، کہیں ایک جھکڑ <sup>②</sup> چلا اس سے ہو گئیں، کہیں آتش فشاں پہاڑ تھا اس کے دامن <sup>③</sup> میں اس کے لاوے سے ہو گئیں۔

قوم سبا <sup>④</sup> کے متعلق کہا کہ انہوں نے بہت بڑا ڈیم بنایا تھا۔ یہ ان کی ایک بڑی عجیب داستان ہے۔ کہا کہ انہوں نے اپنی زرعی

① یہاں قوم نوح ♦ کی تباہی کی طرف اشارہ ہے۔

② یہ اشارہ قوم عاد کی تباہی کی طرف ہے۔ یوں سمجھیے کہ قوم نوح ♦ کی بربادی کے بعد جب یہ علاقے دوبارہ آباد ہوئے تو بنی سام کی پہلی ترقی اسی قوم عاد سے ہوئی تھی۔ یہی قوم عاد ہے جس کی طرف حضرت ہود ♦ مبعوث ہوئے۔ ان کا مقام بعثت و تبلیغ احناف کا علاقہ تھا۔ یہ جزیرہ نمائے عرب کا وہ طول و عرض ریگستان جسے اب رُبَع خالی کہا جاتا ہے احناف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہ تِشال ریت کے ٹیلے خوف و دہشت کے بھیا نک عفاریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اسے اس طرح نیچے دبا لیتے ہیں کہ پھر وہاں محکمہ آثار قدیمہ والے ہی اس کا سراغ لگائیں تو پتہ چلے۔ یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہود ♦ کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے، اِلَّا ان کے جو حضرت ہود ♦ کے ساتھ بچا لیے گئے اور پھر عادِ ثانیہ کہلائے۔ (ماخوذ از پرویز۔ 1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)۔ ص 44-45)

③ یہ اشارہ قوم ثمود کی طرف ہے جنکی طرف صالح ♦ مبعوث ہوئے۔ اس کا زمانہ 250 ق م سے 1600 ق م کا ہے۔

④ ”اس قوم کا مسکن جنوبی عرب (یعنی کا مشرقی علاقہ) تھا اور مآرب دار السلطنت (Capital)۔ یہ اس زمانے کی مہذب اور طاقت ور قوم تھی تجارت میں بہت آگے تھی۔ زمین زرخیز، قیمتی دھاتیں، جواہرات، ریشم اور بخورات کے مسالے بافراط ملتے تھے۔ ہندوستان کا مال تجارت یمن کے ساحل پر جا کر اترتا، وہاں سے یہ لوگ اس سامان کو شام، فلسطین اور مصر تک لے جاتے۔ تجارت اور اس کے ساتھ حکومت، نتیجہ یہ کہ شمالی عرب اور افریقہ تک مختلف آبادیوں پر ان کا تسلط رہا۔ قریب 1100 ق م زمانہ عروج سمجھیے۔ پہلی صدی قبل مسیح یہ قوم تباہ ہو گئی۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات اور ان کے کتبات آج تک ان کی مٹی ہوئی سطوت کی زندہ شہادتیں ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے اور قلعے تعمیر کرتے تھے اور آبپاشی کے لیے انہوں نے بڑے بڑے بند (Dams) بنائے تھے چنانچہ ایک بہت بڑا بند خود دار السلطنت مآرب کے قریب تھا جسے سد مآرب کہتے ہیں۔ حجاز کے عرب بند (Dam) کو ”سد“ اور عرب یمن ”عرم“ کہتے ہیں۔ یہ بند (Dam) پہاڑوں کے اندر بڑی بڑی دیواریں کھینچ کر بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے ارد گرد کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ اس سے یہ سر زمین ایک وسیع و عریض باغ بن گئی تھی۔ پہلے یہ بند (Dam) ٹوٹا جس سے شہر تباہ و برباد ہوا اور گرد و پیش کا علاقہ ایسا ویران ہوا کہ اس میں جھاؤ اور خاردار بیڑیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا (17-16:34)۔ (پرویز۔ 1993ء)۔ برقی طور۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص 259)۔

قوم سبا کی ایک شاخ مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے حمیر کہتے ہیں۔ جب رومیوں نے اہل سبا کی تجارت کو منایا ہے تو حمیر کا ستارہ اقبال چمک اٹھا اور بڑی زبردست قوت اور دولت کے مالک بن گئے۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ نے اپنا لقب ”تبع“ اختیار کیا جس کے معنی حبشی زبان میں (باقی اگلے صفحہ پر)

معاشرت کے تحت اپنی معیشت کے لیے بڑے انتظامات کیے پانی جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے ڈیم بنائے لیکن اس کے بعد جو انہیں دولت کی ہوس ہوئی تو انہوں نے تجارت کے لیے لمبے لمبے سفر اختیار کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جو ڈیم (Dams) اپنی معیشت کے لیے بنائے تھے یہ Neglect (فراموش) کر دیئے گئے ان کی مرمت ہی نہیں کی۔ وہ سارے لوگ تجارت کے لیے چل پڑے کہ اس میں دولت زیادہ ملتی ہے۔ ان کا نبی ♦ آیا اس نے کہا کہ او کم بخنوا! تم نے پہلے یہ ڈیم بنالیا ہے۔ اس کے اندر اتنا پانی جمع ہے اس ڈیم کے متعلق احتیاط برتو اس کی مرمت کرتے رہا کرو ورنہ اگر نیچے سے اس کی بنیاد نکل گئی تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس وقت تمہیں یہ پڑی ہوئی ہے کہ تھوڑا سامان حاصل کر لیا جائے اور تجارت کے لیے نکل جائیں۔ ہر فرد باہر چلا جا رہا ہے جیسے اب پاکستان میں ہے کہ کوئی کویت جا رہا ہے کوئی ابوظہبی جا رہا ہے کوئی لبیا جا رہا ہے کوئی سعودی عربیہ جا رہا ہے ڈاکٹر ادھر چلے گئے انجینئر ادھر چلے گئے صاحب! چلے جاؤ اور یہاں ڈیم بنا بیٹھے ہو۔ ٹھیک ہے جی! ”آپے غرق ہون گے“ جیہڑے اتھے رہن گے<sup>①</sup>۔ ”قرآن یہ بتا رہا ہے کہ نبی ♦ ان سے یہ کہہ رہا ہے۔ عزیزان من! سوچئے تو یہ قرآن کیا کتاب ہے! یہ کہتا کیا ہے؟ اب اس نے کہا کہ بارش زور کی آئی۔ سیلاب آیا پانی زیادہ جمع ہوا نیچے سے بنیادیں نکل گئیں۔ بند جو ٹوٹا ہے تو اس نے کہا کہ پوچھو نہیں کہ اس کی تباہی کیا ہوتی ہے! ہم نے تو دیکھی ہے۔

### طبعی چیزوں کا اخلاقیات کے ساتھ باہمی ربط

اب سوال یہ ہے کہ یہ جو قوم میں طبعی چیزیں ہوتی ہیں اور وہ جو اخلاقی چیزیں ہوتی ہیں ان کا آپس میں ربط کیا ہے؟ یہ بڑا ہی اہم

(بقیہ حاشیہ) ”سلطان“ کے ہیں۔ یعنی غلبہ و استیلاء اور قوت و جبروت کا مالک۔ یہ خاندان بھی اہل سبا کی طرح شروع میں ”کواکب پرست“ تھا۔ (پرویز: برقی طور ادارہ طلوع اسلام لاہور 1993ء ص 94-293)۔ 1955ء میں ایک امریکن حفریات (Archaeologist) نے ان آثارِ قدیمہ کا ذکر کیا تھا جو اس نے جنوبی عرب بالخصوص یمن کے علاقہ میں دریافت کیے تھے۔ اس کی کتاب کا نام Qataban and Sheba ہے اور مصنف کا نام Wendell Phillips ہے۔ ان تفصیل سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ بالخصوص ان کے تعمیر کردہ بند اور اس کے بعد اس تباہی پر جس سے اس قوم کی صرف داستانیں دنیا میں باقی رہ گئیں (19:34)۔ (حوالہ پرویز: 1960ء)۔ لغات القرآن جلد دوم۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص 831)۔ اہل سبا کی تاریخ کے حسب ذیل 4 ادوار ہیں: (1) 650 ق م سے پہلے کا دور جس میں ملوک سبا کا لقب ”مکرب سبا“ تھا پایہ تخت ”صروح“ تھا۔ اس دور میں مآرب کے مشہور ڈیم کی بنیاد رکھی گئی۔ (2) 650 تا 115 ق م کا دور جس میں بادشاہ کا لقب ”ملک“ تھا دارالسلطنت مآرب تھا جو سمندر سے 3900 فٹ بلند صناعاً سے 60 میل جنوب مشرق ہے۔ (3) 115 ق م تا 300 ق م کا دور جس میں ”ریدان“ پایہ تخت تھا جو بعد میں ”ظفار“ شہر کے نام سے مشہور ہوا۔ (4) 300ء کے بعد سے آغاز اسلام تک کا دور۔ یہ یمن کے حبشی و انسرائے ابرہہ کے زمانہ تک کا

ہے۔ (ماخوذ: Phillips, Wendell: Qataban and Shaba)

① جو یہاں رہیں گے وہ خود ہی غرق ہو جائیں گے۔

سوال ہے کہ قوم معاشرے میں پیشوں اور ذاتوں کی بنا پر تفریق کر رہی ہے۔ جو کمی کمین ہیں انہیں ذلیل سمجھ رہی ہے جو بڑے بڑے ہیں وہ پھنچے خاں بنے بیٹھے ہیں۔ یہ سیلاب سے غرق ہو گئے یعنی اخلاقی جرائم میں اور ان میں ربط کیا ہے؟ ربط کے لیے تو عزیزان من! زیادہ دور جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ کے ہاں ہر سال سیلاب آتے ہیں۔ اس کے بعد جب آپ تحقیق کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ جو بند بنایا تھا اس میں سیمنٹ کی جگہ ریت ڈلی ہوئی تھی۔ سیمنٹ کی جگہ ریت لگنا اخلاقی خرابی ہے اور بددیانتی ہے۔ اب اگر قرآن کہیں یہ کہہ دے کہ وہ قوم بڑی بددیانت تھی اس واسطے سیلاب سے غرق ہو گئی تو بظاہر نظر آئے گا کہ صاحب! بددیانتی اور سیلاب سے غرق ہو جانا اس میں باہمی ربط کیا ہے؟ ربط باہمی یہ ہے کہ جب کوئی قوم بددیانت ہو جاتی ہے اس میں رشوت ستانیاں آ جاتی ہیں اس میں استبداد آ جاتا ہے ان کے ہاں پھر دولت کا چکر شروع ہو جاتا ہے پارٹی بازی شروع ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کی Leg Pulling (فریب دہی) ہوتی ہے۔ جتنے ان کے فرائض منصبی ہوتے ہیں وہ ان کی طرف سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں انجینئر اگر جاتا ہے تو وہ ٹھیک طرح سے اس کی نگرانی نہیں کرتا فرائض منصبی سے چشم پوشی کر لیتا ہے ”ٹھیکہ دار جو ہے وہ سیمنٹ کی جگہ ریت ہی ٹھوک دیندا ہیگا۔ اونیں اڈھاتے پہلے دتا ہوندا“ اوہدے وچوں“<sup>①</sup>۔ یہ کچھ ہو جاتا ہے۔ اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو کرپٹ (بددیانت) معاشرے ہیں ان کی تباہیاں مادی ذریعے سے آتی ہیں لیکن اس کی بنیاد ہمیشہ اخلاقی ہوتی ہے۔

### جاپان کی مادی دنیا پر اخلاقیات کا اثر

عزیزان من! یاد رکھیں جس قوم کے اخلاق درست ہوں تو انتظامی امور میں ان کے ہاں بند نہیں ٹوٹتا۔ کسی زمانے میں جاپان میں زلزلے سے اتنی تباہی ہوتی تھی جس کا انتظام دنیا کی کوئی قوم آج تک نہیں کر سکی لیکن انہوں نے اپنے ہاں محنت و کاوش سے ایسے گھر بنا لیے ہیں کہ اب زلزلہ آتا ہے تو آتا رہے وہ گھر کا نپتار ہوتا ہے گرتا نہیں ہے۔ یہ ہے اخلاقی خرابیوں اور طبعی طور پر کسی قوم کے تباہ ہونے کے اندر ربط۔ قومیں طبعی طور پر ہی تباہ ہوتی ہیں۔

عزیزان من! جسے ہم مافوق الفطرت بات کہتے ہیں وہ کہیں نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں خدا کہتا ہے کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (35:43) تم سنت اللہ میں تبدیلی ہرگز نہ پاؤ گے مثلاً سنت اللہ یہ ہے کہ جو قوم اپنے بند پکے سیمنٹ سے بنائے گی وہ سیلاب سے محفوظ رہے گی۔ پکے سیمنٹ سے بنانے کے لیے دیانتداری اور تکنیک کی ضرورت ہے۔ یہ صلاحیت بھی موجود ہو اور دیانتداری کی یہ چیز بھی ہو تو بند بچ جائے گا۔ یہ چیز نہیں ہے تو بند ٹوٹے گا۔ یہ دوسری چیز جو ہمارے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ جو قرآن نے بتایا ہے۔ یاد رکھو!

① ٹھیکیدار سیمنٹ کی بجائے ریت ڈالتا ہے کیونکہ ٹھیکے کی رقم میں سے وہ آدھی رقم تو کام شروع کرنے سے پہلے ہی ادا کر چکا ہوتا ہے۔



حفاظت طبعی طور پر ہی ہوتی ہے۔ اس کی پہلی جماعت <sup>①</sup> کو بھی کشتی کے ذریعے سے سیلاب سے بچنا ہوتا ہے۔ اسے بچانے کے لیے ہم اسے اٹھا کر نہیں لے جاتے۔ یہاں اگر قوم سے کچھ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز کرو، وہ چیز کرو، تو جواب ہوتا ہے کہ دیکھیے! جی وہ تو ٹھیک ہے مگر خدا کی مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے، اس خدا کی مصلحت سے سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔ پھر ہمیں وہ قصے سنا دیئے جاتے ہیں کہ صاحب! میدان بدر <sup>②</sup> میں بڑا مقابلہ تھا، تین سو تیرہ ایک طرف تھے، ہزار دوسری طرف تھے۔ بڑا سخت مقابلہ تھا۔ تین سو تیرہ تو جیت ہی نہیں سکتے تھے، شکست ہو جانی تھی، عین اس وقت بدر کے میدان میں، پھر رسول اللہؐ نے کنکریوں کی ایک مٹھی لی اور ان کی طرف پھینکی، وہ سارے اندھے ہو گئے۔ اب وہ اندھے ہو گئے اور یہ صاحب مارنے لگے:

بھاگے تھے ہم بہت تو اسی کی ہے یہ سزا

ہو کے اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

میں سوچ رہا تھا کہ بات بڑی اہم آرہی ہے اور آپ کہیں گے کہ درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ بہتر ہے کہ کہہ ہی دوں۔ اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ یاد رکھو! کبھی کبھی طوفان بھی ناخدا کی کام کر دیا کرتا ہے بشرطیکہ طوفان میں گھرے ہوئے اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھیں۔ یہ ہے دونوں کے اندر ربط۔ ہاں بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ جنگ بدر <sup>②</sup> کو مافوق الفطرت بتایا جا رہا ہے کہ آپؐ نے وہ کنکریاں پھینکیں اور وہ اندھے ہو گئے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق ہے ہم کسی بات میں بھی نہیں کہتے کہ ناممکن ہے صاحب! اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ جو اتنے بڑے گزروں کو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے وہ یہ کیوں نہیں کر سکتا، لیکن اگلی بات جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) رسول کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ عزیزانِ من! اگر سوال یہی ہے کہ جب شکست ہونے لگے، کوئی اور صورت نہ رہے تو کنکریوں کی مٹھی مار دیجیے، اگلے اندھے ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز ہمارے لیے کس طرح نمونہ بن سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں مافوق الفطرت طریقے سے ہی ہونی ہیں تو یہ تو ہمارے لیے اسوہ نہیں بن سکتیں۔ آج جب بھی کسی سے یہ کہا جائے کہ صاحب! دیکھیے رسول اللہؐ اور ان کے صحابہؓ کبار دس سال کے عرصے میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے، کتنے ملک فتح کر لیے، کتنی قوموں کو انہوں نے فتح کر لیا، تو کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب! ان کی کیا بات ہے جی، وہ تو آپؐ دیکھیے وہ تو رسول تھے صحابہؓ تھے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن نے یہ جو اسوہ حسنہ کہا ہے تو پھر یہ اسوہ حسنہ کیسے بنے گا؟ ان سے پوچھیے کہ جب وہی رسولؐ وہی صحابہؓ جنگ احد <sup>③</sup> کے اندر پہاڑی پہ کھڑے تھے وہاں ایک تکنیکی غلطی ہوئی حتیٰ کہ فتح مبدل بہ شکست ہو گئی اور وہ اتنی بڑی شکست

② جنگ بدر 17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء

① یعنی وہ جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے۔

③ دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005ء، ص 291 (فٹ نوٹ 1 اور 2)

تھی کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق تاریخ میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے آپ ﷺ کو بچانے کے لیے گھیرے میں لے لیا، بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور جتنے تیر آ رہے تھے ان کو اپنی پشت کے اوپر لے کر رسول اللہ ﷺ کو بچایا اور پھر یہ بھی کہ اس پہ بھی رسول اللہ ﷺ کو زخم آیا، دانت شہید ہوا، بے حد خون نکلا۔ اگر وہی چیز تھی کہ آپ ﷺ ایسے وقت میں پتھر مار دیا کرتے ہیں تو اس سے دشمن اندھا ہو جاتا ہے تو یہاں کیوں نہ مارے گئے۔ یہاں قرآن نے واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ آگے نہ بڑھنا، بات سوچنا کہ کیا ہوئی ہے؟ یہ کیوں شکست ہوئی ہے؟ یہ شکست اس لیے ہوئی ہے کہ ان کے کمانڈر نے جو پہاڑی کے درے کے اوپر چھت پر کھڑا تھا، ان سے کہا تھا کہ یاد رکھو! کوئی صورت بھی ہو تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا، یہ ہمارے لیے بڑا نازک مقام ہے، یہاں سے دوبارہ حملہ ہو سکتا ہے، دوبارہ یہ نہ کرنا۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ جب سامنے دیکھا، میدان جنگ میں مال غنیمت پڑا ہوا ہے، تو وہ سپاہی وہاں سے بھاگے اور لگے لوٹنے۔ یہ صورت تھی۔ سو اس ایک حکم کی نافرمانی سے یہ کچھ ہوا۔ تم نے سوچا ہے جاؤ اس گھاٹی کے اوپر دوبارہ ان کا تعاقب کرو اس طرح تم بچو گے۔ یہ ہے ہمارے لیے اسوہ حسنہ، ورنہ فوق الفطرت باتوں سے اگر یہ سب کچھ ٹھیک ہو تو پھر وہ تو یہ کچھ اپنے وقت پر کر گئے، اب ہم آپ ﷺ کیا کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے اسوہ حسنہ نہ ہوا۔

عزیزانِ من! اسی گردش کا نتیجہ تھا کہ یہاں کہا کہ قوم نوح ♦ تباہ ہو گئی۔ اب ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ (23:31) اس کے بعد ہم نے قوموں کا ایک اور دور شروع کر دیا۔ حضرت نوحؑ کے بعد قوم عاد آئی۔ اس کے بعد آنے والی اس قوم میں فَأَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ (23:32) ہم نے اپنا رسول بھیجا۔ اس نے بھی آ کر وہی بات کہی کہ اَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ (23:32) قانون صرف خدا کا ہے، تم صرف اس کا اتباع کرو، دوسروں کا اتباع نہ کرو۔ ہر تم کا، اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے، سو تم بتاؤ کہ أَفَلَا تَتَّقُونَ (23:32) جو میں نے کہا ہے، تم اس کے قوانین کی نگہداشت کرو گے یا نہیں۔ اور پھر وہی بات کہی ہے کہ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا (23:33)۔ یہاں وہی الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ ہیں یعنی وہی سردارانِ قوم آ گئے، وہی دولت مند طبقہ آ گیا جو مخالفت کر رہا ہے۔ آپ دیکھیے، عزیزانِ من! جہاں مخالفت ہوتی ہے وہاں سب سے پہلے یہی اوپر کا مترفین کا، سرمایہ داروں کا طبقہ ہے جو مخالفت کرتا ہے، ورنہ مذہب پرست طبقہ کی مخالفت کا سوال نہیں ہے۔ جو چیز قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں انہیں شکست ہوتی ہے وہاں یہ مذہب پرست طبقہ کو آگے کر دیتے ہیں۔ جب فرعون کو حضرت موسیٰ ♦ کے ہاتھوں شکست ہوئی تو اس نے اپنے ہاں کے بڑے بڑے پادری یعنی مذہبی پیشوائیت کے لیڈران کو بلایا اور کہا کہ یہ بات میرے بس کی نہیں رہی، تم بتاؤ کہ کس اسٹیج پر اس کو شکست ہو؟ پھر ساری قوم کے اندر ڈھنڈورا پٹا دیا کہ یہ ایسے لوگ آ گئے ہیں جو تمہیں تمہارے مذہب سے برگشتہ کر دیں گے۔

آواٹھو! اس کے خلاف۔ یہ وہی تکنیک ہے: آپ مذہبی جذبات کو مشتعل کر دیجیے پھر جو جی میں آئے کر دیجیے۔ یہی حکمتِ فرعونی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قوم کے متعلق قرآن نے کیا بتایا ہے؟ یہ وہی بات ہے جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** (2:213) سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ اس عالمگیر برادری میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اس سے قوم میں تفریق پیدا ہوئی۔ اس سے تباہیاں آنی شروع ہوئیں۔ نبی ♦ آیا اور اس نے آکر کہا کہ یہ تفریق ختم کرو۔ یہ پہلی تفریق ہم نے حضرت نوحؑ کے زمانے میں دیکھی۔ یہ دوسری قوم عادیٰ۔ اب دیکھیے، عزیزانِ من! اس کا تذکرہ سورۃ الشعراء (26 ویں سورۃ) میں کیا ہے۔ قرآن پہلے ان کا تعارف کراتا ہے۔ یہ قوم اس دور کی تاریخ بھی بتاتی ہے۔ بڑی مرفعہ الحال <sup>1</sup> ہے۔ مہذب بھی تھی۔ اب تو ہمارے ذہن میں کچھ یہ آتا ہے کہ تہذیب اور تمدن اور یہ ترقی وغیرہ ہمارے ہی دور سے مخصوص ہے۔ نہیں ایسا نہیں تھا۔ پرانی قوموں کے لیے بھی یہ جو کچھ محکمہ آثار قدیمہ والے سامنے لارہے ہیں اس سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ یہ قومیں اتنی جاہل تھیں بلکہ ان قوموں کے اندر بڑا تمدن تھا۔ قرآن قومِ عاد کا تعارف کر رہا ہے جو قوم حضرت نوحؑ کی Successor (جانشین) ہے یعنی اس قومِ نوحؑ کے بعد یہ قوم آئی ہے جس کا یہ ذکر ہے۔ شروع میں یہ قوم یمن کے اندر ہے اور وہاں سے چلتی ہوئی یہ شام تک چلی جاتی تھی۔ کہا یہ گیا ہے کہ تم دیکھو تو سہی! ان کی کتنی آسائش کی زندگی تھی۔ ان کے پاس کتنی فراوانیاں ہیں۔ قرآن نے کہا کہ حضرت ہود♦ نے جو ان کے بھائی بندوں میں سے تھا، ان سے کہا کہ **وَآتَقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ - أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ. وَجَنَّتِ وَعُيُونٌ** <sup>2</sup> (26:132-134)۔

### انسانیت کے لیے سب سے بڑی نعمت اور دولت سمع و بصر ہے

عزیزانِ من! اس دور میں زیادہ سے زیادہ یہی چیز تھی: باغات، کھیتیاں، چشمے، پانی، مویشی، اتنی اچھی زراعت، پھر افرادی قوت بھی اتنی زیادہ۔ اس دور کے اندر کسی قوم کی مرفعہ الحالی کی یہی چیز ہوتی تھی۔ اتنا کچھ اتنی افراط سے، تمہیں خدا نے دے رکھا ہے۔ یہ ساری

<sup>1</sup> طرح طرح کے ساز و سامان (اور اسلحہ وغیرہ) بتاتی تھی (206:129) 'اونچی اونچی پہاڑیوں پر بڑے بڑے میموریل (یادگاریں) بناتے تھے (26:128)

<sup>2</sup> تم اس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو جس نے، جیسا کہ تم خود جانتے ہو، تمہیں سامانِ زیست کی اس قدر فراوانیاں عطا کر رکھی ہیں۔ مال مویشی کی کثرت، قبیلے کے افراد کی بہتات، لہلہاتے باغات، ان کی سیرابی کے لیے آبِ رواں کے چشمے (یہ سب خدا نے دے رکھے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بنیادی طور پر تمہاری پیدا کردہ ہو لیکن تم اس سامانِ زیست سے حاصل کردہ قوت کو دوسروں پر ظلم و استبداد کے لیے استعمال کرتے ہو۔ 26:130) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 848)۔

چیزیں تمہیں میسر ہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور بات بھی کہی کہ وہ قوم جاہل قوم نہیں تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَابْصَارًا وَافْتِدَاءً** <sup>①</sup> (46:26) علم و فن کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ انسان کی سماعت، بصارت اور قلب ہیں۔ قرآن نے جہاں بھی کسی قوم کا ذکر کیا ہے کہ وہ علم اور بصیرت میں ان چیزوں میں آگے تھی تو انہی الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ان کو یہ بڑی سہولتیں حاصل تھیں اور یہی سمع، بصر اور قلب کی قوتیں ہیں جو حقیقت میں انسان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ وہی ہے جسے آپ Perceptual knowledge (حسی علم) کہتے ہیں۔ یہ علم By Perception (حواس کے ذریعے سے) حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ انہیں ہم حواسِ خمسہ کہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان حواسِ خمسہ سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے باہر کی چیزوں کی کچھ معلومات آپ تک پہنچتی ہیں۔ مثلاً ٹھاہ کی آواز کان میں آتی ہے۔ وہ آواز آئی۔ اب وہ آواز تو ایک پٹانے کی سی آواز ہے۔ یہ آواز کیا کرتی ہے؟ یہ آواز ہمارے جو ذہن میں وہ جو سوچنے والی اندر قوت ہے اس تک پہنچتی ہے اور ہم تو شاید اتنا ہی کہہ سکیں کہ صاحب! بندوق کی آواز ہے، لیکن اسی کو جاننے والے تو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ بڑی بندوق ہے یا وہ چھوٹی ہے۔ اس آواز کے بعد ایک چیخ آتی ہے۔ چیخ بھی کان کے ذریعے آتی ہے۔ یہ چیزیں انسان کے ذہن تک پہنچتی ہیں اور ہمارا ذہن یہ کرتا ہے کہ اوہو یہ تو ہمارے بچے کی چیخ نظر آتی ہے۔ اسے کہتے ہیں Mind، فواد جو ذہن کے اندر فیصلہ کرنے کی ایک طاقت ہوتی ہے۔ بس یہ چیزیں ہیں جو قرآن کہتا ہے کہ جنہیں یہ حاصل ہوں اور وہ ان سے صحیح کام لیں، تو وہ اس مادی کائنات کو مسخر کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس قوم عاد کے متعلق کہا کہ انہیں یہ کچھ حاصل تھا، اس لیے انہی چشموں سے اسی زمین سے انہی باغات سے انہی کھیتوں سے اس نے اتنی بڑی توسیع حاصل کر لی تھی اس طرح وہ قوم پھیلی ہوئی تھی۔ اسی قوم کے لیے کہا کہ **وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ** <sup>②</sup> (29:38)۔ وہ دانایا و بینا قوم تھی، آنکھیں رکھتی تھی۔ ہر چیز کو دیکھتی بھالتی تھی یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کن الفاظ میں قرآن ان کا تعارف کر رہا ہے۔

خود نمائی کی ہوس کا نتیجہ قوموں کی تباہی کی شکل میں نکلتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم نے اس قوم عاد کے متعلق بتایا ہے کہ یہ وہی قوم ہے جس کے افراد **وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ** (26:129) اس قسم کے محلات بنایا کرتے تھے ایسے پختہ قلعے بنایا کرتے تھے جیسے انہوں نے قیامت تک انہی میں رہنا

① انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع..... سماعت، بصارت اور قلب..... حاصل تھے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-180)۔

② وہ لوگ اس قسم کام بر بنائے جہالت نہیں کرتے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھتے سوچتے اور دیکھتے بھالتے کرتے تھے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-918)۔

ہے۔ یہ برسرِ اقتدار اتنے مضبوط قلعے بنایا کرتے تھے۔ یہ قلعے ہی نہیں بناتے تھے قرآن کریم نے ایک بات اور بھی کہی ہے۔ اس میں پھر ہمارے لیے ایک چیز آگئی ہے۔ کہا ہے کہ اَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ اَيَّةً تَعْبَثُونَ (26:128)۔ وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں کے اوپر یادگاریں (Memorials) قائم کیا کرتے تھے جن کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ ایک لفظ ہے عزیزانِ من! جسمیں قومِ عاد کی کہانی بیان ہو رہی ہے، لیکن ہم سے کہا جا رہا ہے کیا تمہیں پتہ ہے کہ وہ کیا کیا کرتے تھے؟ وہ ایسی یادگاریں (میموریل) بنایا کرتے تھے کہ جن کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ ان قوموں میں اتنی ہوس تھی۔ یہ ان کو پورا کرنے کے لیے بے فائدہ بلند و بالا یادگاریں کھڑی کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ کوئی یونیورسٹی قائم کر دی جائے۔ یہ وہ بلند و بالا یادگاریں بناتے تھے جن کا انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ان پر اتنے کروڑ روپیہ لگا دیا۔ اگر اس رقم سے ہسپتال بنا دیا جائے تو اس سے انسانیت کو فائدہ پہنچے۔ اب اس کے اندر پہلی چیز یہ آئی جو قرآن نے کہی ہے کہ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمُكِّثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) یاد رکھو! یہ مٹی اور پتھر کی یادگاریں ہیں جو تم کہتے تھے کہ تخیل دون ہیں کہ ہم ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے ہمارا نام رہے گا۔ یہ نام مٹی اور پتھر کی یادگاروں سے نہیں رہتا۔ یہ اس سے رہتا ہے جو نفع الناس ہو یعنی اس چیز سے جو نفع انسانی کے لیے منفعت بخش ہے وہ یادگار ہمیشہ رہا کرتی ہے۔ پہلی چیز تو ان کی ذہنیت کی یہ بتائی کہ وہ قوم یہ کیا کرتی تھی۔ اب آئی وہ بات کہ معاشرے کے اندر وہ تفریق کیسی تھی انہوں نے وہ کیا کیا تھا اس قوم کا کیا نظام تھا؟ یہ بات (46:25) میں<sup>1</sup> کہی ہے۔ قرآن تو ایک دو الفاظ میں بات کہہ جاتا ہے۔

### آخر قومِ عاد کیوں تباہ ہوئی؟ لفظ جرم کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ قوم کیوں تباہ ہوئی؟ وہ قوم اس لیے تباہ ہوئی کہ وہ قوم الْمُجْرِمِينَ (46:25) تھی۔ اب ہمارے ہاں مجرم لفظ ہی کچھ اور ہو گیا ہوا ہے۔ یہ وہ ہے جسے ہم جرائم پیشہ کہتے ہیں اور عدالت کی رو سے مجرم کہتے ہیں وہ خود Keep to the left (بائیں چلو) اور right (دائیں چلو) والا ہی جرم کیوں نہ ہو ہمارے ہاں وہ جرم ہے۔ یعنی اس قانون کی خلاف ورزی کے لیے جو بات کی جائے وہ جرم ہے۔ ٹھیک ہے قانون کی خلاف ورزی ہے لیکن یہ تو عربوں کی زبان ہے۔ قرآن تو اس زبان کے اندر

<sup>1</sup> تَذَمَّرُ كُلُّ شَيْءٍ عَمَّ رَبِّهَا فَاصْبَحُوا لَا يَرَى إِلَّا مَسْكِنُهُمْ كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ (46:25) اس نے قانونِ خداوندی کے مطابق ہر شے اکھاڑ بھینکی اور چاروں طرف تباہی مچا دی چنانچہ اس ہستی کی حالت یہ ہو گئی کہ اس کے مکانات کے کھنڈرات باقی رہ گئے اور مکین سب ہلاک ہو گئے۔ اس طرح ہم مجرمین کو ان کے غلط اعمال کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (ان سے کہہ دو کہ اگر تم نے بھی اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا تو تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا) (پرویز: مفہوم القرآن ص 1180)۔

آیا ہے۔ ان عربوں سے پوچھو کہ آپ عربی زبان میں جرم کسے کہتے تھے مجرم کسے کہتے تھے؟ یہ تھا ”دوسروں کے ہاں کے درخت کے پھل کی شاخ کو اپنے ہاں لے جانا“۔ جرم کے معنی یہ ہوتے تھے۔ ”بھیڑوں کی اُون کو مونڈھ کر لے جانے والا مجرم ہے“۔ قرآن بات ساری کہہ گیا۔ اس Exploitation (سلب و نہب) کے لیے کوئی جامع لفظ نہیں ہو سکتا: ”مونڈھ لینے والا“ دوسروں کے ہاں کے پھل کے درخت کو کاٹ کر اپنے ہاں لے آنے والا“۔ یہ جرم ہے۔ عزیزانِ من! اس کی تفصیل کو پھیلاتے جائیے اور پھر دیکھتے چلے جائیے کہ جرائم کسے کہتے ہیں اور جب اس نے کہا ہے کہ وہ قوم البحر میں تھی تو اس کے معنی کیا تھے۔ یہ جرم تو آج دنیا میں کثرت سے پھیلا ہوا ہے۔

آج کی سیاست یہ ہے کہ کھیتی کوئی اور بوئے مگر اسے کاٹ کر کوئی اور لے جائے کھیت کسی اور کا ہو اور اس میں چرنے والے کسی اور کے جانور ہوں۔ یہ ہیں وہ افعال جنہیں جرائم کہا گیا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی کیفیت۔ اب یہ چیز ہے کہ جو دوسروں کے ہاں کی کھیتی کو فصل کو، محنت کو، جو Exploitation (سلب و نہب) کر سکتا ہے وہ مجرم ہے۔ قرآن حکیم نے اسے دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ جب کہا کہ پھر اس قوم کی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ **وَإِذَا بَطِشْتُمْ بَطِشْتُمْ جَبَّارِينَ** (26:130) اور جب ضعیفوں کمزوروں پر ہاتھ ڈالتے تھے تو ایسا ہاتھ ڈالتے تھے کہ ان کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قوم کے کیا جرائم گنائے جا رہے ہیں؟ ان کی طرف کیوں نبی ﷺ آ رہا ہے؟ میں کسی کی تحقیر نہیں کرنا چاہتا آج تو جرم یہی ہیں کہ جس کا پا جامہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہو گا وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ قرآن یہ جرم گنا رہا ہے کہ جب وہ کسی کو پکڑتے تھے کسی کے اوپر ہاتھ ڈالتے تھے تو اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے تھے۔ یہاں ”جبار“ کا لفظ قرآن نے ان کے لیے استعمال کیا ہے۔ یاد رکھیے! خدا کے لیے بھی یہ الفاظ آتے ہیں۔ المتکبر بھی آتا ہے جبار بھی آتا ہے۔ عزیز کا لفظ بھی اس کے لیے آتا ہے۔<sup>①</sup> جب کسی مظلوم کی حفاظت کے لیے یہ کیا جائے تو وہ خدائی صفت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دوسروں کے پھل توڑنے کے لیے دوسروں کی بھیڑوں کو مونڈھنے کے لیے جو کسی پہ ہاتھ ڈالتے تھے اتنی سختی سے ہاتھ ڈالتے تھے کہ ان کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے تھے۔

### صاحبِ اقتدار کے کردار کا قوم کی تمدنی زندگی پر اثر

عزیزانِ من! اب آگے قرآن کریم نے یہ بات بتائی کہ یہ اچھی بھلی قوم انسانوں کی قوم اس قسم کی کیسے بن جاتی ہے؟ یہ بڑی عجیب

① العزیز الجبار المکتبر (59:23) اسے ہر قسم کا غلبہ اور تسلط حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کی قوت رکھتا ہے (العزیز)۔ اس نے ہر شے کو اس طرح اپنے قانون کی جبار (کھڑپچوں Splints جن سے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو باندھا جاتا ہے تاکہ وہ جڑ جائیں) میں باندھ رکھا ہے کہ وہ اپنے مقام سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتیں اور اس طرح نظام کائنات میں ذرا خلل واقع نہیں ہوتا (الجبار) اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ عظمت و کبریائی سب اسی کے لیے ہے (ماخوذ: پرویز: ”مفہوم القرآن“ ص 1301)۔

چیز ہے کہ عقل و فکر کی حامل قوم کو آخر ہو کیا جاتا ہے؟ ارشادِ خداوندی ہے کہ یہ اس لیے ہو جاتا ہے کہ **وَ اتَّبِعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ** (11:59) جو اوپر کا اس قسم کا صاحبِ اقتدار طبقہ ہوتا ہے جو جابر یعنی ہڈیاں توڑنے والا طبقہ ہوتا ہے یہ افراد قوم اس کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ امر بھی یعنی جو اس کے جتنے بھی صاحبِ اقتدار احکام ہوتے ہیں ان کو ان کے احکام کی پیروی کرنا پڑتی ہے اور اس طرح ساری قوم ہی وہ کچھ بن جاتی ہے جو کچھ وہ ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! معاف رکھیے گا میں پھر عرض کر دوں کہ میں ہر ایک کے لیے نہیں کہنا چاہتا۔ یہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ عام انسانوں کے متعلق نہیں کہا کہ وہ نمازیں نہیں پڑھتے تھے روزے نہیں رکھتے تھے۔ یہ نہایت ضروری چیزیں ہیں اور یہ ایک نظام کے پروگرام کے اجزاء ہیں۔ خرابیاں یہ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

### المتکبر اور کبریائی کا حقیقی مقام

یہ یاد رکھیے کہ قرآن نے خدا کے متعلق جب یہ کہا ہے کہ وہ المتکبر ہے یعنی کبریائی اس کے لیے ہے تو وہ قوم جو خدا کی یہ صفت اپنے اندر پیدا کرتی ہے اس کے لیے بھی کبریائی ہوتی ہے لہذا مومن کے لیے **اَنْتُمْ الْاَعْلَوْنَ** (3:139) کہا ہے۔ لیکن اس کبریائی اور قوت کا جو استعمال تھا اس میں اختلاف ہوتا تھا۔ ایک سلب و نہب کرنے والا صاحبِ اقتدار طبقہ وہ ہوتا تھا جو ہر کمزور کی ہڈی توڑنے کے لیے تھا اور یوں کہیے کہ ان کے ہاں کا ایک صاحبِ اقتدار طبقہ وہ تھا جس کی کبریائی ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے تھی۔ اب دیکھیے کہ اس قوم کے متعلق کہا ہے کہ وہ جبار تھے اور جب ضعیفوں کمزوروں پر ہاتھ ڈالتے تھے تو ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ ان کے اوپر کے لیڈر اس قوم کے تھے۔ اس لیے یہی کچھ قوم ہو گئی تھی۔ کہا کہ اس کا جرم بتائیے۔ جواب دیا کہ **فَاَمَّا عَادُ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ** <sup>①</sup> (41:15)۔ یہاں وہی **فَاَسْتَكْبَرُوا** آیا ہے یعنی انہیں کبریائی حاصل تھی، قوت حاصل تھی لیکن پھر جرم کیا ہے؟ **الاعلون** جو تم مومن کو بھی کہتے ہو اور سب سے بڑی کبریائی خدا کو کہتے ہو تو اس کبریائی اور المتکبر میں فرق کیا تھا؟ اس کے لیے کہا کہ **فَاَسْتَكْبَرُوا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ** <sup>②</sup> (41:15)۔ تو فرق یہ ہو گیا کہ جب حق کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے مخالفین کی قوت روکنی پڑے اس میں جو قوت استعمال ہوتی ہے وہ خدائی قوت ہے یہ خدائی صفت ہے۔ اس کے برعکس مظلوم کی ہڈیاں توڑنے کے لیے جب وہی استکبار ہو تو وہ فرعونیت ہے ابلیسیت ہے غیر الحق ہے۔ اس طرح الحق کے ساتھ استکبار جرم نہیں، بغیر الحق جرم ہے۔ اور پھر کہا کہ **وَقَالُوا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً** <sup>③</sup> (41:15)۔ انکی کیفیت یہ تھی کہ جو بھی دوسرا ان کے سامنے آتا تھا اس کے لیے ان کے پاس نہ دلیل تھی نہ برہان وہ

① قوم عاد کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے ناحق تکبر اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1112)۔

② انہوں نے ناحق تکبر اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1112)۔

③ اور انہیں اس کا دُعا تھا کہ ان سے زیادہ طاقت ور کوئی نہیں (اس لیے جو جی میں آئے کر سکتے ہیں انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں)

کہتے تھے کہ او! تم جانتے نہیں ہو کہ ہماری قوت کتنی زیادہ ہے۔ قوت کی بات تو آگے آئے گی لیکن قرآن ان کو یہیں کاٹ کے رکھ دیتا ہے کہ **أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً** (41:15) انہوں نے اس پر غور ہی نہ کیا کہ وہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا، ان سے کہیں زیادہ قوتوں کا مالک ہے۔ یہ نبی ﷖ آیا۔ اس نے ان کو بہت کچھ بتانے کے لیے بڑی محنت کی، جان لڑادی کہ وہ یہ مانیں، اس کے پیغام کی تکذیب کی۔ ہوتا یہ ہے کہ نبی کا دل دوسروں کی تباہی پر کڑھتا ہے، لیکن جو خود کشی پہ ہی تلا ہوا ہو، اس کو کون بچا سکتا ہے۔ پھر ہوا کیا؟ قرآن نے ابھی ابھی کہا تھا کہ ان کو سمع، بصر، سماعت، بصارت اور فؤاد، شعور اور عقل و فکر سب کچھ حاصل تھا، لیکن کہا یہ کہ ان کے غلط نظام کے انجام میں جب اس قوم پر تباہی آئی تو اس وقت **فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ** (46:26) ان کی غلط کوشیوں کا انجام اور نتائج تخریب کی صورت میں سامنے آئے اور تباہیاں ابھر کر آ گئیں تو گو وہ بڑی عقلمند قوم تھی، بڑی علم والی قوم تھی، بڑی ہنر والی قوم تھی، مگر ان کی سمع، بصارت اور قلب ان کے کسی کام نہ آیا۔ غلط نظام کا انجام یہ نہیں ہوتا کہ جو قوم جاہل ہوتی ہے وہ اُسی کو تباہ کرتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ قوم تو عقل و فکر کی بلندیوں پہ پہنچی ہوئی ہوتی ہے مگر غلط نظام کا انجام اس کو بھی تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہاں کہا کہ انہیں یہ چیزیں کچھ کام نہ دے سکیں۔ یہاں **فَمَا أَغْنَى** (46:26) آیا ہے کہ یہ کچھ کام نہ دے سکیں۔ جب انہوں نے صحیح نظام کی مخالفت کی، غلط نظام کے بھروسے پہ دنیا کے کمزوروں پہ، ضعیفوں پہ، زندگی تنگ کر دی، تو اس کے بعد وہ ان غریبوں کی جس چیز کا مذاق اڑیا کرتے تھے انہی نے انکو آ کر دبوچ لیا اور ایسا دبوچا کہ ان کی عقل و دانش اور فہم و فراست ان کے کسی کام نہ آئی۔ یہ وہ قوم تھی جو صحیح قوانین خداوندی کی تکفیر کیا کرتی تھی۔ اس کی جڑ کٹ گئی اور دوسری جگہ ہے کہ پھر ان کی کہانیاں اور داستانیں ہی بس رہ گئیں، قوم ختم ہو گئی۔ اب یہ دوسری چیز ہمارے سامنے آ گئی۔ دوسرا نبی ﷖ آتا ہے۔ وہ اس تفریق کو مٹانے کے لیے آتا ہے۔ کمزور اور طاقتور کی تفریق میں وہ کمزور خود کوئی پیدا نشی کمزور نہیں ہوتے، پہلے ان کو کمزور کیا جاتا ہے اور کمزور ہونے کے بعد پھر یہ دو طبقے ہو جاتے ہیں: اوپر کا طبقہ، صاحب اقتدار اور صاحب قوت۔ وہاں صرف دولت کی بات کے ساتھ قوت کی بات کہی ہے اور دوسرا نیچے کا طبقہ جسے کمزور کر دیا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! بات یہ چلی آرہی تھی کہ **وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالْآخِرَةُ وَاتَّرفَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ** (23:33) اُس کی قوم کے اکابرین نے، جنہوں نے قوانین خداوندی سے انکار اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی، جو خدا کے قانونِ مکافات اور مستقبل کی زندگی کے قائل نہیں تھے، اور جنہیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں اور وہ دیکھتے تھے کہ نظام خداوندی کی زدان کے ذاتی مفادات پر پڑے گی،



مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص جو خدا کا پیغام بر ہونے کا مدعی ہے تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ یہ بھی وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو۔ وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ یہ تم سے کس حیثیت سے ممتاز ہے جو تم اس کی بات مانو!۔ عزیزان من! یہ طبقہ عوام کے جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ یہ بات ذرا لمبی ہے۔ اسے ہم اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ آج وقت ہو گیا۔ ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 33 تک آگئے ہیں۔ آیت 34 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



## آٹھواں باب: سورة المؤمنون (34 تا 43)



عزیزانِ من! آج جون 1977ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 34 سے ہو رہا ہے:

(23:34) -

گزشتہ سے پیوستہ

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ موضوعِ سخن قرآنِ کریم کا وہ بنیادی نکتہ ہے کہ آسمانی سلسلہِ رشد و ہدایت کی ضرورت کیوں پیش آئی، حضراتِ انبیائے کرام ♦ کو کیوں بھیجا گیا، ان سے مقصد کیا تھا؟ قرآنِ کریم میں یہ بتایا گیا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213; 10:19) نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری تھی، ایک امتِ واحدہ تھی فَاخْتَلَفُوا (10:19) انہوں نے آپس میں اختلافات پیدا کر لیے، آپس میں کچھ تقسیم پیدا کر لی۔ اس کے لیے فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ (2:213) اللہ

تعالیٰ نے پھر انبیائے کرامؑ کو بھیجا اور انہیں بتایا کہ یہ جو تمہارا فرض زندگی ہے، جس میں تم میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، طبقات پیدا ہو گئے ہیں، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا اور اگر تم ایک برادری بن جاؤ گے تو پھر تمہاری زندگی بڑی خوشگوار یوں اور سرفراز یوں کی حامل ہو جائے گی۔ وہ صرف یہ وعظ کہنے کے لیے نہیں آتے تھے بلکہ ایک عملی نظام قائم کرتے تھے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (2:213)** اور ان کے ساتھ ایک ضابطہ ہدایت، ایک ضابطہ قوانین آتا تھا تاکہ وہ اس کے ذریعے ان اختلافات کو مٹائیں جو انسانوں میں پیدا ہو چکے تھے۔

میں نے کہا ہے کہ یہاں اس (2:213) آیت میں لفظ **يَحْكُمُ** آیا ہے۔ یہ حکم کی بات ہے، یہ حکومت کی چیز ہے، مذہب میں وعظ و نصیحت تھی۔ ان کے معاشرے کے اندر جتنے اختلافات، جتنی اونچ نیچ پیدا ہو گئی تھی اُسے مٹانے کے لیے انہیں امت واحدہ بنانا مقصد تھا۔ قرآن کریم نے یہ مقصد بتایا ہے۔ اس لیے انبیائے کرام کے بھیجنے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ یہ جو انسانوں نے تفریق پیدا کر لی تھی، اس کا مٹانا تہا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں تھا۔ باہمی مفادات کی علیحدگی سے یہ تفریق پیدا ہوتی تھی کیونکہ ہر طبقہ، ہر فرقہ، ہر گروہ، ہر برادری، ہر خاندان، ہر قبیلہ، اپنا اپنا مفاد پیش نظر رکھتا تھا۔ اس لیے جب یہ مختلف گروہوں میں بٹے تو ان کے مفادات میں تصادم ہوا۔ انسان کی عقل کا فریضہ یہ ہے کہ یہ اس کی عقل ہے، جو اس کے اپنے مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے، دوسروں کے مفاد کا تحفظ نہیں۔ اگر وہی افراد ایک گروہ بن جاتے ہیں تو وہی عقل ایک گروہ کی ہو جاتی ہے۔ وہ جو ایک گروہ کی عقل ہوتی ہے، وہی اس کی سیاست ہوتی ہے۔ پھر اس کا ٹکراؤ دوسرے گروہ کی عقل کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کو جو عقل دی ہے، اس کا فریضہ بھی اپنے ہی مفاد کا تحفظ ہے۔ اگر دوسرے سے ٹکراؤ ہے تو وہ اس ٹکراؤ، اس تصادم اور اس تفریق کو کیسے مٹا سکتی ہے؟ اس کے لیے انسانی فکر اور عقل سے ماورا کوئی سرچشمہ ہونا چاہیے جو اس قسم کی Directions (ہدایت) احکام و قوانین دے جو تمام نوع انسانی کے مفاد کو یکساں طور پر دیکھے اور ان کی حفاظت کرے۔ یہی فرق ہے عقل انسانی میں اور وحی خداوندی میں۔ خدا تمام انسانیت کے لیے رب العلمین ہے۔ وہ کسی ایک فرد، گروہ، قبیلے، قوم، نسل، کارب نہیں ہے۔ قرآن کریم سے ربوبیت عالمینی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لیے بہتری وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی تھی، اسی لیے قرآن کریم نے انبیائے گزشتہ اور اہم سابقہ کی داستانیں ہمارے سامنے پیش کیں۔ ان میں نمایاں طور پر یہی بات بتائی گئی کہ جس زمانے میں بھی کوئی نبی آیا، وہ معاشرے میں تفریق کو مٹانے کے لیے ہی آیا۔

عزیزانِ من! یوں تو تفریقات کی مختلف قسمیں ہوں گی لیکن جو اس دور کی سب سے نمایاں تفریق تھی، اس کو قرآن سامنے لاتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ اس نبی ♦ نے اسے کس طرح بنایا۔ قرآن اس زمانے کی رکھی گئی تفریق کی پہلی بنیاد سب سے پہلے حضرت نوحؑ سے شروع کرتا ہے۔ وہ نسلی تفریق ہے۔ جب یہ بیٹا، میرا بیٹا ہوا، تو اب اس بیٹے سے بات آگے بڑھی ہے اور اس سے ایک خاندان بنا اور پھر

اس سے ایک قبیلہ بنا۔ ان افراد میں اشتراک کیا ہے؟ صرف یہ کہ یہ تمام کسی ایک مورث اعلیٰ کی اولاد ہیں۔ اگر یہ اس سے ذرا اونچا چلے جاتے تو تفریق ہی کوئی نہیں تھی۔ وہ جس ایک باپ یا جد امجد کی اولاد کہتے ہیں، وہ بھی تو کسی کا بیٹا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ اپنی تفریق کے لیے یہ بات کہیں سے بھی شروع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اگر آپ ذرا اونچا چلے جائیں تو یہ جو پہلے انسان تھے جو پہلے یہاں امت واحدہ تھی ان میں تو یہ کوئی نسلی امتیاز نہیں تھا۔ یہ پہلا امتیاز نسلی تھا۔ یہاں سے قرآن نے ابتدا کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح ﷺ سے یہ کہا کہ طوفان آنے والا ہے کشتی بناؤ اس کے ذریعے تم محفوظ ہو جاؤ گے، ہم تمہیں اور تمہارے اہل کو محفوظ رکھیں گے۔ اب حضرت نوح ﷺ نے دیکھا کہ ان کا حقیقی بیٹا ان کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ وہ سرکشی برتنا تھا۔ جب یہ کشتی میں سوار ہوئے وہ اُدھر کھڑا تھا۔ انہوں نے آواز دی کہ آؤ، تم بھی کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ نہیں میں تمہارے ساتھ نہیں آتا، میں اپنا انتظام آپ کر لوں گا۔ میں بات مختصر کرتا ہوں۔

### وحدتِ انسانیت کے اعتبار سے خونی رشتہ کوئی رشتہ نہیں ہوتا

قرآن نے بات سمجھانے کے لیے ہمیں یہ بتایا کہ حضرت نوح ﷺ نے کہا کہ یا اللہ! جرأتِ عرض معاف ہو تو یہ گزارش کروں: آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تیرے اہل کو بچا لوں گا، بیٹے سے زیادہ قریب اہل اور کون ہو سکتا ہے؟ یہ کیوں غرق ہو گیا؟ تیرے وعدے تو سچے ہوا کرتے ہیں۔ کہا کہ بات یہ ہے کہ ہمارے وعدے سچے ہوتے ہیں، تمہاری سمجھ کا ذرا سا پھیر ہے۔ تم نے اپنے بیٹے کو نسل کے اعتبار سے اپنا اہل سمجھا ہے۔ ہمارے معیار کے مطابق یہ اہل نہیں ہوتے بلکہ تمہارے اہل وہ تھے جو ایمان میں تمہارے ساتھ شامل تھے۔ جب وہ ایمان میں مشترک نہیں ہیں تو وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہیں۔ تمدنی اعتبار سے، معاشرے کے اعتبار سے، تم اپنے تعلقات رکھو جیسے ہوتے ہیں لیکن جب یہ وحدتِ انسانیت عالمگیر انسانیت کی برادری کی تشکیل کا وقت آئے گا تو وہاں یہ صورت نہیں ہوگی کہ ”یہ میرا بیٹا ہے“ یہ اُس کا بیٹا ہے۔ اس میں تو یہ دیکھا جائے گا کہ ایمان میں، آئیڈیالوجی میں، مشترک کون ہے۔

قرآن نے پہلے ہی نبی ﷺ کو پہلی بات یہ کہدی جسے آج آپ اتنا بڑا اہم مسئلہ بنا رہے ہیں کہ قرآن میں معیارِ قومیت کیا ہے؟ معیارِ قومیت تو قرآن نے حضرت نوح ﷺ اور اس کے بیٹے کے تعلق میں بتا دیا۔ بیٹا اس قوم میں سے نہیں ہو سکتا جس قوم میں حضرت نوح ﷺ تھے۔ دوسرے کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ تو وطنی اعتبار سے قومیت بناتے ہیں، جغرافیائی اعتبار سے بناتے ہیں۔ وہ تو اس گھر میں رہتا تھا، ملک تو ایک طرف رہا۔ آپ زبان کے اعتبار سے قومیت بناتے ہیں۔ باپ بیٹے کی تو زبان بھی ایک تھی۔ آپ نسل کے اعتبار سے قومیت بناتے ہیں، یہی چیز حضرت نوح ﷺ کے ذہن میں آئی کہ ”میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے“، لیکن وحی خداوندی نے یہ تمام معیار کاٹ

کر رکھ دیئے۔ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ معیار قومیت یہ ہے: **فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي** <sup>①</sup> (14:36)۔ حضرت ابراہیم ؑ نے یہ کہا تھا کہ خدا کی راہ میں جو میرے نقش قدم پہ چلتا ہے، وہ میرا ہے، جو یہاں اس نہیں چلتا وہ میرا نہیں۔ ہمیں اس سے واسطہ کیا ہے جو تجھ سے نا آشنا رہنا چاہے۔ قومیت کی پہلی بنیادی اینٹ یہاں سے رکھی گئی۔ یہ وہی ہے جو کہا ہے کہ ہم نے انبیاء کو اس لیے بھیجا تھا کہ اختلاف کو مٹائیں۔

### تقسیم کاری کی بنیاد پر قومیت کا تصور اور طبقاتی تفریق خلاف قرآن ہے

حضرت نوح ؑ کے قصے میں دوسرا اختلاف یہ ہے کہ معاشرے میں مختلف کام مختلف لوگوں نے کرنے ہوتے ہیں۔ اب یہ کوئی دھوبی ہے، کوئی موچی ہے، کوئی لوہار ہے، کوئی ترکھان ہے، کوئی کنجڑا ہے، کوئی سبزی بیچتا ہے، اور ان کے اندر یہ سرداران قوم ہیں، جو کچھ نہیں کرتے اور چودھری بنے ہوئے ہیں۔ بات تقسیم کاری تھی۔ انہوں نے اس بنا پر طبقات پیدا کر لیے تھے۔ یہ جو کام کرنے والے تھے، یہ کام کرنے کے اعتبار سے کمی ہو گئے۔ یعنی کام کرن والے تے کمی ہو گئے، فیروہدے بعد کمین ہو گئے <sup>②</sup>۔ اب یہ ایک ایسی مستقل تفریق پیدا ہوئی کہ آج تک چلی آرہی ہے۔

ان کے ہاں برادریاں کہتے ہیں۔ یہ پیشوں کے اعتبار سے تفریق کرتے ہیں۔ آج بھی یہ ہے کہ اودھوبی ہوندا اے۔ اوکڑا دھوندا ہیگا۔ دھوبی ہے۔ اوتیری بیوی کپڑے دھوندا۔ اے دھوبن ہو جانگی ہیگی اے۔ <sup>③</sup> ذہن انسانی کس طرح تفریق پیدا کرتا ہے! اس معاشرے میں یہ دوسری تفریق تھی۔ ان مخالفین نے حضرت نوح ؑ پر اعتراض ہی یہ کیا کہ جو بات تم کہتے ہو کہ بھی! ہم تو اس پہ آنے کو تیار ہیں لیکن اس کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اور ہمارے یہ کمی، اے دوویں برابر ایک جگہ تے بیہ جان گے۔ <sup>④</sup> طبقات کی تقسیم کی بنیاد پر یہ ہے ذہنیت انسان۔ حضرت نوح ؑ نے کہا کہ پھر تمہاری خاطر میں یہ تقسیم نہیں کر سکتا۔ یہاں اسلام میں تو یہ ہے کہ ”تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے“ <sup>⑤</sup> تمہاری خاطر میں ان کو دھتکار نہیں سکتا۔ اس طرح یہ تفریق مٹ گئی۔ پہلے نبی کا قصہ دیکھ رہے ہیں آپ! کہ کاہے کے لیے نبی ؑ آتے تھے اور قرآن کیا بتاتا ہے کہ وہ آکر کرتے کیا تھے۔

① میرا ”اپنا“ وہ ہوگا جو اس مسلک کا اتباع کرے گا جس پر میں چلتا ہوں (پرویز: مفہوم القرآن ص 575)۔

② یعنی کام کرنے والے ”کامی“ کی ہو گئے اور پھر وہ ”کمی“ سے ”کمین“ ہو گئے۔

③ وہ دھوبی ہوتا ہے یہ کپڑے دھونے والا دھوبی ہے ارے تمہاری بیوی کپڑے دھوتی ہے یہ دھوبن بن جاتی ہے۔

④ ہم اور ہمارے یہ ”کمی“ یہ دونوں برابری کی بنیاد پہ ایک ہی جگہ بیٹھیں گے۔

⑤ بندہ و صاحب محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے (اقبال: شکوہ)

## قوم عاد میں حاکم اور محکوم کی تفریق

عزیزانِ من! حضرت نوح ♦ کے بعد قرآن نے قوم عاد میں حاکم اور محکوم کی تفریق کا ذکر کیا: ارے ایک ہی قوم کے اندر یہ تفریق؟ کیا یہ بھی کوئی تقسیمِ کار ہے؟ حقیقت میں کچھ لوگوں کے ذمے جو کام لگا دیا گیا، وہ تو یہ تھا کہ وہ بہ ہیئتِ مجموعی ملک و قوم کا کچھ انتظام کیا کریں۔ اب انتظام کرنے والے نے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اختیارات کا مطلب اقتدار ہو گیا۔ اقتدار کے معنی طاقت ہو گئے۔ اور پھر طاقت کے معنی حاکم ہو گئے اور جو وہ حاکم ہوئے تو وہ دوسرا محکوم ہو گا یعنی کوئی تو حاکم بنے گا۔ باقی محکوم ہو گئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تفریق ہے کیا؟ صرف یہ کہ انتظامی امور جس کے سپرد کیے وہ حاکم ہو گیا۔ حاکم ہو کر سر پہ بیٹھ گیا۔ حاکم تو بہت تھوڑے سے ہوتے ہیں۔ جن میں جرات نہیں ہوتی، وہ محکوم۔ ہم کس بے تکلفی سے یہ بات کہتے ہیں کہ عوام نے یہ سب کچھ کیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ ان کو عوام قرار دینے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ یہ کہ خود خاص بننا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ عوام ہیں، تو وہ خواص ہیں۔ قرآن حکیم نے قوم عاد کے اندر حاکم اور محکوم کی تفریق کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو کچھ تفریق نہیں۔ یہ تو انتظامی امور ہیں۔ گھر کا سافٹشہ سامنے رکھو۔ یہ تو تمہارے لیے تقسیمِ کار ہے۔ یہ تو مہاداریاں ہیں۔ یعنی یہ کہ تم ایسا کرو۔ یہ وہی کچھ ہے جسے تم آج حکومت کہتے ہو۔ وحی نے تو یہ تفریق بھی مٹا دی۔

## قومِ ثمود کا ذکر: گلہ بانی کی بنا پر باہمی تفریق یعنی ایک زمیندار دوسرا مزارع

عزیزانِ من! اب آگے آتی ہے قومِ ثمود۔ یہ وہ دور ہے جب معیشت کا معیار گلہ بانی پہ تھا۔ پہلے دور میں مویشی پالنا گلہ بانی تھی۔ یہ بہت پہلے دور کی چیز تھی۔ اس گلہ بانی میں مویشی بڑی قیمتی متاع ہوتے تھے۔ جس کے پاس یہ زیادہ ہوتے تھے وہ وہاں کا سردار ہو جاتا تھا۔ جس کے پاس یہ کم ہوتے تھے وہ غریب رہ جاتا تھا۔

اب جس کے پاس یہ مویشی زیادہ ہیں اس کے مویشیوں کے لیے چراگاہوں کی، چشموں کی، پانی کی، ضرورت زیادہ ہے۔ اب وہ اس پر لکیریں کھینچ لیتے ہیں کہ یہ میری زمین ہے، یہ میری چراگاہ، یہ میرے چشمے ہیں، ان میں ان کے مویشی نہیں آسکتے، ان کی بھیڑیں یہاں سے پانی نہیں پی سکتیں۔ یہ ہے جو قومِ ثمود ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ تفریق زمین کی بنا پہ ہوئی: ایک زمیندار ہو گیا، دوسرے کو اس کا مزارع کہہ لیجیے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق پہلے دن سے ہے۔ جس نے ایک غلط اینٹ رکھی ہے کس طرح وہ آج تک چلی آرہی ہے۔ سارے ادوار گزرتے چلے جا رہے ہیں مگر زمیندار اور مزارعوں کی تفریق یا جو کمی ہوتا ہے اس کی تفریق، آج بھی اسی طرح سے باقی ہے۔ اسی لیے تو قرآن میں آیا ہے کہ شیطان نے ایک ہی بات تو خدا سے کہی تھی کہ مجھے اس طرح دھنکارا تو گیا ہے لیکن اب ذرا تماشا دیکھنا، اس حضرت آدم کی حالت میں کیا بناتا ہوں۔ اس کو یہاں تنگی کا ناچ نچا دوں گا، جس کی خاطر یہ کچھ کیا گیا ہے۔ میں آپ سے صرف ایک

بات کہتا ہوں، آپ رب العزت ہیں، صاحب اقتدار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب میرا ہاتھ اس کی گردن پر ہوا اور آپ عین اس وقت میرا ٹیٹوا دبا دیں۔ یہ تو برابر کی لڑائی نہیں ہوگی۔ آپ درمیان میں دخل نہ دیجیے گا اور اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ جب تک آدم اس کرہ ارض پہ رہے اس وقت تک میں بھی رہوں۔ لہذا اگر یہ ہے تو ٹھیک ہے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ لیں کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ حضرت نوحؑ کے دور میں بھی ابلیس موجود تھا اور آج بھی ابلیس موجود ہے؟ سچ کہا تھا مفسرِ قرآن اقبالؒ (1877-1938) نے:

اگرچہ پیر ہے آدمؑ جواں ہیں لات و منات <sup>①</sup>

حضرت نوحؑ کے زمانے <sup>②</sup> کی تفریق آج بھی موجود ہے اور حاکم اور محکوم کی شکل میں قومِ شمود <sup>③</sup> کی تفریق، نیز زمیندار اور مزارع کی تفریق آج ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآن کریم ان کے متعلق یہ بتا رہا ہے کہ حضرت صالحؑ اس قوم کی طرف آئے تھے (47:45)۔

غلط نظام کے اندر ہر قسم کا مادی سہارا تباہ ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! میں بات یہیں سے شروع کرتا ہوں جو حضرت صالحؑ نے کہا تھا کہ اَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَلُكْنَا امِينِينَ . فِي جَنَّتٍ وَعُيُونٍ . وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ . وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَرِهِينَ (26:146-149) یہ میں جانتا ہوں کہ یہ بڑے بڑے چشمے تمہارے پاس ہیں، چراگاہیں تمہارے پاس ہیں، باغات تمہارے ہیں، کھیتیاں تمہاری ہیں، پہاڑوں کے اندر پتھروں کو تراش کر تم اتنے محکم اور مضبوط محلات و قلعے بناتے ہو، اپنے ذہن میں تم سمجھتے ہو کہ ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور بڑی حفاظت کا سامنا بھی اپنا کر لیتے ہو۔ یہ ٹھیک ہے طبعی طور پر تم نے یہ سب کچھ کر لیا ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جو قوم غلط نظام کی پیروی کا رہے، وہ اس سے بھی زیادہ سامانِ خوشحالی اور سامانِ زینت کو لے کر ڈوب جایا کرتی ہے۔ بات تو نظام پہ ہے۔ جو نظام تم نے چلا رکھا ہے

① بدل کے بھیں پھر آتے ہیں ہر زمانے میں اگرچہ پیر ہے آدمؑ جواں ہیں لات و منات (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

② تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا زمانہ قریب 5000 ق م کا ہے۔ (پرویز: جوئے نور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور 1994ء، ص 2) نیز اس کتاب (مطالب القرآن فی دروس الفرقان) کا باب چھٹا، ص 136 کا فٹ نوٹ دیکھیے

③ اُم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) شمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عادی اولیٰ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیِ قرٰی کہتے تھے۔ حجران کا دار الحکومت تھا جو اس قدیم راستہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادیِ قرٰی کے گرد و پیش کا میدان بڑا سرسبز و شاداب ہے لیکن آتش فشاں مادے سے لبریز۔ قرآن کریم نے اس قوم کو عادی کا جانشین بتایا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے پیشتر ان کی تباہی ہو چکی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار ق م سے لے کر 1600 ق م تک کا ہے۔ قوم عادی کی طرح یہ لوگ بھی میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے، جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے (7:74; 15:82) (حوالہ پرویز: جوئے نور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 1994ء، ص 69-68)۔

اس کا نتیجہ تمہاری تباہی ہوگا۔ نہ یہ باغات، یہ کھیتیاں، یہ چراہ گاہیں اور یہ چشمے تمہارے پاس رہیں گے نہ یہ محلات اور تمہارے یہ قلعے تمہارے پاس رہیں گے۔ یاد رکھو! تمہاری صرف داستانیں باقی رہ جائیں گی۔ قوم سے کہا کہ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ<sup>①</sup> (26:151)۔ اس سے نظر آتا ہے کہ انہوں نے حد سے تجاوز کرنے والے ان لوگوں سے کہا کہ یاد رکھو! یہ وہ لوگ ہیں جو مسرفین ہیں، جن کی اطاعت تم کر رہے ہو۔

یہ بات بڑی عجیب سی ہے۔ ہمارے ہاں تو عام طور پر فضول خرچ کو اسراف کہتے ہیں اگر اس کا یہ ترجمہ کیا جائے کہ یہ جو فضول خرچ لوگ ہیں، ان کی اطاعت نہ کرو۔ ان سے کہا جائے گا کہ صاحب! ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ فضول خرچ ہیں یا پیسہ سنبھال کر رکھتے ہیں۔ فضول خرچ ہیں تو اپنی دولت ہے جسے اڑاتے ہیں۔ اسراف کے یہ معنی نہیں ہوتے۔ Originally (اصلاً) اسراف ہوتا ہے: ”کنویں سے پانی نکالنا“۔ Irrigation (آبیاشی) کیلئے نالیاں بناتے ہیں۔ پنجابی آج ساڈے آڈ کینڈے نے اونوں۔ آڈاں بناؤندے نیں<sup>②</sup> ان سے یہ پانی بہتا ہوا جاتا ہے۔ جس کھیت تک یہ جانا ہوتا ہے، وہاں تک وہ چلا جاتا ہے۔ اسی سے جا کر یہ کھیت سیراب ہوتا ہے۔ اگر راستے میں نالی یا آڈ میں ادھر ادھر کہیں شگاف ہو جائیں تو وہ پانی ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ جہاں اس کو پہنچنا ہوتا ہے، وہ وہاں نہیں پہنچتا۔ یعنی اس طرح جو پانی راستے میں ہی بہہ جائے اور کھیت تک نہ پہنچے اسے اسراف کہتے ہیں یا کوئی اس پانی کو راستے میں ہی اونوں وڈ کے اپنی کھیتی ول لے جائے اسے اسراف کہتے ہیں<sup>③</sup>۔

یہ راستے میں ہی کاٹ کر اپنے کھیتوں میں لے جاتے ہیں اور تم ہو کہ ان کی اطاعت کرتے ہو۔ کیا بات ہے، عزیزانِ من! ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ تمہارا ہمدرد ہو، مشفق ہو، مہربان ہو، اُسے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس کھیت کو پانی کی زیادہ ضرورت ہے، یہ اسے وہاں تک خود پہنچائے لیکن ان کی کیفیت تو یہ ہے جو قرآن نے بتائی ہے کہ مُسْرِفِينَ. الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ<sup>④</sup> (26:151-152)۔ اس کا نام فساد فی الارض ہے۔ ہمارے ہاں تو فساد ”ڈنگا فساد“ کو ہی کہتے ہیں۔ اصل فساد تو یہ ہے۔ اس کے مقابلے میں اسی آیت میں ”اصلاح“ کا لفظ آیا ہے۔ اصلاح کا مادہ ص ل ح ہے۔ صلح کے معنی ہوتا ہے ”ہمواریاں“۔ صلح کے معنی ہوتا ہے ہمواری پیدا کر دینا۔ اس آیت میں آیا ہے کہ وَلَا يُصْلِحُونَ (26:152) یعنی یہ جو ناہمواری پیدا کرنے والے ہیں، ان کی کیفیت یہ

① اور اپنے لیڈروں کا کہامت مانو جو عدل و انصاف کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 850)۔

② ہمارے ہاں اسے پنجابی میں ”آڈ“ کہتے ہیں۔ وہ یہ ”آڈیں“ بناتے ہیں۔

③ یا کوئی اس پانی کو راستے میں ہی اس ”آڈ“ کو کاٹ کر اپنے ہی کھیت کی سیرابی کے لیے لے جائے تو اسے ”اسراف“ کہتے ہیں۔

④ عدل و انصاف کی حدود سے تجاوز کر کے ملک میں ناہمواریاں پھیلاتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 850)۔



ہے کہ ”تمہیں جو پانی پہنچنا چاہیے تھا“ تم اسے وہاں تک نہیں پہنچنے دیتے، راستے میں ہی روک کر کاٹ کر اپنے کھیتوں میں لے جاتے ہو۔ ان کی تو یہ کیفیت ہے جبکہ دعویٰ تم ان کی اطاعت کا کرتے ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نبی ﷺ کیا کہنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ حکومت اس کا کیا جواب دیتی یا جو بڑے تھے وہ اس کا کیا جواب دیتے۔ عزیزانِ من! اس دور میں بھی اس کا کوئی جواب بن نہیں سکا۔ دیکھیے قرآن حکیم نے اس سلسلہ میں کہا ہے کہ **قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ** (26:153) انہوں نے کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ میں ابھی بتاؤنگا کہ نبی ہمیشہ قوم کے اونچے گھرانے کا فرد ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے آیت <sup>1</sup> ہے اور بڑی عجیب آیت ہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ تمہیں تو چاہیے تھا کہ تم ہم میں سے ہوتے، بڑے گھرانے کے آدمی ہو۔ ہمارے اس معاشی نظام کو اور زیادہ مضبوط کرتے لیکن تم خود ہی اس کی جڑ کاٹنے لگے ہو اور جو کچھ کر رہے ہو وہ سوائے اس کے کہ کوئی پاگل ہے جو اس قسم کا کام کر رہا ہے۔ ہم تو نہیں سمجھ سکتے۔ ”اس منڈے نوں کہو: او تیری کی مت ماری گئی اے کی کرنا بیایاں؟ قرآن کے کیا الفاظ ہیں! تہاڈی کی مت ماری گئی!“ <sup>2</sup> ان مزارعوں کو کیا سکھارہے ہو ان غریبوں کو کیا پٹی پڑھا رہے ہو پاگل ہو گئے ہو۔ ظاہر ہے نبی کی اس بات پر انہوں نے لیک کہا ہوگا۔

معاشرے میں یہ کمزور اور غریب سرمایہ داروں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں

عزیزانِ من! یہ بات ٹھیک ہے کہ جن کے حق میں یہ کہا جا رہا تھا کہ ساری محنت تم کرتے ہو صبح سے شام تک خون پسینہ ایک کر دیتے ہو سال بھر کے بعد جو تم پیدا کرتے ہو یہ گھروں میں بیٹھے ہوئے اس کا آدھا اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ارے! یہ اٹھا کر کیوں لے جاتے ہیں؟ ان کے مقابلے میں ان کی کمزوری کی وجہ یہی تھی۔ یہ نہیں تھی کہ یہ محنت نہیں کرتے تھے۔ محنت تو وہ کرتے تھے۔ دراصل انہیں کمزور کر دیا گیا تھا۔ قرآن کی کیا بات ہے! کہا کہ **قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ** (7:75) اس پر اس قوم کے سرکش اکابرین نے، جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدست کر رکھا تھا، جماعتِ مومنین سے کہا۔ یہاں **الذين** کے الفاظ آئے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن ان کے لیے **الملا** یعنی سردار کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ وہی ہے جو میں نے پنجابی میں کہا: جناں دیاں کوٹھیاں

<sup>1</sup> یہ آیت یوں ہے: **قَالُوا يَصْلِحْ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ** (11:62)۔ انہوں نے کہا کہ اے صالح! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں (کہ تم اپنے بزرگوں کے سچے جانشین بنو گے اور ہمارے معبودوں کا بول بالا کرو گے۔ اپنی قابلیت سے اس مذہب کو دور دور تک پھیلاؤ گے۔ لیکن تم نے اب ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے ہماری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تم ذرا سوچو تو سہی کہ تم ہم سے کیا کہہ رہے ہو؟) تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ ہم انہیں اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ہمیں تو اس کی صداقت میں بڑا ہی شک ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے دل میں بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے (کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے) (پرویز: مفہوم القرآن ص 806-805)۔

<sup>2</sup> اس لڑکے کو صاف صاف کہہ دو: اے! تمہاری سمجھ پہ پردہ پڑ گیا ہے۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ قرآن کے کیا خوب الفاظ ہیں! تمہاری عقل پہ کیا ہی پردہ پڑا ہے!

دانے نال بھریاں ہوئیاں ہوں۔ الملاء سردار جنناں دے پاڈے بھرے ہوئے ہوں۔ بھرے ہوئے داناں دی کوٹھیاں تو انہی کی ہو سکتی ہیں۔<sup>1</sup> قرآن نے ”اسکبروا“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ کہا ہے کہ یہ جوان کا استکبار ہے یا تکبر ہے، یہ رعونت تھی، فرعونیت تھی۔ یہ کس بنا پہ تھی؟ اس لیے کہ ”کوٹھیاں دانے نال بھریاں ہوئیاں سن۔ اے دانے تے ایناں غریباں دے پیدا کیتے ہوئے سن“<sup>2</sup>۔ کیا الفاظ ہیں! قَالَ الْمَلَأَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتَضَعُّوا (7:75)۔ یہ تو انہوں نے انہیں خود کمزور کر رکھا تھا، یہ بیچارے خود کمزور نہیں تھے۔ اتنی محنت کرنے والا کیسے کمزور ہو سکتا ہے۔ ان اوپر والوں نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ وہ تو ان کی محنت کا سارا حاصل لے جاتے تھے اور اپنی کوٹھیاں دانوں سے بھر لیتے تھے۔ یہ نان شبینہ تک کے لیے محتاج ہو جاتے تھے۔ لہذا کمزور ہو گئے۔ قرآن نے وجہ بتادی۔ یہ وہ لوگ تھے لِمَنْ اَمِنَ مِنْهُمْ (7:75) جنہوں نے حضرت صالحؑ کی آواز پہ حضرت نوحؑ کی آواز پہ لبیک کہا۔ وہ جو قوم کا ”کمی“ طبقہ تھا جسے کمین کہتے تھے انہوں نے حضرت ہودؑ کی آواز پہ لبیک کہا۔ محکوم طبقے نے حضرت صالحؑ کی آواز پہ لبیک کہا۔ یہ مزارعین کا طبقہ تھا جو نیچے والا تھا۔ میں آج کی اصطلاح میں مزارع کہہ رہا ہوں۔ ان کی تو ان سے بھی بری حالت ہوتی تھی۔ وہ Slavery (غلامی) کا دور تھا، غلامی کا زمانہ تھا۔ انہوں نے لبیک کہا۔

### در اصل یہ مخالفت انبیائے کرام کی نہیں تھی بلکہ خدا کے پیغام کی تھی

اب ان الملاء یعنی مترفین، سردارانِ قوم نے یہ پوچھا کہ کیا تم اس کی باتوں میں آگئے ہو؟ یہ کہا کہ اَتَعْلَمُونَ اَنَّ صَلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَبِّهِ<sup>3</sup> (7:75)۔ یہ چیزیں حضرت صالحؑ کے خلاف نہیں ہیں بلکہ خدا کے پیغام پہ اعتراض ہو رہا ہے۔ بات تو ساری پیغام کی ہوتی ہے۔ جو انبیائے کرام □ آتے ہیں ذاتی حیثیت سے تو ان کے ساتھ کوئی عناد ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے معاشرہ کے معزز ترین اشخاص ہوتے ہیں۔ وہ جو پیغام دیتے ہیں جو دعوت پیش کرتے ہیں وہ دعوت ان کی نہیں ہوتی، خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہ تو اسے پیش کرتے ہیں۔ یہاں کہا کہ کیا تم بھی اسی طرح کہتے اور سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے خدا کی طرف سے بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے؟ واہ! نہ کہیں دیکھا، نہ کہیں سنا۔ دوسرا یہ طبقہ جسے کمزور کر دیا گیا تھا یا یوں سمجھیے کہ جسے وہ کمزور سمجھتے تھے، قرآن کے لفظ میں فی الحقیقت وہ کمزور نہیں تھے۔ قرآن ایک لفظ استعمال کرتا ہے جس میں یہ ساری بات آ جاتی ہے۔ انبیائے کرام □ اوچے گھرانے کے افراد ہوتے ہیں۔

1 جن کے گھر رزق کی فراوانی ہو۔ یعنی جن کی کوٹھیاں (بنگلے) اناج سے بھرے ہوں۔ الملاء سردار وہ ہیں جن کے گھروں میں رزق کی بہتات ہو۔ اناج سے بھری ہوئی کوٹھیاں، بنگلے تو انہی کے ہو سکتے ہیں۔

2 ان کے ہاں رزق کی بہتات تھی مگر یہ بہتات تو ان غریبوں کے خونِ جگر کا نتیجہ تھی۔

3 کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ اپنے نشوونما دینے والے کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے؟ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 358)۔

معاشرے میں پہلے بھی ان کا مقام بڑا اونچا ہوتا تھا۔

عزیزانِ من! کہنے کی یہ بات اسی کو سمجھتی تھی جو آپ سید ہوا اور یہ کہے کہ ”نہیں، جولاہا اور سید ایک ہوتا ہے“۔ اگر جولاہا یہ بات کہے کہ جولاہا اور سید ایک ہیں تو کہا جائے گا کہ جا جا بابا! بات ایسے نہیں ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! طاقت و دولت والا اگر کسی کو جھک کر سلام کرتا ہے تو بات ہوتی ہے۔ یہ انبیائے کرام □ جو آ کر یہ کچھ کہتے تھے، اونچے طبقے کے تھے۔ انہیں ہم آج کی اصطلاح میں اوپر کا طبقہ (Elite Class) کہتے ہیں۔ اگر یہ نچلا طبقہ ہوتا تو فوراً اوپر کا طبقہ یہ بات کہہ دیتا کہ ٹھیک ہے تمہاری اپنی زمین کہاں ہے جو یہ کہتے ہو کہ یہ اونچے نیچے مٹا دو۔ اب یہاں وہ کہہ رہا ہے جسے باپ کی طرف سے خود وراثت میں اتنی جاگیر مل رہی ہے، ممتاز گھرانے کا آدمی ہے کہ تمہیں انہیں کمین کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، وہ ان سے کہتا ہے کہ تم درمیان میں یہ کرنے والے کون ہوتے ہو۔ آپ نے دیکھا کہ انبیائے کرام □ کو اونچے گھرانے میں کیوں پیدا کیا جاتا تھا۔ اب وہ آیت سنئے۔ کہتے ہیں کہ قَالُوا يٰصَلِّحْ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا (11:62) انہوں نے کہا کہ اے صالح! تمہارے ساتھ تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں، ہم تو کہتے تھے کہ اللہ کا شکر ہے کہ قوم میں ایک بڑا ہونہار بچہ پیدا ہو رہا ہے، بڑا ذہین، بڑا فطین بچہ ہے۔ عزیزانِ من! ایسے نظر آتا ہے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ میں یہ بات بتادی کہ حضرت صالح □ خود کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہمیں آپ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ان کی امیدوں پہ پانی کیسے پھر رہا ہے؟ کہا کہ یہ بات جو تم کہہ رہے ہو، نہ ہم نے اپنے باپ دادا سے کبھی سنی، نہ دیکھی۔

عزیزانِ من! قرآن ان کی وہی ایک دلیل دیتا چلا آ رہا ہے کہ یہ تو ہماری موروثی زمین ہے، ہم نے یہ وراثت میں پائی ہے۔ حضرت صالح □ نے کہا کہ تمہیں ان زمینوں پر کیا حق ہے، ذرا پیچھے چلے جاؤ تو وہ جو پہلا انسان تھا اس نے تو کہیں سے وراثت نہیں پائی تھی۔ اب سوچو کہ اس نے یہ کیسے لے لی تھی۔ تمہاری یہ دلیل تو ختم ہو جاتی ہے۔ برادرانِ عزیز! میں نے کہا تھا کہ یہ سارا قصہ ہی برادری اور نسل کا قصہ ہے۔ برادری و نسل سے وراثت آئی لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ اَتَّهْنٰ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا وَاِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيبٍ (11:62) کیا ہم انہیں اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں؟ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، ہمارے دل میں تو اس کی وجہ سے بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرت صالح □ نے تو انہیں پرستش سے روکا ہی نہیں ہے۔ یہ تو بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد جس نظام، شعار اور مسلک پر چلے آ رہے ہیں، تم اُس سے روک رہے ہو۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ تو معاشرے کے اندر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ نظام آج کا نہیں ہے۔ یہ تو صدیوں سے اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ تم اس نظام کو الٹنا چاہتے ہو۔ ہمیں تو تم سے بڑی توقعات تھیں۔

میں نے یہ گزارش کیا تھا کہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ اگر داستان بیان کرتا ہے تو وہ بچوں کی طرح کہانی نہیں سناتا۔ بچے تو ذرا ذرا سی Detail (تفصیل) بھی نانی اماں سے پوچھتے ہیں کہ نانی اماں! پھر وہ لال بیگ کتھے گیا<sup>①</sup>۔ یہاں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو دانا و سمجھدار آدمی کو بات سناتا ہے ساری کڑیاں نہیں بیان کرتا۔ ایسے بیان کرتا ہے کہ درمیان کی کڑیاں خود بخود ذہن انسانی مرتب کیے چلا جاتا ہے۔

معاشرے کی تمام ناہمواریاں دارالسلطنت میں بیٹھے چند ایک سرغنوں کی وجہ سے ہوتی ہیں

یوں نظر آ رہا ہے کہ حضرت صالحؑ کے خلاف معاشرے میں طوفان مچ گیا، مخالفین نے وہ ہجوم لاکھڑا کیا کہ طوفان برپا ہو گیا۔ انہوں نے سب میں Agitation (اشتعال) برپا کر دیا۔ اس پر حضرت صالحؑ نے خدا سے پوچھا کہ یہ اتنا بڑا ہجوم، یہ مکھیوں کا چھتہ، جو انہوں نے مجھ پہ چھوڑ دیا ہے یعنی ان لوگوں کو اس قدر زیادہ مخالفت میں ابھار دیا ہے تو میں کس کس کی اصلاح کروں گا؟ یہ مقابلہ کرنا تو میرے بس کی بات نظر نہیں آتا۔ سینے عزیزان من! یہ کوئی انہی کی داستان بیان نہیں ہو رہی آج کی بھی ہو رہی ہے۔ انہیں کہا گیا کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ جو تمہیں اتنا ہجوم نظر آتا ہے یا یہ جو ان کے پاس محافظ کھڑے ہو گئے ہیں، یہ وہ بالکل کچھ نہیں ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (27:48) بات یہ ہے کہ یہ جو Capital City یعنی دارالسلطنت ہے، اس میں 9 بڑے بڑے سرغنے ہیں جن کے ذمے معاشرے کا نظم و نسق ہے۔ وہی تمام شرارتوں کی جڑ ہیں، بس ان کا علاج کر لو تو ان سب کا علاج خود ہی ہو جائے گا۔

عزیزان من! یہ قرآن ہے اور قوم ثمود کی داستان سنار ہا ہے۔ حضرت صالحؑ کی کم از کم بھی تاریخ کہیے تو قریباً یہ پانچ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یہ قرآن آج کی بات سنار ہا ہے۔ حضرت صالحؑ سے کہا کہ ڈرتے کیوں ہو؟ کہ ”جسم قوم پہ چپک کے اتنے سارے دانے نکلے ہوئے ہیں، میں کہاں کہاں مرہم لگاؤں گا، میں تو تھک جاؤں گا۔“ کہا کہ بات یہ نہیں ہے۔ یہ تو خون کا فساد ہے۔ خون کے جراثیم مارنے کے لیے ایک انجیکشن دیجیے، سارے کے سارے ٹھیک ہو جائیں گے۔ اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ مدینہ یعنی جو کپٹل سٹی ہے جو ان کا بڑا دارالسلطنت ہے، بس ان کی یہ ساری بحث وہاں سے ہی ہے کہ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (27:48) وہ فساد کا منبع ہیں، وہ اصلاح نہیں ہونے دیتے۔ بس ایک ہی بات ہے جو کرنے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کا دار و مدار ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار اور نظم و نسق ہوتا ہے۔ وہی عوام کو بگاڑتے ہیں اور انہی کے سنوارنے سے معاشرہ سنورتا ہے۔ اب تک جھگڑے ہوئے، معیاد بھی لے لی، باہمی مذاکرات بھی ہوئے، ہر مرحلے پہ یہ اکھڑتے ہی چلے گئے۔ ان کے پاس کوئی دلیل

① پھر وہ لال بیگ کہاں گیا؟

ہی نہیں ہوتی۔ انہوں نے یہ دھاندلی کی ہوئی ہے۔ دھاندلی تو ہوتی ہی یہ ہے جو قاعدے قانون کے بھی مطابق نہ ہو اور دلیل و بصیرت کے مطابق بھی نہ ہو۔ اس کی Support (مدد) میں آپ کوئی دلیل نہیں دے سکتے۔

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ وہاں اس دھاندلی کا جواب کیا ملتا ہے؟ قرآن ایک فقرے میں جواب دے جاتا ہے۔ چونکہ جس نظامِ عدل کی طرف حضرت صالحؑ دعوت دیتے تھے اس سے ان اربابِ اقتدار کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی اس لیے وہی سب سے زیادہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور مل بیٹھے۔ قرآن کہتا ہے کہ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَاهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهِ وَاَنَا لَصِدْقُونَ ﴿٤٩﴾ (27:49)۔ انہوں نے کہا کہ لو بھئی! سارے قسم کھاؤ کہ یہ بات باہر نہیں نکلے گی۔ آج کی تاریخ میں یا تو اس کے گھر پہ چھاپہ مارو اس کے سب گھر والوں کو تہ تیغ کر دو اور صبح کو قسمیں کھا لینا کہ بھئی! ہمیں پتہ ہی نہیں ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس نے مارا ہے۔ وہ ادھر یہ کچھ کر رہے تھے مگر ادھر سے ہم بھی کچھ تدبیریں کر رہے تھے کیونکہ وہ تو اپنی قوت کے نشے میں مدہوش تھے۔ اس لیے ان کے شعور میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔<sup>①</sup> یہاں آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ بہر حال یہ کچھ کہنے کے بعد باہمی سمجھوتہ ہو گیا۔ کیا بات ہے قرآن کی داستانوں کی! عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب داستانیں ہیں۔ اگر قرآن کی داستانوں پہ آجائیں تو دوسری تمام داستانیں پھینکی پڑ جاتی ہیں۔ سنئے! قرآن کیا بات کہتا ہے۔

### نوع انسانی کے معاشی مسئلہ کا حل میری اور تیری کی تفریق مٹانے میں مضمر ہے

آج یہ کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں معیشت کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، تو اس کے حل ہونے کی بنیاد کیا ہونی چاہیے؟ اس پہ دو الفاظ ہیں اور سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ چراہ گاہیں ہیں زمین ہے ان میں کھیتیاں ہیں۔ اب ان سے پوچھنے کی بات یہ تھی کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ یہ ہماری ہیں تو بتاؤ کہ یہ تمہاری کس طرح سے ہیں؟ پھر اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہماری بھیڑیں تو آ کر آسمیں پانی پی لیں مگر ان کی بھیڑیں نہیں پیئیں گی۔ ہماری اور ان کی بھیڑوں کی یہ تفریق کیسے ہوئی؟ غور کیجیے گا کہ کیا بات ہو رہی ہے؟ پہلی تفریق تو یہ ہے کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ یہ ”ہماری زمینیں اور چراہ گاہیں ہیں“ ان کی نہیں ہیں، تو یہ کیسے ہے اور پھر یہ جو تم کہتے ہو کہ یہ ”ہماری بھیڑیں ہیں“ ان کی بھیڑیں ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جب بھیڑ پیدا ہوتی ہے تو کیا اس کی اون پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ ”فتودی بھیڑ ہیگی اے“ تے اے چو ہد ری فتح اللہ ہیں“ تو سوال یہ ہے کہ جب بھیڑ پیدا ہوتی ہے تو کیا اس کی اون پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ ”فتودی بھیڑ ہیگی اے“ تے اے چو ہد ری فتح اللہ ہیں“

① آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کریں گے اور ہم مقتولین کے ورثاء کے سامنے مکر جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے انہیں ہلاک ہوتے دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 871)۔

② وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (27:50) وہ ادھر یہ تدبیر سوچ رہے تھے اور ہم اپنے قانونِ مکافات کی رو سے ایک اور تدبیر کر رہے تھے جس کا انہیں شعور و احساس تک نہ تھا (پرویز: مفہوم القرآن، ص 871)۔

دی بھیڑ ہیگی <sup>①</sup>۔ یہ کہا کہ ان ساری چیزوں کی نسبتیں تم نے خود قائم کر لی ہوئی ہیں۔

میری اور تیری کی اور خود تمہاری قوم کی بھی خود قائم کردہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ چوہدری فتح اللہ کی بھیڑیں ہیں۔ بھیڑ کو اگر فتح اللہ کی نسبت سے الگ کر دیا جائے تو وہ تو بھیڑ ہی ہوتی ہے اور اسی طرح اگر فتو جولاہے کا نام بیچ سے نکال دیں تو ان بھیڑوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ تو بھیڑیں ہوتی ہیں۔ کہا کہ یہ ساری تباہی اس میری اور تیری کی نسبت نے پیدا کی ہوئی ہے۔ تم نے یہ چوہدری صاحب کی بھیڑیں، یہ فتو کی بھیڑیں اور دوسری طرف یہ چوہدری صاحب کی چراہ گاہ اور یہ فتو بیچارے کی کہہ کر تباہی مچائی ہوئی ہے۔ کہا کہ یہ اتنا سا اس کا ہے ہی نہیں، بلکہ یہ تفریقات جو تم نے اپنے ہاں زمینوں کے اندر بھی اور ان مویشیوں کے اوپر بھی پیدا کی ہوئی ہیں، یہ سارا فساد ان کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ سنئے عزیزانِ من! اپنے ان چار الفاظ کو لکھ رکھیے۔ قرآن حکیم کا کہنا ہے کہ یہ جو درمیان میں نسبتیں ہیں، ان نسبتوں کو مٹا دو۔ یہ انسانوں کی خود وضع کردہ ہیں۔ اب ان کی مصالحت ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک معاہدہ ہوا ہے۔ اس معاہدے میں کیا چیز لکھی گئی ہے؟ عزیزانِ من! سنئے اور جھوم جائیے۔

### قرآن حکیم کے معاشی نظام کی ایک روشن مثال

میں نے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم نے ابدی طور پر معاشی نظام (Economic System) کا حل بتا دیا ہے۔ کہا کہ ہَذِهِ نَافَةٌ اللّٰہِ (7:73)۔ یہ ایک اونٹنی ہے۔ یہ نہ چوہدری فتح اللہ کی ہے نہ یہ فتو جولاہے کی۔ کسی انسان کی طرف اس کی نسبت نہیں کرنی۔ یہ صرف اونٹنی ہے بس اونٹنی ہے۔ البتہ یہ کہو کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور جب بھی آپ اللہ کی کوئی چیز کہیں گے تو انسانوں کی نسبت اور ملکیت اس سے نکل جائے گی، ورنہ اس کی نسبت کچھ بھی کہیں گے تو اس میں کسی نہ کسی انسان کی بات آ جائے گی۔ یہ اگر چوہدری فتح اللہ کی نہیں ہے تو یہ منتقل ہو کر کسی دوسرے انسان کی طرف آ جائیگی، دوسرے کا مال کسی دوسرے کی طرف چلا جائے گا، انسان کی طرف نسبت رہے گی اور جو نبی آپ نے یہ کہا کہ نہیں، یہ اللہ کی ہے تو پھر انسانوں کی ملکیت کا سوال اٹھ گیا۔ انسانوں کی نسبت سے ہی ملکیت ہوتی ہے ورنہ ملکیت کچھ شے نہیں ہوتی۔

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ دو چیزیں یاد رکھو: ایک تو یہ جو تم نے مویشیوں کی نسبتیں مقرر کر رکھی ہیں کہ یہ اُن کی بھیڑیں ہیں اور وہ ان کی بھیڑیں۔ ان کی اور اُن کی کیا بھیڑیں؟ یہ تو نَافَةُ اللّٰہِ (7:73) ہے۔ اللہ کی اونٹنی ہے۔ فَذَرُوْهَا (7:73) جو پابندیاں تم نے عائد کر رکھی ہیں وہ پابندیاں اٹھا دو، انہیں چھوڑ دو، تاکہ تَسَکُلُوْا فِیْ اَرْضِ اللّٰہِ (7:73) اللہ کی زمین ہے، اس کے اوپر اللہ کی اونٹنی کو چھوڑ

① یہ فتو کی بھیڑ ہے اور وہ چوہدری فتح اللہ کی بھیڑ ہے۔

دوتا کہ یہ بھی کھائے۔ بات ختم ہوگئی۔ ارض اللہ کہنے سے انسانوں کی ساری ملکیت کا تصور ختم ہو گیا۔ کہا کہ ملکیت کچھ نہیں ہوتی۔ تم اس کی نسبت مقرر کر لیتے ہو اس کی یہ اضافت ہوتی ہے۔ درمیان کی یہ اضافت اٹھا دیجیے ملکیت کا تصور ختم ہو جائے گا: اللہ کی زمین اللہ کی مخلوق۔ اللہ کی مخلوق کو اللہ کی زمین میں چھوڑ دو۔ یہ جو تم نے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں ان کو ہٹا دو۔ بس ٹھیک ہے اللہ کی زمین اللہ کی مخلوق: چلے پھرے کھائے۔ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا کہ یہ تم ہمارے کھیت میں آگئے۔ یہ جو ہمارے کھیت میں دوسرے کا بیل آتا ہے تو پتہ ہے وہ لاٹھی مار مار کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ خبردار! اگر اس کو تم نے Touch (مس) بھی کیا۔ خدا کی زمین میں خدا کی اونٹنی ہے وہ چرے گی۔ اگر تم نے یہی نسبتیں قائم رکھیں تو یاد رکھیے پھر ایسی دردناک تباہی آئے گی کہ اس کا مداوا کوئی نہیں کر سکے گا۔ یہ تفریق ابدی نہیں رہ سکتی۔ یہ ہے عزیزان من! سارے معاشی نظام کا بنیادی نکتہ: خدا کی اونٹنیاں خدا کی زمین۔ حضرت صالحؑ نے اپنے دور کی نسبت سے ناقتہ اللہ کہا ہے۔

### قرآن حکیم کے معاشی نظام کے متعلق حضور کی ایک حدیث

نبی اکرم ﷺ کی ایک روایت (ابوداؤد کی) ہے۔ وہ صحیح حدیث پتھروں کے اندر بھی چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عزیزان من! اسی عنوان پہ حضور اکرمؐ نے یہ فرمایا کہ اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لیے خالی چھوڑ دو۔ انہوں نے <sup>1</sup> صرف ناقتہ اللہ کہا تھا حضور ﷺ نے عباد اللہ کہا: اللہ کے بندے اللہ کی زمین۔ یہ ہے قرآن اور یہ ہے اس پر مبنی حضور ﷺ کا ارشاد۔ حضرت صالحؑ کے سلسلے میں یہاں سمجھوتا نظر آتا ہے۔ وہ مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے سمجھوتا کر لیا، دستخط کر لیے، لیکن اس پر کیسے قائم رہتے۔ یہی تو چیز تھی کہ وہ ان مجبوریوں سے سمجھوتے کر لیتے ہیں مگر اس پر کار بند نہیں رہتے۔ اسی لیے قرآن کریم نے کہا کہ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ (91:13) ان کے رسول نے ان سے کہا تھا کہ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا <sup>2</sup> (91:13)۔ اللہ کی اونٹنی ہے تم باریاں مقرر کر لو۔ اگر تم کہتے ہو کہ اس چشمے پہ جگہ تھوڑی ہوتی ہے سب کی سب ایک وقت میں پانی پینے کے لیے نہیں آ سکتیں تو ان کی باریاں مقرر کر لو۔ یہ باریاں یکساں ہوگی ان سب کی نسبت کسی کی طرف نہیں ہوگی۔ یہ کہہ لو کہ اتنی بھیڑیں ہیں ایک وقت میں فلاں چشمے پہ اتنی بھیڑیں آئیں گی فلاں چراگاہ پہ اتنی بھیڑیں آئیں گی۔ بس یوں باریاں مقرر کر لو۔ یہ سب کچھ طے ہو گیا، دستخط ہو گئے، لیکن یہ دستخط پر کیسے قائم رہ سکتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ انسان کا خون نمکین ہوتا ہے اس لیے اگر کسی درندے کو اس کا خون لگ جاتا ہے تو پھر وہ کسی دوسرے کا خون پیتا ہی نہیں ہے۔ انسان ہی کو

<sup>1</sup> یہ اشارہ حضرت صالح علیہ السلام کی طرف ہے۔

<sup>2</sup> یہ ”خدا کی زمین پر خدا کی اونٹنی ہے۔“ اسے اس کی باری پر پانی پینے دو (26:155; 7:73) (پرویز: مفہوم القرآن ص 1454)۔

تلاش کرتا ہے۔ یہ تو پتہ نہیں لیکن انسان کا خون منہ کو لگا ہوا ہو، تو پھر چھٹتا ہی نہیں۔ کسی مجبوری کے ماتحت انہوں نے یہ معاہدہ تو کر لیا لیکن فَكَذَّبُوهُ (91:14) معاہدے کو جھٹلادیا اور فَعَقَرُوْهَا (91:14) آخر کار اونٹنی کو مار مار کے جان سے ہی مار دیا۔

### طبقاتی نظام حیات کا نتیجہ ایک الم انگیز بتا ہی ہے

عزیزانِ من! قرآن درمیان کی تفصیل نہیں دیتا کہ پھر آخر میں اس طبقاتی نظام کی بتا ہی کس طرح آتی ہے۔ دو الفاظ سنئے سارا مسئلہ زمین کا تھا جس پہ انہوں نے اپنے قبضے جمار کھے تھے۔ اسی سے وہ ناہمواریاں پیدا ہوئی تھیں، اونچ اور نیچ پیدا ہوئی تھی۔ قرآن تفصیل میں گئے بغیر انجام بتاتا ہے۔ کہا کہ انہوں نے یہ کچھ کیا، اپنا نظام اسی طرح سے قائم رکھا۔ اس معاہدے کے اوپر بھی قائم نہ رہے مگر یہ طبقاتی تفریق اور شدید ہوتی چلی گئی۔

اس معاہدے کے بعد کیا ہوا؟ میں نے کہا ہے کہ سارا مسئلہ زمین کا تھا اور اونچ نیچ کا تھا۔ قرآن استعارے میں بات کیا کرتا ہے۔ اس کے انجام کے متعلق کہا کہ **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمُ رَبُّهُمْ** <sup>①</sup> (91:15) ہم نے ان کے اوپر روڈرولر پھیر دیا۔ یہ یونہی دھاندلی سے نہیں کیا تھا **بِذُنْبِهِمْ** (91:15) ان کے جرائم کی بنا پر کیا تھا اور اس کے نتیجے میں **فَسَوَّهَا** (91:15) ساری زمین ایک جیسی ہو گئی، دمدمہ آ گیا یعنی روڈرولر پھیر دیا، یہ طبقات ختم ہو گئے۔ قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں: **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمُ رَبُّهُمْ بِذُنْبِهِمْ** (91:15)۔ ان الفاظ میں کیا بات ہے! آپ دیکھیے کہ صوتی اعتبار سے بھی یہ نظر آتا ہے کہ ایک گرج سی ایسے آرہی ہے جیسے وہ روڈرولر چلنے کی آواز ہے: **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمُ رَبُّهُمْ بِذُنْبِهِمْ** (91:15) یہ کچھ دھاندلی نہیں بلکہ ان کے جرائم کی وجہ سے ہوا۔ جرائم تو ہم ذنب کا ترجمہ کرتے ہیں۔ عربی زبان میں ”ذنب“ کی بات ہی وہ ہوتی ہے ”جو چیز کسی کے پیچھے لگی ہوئی ہو“۔ ذم کو ”ذنب“ کہتے ہیں کہ پیچھے چپکی ہوئی جہاں جائے ساتھ جائے، تو اس قسم کے غلط نظام کے انجام باہر سے نہیں آتے بلکہ اس کے نتائج تو اس کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ اس کے پیچھے چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔

### ظہور نتائج کے وقت خدا کا ہاتھ کا پتا ہی نہیں

ظہور نتائج کے وقت یعنی **ذُنْبِهِمْ** اور اس کا نتیجہ **فَسَوَّهَا** (91:15) انہیں تہس نہس کر کے زمین کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیتا ہے، انہیں پیس کر خاک راہ گزر بنا دیتا ہے۔ اسی طرح وہ طبقاتی امتیازات ختم کر کے ساری زمین یکساں کر دی جسے آپ کہتے ہیں کہ اونچ

① خدا کے قانون مکافات کا دمدمہ آیا (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 1454)۔



نچ کو Level (ہموار) کر دیا۔ اور سنیے، عزیزانِ من! یہاں کہنے کے بعد یہ کہا کہ **وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا** <sup>①</sup> (91:16)۔ جب کسی کے جرائم کے نتیجے میں یہ تباہیاں آتی ہیں تو پھر خدا کا ہاتھ کانپا نہیں کرتا۔ جب وہ ہاتھ ڈالتا ہے پھر وہ کسی بھی چیز سے ڈرتا نہیں ہے کہ کیا ہوا۔ کہا کہ یہ ہوتا ہے انجام، اس قسم کے غلط نظام کا، جس میں یہ طبقاتی تفریق پیدا کر دی جاتی ہے۔ یہ تیسری چیز آگئی۔

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ وہ اختلافات کیا تھے جن کو مٹانے کے لیے انبیائے کرام آتے تھے۔ ہم تو اپنے ہاں یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اختلافات کچھ ایسے ہی تھے کہ کوئی نبی آگئے یا اگر کوئی نبی آتے تو یہ کہتے کہ آمین اوچی آواز سے نہیں کہنا چاہیے، نیچی آواز سے نہیں کہنا چاہیے، یہ اختلاف مٹا دیتے اور یہ بھی کہ ہاتھ یہاں نہیں، یہاں باندھنے چاہئیں۔ یعنی وہ آکر اس قبیل کے اختلاف مٹا دیتے تھے جب کہ وہ تو غلط نظام کو مٹانے کے لیے آتے تھے۔ اسی لیے کہا کہ **فَسَوَّهَا** (91:15) ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں تہس نہس کر کے زمین کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔ وہ یہ کرنے کے لیے آتے تھے۔ عزیزانِ من! وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری تھی۔ اس میں انسانوں نے اختلافات پیدا کیے، انبیاء آئے اور انہوں نے کتاب کے ذریعے اختلافات کو مٹانا شروع کیا اور اس طرح اب یہ داستانیں ہمارے سامنے آئیں کہ وہ اختلافات، تفرقے اور تفریقات، طبقات کیا تھے، جنہیں مٹانے کے لیے یہ حضرات آتے تھے۔

### پورے کا پورا نظامِ دین انہی تفرقوں کو مٹانے کی وضاحت میں مضمر ہے

آپ ڈھونڈتے پھرتے ہیں، تحقیق کرتے ہیں کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہوگا؟ وہ تو یہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے جو کچھ نوح سے کہا تھا، وہی کچھ اصولی طور پر حضرت نبی اکرم ﷺ نے کہا تھا۔ ہم نے ہر نبی ﷺ سے وہی کچھ کہا تھا۔ یہ باتیں حضرت نوح ﷺ، حضرت ہود ﷺ اور حضرت صالح ﷺ کی نہیں ہیں بلکہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہے، وہ ہدایت یا ضابطہ تو انہیں ہیں۔ یہ تو اس کے مختلف ٹکڑے بیان ہو رہے ہیں اور وہ سارے کے سارے یہیں حضور نبی اکرم ﷺ تک آکر مکمل ہو گئے اور کہا کہ **وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا** (6:116) آخر الزمان نبی ﷺ کے دور میں ان کی کتاب کے اندر آکر یہ سارے ضابطے مکمل ہو گئے۔ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهِ** (6:116) اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ نے یہ دیکھنا ہے کہ وہ اسلامی نظام اور اقامتِ دین کیا چیز ہے تو وہ یہاں سے دیکھیے جو قرآن کریم نے خود انبیائے کرام ﷺ کی داستانوں میں بیان کیا ہے۔ یہی جب آپ

① اور ایسا کرتے وقت وہ اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لیے کہ یہ بات، ظلم اور ناانصافی کی نہیں تھی بلکہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ تھا جو ان کے سامنے آ گیا (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1455)۔

آخر میں نبی اکرم ﷺ کے دور کے اندر دیکھیں گے تو یہ تکمیل تک پہنچے گا۔ یہ نظام ایک ذات اقدس و اعظم ﷻ کے ہاتھوں سے متشکل ہو کر سامنے آ گیا۔ لہذا یہ ہے وہ دین جس کے لیے انبیائے کرام ﷺ آیا کرتے تھے۔

### معاشرے میں طبقاتی تفریق پیدا ہونے کی وجہ اور اس کی اصلاح

اب آگے وہ بات آگئی جس کے بعد ہم آج کا یہ درس شروع کر رہے ہیں۔ پہلے کہا تھا کہ یہ طبقاتی تفریقات کیوں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے بعد باوجود اتنا کچھ سمجھانے کے یہ ٹیٹی کیوں نہیں ہیں، لوگ پھر وہی کچھ کیوں کرنے لگ جاتے ہیں، بتایا کہ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے اور اسی پہ اصلاح کا سارا دار و مدار ہے۔ عزیزانِ من! آپ کے ہاں جو قانون بناتے ہیں، جو معاہدے پہ دستخط کرتے ہیں، پھر اس معاہدے کو توڑ کیوں دیا جاتا ہے؟ اس میں بنیادی بات جو سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ ہم نے اسے ایک مسئلہ کی حیثیت سے ”آخرت“ پر رکھ چھوڑا ہے۔ یعنی وہ آخرت پہ ایمان ہے۔ ایمان کے پانچ اجزاء ہیں ان میں ایک ”ایمان بالآخرت“ بھی ہے۔ بس یہ ایک لفظ ہے جو ہم بول دیتے ہیں۔ انسانی ذہنیت (Human Mentality) کی ساری بنیاد یہ ہے کہ آپ کے ہاں زندگی کا تصور کیا ہے؟

میں نے شروع میں یہ کہا تھا کہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسانی بچہ اور حیوانی بچہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو اس بچے کی ساری زندگی فزیکل لائف (طبعی زندگی) ہوتی ہے: طبعی زندگی یعنی جسم کی زندگی، کھانا پینا، اس کی پرورش۔ یہ سب کچھ حیوانی سطح کے مطابق ہوتا ہے اس کے اندر افزائش نسل کا جو ہر رکھا ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے۔ ایک وقت کے بعد تائید نفس کی یہ مشینری چلنے سے بند ہو جاتی ہے، اور یہ مر جاتا ہے۔ حیوان تک تو یہ چیز چل سکتی ہے کیونکہ اس نے اپنی ساری زندگی میں کوئی جرم اور گناہ نہیں کیا ہوتا، وہ کر ہی نہیں سکتا۔ یہ انسان بھی اسی طرح ایک بچہ پیدا ہوتا ہے، جیسے وہ حیوان کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد چونکہ وہ انسانی بچہ صاحب اختیار و ارادہ ہے، قدم قدم کے اوپر یہ گناہ کرتا ہے، جرائم کرتا ہے، استحصال کرتا ہے، سلب و مہب کرتا ہے۔ یعنی یہ سارا کچھ کرتا ہے جو حیوان نہیں کرتا۔ یہ کون سی چیز ہے جو اسے اس سے روک سکتی ہے؟ یہ آپ کے ہاں کے معاشرتی قوانین ہیں۔ یہ وہی ہیں، جنہیں تمدنی قوانین یا سوسائٹی کے قوانین کہتے ہیں۔ سوسائٹی کے قوانین نے تو یہ اطلاع کر دی ہے کہ یہ کچھ آپ نے جرائم کیے۔ اگر آپ کے ہاں اپنا ملک نہیں ہے، تو آپ دنیا بھر کے ممالک لے لیجیے اور بتائیے کہ وہ کون سا ملک ہے، جہاں یہ قوانین موجود نہیں ہیں کہ دھوکا دینا بڑا جرم ہے، چوری کرنا جرم ہے، جھوٹ بولنا جرم ہے، دوسرے کو ستانا جرم ہے، دوسرے کی چیز دھاندلی سے لینا جرم ہے۔ بتائیے کون سا ملک ہے، کون سی قوم ہے، جہاں یہ قوانین نہیں ہیں اور پھر یہ بھی بتائیے کہ کیا کوئی ملک بھی ایسا ہے جس میں یہ جرائم نہ ہوتے ہوں؟ یہ جرائم کیوں نہیں مٹ رہے؟ جیسا کہ میں مثال دیا کرتا ہوں: بیل کو بھوک لگتی ہے، وہ باہر چلا جاتا ہے۔ جو کھیت پہلے سامنے آتا ہے اس میں منہ مارتا ہے۔

وہ کھیت اپنے مالک کا ہو یا دوسرے کا ہو اسے اس سے غرض ہی نہیں ہوتی کہ وہ ان دونوں میں تمیز کرے۔ لہذا اگر انسان کی زندگی بھی حیوان کی زندگی کے لیول پر ہے تو وہ بھی یہی کچھ کرے گا۔

### انسانی سطح کا تصور ہی معاشرتی مصائب و آلام کا حل ہے

انسان بیل نہیں ہیں، ان سے قومیں بنتی ہیں۔ ان کم بختوں کی کیفیت بیل سے کم نہیں۔ یہ اپنے کھیت کے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی کاٹتا ہے۔ حیوان تک تو یہ چیز گناہ یا جرم نہیں ہے۔ اس چیز کو انسان نے آ کر جرم قرار دیا ہے۔ یہ بھی ہر معاشرے نے قانون بنایا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اور قانون اسے روک نہیں سکا۔ سوال یہ ہے کہ قانون اسے کیوں نہیں روک سکا؟ اس لیے کہ انسانی زندگی، حیوانی زندگی قرار پاگئی۔ یعنی کھانا پینا، عیش کرنا، بچے پیدا کرنا، ان کے لیے کچھ چھوڑ جانا اور اس کے بعد مر جانا۔ اگر Concept of Life (تصور حیات) یہی ہے تو کوئی اصلاح انسانی زندگی میں ہو ہی نہیں سکتی۔ حیوانی زندگی ہو، اور اس کم بخت کو قوتیں لا انتہائی ہوں، تو شیر کسی کو کیا پھاڑے گا جو انسان پھاڑتا ہے۔ اس کو قوتیں اتنی مل گئیں اور ذہن ہوا، حیوانی لیول کا، عزیزانِ من! پھر سوچیے تو سہی! ذرا نظر تو دوڑائیے ہمارے سامنے اس سے کوئی زیادہ لائف کا تصور ہے؟

تمدنی سوسائٹی کے قانون کا لحاظ صرف وہ کرتا ہے جسے ڈر ہوتا ہے کہ میں پکڑا جاؤں گا تو کوئی چھڑا نہیں سکے گا۔ جو صاحب اثر نہیں ہے، صاحب سفارش نہیں ہے، کوئی دولت نہیں کہ رشوت دے سکے، تو وہ غریب مارا جاتا ہے۔ جن کے پاس یہ سہارے ہوتے ہیں، وہ دندناتے پھرتے ہیں۔ ان کو کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ ان پر کوئی ہیئت حاکمہ بھی ہے۔ جو صاحب اثر و رسوخ ہوتے ہیں وہ قانون ہی بدل دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! اگر اس کے برعکس Concept (تصور) یہ ہو کہ انسان کی زندگی، حیوانی طبعی زندگی کی طرح نہیں ہے تو اس میں یہ ہوتا ہے کہ اس کا ایک رول ہے جس میں اس کا ایک عمل، ایک ایک فعل، حتیٰ کہ قرآن کے الفاظ میں دلوں میں گزرنے والے خیالات تک نتیجہ پیدا کر کے رہتے ہیں، خواہ وہ سوسائٹی کی گرفت میں آئے یا نہ آئے یہ بھی کہ اور اگر یہ چاہے کہ یہاں سے مرجانے کے بعد چھوٹ جائے تو یہ نہیں چھوٹ سکتا کیونکہ اس تصور کے لحاظ سے اسے معلوم ہے کہ مرجانے سے اس کا جسم تو مرجاتا ہے، یہ نہیں مرتا، جس نے یہ کچھ کیا تھا۔ اگر آپ کا ارادہ نہ ہو تو یہ جسم تو کچھ کرتا ہی نہیں ہے۔ اگر آپ کا ارادہ ہی نہ ہو تو آپ کا ہاتھ اسے چرا ہی نہیں سکتا۔ یہ ارادہ ہاتھ تو نہیں کرتا، ارادہ تو ”میں“ (I-am-ness) کرتا ہے۔ میں نے یہ کہا کہ اس ”میں“ نے یہ ارادہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ بس یہ ہے فرق انسان میں اور حیوان میں۔ آپ سمجھ لیجیے عزیزانِ من! کفر اور ایمان کا فرق ہی یہ ہے۔

یہ جسے آپ خدا پر ایمان لانا کہتے ہیں، تو وہ بات تو عملاً یہ ہے یعنی انسان کا اپنی ذات پر ایمان لانا، اس بات پر ایمان لانا کہ میری

زندگی حیوانی زندگی نہیں۔ یہ ایک اور ”چیز“ ہے جس پر میرے ہر عمل اور ہر فعل کا نتیجہ ثبت ہو کر رہتا ہے۔ وہ ایک اسٹور ہاؤس ہے، وہ ایک ”لوہ“ ہے جس پہ انسان کے ہر فعل و عمل کا وہ نقش ثبت ہوتا چلا جاتا ہے جو اس کے مرنے سے نہیں مٹتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں یہاں معاشرے کے جرائم سے بچ بھی جاؤں تو یہ ”میں“ اس کے باوجود نہیں مٹتی حتیٰ کہ معاشرہ بھی اگر کسی جرم کی سزا دیتا ہے تو وہ چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے کسی چیز کے چرانے کا ارادہ کیا، سامنے بیٹھے رہے، وہ بھی بیٹھا رہا، جس کی چیز تھی۔ گھڑی میز پہ رکھی تھی۔ ذہن میں یہ تھا کہ یہ کہیں ادھر ہٹ کر جائے تو میں اس گھڑی کو لے جاؤں، وہ ہٹ کر نہیں گیا، آپ نے اسے چرایا نہیں، تو یہ کسی قانون کی رو سے جرم نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جو انسانی زندگی کے اندر ایک شے ہے جسے میں نے ابھی کہا کہ قرآن اسے ”میں“ کہتا ہے، یہ اس ”میں“ نے جرم کر دیا۔ سوسائٹی تو صرف اسے سزا دے سکتی ہے جو جرم اس کی گرفت میں آتا ہے۔ میں نے Actually (حقیقت میں) کوئی چیز چرائی تو وہ اس کی نگاہ میں جرم ہے۔ وہ اس کی سزا تو دے گی یعنی یہ جو آپ ارادے کرتے ہیں سوسائٹی کے قانون کی گرفت میں یہ بات نہیں آتی اور پھر آپ اس میں کامیاب بھی نہیں ہوتے، تو یہ تو قانوناً جرم ہی نہیں ہے لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ یہ جرم وہ خود اپنے خلاف کرتا ہے، جب وہ اس کا ارادہ کرتا ہے۔ قرآن اس کے اس ارادے کو اس کے جرم کی بنیاد کہتا ہے: وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ <sup>①</sup> (22-45)۔ یہ تم سمجھتے ہو کہ میں نے اس کی چوری کر لی ہے، نہیں، تم نے اپنے اس ارادے سے کچھ اپنی چوری کی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اس پر زیادتی کی ہے، نہیں بلکہ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (16:118) اپنے آپ پہ کچھ زیادتی کی ہے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں اور جسے اقبال (1877-1938)ؒ نے مجزوب فرنگی کہا ہے، وہ نیٹشے (Nietzsche, Friedrich 1844-1900) ہے۔ بڑی عجیب شخصیت ہے، خدا کا منکر ہے۔ لیکن سوچے بات کیا کہہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو جرم تم نے میرے خلاف کیا تھا، اسے تو میں معاف کر دوں گا لیکن اس سے جو جرم تم نے خود اپنے خلاف کیا، اسے کون معاف کرے گا، اسے تو میں بھی معاف نہیں کر سکتا۔

### جہان فردا کی تصویر کشی: بآواز بلند اپنے جرم کا اعتراف

وہ جرائم جو انسان کی ذات اپنے ساتھ لے کر آگے چلتی ہے، کبھی فرصت ہوتی تو وہ بھی سمجھاؤں گا کہ یہ کیا ہے؟ آگے اور پیچھے کا سوال ہی نہیں ہے۔ زندگی مسلسل چلتی ہے۔ یہی جو ذات انسان ہے، یہ اپنے تمام اعمال کے نتائج کو اپنے اندر لیے ہوئے، خود چلی آتی ہے۔ کہاں چلی آتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ عدالت کی طرف خود چلی آتی ہے۔ یہ کیا ہی خوب بات ہے کہ اس نے خود اپنے آپ کو گرفتاری

① ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ برآمد ہو جائے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1169)۔

کے لیے پیش کر دیا۔ پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں سے جو چلے گئے تو قصہ زندگی ختم ہوا۔ سن رکھیے یہ قصہ ختم نہیں ہوا بلکہ تمہارے معاشرے سے چل کر یہ قصہ زندگی ہماری عدالت کے اندر آ گیا۔ کس طرح سے آ گیا؟ اس کے لیے کہا کہ وہ اس کا جو اعمال نامہ پہلے لپٹا ہوا تھا وہ اس کو کھول کر لے آیا، صرف اتنا ہی فرق تھا کہ وہاں وہ اس کی گردن میں سامنے لپٹا ہوا تھا، یہاں آیا تو اسے کھول کر ہمارے سامنے لے آیا۔

اس نے اپنا وہ اعمال نامہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ ہم نے کہا کہ ہمیں پڑھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اِقْرَأْ کِتَابَکَ (17:14) لو اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لو۔ ذرا اونچی آواز سے پڑھنا تاکہ سب سن لیں۔ عزیزانِ من! جب میں یہاں پہنچتا ہوں، پوچھیے نہیں کہ کیا حالت ہوتی ہے۔ کتنے ہی ایسے افراد ہیں جن کے خلاف ہم نے اپنے دلوں میں کیا کچھ نہیں سوچا، کتنی ہی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو ظاہر نہیں ہوتیں یا جن کا علم نہیں ہو سکتا تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ انہیں علم نہ ہونے پائے۔ یہاں کہا ہے کہ وہ سب وہاں موجود ہوں اور یہ اسے وہاں ان کے سامنے باوازا بلند پڑھ رہا ہو تو جسے جہنم کہتے ہیں اس سے بڑا جہنم اور کیا ہوگا۔ کسی ایک کے سامنے جسے آپ نے دوست کہہ رکھا ہے اس کے خلاف جو آپ نے کوئی سازش کی ہے اس کا پردہ اگر چاک ہو جائے تو آپ ساری عمر اس کے سامنے منہ نہیں دکھاتے۔ وہاں یہ کیفیت ہوگی کہ یہ سب وہاں موجود ہوں گے۔ سوال ہوگا کہ کیا اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لیا ہے؟ اقرارِ جرم تو ہو گیا، عدالت میں کھڑا ہے۔ کہا کہ ہمیں کسی اور کو بلانے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ ہی کچھ پوچھنے کی۔

جرم کی سزا از خود وارد ہوتی ہے

”لو اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لو“ کے آگے بات ہوئی کہ لو سزا بھی تم خود ہی مقرر کر لو۔ مقرر کیا کر لو؟ وہ تو اس کے اوپر وارد ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ ہے جہنم، عزیزانِ من! یہ جتنی دھاندلیاں آپ دیکھتے ہیں اور جو ہم نے ان داستانوں میں سے تمہیں سنائی ہیں اب آگے آئیے سنیں کہ قرآن کہتا ہے کہ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا (23:33) وہ مستقبل کی زندگی کے قائل نہیں تھے وہ اس سے انکار کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ زندگی بس یہاں کی زندگی ہے۔ ہم نے اتنا سامان کر رکھا ہے کہ ہم یہاں کسی کی گرفت میں نہیں آئیں گے۔ یہاں وہ کہتے تھے کہ اَتَرَفْنَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (23:33)۔ دیکھیں ہم کیسے موج کر رہے ہیں، ہمیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ کچھ نہ کیجیے دیکھیے پھر وہاں جہنم میں جانا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! تمہیں پتہ نہیں ہے، ہم نے انتظام کر لیا ہے، ہم یہاں عیش کر رہے ہیں، اللہ نے چاہا تو ہم وہاں بھی عیش کریں گے، مولوی صاحب نے کہا تھا کہ مسجد بنا دیجیے جنت میں گھر بن جائے گا، میں نے بنا رکھی ہے۔ ہم وہاں بھی عیش ہی کریں گے: اَتَرَفْنَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (23:33) انہیں بڑی خوشگواریاں، بڑی سہولتیں حاصل ہیں۔ یہ یہاں ان کی جنت کا ذکر کرتے ہیں جن کے پاس اتنی دولت

ہوتی ہے۔ وہ بیچارے جو یہاں کی روٹی نہیں خرید سکتے، ان کے لیے کہاں کی جنت۔ بس یہی کہ مرے کو ماریں شاہ مدار<sup>①</sup>۔  
وہ اکابرین جنہیں اَتَرَفْنَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (23:33) ہے یعنی سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں؛ دیکھتے تھے کہ نظامِ خداوندی کی زد ان کے ذاتی مفادات پر پڑے گی، مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (23:33) یہ شخص جو خدا کا پیغامبر ہونے کا مدعی ہے، تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ يَا كُلُّ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ (23:33) یہ بھی تمہاری طرح روٹی کھاتا ہے، تمہاری طرح پانی پیتا ہے، تمہاری طرح رہتا سہتا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ چیز بٹھائی کہ ایسا کہنے والا کوئی مافوق البشر ہونا چاہیے۔ اس کی بات مانو۔ جو مافوق البشر نہیں ہے اس کی بات کیا ماننی! کیونکہ وہ کسی حیثیت سے بھی ممتاز نہیں ہے۔ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلُكُمْ إِنَّكُمْ إِذَا لَخَسِرُونَ (23:34) اگر تم نے اس اپنے ہی جیسے انسان کی اطاعت اختیار کر لی، تو سمجھ لو کہ تم تباہ ہو گئے اور ہماری اطاعت تو تم اس لیے کرتے ہو کہ ہم بڑے ہیں، کرنی چاہیے مگر وہ تو مِثْلُكُمْ ہے یعنی تمہارے ہی جیسا انسان ہے۔ جو تمہارے جیسا ہے اس کی اطاعت چہ معنی دارد۔ اطاعت تو بڑوں کی کیا کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہتا کہ میں کوئی بڑا انسان ہوں۔ یہی چیز اس کے خلاف پیش کی جا رہی ہے: مِثْلُكُمْ یہ آپ کے جو خواص ہیں، اپنے آپ کو عوام میں سے نہیں کہلاتے۔

سرکش اکابرین کہتے تھے کہ دولت ہمارے پاس، اقتدار ہمارے پاس، ہم جو چاہیں کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں لیکن یہ رسول کہتا ہے کہ نہیں! خدا کا قانونِ مکافات ایسا ہے جس کی گرفت سے تم بچ نہیں سکتے حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں جاسکتے۔ یہ سرکش اکابرین کہتے ہیں کہ اَيَعِدُّكُمْ أَنْكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنْكُمْ تُخْرَجُونَ (23:35) یہ تمہیں دھمکیاں دیتا رہتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تم پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے۔ مرنے کے بعد پھر ایک ایک بات کا حساب کتاب دینا ہوگا، وہاں عدالت میں جاؤ گے، ذرا سوچو کہ هِيَآتْ هِيَآتْ لِمَا تُوْعَدُونَ (23:36)۔ اس نے انہوں نے بات کہدی! کیسی عقل و قیاس سے بعید بات ہے جس سے یہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔

عزیزانِ من! زبان سے کوئی یہ نہ بھی کہے مگر کیا آج عملاً ہماری زندگی یہی نہیں ہے؟ ناجائز طریقے پر یہ کچھ خریدتے ہوئے کیا کسی کو بھی یہ خیال آتا ہے؟ اگر وہ سوسائٹی کے قانون کو Satisfy (راضی) کرتا ہے یا اس کا انتظام کر لیتا ہے کہ قانون کی گرفت میں نہ آئے تو معاشرے میں اس کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ کیا کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اس کے بعد اس کا کوئی حساب دینا ہے؟ جس کو یہ خیال آ جائے گا وہ

① یہ مثل ہے ”مصیبت زدہ کو اور ایذا پہنچانا“

کبھی بھی خواہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے اور خواہ معاشرے میں قانون بھی نہ ہو وہ کبھی یہ نہیں کہے گا مگر وہ تو یہ کہتا ہے کہ اِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ (23:37) زندگی یہی اسی دنیا کی زندگی ہے اور بس۔ یہیں بچے پیدا ہوتے ہیں یہیں ہمارے سامنے لوگ مر جاتے ہیں اللہ اللہ خیر سلا! <sup>1</sup> لہذا یہ غلط ہے کہ ہم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جائیں گے۔ <sup>2</sup> جیسا کہ یہ داعی انقلاب کہہ رہا ہے کہ صاحب! اس کے بعد حساب کتاب دینا ہوگا اور تمہارا کہنا یہ ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

اس کی کچھ نہ مانو۔ اِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا (23:38) یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طرف سے جھوٹی باتیں بناتا ہے اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے حالانکہ وہ یہ کچھ نہیں کہتا وہ تو خدا کی طرف سے باتیں کر رہا ہے اور خدا نے جو کچھ کہا ہے وہ بتا رہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ (23:38) ہم اس کی بات کبھی نہیں مانیں گے۔ جو مرضی کر لو ہم کچھ نہیں مانیں گے۔ اس پر قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُون (23:39) اس رسول نے نصرتِ خداوندی کو پکارا اے میرے پروردگار! یہ لوگ میری بات سنتے ہی نہیں اور اندھا دھند تکذیب کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے اے صحیح نظامِ خداوندی! آؤ ذرا میری مدد کرو۔ مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ذرا ان کی خبر لی جائے۔ اس کی چھوٹی سی ہی جماعت تھی۔ وہ وہاں سے کسی دوسری جگہ جا کر صحیح نظام کو قائم کرتا ہے۔ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لِّيُصْبِحَنَّ نَدِمِينَ (23:40) خدا نے کہا کہ عنقریب ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آ جائیں گے۔ کچھ لمبا عرصہ نہیں لگے گا۔

عزیزانِ من! اب پھل پک چکا۔ نظر آتا ہے کہ انبیائے کرام آتے ہی اس وقت تھے جب یہ چیز شدید شدت تک پہنچ جاتی تھی نظام آخر تک چلا جاتا تھا کہ اب کچھ زیادہ دیر کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد تم دیکھو گے کہ تم اپنی اس روش پہ کس قدر نادام اور پشیمان ہوتے ہو جس پہ آج اتنا اترا رہا ہے۔ چنانچہ وہ وقت گزرنے نہ پایا تھا کہ فَآخَذْتَهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً (23:41) خدا کے عذاب کی گرفت نے انہیں آ پکڑا۔ اور ہم نے انہیں خس و خاشاک کی طرح پامال کر دیا۔ وہ چار الفاظ ہیں۔ کہا کہ یہ ’جویوں اتنے بڑے بنے پھرتے تھے یہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ گئے‘۔ فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (23:41) سودیکھو کہ یہ لوگ جو ظلم و استبداد کی روش اختیار کرتے ہیں وہ کس طرح زندگی کی کامرانیوں اور خوشگوار یوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ محرومیاں کیوں ہوئیں؟ اس لیے کہ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے تھا اسے یہ وہاں نہیں رکھتے۔ عربی زبان میں

1 فراغت ہوئی، فرصت ملی، اور کچھ نہیں۔

2 مادی تصورِ حیات (Materialistic Concept of Life) کچھ ہمارے ہی دور (Period) کی اختراع نہیں ہے۔ یہ تصور بہت پرانا ہے۔

ظلم کے معنی یہ ہیں۔ لہذا کہا کہ یہ کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُونًا الْخَرِينَ (23:42) پھر ان کے بعد ہم نے اور قوموں کا دور شروع کیا۔ قوم نوح ♦ کو قوم عاد کو قوم ثمود کو تم نے دیکھا۔ ان کے بعد پھر اسی طرح سے قومیں آئیں اور اسی طرح سے پھر یہ سارا کچھ ہوتا رہا۔ وہ اختلافات مٹانے کے لیے آتے رہے یہ اختلافات پیدا کرتے رہے۔ اتنا لمبا وقت تو اس قوم کو لگ جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کوئی پروسیس (عمل) بھی ہو اس کے متعلق کسی سائنسٹ سے پوچھیے کہ کتنا لمبا عرصہ لگتا ہے۔ وہ لیبارٹری میں یہ کچھ کر رہا ہوتا ہے کہ یہ یہاں ملاؤ یہ یہاں کرو اسے اتنے ٹیمپریچر (درجہ حرارت) پر اتنے دن رکھو اتنا یہ کچھ کرو۔ بڑا لمبا پروسیس (عمل) ہوتا ہے۔ آخر میں پھر ایک وہ مرحلہ آ جاتا ہے جس میں وہ سارا پروسیس (عمل) ختم ہو جاتا ہے تو پھر اس میں اچانک وہ نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے جو اس وقت تک لیبارٹری میں کیا گیا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ میرے سامنے ٹیسٹ ٹیوب کے اندر یہ یونہی پانی سا تھا اس کے اندر ہم نے یوں دیکھا تو اس سے یہ کچھ بن کر نکل آیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ یونہی اسی وقت بن کر نہیں نکل آیا۔ اس میں بڑا لمبا عرصہ لگتا ہے۔ یہ قوموں کے ان جرائم کا Accumulative Effect (مجموعی اثر) ہوتا ہے لیکن جب وہ نقطہ سامنے آ جاتا ہے تو پھر اسے کوئی قوت بھی روک نہیں سکتی۔ اس لیے کہا کہ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ<sup>①</sup> (23:43)۔ نہ تو ایک سیکنڈ پہلے اس ٹیسٹ ٹیوب میں سے رنگ بدلتا ہے اور نہ ہی اس میں ایک سیکنڈ کی تاخیر ہوتی ہے۔ خدا کا یہ قانون ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ اس کے بعد یہ کہا کہ پھر ہم نے اور رسول بھیجے اور یہ سلسلہ آگے چلتا جا رہا ہے۔ یہی جو ان کے ہاں کی تفریقات ہیں اور جو طبقاتی چیزیں ہیں انہی کو مٹانے کے لیے یہ سلسلہ چلا آ رہا<sup>②</sup> ہے۔

عزیزانِ من! آج وقت ہو گیا۔ ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 43 تک آ گئے۔ 44 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



① یاد رکھو! ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے نہ تو کوئی قوم ظہورِ نتائج سے پہلے تباہ ہوتی ہے اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ظہورِ نتائج کے بعد زندہ رہ سکے۔ اس

میں کمی پیشی ہو نہیں سکتی (5:15; 13:38; 7:34) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 780)۔

② انبیائے کرام کا یہ سلسلہ رشد و ہدایت ہمارے نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوا۔



## نواں باب: سورۃ المؤمنون (آیات 44 تا 49)



عزیزانِ من! آج جمعہ کا دن ہے اور جولائی 1977ء کی پہلی تاریخ ہے۔ قرآن کریم کا یہ درس قریب پچیس سال<sup>①</sup> سے جاری ہے۔ پہلے کراچی میں تھا، 1958ء میں جب میں منتقل ہو کر لاہور آیا تو اس کے بعد سے یہ یہاں مسلسل جاری ہے۔ چونکہ دفاتر وغیرہ میں تعطیل اتوار کو ہوتی تھی، اس لیے درس بھی اتوار کی صبح کو ہوتا تھا۔ اب حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ تعطیل اتوار کے بجائے جمعہ کو ہوا کرے گی، اس لیے ہم نے بھی درس کا یہ دن اتوار کی بجائے جمعہ مقرر کر لیا ہے اور آج پہلا ہی جمعہ ہے کہ جب اتوار کے بجائے جمعہ کو تعطیل ہو رہی ہے اور اس پہلے جمعہ کو ہی ہم درس کا بھی آغاز اس کے مطابق یعنی اتوار کی بجائے جمعہ کو کر رہے ہیں۔ آئندہ بھی یہ بتوفیق ایزدی جمعہ کی صبح ہی کو ہوا کرے گا جب تک یہ تعطیل جمعہ کی رہے گی۔

① ان ہفتہ واری دروس قرآن کی مکمل تاریخ کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2006ء، ص 29 تا 30؛ نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ الفاتحہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2007ء، ص 49 تا 51 اور انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

## اپنے اپنے دور میں انبیائے کرام کی تعلیم کا خلاصہ

درس کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 44 سے ہوتا ہے: (23:44)۔ پچھلے اتوار کو بارش کی وجہ سے باقاعدہ درس نہیں ہوا تھا، اس لیے تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ موضوع زیر غور یہ ہے کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد کیا تھا؟ خدا کی طرف سے وحی کی رو سے یہ ہدایات کس مقصد کے لیے دی گئی تھیں؟ میں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم نے خود اسے واضح کیا ہے کہ نوع انسان پہلے بغیر کسی قسم کی تفریق کے ایک قوم، ایک امت، اور ایک برادری کی حیثیت سے رہتی تھی اس میں اختلافات، تفرقات، طبقات نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد انسانوں نے اس میں اختلافات پیدا کیے اور ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور انبیائے کرام کی تشریف آوری ہوئی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس وحی کے ذریعے جو خدا انہیں عطا کرتا تھا، وہ انسانوں کی پیدا کردہ اس تفریق کو اختلاف کو مٹا کر پھر سے نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا دے۔ انبیائے سابقہ کی تمام کتابوں اور اقوام گزشتہ کی تاریخ کے احوال و ظروف قرآن کریم نے خود بیان کیے ہیں اور وہاں بتایا ہے کہ ہر نبی اپنے دور میں جو بین اختلاف انسانیت کے اندر پیدا ہو گئے تھے اپنے دائرہ کے اندر ان کو مٹانے کی کوشش کرتا تھا۔

اس سلسلے میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، یعنی قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود کی داستانیں ہمارے سامنے پہلے آچکی ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت نوح نسلی امتیاز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے آئے۔ حضرت ہود نے یہ کہا کہ ایک قوم محض قوت کے زور پر دوسری قوموں کو دبا کر اپنا محکوم بنا لیتی ہے اور ان پہ ظلم اور استبداد کرتی ہے یہ تفرقہ مٹنا چاہیے۔ حضرت صالح کے دور میں یہ بات بتائی گئی کہ یہ جو جاگیردار طبقہ زمینوں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اسے اپنی ملکیت تصور کرتا ہے اور غریب چرواہے آج کی اصطلاح میں انہیں کاشتکار یا مزارع کہیے گا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا، یہ بالکل غیر فطری چیز ہے خدا کی منشا کے خلاف ہے۔ وہ اسے مٹانے کے لیے آئے۔

عزیزانِ من! اس تک کے سلسلہ رشد و ہدایت کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ **ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا** (23:44) اسکے بعد پھر رسولوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور وقفے وقفے کے بعد عند الضرورت ایک رسول کے بعد دوسرا رسول آیا **كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةٌ رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ** (23:44) رسول آتا رہا، وہ تفرقہ مٹانے کی کوشش کرتا رہا، اس کی قوم نے اس کی تکذیب کی، اس کی بات نہیں مانی، اس کی مخالفت کی، اس نے اس کی پیش کردہ تعلیم کی تکذیب کی **فَاتَّبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا** (23:44) چنانچہ وہ جو اس سے پہلے ان قوموں کا حال ہوا تھا، اس تکذیب اور اس انکار اور سرکشی کی وجہ سے یہی انجام ہر قوم کا ہوتا رہا۔ قرآن کریم نے دو الفاظ میں بات کہہ دی

کہ **وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ** (23:44) پھر انکے افسانے باقی رہ گئے، قومیں ختم ہو گئیں، اس کے نتیجے میں وہ یکے بعد دیگرے ہلاک ہوتی رہیں۔ **فَبَعْدًا لِّقَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ** (23:44) ان اقوام کی تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کر دیتے ہیں اور اپنی غلط روش پر اڑے رہتے ہیں، وہ زندگی کی خوشگوار یوں اور کامرانیوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس طرح جو قوم بھی خدا کے اس بنیادی اصول سے انکار کرے گی، وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم ہو جائے گی۔ یہ کہنے کے بعد قرآن کریم فرعون<sup>1</sup> کے زمانے تک آ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ **ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ . اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَٓئِہٖ** (23:45-46) اسی پروگرام کے مطابق ہم نے موسیٰ ♦ کو اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنے واضح قوانین، مضبوط دلائل کے ساتھ فرعون اور اس کے اکابرین کی طرف بھیجا۔ دونوں بھائیوں نے اُن کے سامنے ہمارا سچا دین پیش کیا لیکن **فَاسْتَكْبَرُوا** (23:46) فرعون (اور اس کے ملاء) نے قوت کے نشے میں مدھوش ہو کر اس سے سرکشی اور تکبر برتا۔ **وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ** (23:46) وہ تھے ہی بڑے سرکش، مغرور اور بخود غلط۔

عزیزانِ من! قرآن کریم میں یوں تو مختلف انبیائے کرام کی داستانیں اور ان کی قوم کے قصے آتے ہیں لیکن جس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ قوم بنی اسرائیل کا قصہ اور فرعون کی داستان ہے یا کشمکش صاحبِ ضربِ کلیم یعنی حضرت موسیٰ ♦ اور فرعون کی داستان ہے، کسی دوسری قوم کی یا دوسرے نبی کی داستان اس تفصیل سے نہیں آئی<sup>2</sup>۔ اس کی خاص اہمیت ہے۔ پہلی قوموں کے اندر ہم نے یہ دیکھا ہے کہ ایک اختلافی چیز تھی، ایک طبقاتی چیز تھی۔ اس میں ایک نئی چیز سامنے آتی ہے یعنی پہلے یہ چیز تھی کہ وہ قوم اپنے دائرے کے اندر ایک قوم ہوتی تھی، نسل کی جہت سے تو پھر بھی وہ ایک قوم تھی، وطن کی جہت سے بھی وہ ساری کی ساری ایک قوم تھی۔ یہاں ایک بالکل نئی چیز آتی ہے کہ ایک وطن کے اندر رہنے والے بھی ایک قوم کے افراد نہیں ہیں۔ آج کی اصطلاح میں، جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے افراد آج بھی قومیت کے معیار کے مطابق ایک قوم تصور کیے جاتے ہیں، مگر فرعون کی یہ داستان یہ چیز نہیں ہے۔ میں عرض کروں گا کہ اس اعتبار سے قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ داستان بنی اسرائیل ہمارے حالات پر منطبق ہوتی ہے۔ ایک مملکت کے اندر ایک ہی خطہ زمین ہے، اس کے اندر کچھ لوگ بستے ہیں، اس کے اندر بھی یہ تفریق ہے کہ ایک سلطان قوم ہے اور دوسری محکوم قوم یعنی بجائے اس کے کہ چلیے

<sup>1</sup> فرعون اور خاندانِ فرعون کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء، ص 119، نیز فٹ نوٹ 1، نیز پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیر نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورہ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2004ء، ص 109 اور فٹ نوٹ 1۔

<sup>2</sup> اس تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء

جغرافیائی حدود معیار مقرر کر لیجیے اس کے اندر بسنے والی تو ایک قوم ہو جائے۔ نہیں یہاں فرعون کی داستان میں جو چیز پہلی بار ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس ایک ہی خطہ زمین کے اندر بسنے والے جو لوگ ہیں وہ بھی باہمی طور پر تقسیم کیے گئے ہیں۔ ایک حاکم قوم ہے دوسری محکوم۔ یعنی وہی دوسری محکوم قوم یہاں اچھی خاصی تعداد میں بس رہی ہے گویا یہ ایک نئی چیز پہلی بار ہمارے سامنے آئی ہے۔ آج ہمارے سامنے تو ایک خطہ زمین کے اندر بسنے والے ایک ہی قوم تصور کیے جاتے ہیں ان میں طبقاتی تفریق بھی ہوتی ہے مگر یہاں یہ ایک الگ چیز آئی ہے اور عجیب طرح سے موثر ہے۔ آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ بڑی ہی موثر ہے۔ اگر اس طرح دیکھا جائے تو یہ پورا واقعہ ہمارے واقعات پر منطبق ہوتا ہے۔

### فرعون کا سب سے موثر حربہ، قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرنا تھا

اس کے لیے فرعون کرتا کیا تھا؟ کس طرح یہ اپنا بیلنس (توازن) قائم رکھتا تھا؟ کس طرح اپنا غلبہ قائم رکھتا تھا؟ یہ ہے جسے حکمت فرعون یا میکاوی سیاست کہا جاتا ہے اور جو آج کے ہمارے زمانے میں عام روش ہو گئی ہے۔ آپ سوچیے تو سہی کہ ایک شخص جسے بادشاہ کہا جاتا تھا، آج کی اصطلاح میں اسے آپ ڈکٹیٹر کہہ لیجیے، حاکم کہہ لیجیے یا چند نفوس کا ایک گروپ ہی سہی، یہ ایک گروہ ہزاروں نہیں لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں پر حکومت کر رہا ہے۔ وہ ہر باشندے کے سر پر ایک سپاہی تلوار یا شمشیر دے کر یا بندوق دے کر کھڑا نہیں کر سکتا۔ یہ سیاست ابلیسی ہے۔ اس کی بنا یہ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے عزیزانِ من! یہ جو داستان ہمارے سامنے آرہی ہے اسے بڑے غور سے سنیے گا کہ ارے دل! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے۔ یہ فرعون کرتا کیا تھا؟ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَ اِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ (10:83) فرعون اپنی مملکت میں بڑا ہی سرکش اور مستبد تھا۔ اس نے بہت بڑی قوت حاصل کر لی تھی اور جو لوگ اس کے مخالفین کے ساتھ جاملیں ان سے انتقام لینے میں کسی حد پر رکنے والا نہیں تھا۔

اسے یہ قوت کیسے حاصل ہو گئی تھی؟ وہ اس قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا تھا۔ غور فرمائیے، عزیزانِ من! بنیادی بات قرآن نے بتادی کہ اس حکمت فرعون کا راز یہ تھا کہ وہ اس محکوم قوم کے اندر پارٹیاں بناتا تھا اور پھر پارٹیاں بنانے کے بعد کبھی ایک پارٹی کو کمزور کرتا اور دوسری کو اوپر چڑھا دیتا، غور فرمایا آپ نے! عزیزانِ من! اس تین چار ہزار سال ق م کے عرصہ میں اسے اگر آپ کم از کم چار ہزار سال ق م بھی کہہ لیں، تو بھی ذہن انسانی نے چکر کاٹ کے پھر پھر کے اتنا کچھ تباہیوں کے بعد جو نظام حکومت جاری کیا، وہ جمہوریت ہے اور جمہوریت کی بنا ہی یہ ہے کہ وہ کم از کم دو پارٹیاں بنائے یعنی جمہوریت تصور میں ہی نہیں آتی اگر پارٹیاں نہ ہوں کہ صاحب Majority (اکثریت) کا تو ہونا ضروری ہے یا آج کی اصطلاح میں اپنے Division کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی اس قوم کے اندر مستقل طور پر کچھ

لوگ ہوں جن کا کام ہی یہ ہو کہ وہ ان کو Oppose (مخالفت) کریں۔ اسے جمہوریت مسلمہ مانا جا رہا ہے، خدا کی رحمت تصور کیا جا رہا ہے، اس پر فخر کیا جا رہا ہے کہ صاحب! انسانوں نے بالآخر وہ راز ڈھونڈ لیا اور راز یہ ڈھونڈ لیا کہ وہاں تو پھر بھی کبھی چانس ہو سکتا تھا کہ ایک ملک میں بسنے والی ایک قوم بن جائے۔ یہاں بنیاد ہی یہ ہے کہ جمہوریت کے لیے ہر وقت کم از کم دو پارٹیوں کا وجود لازم ہے، جب تک اپوزیشن ایوان میں نہیں بیٹھی گی، وہ حکومت کر نہیں سکتی۔ اپوزیشن کی وجہ سے اب وہ جوان کے ہاں ویٹو پاور ہے، وہ آگیا ہے، ذرا سا ادھر سے، کچھ توڑ کے ادھر لے گئے، ادھر سے توڑ کے ادھر لے گئے۔ اس طرح حزب اقتدار پارٹیوں کو کمزور کرتا رہتا ہے یا کسی کو اوپر چڑھاتا رہتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے! یہ سیاستِ فرعونی ہے اور یہ بات کوئی چار ہزار سال (ق م) کی نہیں ہو رہی، آج بھی یہی ہے:

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات <sup>①</sup>

یعنی وہی جو قرآن نے کہا تھا کہ ان اختلافات کو مٹانے کے لیے وحی بھیجی پڑی۔ عزیزانِ من! اس سے پتہ چلتا ہے کہ عقل و فکر انسانی تنہا اس قابل ہی نہیں کہ اس مسئلے کو حل کر سکے۔ آپ یہ دیکھ لیجئے کہ فکر انسانی کم از کم چھ ہزار سال کے پیہم تجارب کے بعد بطور ایک کسوٹی ابھری ہے۔ یہ مختلف حکومتی طریقوں کو آزما کر، تجربے کر کے، غلط اقدامات کو چھوڑ کر اور صحیح نتائج کو اختیار کر کے، آخر میں جمہوریت کے نظام پہ پہنچتی ہے جو بالآخر وہی حکمتِ فرعونی ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ فرعون عوام کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا تھا اور پھر کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھاتا تھا اور کبھی دوسری پارٹی کو۔ اگلی بات یہ ہے کہ جس محکوم کے اندر وہ دیکھتا تھا کہ اس میں ایسے انسان پیدا ہو رہے ہیں جن میں جوہر انسانیت ہے، جن میں کچھ غیرت ہے، کچھ حمیت ہے، جنہیں آپ اپناے قوم کہتے ہیں، وہ انہیں ذبح کر دیتا تھا۔ ذبح کرنے کے معنی سر قلم کر دینا نہیں ہوتا، اس کے معنی ”کمزور کر دینا، ضعیف کر دینا، ایسی کیفیت میں مبتلا کر دینا کہ وہ مؤثر نہ رہیں“۔ کسی کو غیر مؤثر کرنے کے لیے عربی زبان میں قتل اور ذبح کا لفظ آتا ہے۔ نظر آتا تھا کہ ان میں جو ذرا باصلاحیت و باحمیت لوگ ہیں، وہ انہیں غیر مؤثر بنا دیتا تھا۔

فرعونی سیاست میں سرفرازی یا حمیت کا اظہار موت کو دعوت دیتا ہے

اس طرح غیر مؤثر بنانے کے لیے میں باغ کے مالی کی مثال دیا کرتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جونہی اس نے دیکھا کہ کسی اچھی بھلی، ہری بھری، بڑی خوبصورت کوئیل نے ذرا سر اوپر نکالا، اس نے اُسے وہیں کڑچ <sup>②</sup> کر دیا کیونکہ وہ کوئیل اس کے ذہن و تصور کی Shape (شکل) کے مطابق نہیں رہتی، اس سے کوئیل کا سر ذرا اونچا ہو جاتا ہے۔ یہ ہے فرعونی سیاست۔ وہ اس قوم کو زندہ رکھنا چاہتا ہے

① بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات (اقبال: ضربِ کلیم)

② کاٹ کر رکھ دیا۔

اس لیے کہ اگر زندہ نہ رکھے تو حکومت کس پہ کرے۔ حکومت تو محکوم کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یعنی حاکم کا تصور نہیں ہوتا جب تک محکوم ساتھ نہ ہو۔ وہ اپنے محکوم لوگوں کو حکومت کرنے کے لیے ضرور زندہ رکھتا تھا۔ مالی کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ باغ کی شاخیں اس کے نقشے کے مطابق ہری بھری رہیں اور جنہیں دیکھے کہ ابھر رہی ہیں وہ انہیں وہیں کاٹ کر رکھ دے۔ فرعون یہ دیکھتا تھا کہ جن میں جوہر نہیں ہیں وہ انہیں اوپر لے آتا تھا قتل عربوں کا یہ محاورہ ہے یعنی جوہر مردانگی و حمیت کو ختم کر دینا۔ اس جوہر مردانگی کے محاورے سے عورت کی تحقیر اور تذلیل مقصود نہیں ہوتی۔ یہ محاورہ کہا جاتا ہے۔ فرعون دیکھتا تھا کہ جن میں قوت اور جوہر مردانگی ہے وہ ابھر رہے ہیں وہ انہیں فوراً ذلیل و خوار کر دیتا تھا تاکہ اس جوہر کی نمود نہ ہو سکے۔ وہ صرف انہیں آگے لاتا تھا جنہوں نے چوڑیاں پہن رکھی ہوتی تھیں یعنی ان میں سرفرازی اور حمیت نہیں تھی۔ غور فرمائیے یہ سیاست فرعون کی کیا ہے۔ کیا آج آپ کے ہاں یہی سیاست نہیں ہے؟ یہ ہے اس کی ابتدا۔ یہیں قرآن نے کہا ہے کہ إِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْأَرْضِ<sup>①</sup> (10:83)۔ اس کا راز یہ ہے کہ ایک طبقہ ضرور محکوم رہے۔ محکوم طبقے میں پارٹیاں بناتے چلے جائیے۔ کبھی اس کو ابھارا، کبھی اُس کو چڑھایا، کبھی اس کو نیچا کیا اور ان میں سے جس میں دیکھا کہ ذرا سرفرازی ہے یعنی سرا بھارنے کی تھوڑی سی بھی صلاحیت یا حمیت یا خواہش یا آرزو پیدا ہوئی ہے اسے کڑی کر کے رکھ دیا، یعنی اس کو آگے نہیں بڑھایا، جنہوں نے وہی محاورہ چوڑیاں پہن رکھی ہوں انہیں ابھار کر آگے بڑھا دیا۔ قرآن اس مظہر (Phenomenon) کے لیے لفظ فساد لایا ہے۔ دیکھیے یہ لفظ کہاں لایا ہے۔<sup>②</sup>

قرآن میں آپ نے دیکھا کہ فساد کسے کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ ”دنگا فساد“ یا وہ ”جھگڑاؤ گڑا“ ہی ہوتا ہے ”فسد“ کے معنی ”ناہمواریاں پیدا کرنا ہوتا ہے“ اور اصلاح کے معنی ”ہمواری پیدا کرنا ہوتا ہے۔“ کہا کہ یہ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں اور انہیں دور کرنے کے لیے خدا کی طرف سے انبیائے کرام □ کے توسط سے وحی آتی تھی۔ انبیائے کرام □ وہ انقلاب لاتے تھے جس کی رو سے یہ فساد اصلاح میں بدل جائے یہ ناہمواریاں ہمواریوں میں تبدیل ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ سیاست کی رو سے تو وہ ایسا کرتا تھا۔ سیاست کی

① فرعون اپنی مملکت میں بڑا ہی سرکش اور مستبد تھا (پرویز: مفہوم القرآن ص 481)۔

② إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْأَرْضِ وَ جَعَلَ أَهْلَهَا شِيعًا یَسْتَضِعُّ طَائِفَةً مِنْهُمْ یُدْبِحُ أَبْنَاءَ هُمْ وَ یَسْتَحِی نِسَاءَ هُمْ ط إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (28:4)۔ واقعہ یہ تھا کہ فرعون نے اپنی مملکت میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لیے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا اس کے لیے اس کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہر مردانگی نظر آتے، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا اور جوان جوہروں سے عاری ہوتے انہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح اس قوم کے اندر ناہمواریاں پیدا کر کے ان کی قوت کو توڑتا چلا جاتا (25:40; 141:7; 49:2) (پرویز: مفہوم القرآن ص 883)۔

روسے یہ بڑھاؤ چڑھاؤ ہو بھی سکتا تھا لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنی بڑی تعداد کے اندر لوگ اس قسم کے استبداد کو ظلم کو نا انصافیوں کو برداشت کرتے چلے جائیں؟ قرآن کہتا ہے کہ اس کے لیے وہ محکوم طبقے میں پارٹیاں بناتا چلا جاتا تھا۔ معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرنے والی تکنیک استعمال کیا کرتا تھا۔

### فرعون کا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار دوسروں کی روٹی پر قبضہ تھا

عزیزانِ من! یہ میں آگے بناؤں گا کہ جب حضرت موسیٰؑ گئے اور انہوں نے جا کر اپنا یہ مطالبہ پیش کیا تو اسے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ یہ ایک شخص آ گیا ہے۔ یہ اس قوم کو ابھاردے گا، اس کے جوہر مردانگی میں نکھار پیدا کرے گا، تو اس نے پروپیگنڈہ شروع کیا، وہ حضرت موسیٰؑ کی انقلابی تحریک کے بڑھتے ہوئے اثرات سے اس قدر خائف تھا کہ **وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي أَفَلَا تُبْصِرُونَ** (43:51) وہ ملک میں اس قسم کے اعلان کرتا رہتا تھا کہ اے میری قوم! کیا میں ملک مصر کا مالک نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں جو میرے انتظام کے ماتحت چل رہی ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دارومدار ہے، میری نہیں ہیں؟ کیا تم ان باتوں پر غور نہیں کرتے؟ یہاں سے وہ بات آگئی کہ پروپیگنڈہ سے کس طرح ایک اتنے بڑے طبقے کو محکوم رکھا جاتا ہے؟ کیسے اس کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا جاتا ہے؟ کہ وہ راز کیا ہے۔ وہ راز ہے روٹی پر قبضہ، اسے اپنے ہاتھ میں رکھنا۔ یہاں بات سمجھ میں آگئی کہ اگر تم نے ذرا سرکشی برتی تو پتہ ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک وقت کیلئے روٹی کھانے کو نہیں ملے گی۔ اس لیے عقل و ہوش سے کام لو، اس معاملے کو سوچو کہ بات کہاں تک جائے گی، کس کی باتوں میں آ رہے ہو۔ **أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ** <sup>①</sup> (43:52)۔ اسی بنا پر دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ **أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَىٰ** <sup>②</sup> (79:24)۔ کہا کہ رب پرورش کرنے والا ہے اور میں ہوں جو سب سے اعلیٰ ہے، یہ چھوٹے چھوٹے دوکاندار، یہ ڈپو راشن والے، یہ فوڈ والے، تمہیں یہ چیزیں نہیں دیتے۔ یہ سارے کے سارے میرے اس انتظام کی وجہ سے دیتے ہیں۔ رزق کے سرچشموں پر میں ہوں۔ **أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَىٰ** میں تمہاری پرورش کرتا ہوں، کھانے پینے کو میں دیتا ہوں، میں ہی تمہارا ”ان داتا“ ہوں۔ اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ **أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَىٰ** <sup>②</sup> ہے اور حقیقت میں غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑنے کا یہی راز ہے۔ فرعون کا کہنا تھا کہ یہ جو موسیٰؑ کہتا ہے کہ تمہارا نشوونما دینے والا خدا ہے، یہ غلط ہے۔ وہ رزق کے سرچشموں کے اوپر اپنا قبضہ جماتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ **أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَىٰ** <sup>②</sup> (79:24)۔ فرعون نے اپنے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص تمہیں بھڑکانے اور اکسانے کے لیے آیا

① کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں اس شخص کے مقابلے میں کس قدر بہتر اور برتر ہوں جو ہماری محکوم قوم کا ایک فرد ہے اس لیے نہایت پست اور کمزور۔ پھر یہ ایسا دہقانی اور گنوار ہے کہ اسے کھل کر بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں آتا (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1150)۔

② تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا میں ہوں (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1410)۔

ہے۔ سنو: اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِيْنٌ وَلَا يَكَاذُ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ (43:52) کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں اس شخص کے مقابلے میں کس قدر بہتر اور برتر ہوں جو ہماری محکوم قوم کا ایک فرد ہے نہایت پست اور کمزور ہے، دہقانی اور گنوار ایسا کہ کھل کر بات کرنے کے اسلوب سے بھی ناواقف ہے؟ اس کے پاس کیا ہے؟ کچھ نہیں۔

### حضرت موسیٰ ♦ کی زبان میں لکنت کا معاملہ اور حضرت ہارون ♦ کی رفاقت کی التجا

آپ کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ ♦ اتنا عرصہ باہر گاؤں میں دیہات میں صحرائیں جنگلوں میں رہے تھے۔ آپ ♦ نے اللہ تعالیٰ سے یہ کہا تھا کہ مجھے فرعون کی طرف بھیج تو رہے ہو وہ بڑی قوت کا مالک ہے ان کے ہاں اگر مناظروں مباحثوں کے اندر آ گیا تو کیا ہوگا۔ تو جانتا ہے کہ میری زبان میں لکنت ہے <sup>1</sup>۔ میں وہیں کا تو رہنے والا ہوں اس لیے رَبِّ اَشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ . وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ . وَاَحْلِلْ غَلْظَةَ مِّنْ لِّسَانِيْ . يَفْقَهُوا قَوْلِيْ (20:25-28) اے میرے نشوونما دینے والے! یہ مہم بڑی سخت ہے اس کے لیے تو میرے سینے میں وسعت اور کشاد عطا کر دے۔ اور جو دشواریاں میری راہ میں آئیں انہیں مجھ پر آسان کر دے اور میری زبان میں ایسی طاقت اور روانی پیدا کر دے کہ میں تیرے پیغامات کو بطریق احسن فریق مقابل تک پہنچا سکوں اور میری بات ان کی سمجھ میں آ جائے اور سیدھی ان کے دل تک اتر جائے۔ چونکہ یہ مہم مشکل ہے اس لیے وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ . هٰزُوْنَ اٰخِيْ . اَشْدُّ بِهِ اَژْدِيْ . وَ اَشْرِكْهُ فِیْ اَمْرِيْ (20:29-30) میرے اہل خاندان میں سے میرے بھائی ہارونؑ کو میرے ساتھ کر دے تاکہ وہ میرا بوجھ بٹائے۔ اس کی مدد سے میری قوت مستحکم ہو جائے گی۔ وہ اس عظیم مہم میں میرا شریک کار رہے گا۔

حضرت موسیٰ ♦ کی زبان میں لکنت تھی (26:13)۔ لکنت کا بھی ہمارے ہاں بڑا عمدہ افسانہ ہے۔ بہر حال میں اس پر کیوں وقت ضائع کروں۔ ایک مدت تک مدین کے بیابانوں میں بدویت کی زندگی بسر کرنے سے آپ ♦ کی زبان میں وہ طلاق نہیں رہی ہوگی جو ایسے مواقع پر حسنِ خطابت کے لیے ضروری ہے۔ یہ عظیم مناظرہ ہوا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ہاں کی مذہبی پیشوائیت سامنے آئی ہے۔ اس میں تو یہ ساری چیزیں تھیں جو مناظرہ میں ہوتی ہیں۔ اس میں واقعی بڑی ضرورت تھی۔ اس کا صحیح اندازہ حضرت موسیٰؑ نے لگایا تھا جب فرعون نے کہا تھا کہ اس کی حالت کو دیکھو اور کہتا یہ ہے میں خدا کی طرف سے آیا ہوں۔ خدا کی طرف سے آتا تو اس کے ساتھ فرشتے ہونے چاہئیں اور میرے مطابق ان کے ہاں نورتن ہونے چاہئیں اور وہ ایرانیوں کے ہاں بھی پرانے زمانے کے اندر یہ چیز تھی۔ وہ صاحب کنگن ہوتے تھے۔ انہیں نورتن کہا جاتا ہے۔ رتن کی ایک نشانی ہوتی تھی سونے کا کنگن۔ وہ ان کو پہنایا جاتا تھا۔ فرعون نے کہا کہ خدا کی طرف سے اس کا ایک بہت بڑا، کم از کم سونے کا، کنگن بھی ہونا چاہیے کوئی فرشتوں کی قطار ساتھ ہونی چاہیے۔ چلے آئے صاحب! وہاں پہ اور آ کر کہنے لگے کہ ہاں صاحب! میں خدا کا پیغام لایا ہوں۔

1 یہ تاریخ کے قیاسات ہیں۔



## فرعون کی سیاست اور پروپیگنڈا کی مشینری نے انسانی جذبات کو مدہوش کر دیا تھا

عزیزانِ من! فرعون نے ان کے خلاف اتنے زور سے ڈگڈگی بجائی، اتنے وسیع پیمانے پر موثر پروپیگنڈہ کیا، کہ قوم کو الو بنادیا۔ فرعون نے اس کے خلاف ان کی سٹی گم کر دی، وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہ رہی۔ پروپیگنڈہ یہ کرتا ہے۔ یہ عجیب نفسیاتی کیفیت ہے عزیزانِ من! مسلسل ایک جھوٹ کو اس طرح دہراتے چلے جائے اور نہایت زور و شور سے دہراتے چلے جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی اور اس کے لیے تو اب ہمیں کسی دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا تو ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ ایک طبقے کے جذبات کو اس طرح انگلیخت کیا جاتا ہے کہ وہ بالکل مدہوش ہو جاتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ اس مسلسل پروپیگنڈے سے قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہی۔ کیا بات ہے قرآن کی! عزیزانِ من! یہ بات کر رہا ہے چار ہزار <sup>1</sup> سال ق م کی، فرعون نے اس زور و شور سے پروپیگنڈہ کیا کہ ان کی عقل و فکر کو ماؤف کر دیا۔ اب آپ دیکھیے کہ قرآن نے کیا نقشہ کھینچا! ہمارے سامنے ایک ہی خطہ زمین کے اندر بسنے والے باشندے دو حصوں میں تقسیم ہو رہے ہیں: ایک حاکم قوم ہے، دوسری محکوم، محکوم قوم میں وہ پارٹیاں بناتا رہتا ہے، کبھی اس کو چڑھایا اور اس کو اتارا، اور کبھی اس کو چڑھایا اور اس کو اتارا۔ جن میں ذرا جوہر مردانگی ہوا، ان کو غیر موثر بنادیا اور جن کو دیکھا کہ اپنے مطلب کے ہیں، خوشامدی ہیں، ان کو آگے بڑھادیا اور یہ سارا کچھ کیا۔ اب یہ ہوئے عناصر ترکیبی کہ اچھے بھلے، اپنے جیسے انسانوں کو اپنا مطیع بنانے کے لیے ان کی پارٹیاں بناؤ، جن میں ذرا سا بھی سرفرازی کا جوہر دیکھو کڑچ کر کے رکھ دو، رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں رکھو، اور مسلسل پروپیگنڈہ کرتے چلے جاؤ۔ عزیزانِ من! اس سیاست ابلیسی کے عناصر ترکیبی دیکھ رہے ہیں۔ قرآن ایک لفظ میں کیا بات کہہ گیا۔ مسلسل پروپیگنڈے سے ان کی عقل و ہوش گم کر دی۔

## فرعون سے حضرت موسیٰ کا مطالبہ: ”قوم بنی اسرائیل کی آزادی“

حضرت موسیٰ نے آکر صرف اتنا کہا تھا کہ اُرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (26:17) تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔ راستے میں رکاوٹ نہ بنو، تم سے الگ ہو جاتے ہیں، بڑی وسیع زمین پڑی ہوئی ہے، تم یہاں خیریت سے حکومت کرو، لیکن یہ جو محکوم قوم ہے اس کو اجازت دو کہ یہ اپنے طور پر ایک خطہ زمین میں جا کر آپ خود بھی آزاد فضا میں سانس لے اور آزادی کی زندگی بسر کرے، تم بھی آزاد رہو یہ بھی آزاد رہے۔

① اس تمام کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005۔

## قوم موسیٰ ♦ کے روپ میں تحریک پاکستان کی کہانی تاریخ کی زبانی

یہ تھاجی مطالبہ۔ یہ کس قدر بے ضرر اور معقول سا مطالبہ ہے! اس میں ان کا کیا نقصان ہوتا ہے۔ ”نقصان کیا ہوتا ہے؟“ اسے آج سے پچاس <sup>①</sup> برس پہلے کے ہندو سے پوچھیے اور عزیزانِ من! یہاں سے ہم تحریک پاکستان پہ آ گئے۔ اس ایک خطہ زمین میں بسنے والے سارے انسان دو حصوں میں تقسیم تھے۔ وہ (ہندو) جمہوریت کا نام لیتے تھے، کسی اور نظام کا نہیں، گویا کہ یہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نظام ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ سیاست میں کتنے گھاگ تھے۔ یہ ایسی چیز ہے جس سے کوئی گلہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں ڈیموکریسی (جمہوری) نظام نہیں ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ یہاں ڈکٹیٹر شپ نہیں ہوگی، جمہوریت ہوگی یعنی یہ ایسی بات تھی کہ جو مانی پڑی، مانی پڑتی تھی، ساری دنیا کہہ رہی تھی کہ بھئی! بات تو ٹھیک ہے، اس جمہوریت کا نتیجہ آزادی تھا اور اکثریت ملک کے باشندوں کی حکومت ہوگی۔ لوگ اکثریت (Majority) اور اقلیت (Minority) میں بٹتے تھے اور مذہب کی بنا پر یہ جو مسلمان تھے، وہ اقلیت (Minority) میں رہتے۔ یہ ہندو مستقل طور پر اکثریت (Majority) میں۔ اقلیت تو اکثریت میں آ ہی نہیں سکتی۔ اس طرح مسلمان دوسرے کے اندر مستقل طور پر محکوم رہتے۔ یہ کس قدر ایک معصوم سی چیز تھی، کس قدر بظاہر غیر ضروری بات تھی، جسے ساری دنیا معقول مانتی تھی کہ یہاں ایک Democratic Rule (جمہوری طرز حکومت) ہوئی، ایک ہی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے سارے لوگ، ایک قوم ہوتے۔ نیشنلٹی (قومیت) جغرافیائی حدود پر ایک پوزیشن بن جاتی، ایک ملک کے اندر بسنے والے تمام انسان ایک ہی قوم ہوتے۔ ہندو ساری دنیا کو یہ کہتا تھا کہ بتاؤ، ہم کہاں باہر نکل رہے ہیں، ہم کونسی غیر معقول بات کر رہے ہیں؟ دنیا والو! سوچو تو سہی، یہ مسلمان لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہمیں ساری دنیا کہتی تھی کہ یہ صحیح بات کہہ رہے ہیں۔ یہ ایک قوم ہے اور اب اس ایک قوم کے اندر یہ لوگ یہ نہیں کہتے ہیں کہ ہم ہندو حاکم رہیں گے۔ اس کا سوال ہی نہیں۔ اس کے برعکس ہم مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ جغرافیائی حدود کی بنیاد پر یہ تقسیم غلط ہے۔ یہ ایک قوم نہیں۔ جب تک یہ مسلمان اپنا مذہب بدل کر ہندو نہ ہو جائیں، یہ اقلیت ہے، یہ اکثریت میں آ ہی نہیں سکتے تھے اور جب تک یہ مذہب نہیں بدلتے تھے، مستقل طور پر اقلیت میں رہتے تھے، وہاں ڈیموکریسی (جمہوریت) کے اعتبار سے، ڈیموکریسی کے خلاف اگر کبھی کوئی آواز اٹھاتے تھے تو وہ بغاوت ہو سکتی تھی۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا، عزیزانِ من! کہ یہ داستانِ بنی اسرائیل غور سے سنیے گا۔ یہ آپ کی داستانِ ہماری داستان، ہم پہ لکھی ہوئی ہے۔ وہاں جھگڑا ہی وہ تھا جو فرعون اور حضرت موسیٰ ♦ کا تھا۔ یہ جو محمد علی جناح (1876-1948) ہیں، زباں پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام

① یاد رہے یہ بات جولائی 1977ء کی پہلی تاریخ کو کہی گئی تھی۔

آیا! اللہ انہیں جنت عطا فرمائے! کہاں سے یہ لوگ آ جاتے ہیں! اس نے ان سے آ کر وہی کہا تھا جو حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا تھا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ① (26:17)۔ ان کو الگ ہونے کی اجازت دیدو تم اپنے گھر میں خوشی خوشی بسے رہو! ان کو الگ ہو کر بسنے دو۔ بات تو یہی کہی تھی۔ کوئی فرعون بھی دنیا میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ عزیزانِ من! اب پھر درمیان میں ”میں“ آ ہی جاتی ہے! کیا کہوں! اس دور (Period) کے طلوع اسلام دیکھیے۔ یہ چیز آپ کو اس طرح سے طلوع اسلام میں ملے گی کہ یہ ساری صرف سیاستِ فرعونؑی ہے! آج اس نے دوسرا نقاب اوڑھ رکھا ہے اور پردہ ڈال رکھا ہے دوسرے الفاظ اپنا رکھے ہیں! اس کا نام ڈیموکریسی رکھا ہوا ہے۔ یہ ساری فرعونؑی سیاست کی چیز ہے۔ ہمارا مطالبہ کیا ہے؟ یہی کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (26:17) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دو۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ حضرت موسیٰؑ نے کتنی معقول دلیل دی تھی۔ فرعون اپنی قوم سے کہتا تھا کہ یہ کس کی بات سن رہے ہو! تمہیں معلوم ہے کہ یہ کون ہے؟ سنو! وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِدُوْنَ (23:47) یہ ہماری محکوم قوم کے فرد ہیں۔ واہ! تحریک پاکستان میں اس قدر استہزا کے ساتھ ہمیں یہی جواب ملتا تھا۔ محمد علی جناحؒ (1877-1948ء) اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا تھا کہ یہ مسلمان یہاں اپنا مستقل الگ کلچر مانگتے ہیں! اس کی حفاظت چاہتے ہیں۔ عزیزانِ من! میں جو سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ مسلمان کا کلچر دین اسلام کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ ہندو نے کہا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو قوتیں ہستی ہیں: ایک ہندو اور دوسرے انگریز۔ انگریز اس تیسری قوت ② کو قوت ہی نہیں مانتا تھا۔ شروع میں یہ ہندو اتنا عرصہ کوشش کرتے رہے کہ مذاکرات ہی نہ ہوں! کہیں بیٹھ کے بات طے ہی نہ ہو۔ وہ کہتے تھے کہ صاحب! یہ قوم اس قابل ہی نہیں ہے کہ ان سے بھی بات کی جائے۔ قوم کیا ہے؟ وہ تو کانگریس ہے۔ یہ وہی ہے جو فرعونؑ نے کہا تھا کہ میں اس شخص سے کیا بات کروں! وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِدُوْنَ (23:47) وہ محکوم قوم کا فرد ہے۔ کیا اس قابل ہے کہ حاکم قوم کے فرد سے بات کرے اور کہے کہ ہم سے بات کرلو؟ اس پہ ان کو جھگڑا رہا کہ بات ہی ان سے نہیں کی جاسکتی۔ دنیا کو کہتے تھے کہ ساری دنیا میں اصول تو یہ ہے کہ جو اکثریتی پارٹی ہوتی ہے بات تو اس سے کی جاتی ہے۔ وہ برٹش گورنمنٹ سے یہ کہتے تھے کہ یہاں آ کر ہم سے بات کرو۔ تم نے جو Minority (اقلیت) سے الگ بات کرنی شروع کر دی یہ تو تمہارے اپنے ہی اصول کے خلاف ہے۔ یہ ہیں جو محکوم قوم کے افراد ہیں اور عزیزانِ من! ہندو نے یہی دلیل دی۔ ایک ہی دلیل کافی ہے۔

ہندوؤں کی نظر میں مسلمان اچھوتوں سے بھی کم تر تصور کیے جاتے تھے

ہندو اپنے اچھوتوں کو اتنا ذلیل نہیں سمجھتا جتنا مسلمان کو ذلیل سمجھتا ہے۔ میں تو اس علاقے کا رہنے والا تھا جہاں اکثریت ہماری تھی!

① بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔

② یعنی مسلمان قوم

اس شہر کا رہنے والا تھا جہاں ممتاز حیثیت مسلمانوں کے گھرانوں کی تھی۔ اب تک یاد ہے عزیزان من! صد شکر کہ اس ہماری نئی نسل نے ہندو نہیں دیکھا، اور بد قسمتی آپ کی کہ آپ نے ہندو کو نہیں دیکھا۔ آپ کو یہ پتہ نہیں کہ ہندو کیا تھا؟ اسی لیے آج یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ صاحب! ہم نے پاکستان بنا کے کیا کر لیا۔ وہاں رہتے تو بڑا ٹھیک تھا، اچھے رہتے بستے۔ ان کو پتہ نہیں تھا کہ ہندو کیا تھا؟ آپ کو میں سناتا ہوں۔ معاف رکھیے گا یہ جو یہاں بات آگئی۔ پہلے میں نے شہر کہا ہے، علاقہ کہا ہے، جہاں ہماری اکثریت تھی، محلہ چودھریاں اس کا نام تھا، ہم لوگوں کی بڑی ممتاز حیثیت تھی۔ وہاں اسی محلے میں ہمارے بھروسے پر دودھ بیچنے والا دوکاندار ہندو بھی تھا۔ گاہک آتے تھے۔ یہ ہندو دوکاندار ہندو گاہکوں کے لیے الگ دودھ کی بالٹیاں رکھتا تھا۔ ہندوؤں کے لیے یہ بالٹیاں صاف کر کے رکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ ان سے لیتے تھے اور پیتے تھے۔ اس نے چھینکے کے اندر ایک پرانا مٹی کا پیالہ رکھا ہوتا تھا۔ مسلمان اس کے ہاں جاتا تھا تو وہ اس کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ہم وہ پیالہ وہاں سے اٹھاتے تھے۔ اس نے اپنی وہ ”گڑوی“ ہمارے پیالے کی نسبت اونچی رکھی ہوتی تھی کہ ہمارے پیالے کے پانی کی ایک چھینٹ تک ان کی ”گڑوی“ پر نہ پڑ جائے۔ وہ اس میں پانی ڈالتا تھا، ہم اسے خوب دھوتے تھے، پھر اس سے وہ دودھ لیتے تھے۔ دودھ پینے کے بعد پھر اسی طرح سے وہ پانی نکالتا تھا، اس سے اسے ہم دھوتے تھے اور اس چھینکے میں رکھتے تھے۔ وہ دو چھینکے ہوتے تھے، ایک بائیں طرف اور دوسرا دائیں طرف۔ اس علاقے کے چوہدری وہ محلہ چوہدریوں کا تھا، اس دوکاندار سے قیمتاً دودھ لیتے تھے۔ شاید وہ ہم سے چار پیسے زیادہ ہی لیتا ہو لیکن کیفیت یہ تھی کہ دو الگ الگ پیالے تھے، مگر ردِ عمل وہی تھا کہ میں ہندوؤں کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ میں نے ساری عمر نہیں کھائی۔ اس کے بعد معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا؟ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ ہندو کیا تھا۔

عزیزان من! اس سے اندازہ لگائیے کہ جب کہا کہ اَرْسَلْنَا مُوسٰی وَاَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ . اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عٰلِيْنَ (23:45-46) پروگرام کے مطابق ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو بھیجا۔ انہیں بھی ہم نے اپنے قوانین عطا کیے تھے اور ان کے ساتھ ایسے واضح دلائل دیئے تھے جن سے ان قوانین کی صداقت اور محکمیت نکھر کر سامنے آجائے۔ انہیں ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے اکابرین کی طرف بھیجا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے ان کے سامنے ہمارا سچا دین پیش کیا لیکن انہوں نے سرکشی اور تکبر برتا۔ وہ تھے ہی بڑے مغرور سرکش اور بخود غلط۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ جو کچھ ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس پر غور کرتے، فَقَالُوْا اَنْتُمْ لِبَشَرِيْنَ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِبْدُوْنَ (23:47) کہا کہ کیا ہم ان کی بات مان لیں جو انسان ہونے کے اعتبار سے ہمارے ہی جیسے ہیں۔ مافوق البشر نہیں ہیں اور جہاں تک مرتبہ اور درجہ کا تعلق ہے، وہ اس قوم کے افراد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِبْدُوْنَ (23:47)۔ وہ محکوم قوم کا فرد برابری کا دعویٰ کر کے، ہم سے بات کہنے کے لیے آگیا ہے۔

## تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جناب پرویز کو قائد اعظم کا فرمان

عزیزانِ من! ہماری غیر منقسم انڈیا میں وہاں یہ حالت تھی۔ قدم قدم پہ بارگاہِ خداوندی میں سجدہ شکرانہ ادا کرو کہ تم اس ذلت سے بچے۔ ہم سے پوچھو کہ ہمارے ساتھ کیا ہوتا تھا۔ میں نے تو ذرا سی مثال آپ کو دی ہے۔ وَقَوْهُمْ هُمَا لَنَا عِبْدُونَ (23:47)۔ محکوم اور پھر آہستہ آہستہ محکوموں کی حالت بھی یہ ہو جاتی تھی۔ ہماری یہ اپنی ہی قوم کے لوگ تھے۔ صاحبِ ضربِ کلیم کے نقشِ قدم پہ چلنے والا محمد علی جناحؒ (1876-1948ء) بھی صرف یہ کہتا رہا کہ اس قوم کو جانے کی اجازت دو۔ اس میں اسی قوم کے افراد تھے جو اس کی اور اس کے مطالبے کی اس قدر مخالفت کر رہے تھے کہ ہمارے لیے ہندو کا مقابلہ کرنا تو آسان تھا، عزیزانِ من! انگریز کا مقابلہ کرنا بھی آسان تھا لیکن جیسا کہ قائد اعظمؒ محمد علی جناحؒ نے مجھ کو بلا کر کہا تھا کہ یہ جو اپنی ہی قوم کے افراد ہیں، اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر مخالفت میں آگئے ہیں، ان کا مقابلہ کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔

## علامہ اقبالؒ کی نظر میں محکوم قوم کی ذہنی پستی کی حالت

وہاں یہ نظر آتا تھا کہ محکوم قوم کی ذہنیت کس قدر پست ہو جاتی ہے، پھر وہ لوگ کتنے سستے جکتے ہیں۔ ان کے بکنے کی داستانیں یہاں نہیں، میں کسی دوسری جگہ لکھوں گا کہ وہ کتنے سستے جکتے ہیں۔ اف! یہی وہ مقام ہے جہاں چیخ کر مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ

دین و دانش را غلام ارزاں دہد

محکوم ذہنیت تو یہ ہو جاتی ہے کہ وہ دین کو بھی اور اپنی عقل کو بھی بیچتا ہے، بڑا سستا بیچتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہ کس چیز کو سستا کہتا ہے؟

تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

اپنے جسم کو زندہ رکھنے کے لیے جان بیچ دیتا ہے۔ یہ مفکر قرآن محمد اقبالؒ نے اس وقت کہا تھا جب وہاں ہمارے ساتھ یہ کچھ ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے مقدسین بھی تھے، عالم فاضل بھی تھے جو آ رہے تھے، انہیں علمائے دین ہونے کا بھی بڑا دعویٰ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ

گرچہ برب ہائے اونا م خدا ست قبلہ او طاقت فرمانروا ست

طاقت نامش دروغ با فروغ از بطون او نزاید جز دروغ

ایں صنم تا سجدہ رش کر دی خدا ست چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

ان کا قبلہ اکثریت (Majority) ہے، اسی اکثریت کی طاقت ہے، اس طاقت کی فرماں روائی ہے اور یہ طاقت دراصل جھوٹ کی

طاقت ہے اور یہ جھوٹ بھی ایسا جسے بڑا بلند کر کے بیان کیا جائے۔

ان کی یہ باتیں چاہے جتنی بھی خوش آئند ہوں، انہیں اگر ماضی کے آئینے میں دیکھا جائے تو وہ سارا جھوٹ ہی کا پلندہ ہوتا ہے۔ انہیں یہ پتہ نہیں کہ جن کی طاقت سے یہ مرعوب ہوتے ہیں، جنہیں یہ خدا سمجھتے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب تک ان کے سامنے سجدہ کرتے رہو یہ خدا نظر آئیں گے۔ ذرا اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ تو یہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

جب کوئی قوم اٹھ کھڑی ہو تو پھر خدا بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! تحریک پاکستان میں مٹھی بھر مسلمان تھے جو اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہ ہندوہم سے چار گنا زیادہ تھے اور ان سمیت پوری انگریز کی سلطنت کانپ اٹھی تھی۔ بس بات یہ تھی کہ ”وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے“۔ فرعون یہ کہہ رہا ہے کہ اَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَى (79:24) تمہاری پرورش میں کرتا ہوں اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔ یہ جو موسیٰ ♦ کہتا ہے کہ تمہارا نشوونما دینے والا خدا ہے، یہ غلط ہے۔ اس پر اقبالؒ (1877-1938) کہتے ہیں کہ رب موسیٰ ♦ اور فرعون کے رب ہونے میں فرق ملاحظہ فرماؤ:

آں خدا نانے دہد جانے دہد

ایں خدا جانے برد نانے دہد

ایک وہ خدا ہے جو جان عطا کرتا ہے اور روٹی بھی عطا کرتا ہے مگر یہ خدا روٹی تو دیتا ہے، جان نکال دیتا ہے۔ یہ تھی وہاں لڑائی، عزیزانِ من! جو چار ہزار سال ق م فرعون مصر کے ایوان گاہ میں لڑی جا رہی تھی۔ ”جرم موسیٰ ♦“ یہی تھا کہ اس نے فرعون سے یہ کہہ دیا تھا کہ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (26:16) تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔

عزیزانِ من! ہم ہندو سے کچھ بھی نہیں مانگتے تھے۔ ہم صرف یہ کہتے تھے کہ تم اپنے علاقے میں بلا خوف و خطر سکھی رہو، حکومت کرو۔ صرف اتنی سی بات کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا وہ اتنا سا طبقہ ہے، اسے خدا کی زمین میں سانس لینے کے لیے اجازت دے دیجیے۔

فرعون اس لیے فرعون تھا کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنا عبد بنا کر رکھنا چاہتا تھا

یہاں (23:47) میں ایک لفظ میں قرآن نے اصل بات کہہ دی۔ جی نہیں چاہتا کہ اسے سامنے لائے بغیر آگے بڑھوں۔ فرعون نے تو یہ کہا تھا کہ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِبْدُونَ (23:47) یہ ہماری محکوم قوم، ہمارے عبد ہیں۔ خدا کی زمین میں یہ جتنے افراد بھی بستے ہیں، ان کے مقابلے میں ایک لفظ، عزیزانِ من! حضرت موسیٰ ♦ سے کہا۔ لفظ ”عبد“ کے متعلق اب آپ کو معلوم ہے۔ اسی لفظ سے یہ لفظ عبادت نکلا ہے۔ اس کے معنی محکومیت کے ہیں، پرستش کے نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون نے یہ کہا تھا کہ یہ ہمارے محکوم، ہمارے عبد ہیں۔

حضرت موسیٰ ♦ نے اس سے کہا تھا کہ میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ اَنْ اَذُوَّا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ (44:18) خدا کے بندوں کو میرے حوالے کر دو، بس میرے ساتھ جانے دو۔ ان آیات سے دونوں سیاستوں کا فرق سامنے آ گیا۔ حضرت موسیٰ ♦ نے کہا کہ یہ ہمارے بندے نہیں ہیں، یہ ان کو عباد اللہ کہہ رہا ہے یعنی کہہ رہا ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی زمین میں سانس لینے کے لیے میرے ساتھ جانے کی اجازت دو۔

### حضرت موسیٰ ♦ کے ساتھ فرعون کی ایک سرمایہ دارانہ چال

نظر آتا ہے کہ وہاں یہ قوم بنی اسرائیل اقلیت (Minority) میں تو تھی لیکن بہر حال موثر تھی اور حضرت موسیٰ ♦ کا ان کے نزدیک ایک خاص مقام تھا، ورنہ وہ اس کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اب تیار ہوا تو سنو، فرعون سودے بازی پہ اتر آیا۔ یہی ڈھنگ ہوتا ہے عزیزانِ من! جب وہ کسی قوت سے مرعوب نہ ہو تو پھر اسے خریدنا چاہتا ہے، اس پہ اپنے احسانات جتاننا چاہتا ہے۔ بڑی خوبصورتی سے قرآن نے یہ بات کہی ہے۔ فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ ♦! اؤ تم تو ہمارے اپنے ہو، تمہیں یہ کیا ہو گیا۔ توں بہکی، بہکی گلاں کر دیا پیاں <sup>1</sup> موسیٰ ♦! تم تو بنی اسرائیل کے بچے تھے، جنہیں یہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہ بیٹھی ہوئی ہے جس نے تمہیں گود میں لیا ہے۔ <sup>2</sup> میں تمہارا باپ بنا، ان مخلوق میں تمہاری پرورش ہوئی، شہزادوں کی طرح ناز و نعمت میں پلے تمہارا اتنا بلند مقام ہم نے کیا۔ یہاں تک کہ تم نے یہاں ہمارے فرد کو ایک دوسری قوم کے فرد کو قتل بھی کر دیا۔ <sup>3</sup> ہم نے اس میں بھی تمہارا پیچھا نہیں کیا، تم چلے گئے۔ اب تم واپس بھی آ گئے ہو، تو ہم نے تم سے ہاتھ نہیں مانگا، مجھے وہ پرانے تعلقات یاد ہیں۔ مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ کیوں، موسیٰ! یہ ہیں باتیں اور کہا کہ اسکے بعد ہمارے احسانات کا بدلہ یہ دے رہے ہو کہ ہماری حکومت کو ہم سے ہی چھین رہے ہو۔ اتنے احسان فراموش تو نہ بنو۔

### خدا کے نور سے دیکھنے والی ہستی حضرت موسیٰ ♦ کا فرعون کو جواب

غور سے سنئے عزیزانِ من! فرعون کے اس احسان کا جواب دیا جاتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے، آپ نے بہت سے احسانات گنائے لیکن یہ سب سے بڑا احسان جو تم بھول گئے، میں تمہیں یاد دلادیتا ہوں کہ تمہارا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَدْتُ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ (26:22) ان تمام احسانات کے بدلے میں تم یہ چاہتے ہو کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی میں رکھ سکوں۔ یہ بھی تو

1 تم بہلی بہکی باتیں کر رہے ہو۔

2 یہ اشارہ ہے فرعون کی بیوی کی طرف ہے۔

3 حوالہ قرآن ہے (26:19)

احسان جتاؤ کہ میں نے بنی اسرائیل کو تمہاری قوم کو غلامی میں رکھا ہوا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتے۔ عزیزانِ من! آپ نے موسیٰ! ♦ کا جواب سن لیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948) کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیا گیا تھا کہ تم یونائیٹڈ انڈیا (متحدہ ہندوستان) کو غیر منقسم ہندوستان ہی رہنے دو، ہم تمہیں ہندوستان کا پہلا وزیر اعظم بنائیں گے اور یہاں اپنی مرضی کی حکومت بنالینا۔ اس پر قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے بر محل کہا تھا کہ جاؤ کسی اور کو اس فریب میں لاؤ۔ قائد اعظم بکنے والی جنس نہیں ہے اور یہ تھا وہ (Tribute) (خراجِ عظمت) جو انہیں انگریزوں کے ہاں سے Pay (ادا) کیا گیا تھا اور بر ملا کیا گیا تھا کہ وہ Unpurchaseable (بکاؤ مال نہیں) ہیں یعنی انہیں کسی قیمت پر خرید انہیں جاسکتا اور یہ وہی ہے جو حضرت موسیٰ! ♦ نے کہا تھا: احسانات جتاتے ہو تو یہ بھی جتاؤ کہ اس کے بدلے میں یہ چاہتے ہو کہ قوم بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنائے رکھو۔

### تحریک پاکستان کے سلسلہ میں نیشا لسٹ علما حضرات کی طرف سے مخالفت میں دیئے گئے دلائل

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ کانگریس شکست کھا گئی۔ وہاں ہندو کی کوئی دلیل نہیں چل سکی جو کیا انہوں نے کیا، پھر اس کے بعد مذہبی پیشوائیت نے علمائے دین کو آگے بڑھایا، جماعت اسلامی کو بھی آگے بڑھایا۔ انہوں نے جماعت اسلامی اور نیشا لسٹ علماء نے وہاں ان مسلمانوں سے جو اس تحریک کا ساتھ دے رہے تھے، کہا کہ جسے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں جا کر یہ ایک ایسی حکومت قائم کریں گے جو اسلامی حکومت ہوگی، خدا کی بادشاہت ہوگی، تو یاد رکھو! یہ سب فریب دے رہے ہیں، وہاں کی جو حکومت ہوگی، وہ کافروں سے بھی بدتر ہوگی، اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ یہ کچھ ان کی کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوئم<sup>①</sup> کے اندر آج بھی موجود ہے کہ کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ ان سے بھی بدتر حکومت ہوگی۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ تحریک (Movement) بہت زور پکڑ رہی ہے تو یہ مذہبی پیشوائیت اسلام کے تجریدی نظریئے یعنی Abstract (غیر محسوس) چیزوں کو سامنے لے آئی کہ خدا کی حکومت آسمانوں پہ بھی ہے، تمام Universe (کائنات) پر اس کی مملکت ہے۔ انہیں کہا کہ یہ تمہیں کس فریب میں مبتلا کر رہے ہیں کہ اسلام کے لیے ایک الگ خطہ زمین کی ضرورت ہے، وہاں اسلام پنے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے سارے ہندوستان کو مسلمان بنادیں۔ یہ دلیل دی جا رہی تھی کہ ان کے مطابق اس اتنے سے حصے کے اندر سمٹ کر اسلام کیا آئے گا اور ان کی یہ دلیل تھی کہ اسلام کے زندہ ہونے کے لیے کسی الگ خطہ زمین کی ضرورت ہی نہیں ہے اس لیے خطہ زمین رہنے دو۔ ان کے لیے وہ سعدی شیرازی (1184-1291) کا دو بھائیوں کا قصہ مشہور ہے کہ دو بھائیوں

① اس کتاب سے مزید اقتباسات کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طہ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005، ص 230-223 نیز انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔



میں جا سیداد پر جھگڑا ہوا تھا۔ ایک ہی مکان تھا اور فیصلہ ہوتا نہیں تھا تو اس بڑے بھائی نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے تھوڑا سا حصہ میں لے لیتا ہوں، تم چھوٹے ہو، تمہاری پرورش مقصود ہے، تمہارے پیچھے میں ہاتھ رکھوں گا، تم سب سے بڑا حصہ لے لو۔ بس یہ ذرا سا، یہاں صحن سے لے کر چھت تک، بس اتنا سا کمرہ مجھے دید و میں اتنے پہ ہی راضی ہو جاؤں گا۔ چھت سے لے کر آسمان تک سارا تمہارا رہا۔ وہاں کہا یہ جارہا تھا کہ اتنے سے خطہ زمین کے اندر اسلام کا احیا دیکھو! یہ اسلام کہاں لیے جا رہے ہیں۔ یہ اتنا بڑا وسیع ملک ہے، یہاں سب کو مسلمان بنایا جائے گا اور اگر ایک الگ مملکت کا اتنا ہی بڑا چاؤ ہے، تو اس کے لیے انہوں نے یہ اسکیم بھی دی کہ چلیے الگ چھوٹی سی مملکت بنا لیتے ہیں۔ وہ ایک صوبے کی طرح ہوگی دونوں کے اختیارات ہوں گے لیکن سنٹر کے پاس سارے اہم سبجیکٹ ہونگے: امور خارجہ، ڈیفنس، اقتصادیات یعنی فنانسز وغیرہ۔ یہ سنٹر (مرکز) میں دیدیتجیے۔ بس ٹھیک ہے صحن خانہ سے بام تک ان کو دیدیتجیے اور آگے پھر سارا تمہارا حصہ ہے۔ دلائل میں ادھر ہندو شکست کھا گیا اور ادھر حضرت موسیٰؑ سے فرعون شکست کھا گیا۔ پھر یہ اگلی بات سوچھی۔

### لوگوں کو مذہبی جذبات برا بیچنے کرنے والی فرعون کی ایک چال

عزیزانِ من! فرعون کی سیاست تھی کہ جب دلائل سے کام نہ چلے، وہ قوت کے سامنے مرعوب نہ ہو، کسی قیمت پہ بھی خرید نہ جائے، تو پھر لوگوں کے مذہبی جذبات کو برا بیچنے کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ فرعون نے کہا کہ صاحب! اچھا، ہم یہ مذاکرات کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرتے ہیں اور میں خود اس کے لیے کچھ انتظام کرتا ہوں۔ اس نے سارے ملک میں اپنے ڈھنڈور چھی بھج دیئے۔ اس زمانے میں یہ مذہبی پیشوائیت عجیب چیز تھی۔ اس نے شروع سے ہی یہ چیز رکھی ہے مثلاً جو گائے کا سینگ ہے، وہ تو مملکت کے ہاتھ میں دیدیتی ہے کہ دودھ آپ نکالتے رہیں، خود برسرِ اقتدار آ کر ذمہ داریاں نہیں لیتی۔ یہ مذہبی پیشوا مہاراج دوسرے کو بناتے ہیں، تاج اس کے سر پہ اپنے ہاتھ سے رکھتے ہیں، لیکن حکومت خود کرتے ہیں۔ یہ شروع ہی سے چلا آ رہا ہے۔ فرعون کے ہاں بھی یہی تھا۔ اگرچہ وہ خود ایک ”رع دیوتا“ کا اوتار مانا جاتا تھا لیکن اصل حکومت ہامان<sup>1</sup> کی تھی اور قرآن نے ہامان کے ساتھ جنود کہا ہے: اس کا بڑا لاؤ لشکر ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ پھر فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا ہے کہ تھوڑے دن کے لیے ذرا آرام کرو اور خود سارے ملک میں ڈھنڈور چھی دوڑا دیئے۔ ہامان کو بلایا اور کہا کہ اپنے سارے لاؤ لشکر بلاؤ اور یہ جتنے تمہارے ہاں کے بڑے بڑے نامور ہیں، مہا چنڈت ہیں، ان سب کو اس کے مقابلے میں لے آؤ، اور اس مقابلے کے لیے ساری مملکت میں ایک عظیم دن مقرر کر دیا۔ دنیا اکٹھی کر لی اور ان سے یہ کہا کہ

1 مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ، تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2004ء

اگر یہاں تم اسے شکست دیدو پھر اس کی نہیں چلنے دیں گے تم ثابت یہ کر دو کہ یہ تمہیں تمہارے دین سے پھیرنا چاہتا ہے یہاں نیا دین مسلط کرنا چاہتا ہے۔ بس لوگوں کے سامنے یہ کر دو۔

### فرعون کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی سودے بازی کا مطالبہ

قرآن تو ہر مقام پر عزیزانِ من! بڑی دکھتی ہوئی رگ پکڑتا ہے۔ یہ قصہ تو وہ یونہی بیان کرتا چلا آ رہا ہے لیکن چلتے چلتے بات کہہ جاتا ہے کہ یہ مذہبی پیشوائیت کیا ہوتی ہے۔ اسمیں خدا کے نام پر یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب یہ اور ان کے نمائندے آئیٹھے تو انہوں نے فرعون سے کہا کہ سرکار! دیکھو تو سہی ہم انہیں چٹکیوں میں اڑا دیں گے۔ اس کی قوم نے کہا کہ یہ بہت اچھی بات ہے یہ مذہب کا معاملہ ہے مذہب کی حفاظت ہے۔ یہ کہنے لگے کہ ٹھیک تو ہے یہ مذہب کا معاملہ ہے لیکن پہلے یہ بتائیے کہ اگر ہم نے اسے شکست دیدی تو ہمیں کیا ملے گا۔ پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ یہ پیسے گناتے ہیں اس لیے فرعون سے پوچھا کہ پہلے یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا ملے گا۔ دیکھیے ملائیت پہلے کیا کر رہی ہے۔ یعنی آرہے ہیں اپنے مذہب کو سچا ثابت کرنے کے لیے اور کہہ یہ رہے ہیں کہ پہلے یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا دو گے۔ وہ بھی کارگیر تھا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے دیں گے تو تمہیں بہت کچھ۔ پہلے بھی تمہیں دیا ہوا ہے۔ اب بڑی بات یہ ہے کہ ہم تمہیں خان صاحب بنادیں گے خان بہادر بنادیں گے، شمس العلماء بنادیں گے، خطابات سے نوازیں گے تم ہمارے مقرب بن جاؤ گے۔ یہ بھی ان کی ایک دکھتی ہوئی رگ ہوتی ہے۔ ان میں بڑا Inferiority Complex (احساس کمتری) ہوتا ہے۔ اس لیے فرعون کا یہ کہنا ہے کہ ہم تمہیں مقرب بنادیں گے۔ اسے پتہ ہے کہ یہ مذہبی پیشوائیت اس پر زیادہ اعتماد کرتی ہے چنانچہ اس نے بلالیا، اکٹھا کر لیا۔ عزیزانِ من! اس تفصیل میں اس مقام پر چونکہ قرآن آیا ہی نہیں اس لیے میں بھی تفصیل میں نہیں جاتا۔ آگے آؤنگا تو وہ جو مناظرے ہیں وہ آپ کو بتاؤنگا یہاں تو اتنا ہی کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنی فریب کاریوں سے رسیوں کو بھی سانپ بنا بنا کر دکھا دیا۔ مگر بات نہ بنی۔ یہ ہمیشہ رسیوں کو سانپ بنا بنا کر دکھاتے ہیں۔<sup>①</sup>

ہندوستان میں انگریز کے غلبہ اور ہندوؤں کے تغلب کے بالمقابل مسلمانوں میں ابھرنے والا جو ہر مردانگی عزیزانِ من! وحی پر مبنی دلائل کا اژدھا ان رسیوں کو یوں نکل گیا کہ انکا کوئی نام و نشان تک نظر نہ آیا۔ دین کے مقابلے میں مذہب کہاں ٹھہر سکتا ہے۔ یہ ساری جتنی بھی یہ کشمکش ہے اس میں ایک چیز قرآن نے بتائی ہے کہ خدا نے کہا کہ ”ہماری مشیت کبھی یہ بھی کیا کرتی ہے۔“ اب آپ اس میں دیکھیے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہی وہ مشیت خداوندی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ محکوم قوم میں اگر جو ہر مردانگی

① ان نکات کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طہ ادارہ طلوع اسلام لاہور 2005۔

اُبھر آئیں تو وہ فتحیاب ہو جاتی ہے۔ وہاں تحریک پاکستان میں بھی ہمیں یہ نظر آتا تھا کہ اگر یہ ہندو اور انگریز اس بات پر اڑ گئے، انہوں نے مزید اپنی ساری قوت لگا دی تو معاملات بگڑ جائیں گے۔ عزیزانِ من! انگریز جیسی یہ قوم جسکی اس زمانے کی مملکت، سلطنت، اسکا غلبہ، تغلب اور حکومت کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس کی مملکت میں The Sun Never Sets سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ ہندوستان میں وہ ایک پارٹی تھی جس میں یہ پورے ہندو تھے۔ پوچھو کہ کتنا بڑا اقتصادِ تغلب تھا اور ہندوستان کے اندر پھیلے ہوئے چھوٹی چھوٹی جگہ پر مسلمان تھے۔ پھر انہوں نے جس طرح ہمارے مقابلے کے لیے وہاں پرائیویٹ آرمی تیار کر دی تھی اس میں نظر بظاہر ایسا دکھائی دیتا تھا کہ یہ آزادی بہت مشکل ہے۔ یہی حالت وہاں فرعون کے زمانے میں اس اقلیت بنی اسرائیل کی تھی۔ نظر بظاہر یہ شکل نہیں تھی کہ کبھی فرعون کے ساتھ بھی یہ کچھ ہوگا لیکن قرآن کریم یہاں اپنے انداز میں ایک بات کہتا ہے کہ ”کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محکوم قوم کے لیے یہ اس قسم کے مواقع فراہم کر دیتے ہیں کہ انکو آزادی حاصل ہو جائے“۔

قرآن کہتا ہے کہ وَ نُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِعُوا فِي الْأَرْضِ (28:5)۔ ہماری مشیت کے پروگرام میں کچھ یہ ہوا کہ یہ قوم جو بڑی کچلی گئی ہے بڑی ہی کمزور کر دی گئی ہے، ہم انہیں اپنی رحمت سے نوازیں۔ قرآن اس قسم کے الفاظ وہاں استعمال کیا کرتا ہے جہاں اس قسم کے مواقع فراہم کرنے کے ہوں، جہاں یہ ہو کہ وہ بظاہر لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں کہ یہ مواقع کس طرح سے فراہم ہو گئے۔ واقعی اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ یہ Believe (یقین) ہی نہیں کرتا تھا: نہ انگریز نہ ہندو کہ واقعی ایسا ہو جائے گا یا ایسا ہونا ممکن ہوگا۔ ماؤنٹ بیٹن (Mountbatten 1900-79) انگلستان سے تہیہ کر کے آیا تھا کہ میں جا کر اس تقسیم کے مسئلے کو روکتا ہوں۔ اس سے پوچھا گیا تھا کہ کیوں؟ کیا تم نے اس تقسیم کے مسئلے کو روک دیا؟ یہ لوگ بیلف<sup>1</sup> (Bailiff) وغیرہ تھے جو انگلینڈ نے بھیجے ہوئے تھے۔ انہی میں ماؤنٹ بیٹن کو سلیکٹ (منتخب) کیا گیا تھا۔

یہ ماؤنٹ بیٹن (1900-79) تو ایڈمرل تھا، جہاز ران تھا، اور اس کو خاص جذباتی طور پر ہندوستان بھیجا گیا تھا، اس لیے کہ یہ رائل فیملی<sup>2</sup> (شاہی خاندان) کا تھا۔ ہندوستان کا، جو انگلستان کی ملکہ یعنی بادشاہ کے تاج کا ہیرا ہے وہ ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ خود اس خاندان

<sup>1</sup> Bailiff. Chiefly British. An Official who assists a sheriff and who has the power to execute the writs, processes, and arrests. (P.126) Sheriff. In England and Wales, the Chief Officer of the Crown (P.1405)(Ref. Reader's Digest (1990) Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited)

<sup>2</sup> یہ ملکہ وکٹوریہ (Queen Victoria) کا پوتا تھا۔ لارڈ ویل کی جگہ مارچ 1947ء کو وائسرائے آف انڈیا کی حیثیت سے آیا اور 31 مارچ 1948ء تک ہندوستان میں رہا۔

(Sawar, gul shahzad (2005) pakistan studies, An Analytical Approach to Pakistan Affairs. Karachi: Rehbar Publishers. pp 154.156)

پر بھی تو اس کا بڑا اثر پڑتا تھا، انگریز قوم پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ اس سے پہلے کا وائسرائے اس تحریک آزادی کو نہ مٹا سکا تھا، نہ کچل سکا تھا۔ اب یہ Select (منتخب) ہو کر آیا تھا۔ یہ وہاں انگلینڈ سے یہ کرنے کے لیے آیا تھا کہ میں جا کر یہ معاملہ سلجھاتا ہوں کہ یہ تقسیم نہیں ہو سکے گی۔ اس نے آخر سر توڑ کوشش کر دیکھی مگر یہ معاملہ نہیں رکا۔ یہ ہم سے پوچھیں۔ میں تو ادھر وہاں بھی گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔ وہاں ساری سیاست ہوتی تھی۔ وہاں کی چیزیں بھی میرے سامنے ہیں کہ اس شخص نے آ کر اس تحریک آزادی کو فیل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہ ہوا تو خود ہی وہ وہاں سے بھاگ کر انگلینڈ چلا گیا۔ اس نے وہاں جا کر کہا کہ بابا! کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے۔ اس کے یہ بیانات حال ہی میں چھپنے والی کتاب میں آئے ہیں۔

### پرویز کی چشم دید گواہی اور ماؤنٹین کا اعتراف

اس کے یہ بیانات اس زمانے میں تو میرے سامنے تھے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ اس معاملے کے اندر میں ہر طرح سے کامیاب تھا، کوئی مشکل نہیں تھی، لیکن وہ معاملہ صرف اس ایک شخص<sup>1</sup> کے سر تھا کہ جسے یوں کر ناکھانے میں اسے یوں میں نہیں بدل سکا۔ اس کا یہ بیان آیا ہے کہ میں نے ہر طرح کی چالاکیاں بھی کر دیکھیں، مگر یہ شخص ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس نے کہا ہے کہ اس قدر بڑا سیاستدان میں نے کہیں نہیں دیکھا، جو اپنی بات پر اس قدر اڑا ہے۔ یہ وہی ہے جسے بے لچک اصولوں کا مالک کہا گیا ہے۔ میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے جو میری شکست کا باعث ہو۔ وہاں جا کر وہ رویا ہے۔ انہوں نے پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جون 1948ء میں یہ کیا جائے گا۔ اس نے انگلستان جا کر کہا کہ بابا! تمہیں اس شخص کا پتہ نہیں ہے۔ اگر اس وقت تم نے اتنا لمبا عرصہ ڈال دیا تو معلوم نہیں کہ وہ شخص کیا قیامت برپا کر دے گا، خدا کے لیے ابھی دو تین مہینوں کے اندر اندر فیصلہ کر دو۔ 1947ء میں ہمیں وہاں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں Instructions (ہدایات) تھیں کہ جون 1948ء تک ٹرانسفر آف پاور (انتقال اختیارات) کا پروگرام بناؤ۔ وہ انگلستان جا کر واپس آیا اور آتے ہی اس نے ایک کلینڈر چھپوایا جو ہم سب کو تقسیم کیا گیا۔ اس نے یہ تین جون (1947ء)<sup>1</sup> کو بانٹ دیا تھا۔

اس نے اس کلینڈر پر 14 اگست ڈالی تھی، ڈالی کیا ہر صفحہ کے اوپر یہ تاریخ درج کی ہوئی تھی اور نیچے لکھا ہوا تھا کہ تقسیم ہند کے لیے اتنے دن رہ گئے۔ اگلا دن آیا تو اس میں پھر ایک دن کم ہو جاتا تھا۔ مثلاً پہلے میں نوے دن رہ گئے، ایک دن بعد نو اسی دن رہ گئے، اٹھاسی دن رہ گئے۔ ہمیں یہ ڈائریاں دی تھیں کہ یہ دن گنتے جاؤ اور اس کے مطابق تقسیم کا پروگرام بناؤ۔

1 ڈوگر پبلشرز (Latest) who is who & what is dhat اردو بازار لاہور 2007ء ص 23۔

عزیزانِ من! اس درس میں دو چار منٹ شاید دیر ہو جائے۔ یہ ایک واقعہ ایسا ہے کہ جسے بیان کیے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ یہ غالباً مارچ 1947ء کا واقعہ ہے۔ میں قائد اعظمؒ کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان قرآن کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں باتیں کرتا کرتا قرآن کریم میں سورۃ الرعد میں آنے والی بات کہہ گیا کہ نبی اکرمؐ نے خدا کے حضور یہ آرزو پیش کی کہ تینیس سال ہوئے ہیں اس کشمکش میں اتنا عرصہ لمبا ہو گیا، مشتقتیں مصیبتیں صعوبتیں نکالیف یہ ساری کی ساری میرے حصے میں آئی ہیں۔ یا اللہ ایسا بھی ہوگا کہ میں اپنی زندگی میں اس چیز کو کامیاب ہی دیکھ لوں؟ یہ بڑی مقدس اور معصوم سی آرزو تھی۔ پھر پتہ ہے کہ وہاں سے اس کا جواب کیا آیا؟ وہ قانون والا خدا ہے۔ اس نے یہ کہا کہ اے رسول! درکھو: عَلَیْكَ الْبَلْغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:48) تیرا کام اس چیز کو عام کیے چلے جانا ہے، ہم دیکھیں گے کہ ہمارے قانون کی رو سے یہ کب واقع ہوگا، یہ تیرا کام نہیں ہے۔ اب آگے کہا کہ یہ ضرور ہوگا، چاہے تیری زندگی میں ہو اور یہ ہو سکتا ہے کہ تیرے بعد ہو۔<sup>①</sup> اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اپنا کام کیے جاؤ۔

### قائد اعظم کے آنسو ان کی بلند ہمتی کا اظہار اور ایک نصیحت کا ”کام تیز کر دو“

عزیزانِ من! میں نے رواروی میں قرآن کی آیت میں یہ کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہو۔ وہ بات کیا کرتے تھے تو آنکھ میں آنکھ ڈال کر کیا کرتے تھے۔ اس طرح سے ان سے کوئی بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ کوئی ڈر ہوتا تھا۔ اس کے اندر احترام اتنا ہوتا تھا اور وہ ساتھ ساتھ ”ہوں“ اور ”ہوں“ کہتے رہتے تھے جس سے ہم سمجھتے تھے کہ بات چل رہی ہے۔ میں نے رواروی میں یہ کہا۔ اس کے بعد دیکھا تو وہ جو ”ہوں“ تھی وہ نہ آئی۔ سامنے یوں کر کے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے اور مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ یہ ایسا کیوں ہو گیا۔ میں نے وہ کیا بات کہہ دی۔ میں نے کہا کہ پتہ نہیں، مجھ سے کیا چیز ہوگئی۔ منٹ کے بعد میں نے یہ عرض کیا کہ کیا کوئی ایسی چیز ہوگئی؟ کہنے لگے: نہیں، تم نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی، یونہی میرے ذہن میں یہ آیا کہ وہ خدا کے جواب پر آخری رسول ہیں جو اتنی عظیم ہستی ہیں، اُس معصوم کی اس آرزو کے اوپر بھی اس نے اپنی قانونی استثنیٰ نہیں کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے کہ تیری زندگی میں ہو، ہو سکتا ہے کہ تیرے بعد میں ہو۔ اس کے متعلق مت گھبراؤ، کام کرتے جاؤ۔ میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اتنا عرصہ یہ کرتے رہے، میں زندگی کے آخری دنوں میں پہنچ چکا ہوں۔ آرزو یہ ہے کہ شاید اپنے سامنے اس کو دیکھ لوں لیکن تم نے خدا کی یہ بات جو کہی ہے اس سے تو

① قائد اعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948)۔

② قرآن کریم کی وہ پوری آیت یوں ہے: وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:48) جن باتوں کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ تو بہر حال ہو کر رہیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض باتیں تیرے سامنے وقوع پذیر ہو جائیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو اس سے پہلے ہی وفات پا جائے (لہذا اس کا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ نتائج کب برآمد ہوتے ہیں) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطہ ہدایت کو لوگوں تک پہنچاتا جائے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق نتائج کب ظہور میں آتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص-563)۔

مجھے نظر آتا ہے کہ وہ اس پہ کوئی گارنٹی نہیں دیتا، تو اس پہ تھوڑا سا احساس پیدا ہوا۔ میں نے ان آنکھوں میں آنسو بھی ڈبڈبائے ہوئے دیکھے جن پر انہیں اتنا ضبط تھا۔ وہ آنکھوں میں آئے ہوئے ان آنسوؤں کو بھی پھیر کر لے جایا کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یا اللہ! یہ میں نے کیا کہہ دیا! میں نے کہا کہ جی، کوئی بات نہیں، یونہی بات بتانی تھی۔ پھر میں نے بتایا کہ حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں وہ سارا کچھ ہو گیا۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے، وہ تو ہو گیا لیکن خدا نے تو اس کے لیے کوئی گارنٹی نہیں دی تھی۔ یہ مارچ 1947 کی بات ہے۔ اس وقت تک نہ انہیں اس کا یقین تھا، نہ ہمیں یقین تھا کہ یہ ہو جائیگا۔ اور اب تک ان کی نصیحت، جو ہم سے بھی آگے چلے گئے تھے، یہ تھی کہ کام تیز کر دو۔ وہ تو عزیزانِ من! میں وہاں سے کچھ افسردہ سا ہی اٹھا۔ جانے لگا تو کہنے لگے کہ Well, my boy! وہ پیار سے ”بچے ادھر آؤ“ کہتے تھے۔ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کے اس جواب کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس پروگرام کو جاری رکھا تھا۔ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگے: ”بیٹا! پروگرام کو جاری رکھنا، خدا کی اس بات پہ نہ جانا“<sup>①</sup>۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں مارچ 1947ء میں بھی کوئی یقین نہیں تھا کہ یہ ہو جائے گا اور وہ<sup>②</sup> انگلستان سے واپس آیا اور تین جون کو اس نے آ کر یہ بالکل غیر متوقع اعلان کر لیا ہے۔ تین جون کے یہ ایسے مواقع ہیں جہاں قرآن کی یہ چیز ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَ نُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِعُوا فِي الْأَرْضِ<sup>③</sup> (28:5) ہم نے چاہا کہ یہ قوم جسے یہ بڑا ہی کچل رہے ہیں اس پہ کچھ احسان کریں، کچھ اُسے اپنی نوازش سے بہرہ یاب کریں اور وَ نَجْعَلُهُمْ أَئِمَّةً وَ نَجْعَلُهُمُ الْوَرِثِينَ . وَ نَمَكِّنْ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامَانَ وَ جُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ (28:5-6) انہیں ملک کی سرداری عطا کر دی جائے اور ایک خطہ زمین کا مالک بنادیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔ اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار ہامان اور ان کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دیا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے اور جس سے بچنے کے لیے وہ اس قدر محکم تدبیر اختیار کیا کرتے تھے۔ یعنی ان کی تباہی اور بربادی۔ اس طرح ہم نے یہ چاہا کہ پانسہ پلٹ دیا جائے، انہیں ان کی زمینوں کا وارث بنایا جائے اور یہ جس چیز کی اتنا عرصہ مخالفت کرتے رہے کہ کہیں یہ تقسیم نہ ہو جائے، وہ ہو کے رہے اور پھر وہ ہو کے رہی۔

① یہ واقعہ انہوں نے طلوع اسلام بابت فروری 1983ء ص 15-14 پر بھی رقم کیا ہے۔ اسی کے لیے مزید دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر):

مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء، ص 329 (فٹ نوٹ 1)

② ماؤنٹ بیٹن (79-1900)۔

③ اس کی سرکشی اور فساد انگیزی کے پیش نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کیے جا رہا تھا، اسے ہماری نعمتوں سے

نوازا جائے (پرویز: مفہوم القرآن ص 884)۔

## نوع انسان کے لیے قرآن حکیم کا ابدی پیغام اور ابدی اصول

عزیزانِ من! قرآن یہ چیز کہتا ہے کہ اس میں کچھ یہ پہلو بھی آجاتا ہے۔ اب ہوا یہ کہ فَكَذَّبُوهُمَا فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ (23:48) انہوں نے ان دونوں کی تکذیب کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی ان قوموں میں سے ہو گئے جو تباہ ہو چکی تھیں اس لیے کہ جو قوم بھی زندگی کے صحیح اصولوں سے انحراف کرے گی تباہ ہو جائے گی حالانکہ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (23:49) ہم نے موسیٰ کو ضابطہ قوانین دیا تھا تا کہ وہ لوگ اس کے مطابق چل کر اس تباہی سے بچ جائیں۔ عزیزانِ من! میں نے یہاں آ کر یہی لکھا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں وہ ایسا خطہ زمین پاکستان کے نام سے مل گیا۔ ہم نے اس کے ساتھ آج تک کیا کیا؟ اُف! کسی کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے: قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا۔ پھر یہ درخواست کی ہے کہ ہم خطا کار ہیں، ہم سے بھول ہو گئی، ہم نے خطائیں کی ہیں یا اللہ! ان کو نظر انداز کر دے، ہمیں توفیق عطا کر دینا کہ تو نے ہمیں جس انعام سے نوازا تھا ہم اس کے حقدار ثابت ہوں۔ عزیزانِ من! اس اگلی بات میں ایک ٹکڑا ہے جو درمیان میں آیا ہے کہ مذہبی پیشوائیت آ کر کیا کرتی تھی۔ یہاں اس کی تفصیل نہیں ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس کے فوری بعد یہ حضرت عیسیٰ کا ذکر لے آیا ہے۔ یہاں یہ حق و باطل کی ساری کشمکش اقتدار کے ساتھ تھی، حکومت کے ساتھ تھی، یہ ٹکراؤ فرعون کے ساتھ تھا۔ حضرت عیسیٰ ♦ آتے ہیں تو انکا سارا ٹکراؤ مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہی ان کی زندگی ہے۔ اب یہ چیز ہم اگلے درس میں لیں گے۔ آج کے درس کا وقت عزیزانِ من! ختم ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



## دسواں باب: سورة المؤمنون (آیات 50 تا 56)



عزیزان من! آج جولائی 1977ء کی 8 تاریخ ہے، جمعہ کا دن ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 50 سے ہو رہا ہے: (23:50)۔

تجدید یا دداشت کے لیے عرض کر دوں کہ بات اس اہم نکتہ سے چلی ہوئی ہے کہ دین کا مقصد کیا تھا، انبیائے کرام □ کس غرض سے آیا کرتے تھے، وحی کی ضرورت کیوں پڑی تھی؟ قرآن کریم نے یہ بتا دیا تھا کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (10:19) نوع انسانی ایک واحد عالمگیر برادری کی طرح رہتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اختلافات شروع کیے۔ جب اس طرح اختلافات پیدا ہوئے تَوَفَّعَتْ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ (2:213) اللہ تعالیٰ نے ان کے اختلافات مٹانے کے لیے وحی کا سلسلہ جاری کیا، انبیائے کرام □ اسی غرض سے آیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کتاب بھیجی۔ وہ کتاب کے ذریعے ان کے اختلافات مٹایا کرتے تھے۔ گویا انبیائے کرام خدا کی طرف سے ایک ضابطہ قوانین لے کر آتے تھے اور اس کا مقصد انسانوں کے خود وضع کردہ اختلافات کو مٹا کر انہیں پھر سے عالمگیر برادری بنادینا ہوتا تھا۔ یہ ہے وحی کا دین کا اور انبیاء کی بعثت کی غایت، منتہا اور مقصود



و مطلوب۔ لہذا قرآن کریم نے اپنے ہاں یہ جو انبیائے کرام □ کی داستانوں کے سلسلہ میں اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کیں تو اس میں اہم بات یہی تھی کہ اس خاص دور میں ان اختلافات کی نوعیت کیا تھی۔ اختلاف کے یہ معنی نہیں تھے کہ مناظرے ہوتے تھے بلکہ ان اختلافات نے انسانوں کو مختلف امتوں میں بانٹ دیا، مختلف قوموں میں، مختلف قبیلوں میں، گروہوں میں، خاندانوں میں اور پارٹیوں میں تقسیم کر دیا۔

### عالم گیر سطح پر وحی کی تعلیم کا مقصد امت واحدہ کی تشکیل ہے

ہر نبی کے زمانے میں یہ انسانیت جو گروہوں میں بٹ جاتی تھی تو اس تقسیم کی ایک خاص وجہ اور کچھ خاص بنیاد ہوتی تھی اور وہ نبی خاص طور پر اس بنا و بنیاد کو مٹانے کے لیے آتے تھے۔ کہیں نسل کی بنیاد پر وہ بٹتے تھے، کہیں قبائلی بنیاد پر، کہیں طبقاتی تقسیم پر، کہیں پیشوں کے اعتبار سے، اور کہیں وہ جاگیردار یوں، مزارعوں اور کاشتکاروں کی تقسیم پر گویا یہ انسان مختلف طبقات کے اندر بٹے ہوئے ہوتے تھے اور انبیائے کرام □ آتے تھے کہ ان کے طبقات کو مٹا کر انہیں پھر امت واحدہ بنا دیا جائے۔ قرآن نے آکر یہ بتایا ہے اور یہی ہے وہ غایت جسے ”پنجابی میں ساری گل دات کڈیا ہوا کیندے نیں<sup>①</sup>“۔ ہر وہ نظریہ، عقیدہ، تحریک اور اقدام جو عالمگیر انسانیت کو ٹکڑوں میں بانٹ دے، تفرقے پیدا کر دے، فرقے پیدا کر دے، پارٹیاں بنادے، قومیں بنادے، وہ خلاف دین، خلاف وحی، خلاف منشائے خداوندی ہے اور ہر وہ اقدام جو ان کو پھر سے ایک امت بنادے، ایک برادری بنادے، وہ دین کا مقصود ہے۔

قرآن کریم ایک تو اتر کے ساتھ یہ سلسلہ بیان کرتا چلا آ رہا ہے۔ حضرت نوح □، حضرت ہود □، حضرت صالح □، حضرت شعیب □، حضرت موسیٰ □ کے سلسلے میں سابقہ درس میں یہ چیز سامنے آئی تھی اور اب یہ بات Climax (عروج) پہ آ پہنچی تا آنکہ ہم نے حضرت عیسیٰ □ کو اپنا پیغام بر بنا کر بھیجا۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ □ کی بھی سخت مخالفت کی کیونکہ وہ انہیں خدا کے صحیح دین کی طرف دعوت دیتا تھا اور اس کی والدہ مریم ② کی بھی کیونکہ اس نے ان کی خود ساختہ شریعت کی خلاف ورزی<sup>②</sup> کی تھی۔ یہاں حضرت عیسیٰ □ کی زندگی کے حالات نہیں بتائے بلکہ ایک آیت میں ان کی اور ان کی ماں کی طرف اشارہ کیا کہ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً ۖ وَآوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ (23:50) ہم نے ان دونوں کو اس قوم کی نجات اور تباہی کی نشانی بنا دیا یعنی اگر وہ

① جسے پنجابی زبان میں ساری بات کا ملخص کہتے ہیں۔

② اس تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکہف و سورہ مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2004ء (حصہ سورہ مریم)۔

ان کی مخالفت سے باز آ کر ان کا احترام کرتے اور جو دین خداوندی حضرت عیسیٰ ﷺ نے پیش کیا تھا اسے اختیار کر لیتے تو وہ تباہی سے بچ جاتے، اگر وہ اس روش سے باز نہ آتے تو ہلاک ہو جاتے لیکن انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ ہم نے ان دونوں کو ان کی دستبرد سے محفوظ کر کے ایک مرتفع مقام پر پناہ دی جو ان کے رہنے کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔ اس میں صاف اور شفاف پانی کے چشمے رواں تھے جن کی وجہ سے وہ جگہ نہایت سرسبز و شاداب تھی۔

یہی کچھ ناقہ حضرت صالح ﷺ کے سلسلہ میں کہا تھا کہ دیکھیں کیا یہ لوگ قانون خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور ایک برادری بنتے ہیں یا نہیں؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا وہ قوم وحی خداوندی کا اتباع کرتی ہے کسی شے کو اس اتباع کے جانچنے کا ایک Symbol (علامت) بنادیا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ قوم اتباع کرتی ہے اور وہ Symbol (علامت) ہمیشہ محسوس ہونا چاہیے جس سے پتہ چل جائے کہ یہ جو اس علامت کے لیے انہیں کہا جا رہا ہے اس پر عمل پیرا ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے۔ یہاں محسوس طور پر حضرت عیسیٰ ﷺ کو اور ان کی والدہ کو Symbol (علامت) بنایا جا رہا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ جو کچھ انہوں نے ناقہ صالح ﷺ کے ساتھ کیا، وہی کچھ اس قوم بنی اسرائیل نے اپنے اس آخری نبی حضرت عیسیٰ ﷺ کے ساتھ کیا اور یہاں یہ تفرقہ، یہ تفریق، یہ اختلاف، Climax (نقطہ عروج) پہنچ گئے تھے۔ آپ نے پہلے یہ دیکھا کہ یہ اختلافات نسل کی بنیادوں پر، طبقاتی بنیادوں پر، پیشوں کی بنیادوں پر، دولت کی بنیاد پر، قومیتوں کی بنیادوں پر نظر آتے ہیں اور یہاں آ کر ہم دیکھتے ہیں کہ انبیائے کرام کے اس دنیا میں آنے کی تو بنیاد ہی ایک بنتی ہے یعنی یہ کہ دین میں اختلافات کو مٹا کر ایک امت بنانے کے لیے اور یہ دین کے نام لیوا جنہیں مذہبی پیشوائیت کہا جاتا ہے، دین کے نام پہ اس بنی ہوئی امت واحدہ کے اندر تفریق پیدا کرتے تھے یعنی یہ انتہا ہے کہ یہی گروہ پہلے تفریق پیدا کرتا ہے۔ ان میں خدا کو بھی نہ ماننے والے کیوں نہ ہوں لیکن یہاں قیامت یہ تھی کہ یہ خدا کے نام پہ ایک تحریک لے کر اٹھتے تھے مگر مقصد و نشان کا کچھ اپنا تھا۔ لہذا یہ تھا جو خدا نے کہا ہے کہ کسی طریقے سے پہلے نبی نے کچھ تفرقے مٹائے ہیں، تو یہ اس سے بھی زیادہ شدید تفرقے پیدا کر دیتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر بننے والے فرقوں کے علاوہ جو باقی تفرقے تھے وہ Common Sense (عقل عامہ) کی بنیاد پہ ہی سہی Reason (عقل) کی بنیاد پہ ہی سہی، کوئی شخص بھی اس تفرقے کو اختلاف کو مستحسن قرار نہیں دیتا لیکن یہ مذہبی بنیاد پر پیدا کردہ وہ تفرقہ ہے جس میں اس پہ فخر کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم یہ جو آخر میں حضرت عیسیٰ ﷺ کا ذکر لایا ہے اور یہ جو انبیائے کرام □ کی کڑی تھی، اس میں بھی بنی اسرائیل کے انبیاء میں یہ آخری کڑی ہے تو وہ اسی لیے ہے کہ یہاں پہنچ کر مذہبی پیشوائیت کے پیدا کردہ اس تفرقے نے وہ شدت کی گہرائی اختیار کی کہ جس کی مثال اس سے پیشتر تفرقوں میں کہیں نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ دعویٰ تو ان کا یہ ہوتا ہے کہ ہم تمہیں خدا کی طرف لے جانے والے راستے پہ چلا رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے اس راستے میں روک بن کر کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے ان کے لیے احبار اور ہبان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہاں فرمایا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ<sup>①</sup> (9:34)۔

### احبار اور ہبان کی اصطلاحات کا مفہوم

عزیزانِ من! یہودی اور عیسائیوں کے ہاں یہی اصطلاحات ہیں۔ احبار، حمر کی جمع ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ”علماء“۔ رہبان، راہب کی جمع ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ”پیران طریقت، مشائخ“۔ احبار شریعت کے علمبردار ہیں اور رہبان طریقت کے علمبردار ہیں۔ یہودیت میں بھی یہ دونوں گروہ ہوتے تھے۔ یہودیت کی ابتدائی زندگی میں تو صرف شریعت اور قانون تھا لیکن آخر میں آکر ان کے ہاں بھی یہ طریقت آئی، باطنیت آئی، یہی تصوف آیا اور ان کے ہاں علما کے علی الرغم یہ مشائخ کا، پیروں کا، گروہ پیدا ہوا اور یہ تھے وہ جن کو رہبان کہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں کے تصوف کے لیے رہبانیت کی یہ Term (اصطلاح) استعمال ہوتی ہے اور پھر جب مشائخ کا ذکر آجائے تو پھر تو سوال ہی نہیں ہے کہ ان کا نام نہ آئے، خواہ آپ ان کا نام کچھ بھی رکھ لیں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ یہودیوں کے ہاں تو یہ پیدا ہو چکے تھے اور جب عیسائیت میں یہ چیز آئی تو جسے آپ علما کا یہ گروہ کہتے ہیں، جنہیں آپ احبار کہتے ہیں، انہوں نے تو ایک پوری گدی سنبھالی ہے۔ وہ جو ہیکل سلیمانی<sup>②</sup> چلا آ رہا تھا، وہ تو اس زمانے میں اس مملکت کا کیپٹل (دار الخلافہ) تھا لیکن جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو یہ جتنی چیزیں، ایوانات حکومت ہوتی ہیں، مملکت کے مرکز ہوتے ہیں، وہ پھر آپ کے ہاں پرستش گاہیں بن جاتی ہیں، تو وہ ہیکل انہوں نے بعد میں پرستش گاہ بنایا اور خود اس کے ہاں فریادی بن بیٹھے لیکن کیفیت عجیب تھی۔ یہاں ایک عجیب قسم کی تفریق شروع ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ ♦ اسی بنی اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں۔ انہوں نے انہیں انسانوں کی غلامی سے چھڑایا تھا اور خدا کی غلامی میں لے آئے تھے۔ یہی احبار اور رہبان انہی کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے اور انہی کے دین پر چلنے کے مدعی تھے مگر ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ رومن ایمپائر (سلطنت روم)<sup>③</sup> کے تابع رہتے تھے اور بڑے خوش تھے۔ انہوں نے ان سے یہ اجازت لے رکھی تھی کہ وہ ان

① ان کے علماء و مشائخ میں سے جنہیں یہ خداوندی درجہ دیتے ہیں، اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب سے لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں (کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔) (پرویز: مفہوم القرآن ص 424)۔

② ہیکل سلیمانی کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2004ء، دوسرا باب، ص 50-28۔

③ رومن ایمپائر (سلطنت روم) کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005ء، ص 92، فٹ نوٹ 1 اور ص 91 فٹ نوٹ 6۔

کے اعتقادات، مذہبی رسوم، Presonal Laws (شخصی قوانین) میں دخل نہیں دیں گے یعنی اگر کسی حکومت کی طرف سے اس قسم کی اجازت مل جائے کہ ”جاؤ“ جس طرح جی چاہے گھنٹے بجائو، بجے بجائو، گیت گاؤ، جیسے جی چاہے عبادتیں کرو اپنے نکاح طلاق کے مسئلے آپ طے کرو، لیکن ہمارے معاملے میں دخل نہ دو تو وہ اس حکومت کے تابع رہیں گے۔ اگر اس حیثیت سے دیکھا جائے تو عین وہی چیز تھی جو ہندوستان میں تحریک پاکستان کے زمانے میں مذہب کے نام پر پیش کی جاتی تھی کہ ان چیزوں کی یعنی شخصی قوانین کی اجازت دی جا رہی ہے، وہ گارنٹی (ضمانت) دیتے ہیں کہ مذہبی آزادی حاصل ہوگی، باقی رہی مملکت تو مملکت کے قوانین جمہوری طریقے پر ہونگے اور جمہوریت تو پھر ان کے ہاں مذہب سے بھی زیادہ مقدس ہو چکی تھی۔

### حضرت عیسیٰ کا ”جرم“

عزیزان من! یہ تھی بنی اسرائیل کی یہودیوں کی صورت۔ جب حضرت عیسیٰ تشریف لائے تو کلیسا نے، چرچ نے، ان کی جو تاریخ زندگی پیش کی ہے وہ عجیب چیز ہے۔ انہیں جوگی، سادھو، سنیا سی، تارک دنیا، قلم کا بنا کر رکھ دیا کہ کوئی ایک گال پہ طمانچہ مارے تو دوسری گال آگے کر دو، کوئی گالی دے تو کہو اللہ تیرا بھلا کرے۔ یعنی وہ یہ کچھ دینے کے لیے آئے تھے، لیکن اس ساری مسخ کردہ تاریخ میں وہ تختی<sup>1</sup> کو اتارنا بھول گئے۔ ان رومن کے ہاں یہ قاعدہ تھا کہ جسے موت کی سزا دی جاتی تھی، صلیب پہ چڑھایا جاتا تھا، اس کے نیچے تختی پر اس کا جرم لکھا جاتا تھا۔ وہ جو تختی ہے وہ محفوظ رہی۔ اس پہ لکھا ہوا جو جرم تھا، وہ یہ تھا کہ یہ ”شخص رومن ایمپائر (سلطنت روما) کا تختہ الٹ کر بنی اسرائیل کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ اس بغاوت کی سزا میں اس کو یہ صلیب دی جاتی ہے۔“ یہ بنی اسرائیل میں نبی پیدا ہوا۔ اب اس تختی نے بتا دیا کہ ان کی تحریک (Movement) کیا تھی؟ تحریک یہ تھی کہ جس طرح حضرت موسیٰ نے انہیں فرعون کی غلامی (Slavery) سے نکالا تھا، اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی انہیں رومن ایمپائر (سلطنت روما) کی غلامی سے نکال کر دین کی بنیادوں پر ایک آزاد قوم بنانا چاہتے تھے اور یہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ یہودیوں کے احبار نے حضرت عیسیٰ کے خلاف مرتد ہو جانے کے لیے ارتداد کے جرائم عائد کیے۔ یہ جو آپ کے ہاں بھی مرتد کی سزا قتل ہے تو دراصل یہ سزا یہودیوں کے ہاں تھی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ کے خلاف یہ جرم عائد کیا اور ان کے ہاں کے مذہبی پیشواؤں یعنی احبار نے سزائے موت کا فتویٰ دے دیا۔ احبار یہ سزا خود نہیں دے سکتے تھے، وہ تجویز کرتے تھے، انہیں حکومت سے اس کی Approval (منظوری) لینا پڑتی تھی۔ اس Approval

1 اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکہف و سورۃ مریم (کا حصہ سورۃ مریم) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور

(منظوری) کے لیے وہ گورنر کے پاس گئے تھے۔ اور اُس پہ یہ Pressure (دباؤ) ڈالا کہ اگر تم نے اس سزا کی منظوری نہ دی تو تمہاری حکومت کے خلاف بغاوت ہو جائے گی۔ انہوں نے وہاں سے اس کی سزا کی Approval (منظوری) لی تھی۔

غور کیجیے گا کہ یہ لوگ کہاں تک جاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک وہ شخص اٹھتا ہے وہ ان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، ان کو غلامی کے چنگل سے نکال رہا ہے۔ یہ ایک غیر قوم کی حکومت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ اسی کے خلاف اٹھتے ہیں اور اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ وہ ان کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر ان کے ہاں کا انجیل کا وہ بیان صحیح ہے تو خود ان کے جو حواری یا شاگرد بنے ہوئے تھے، ان کے اندر غدار گھسے ہوئے تھے۔ بقول انجیل انہی میں سے ایک نے انہیں کل تیس<sup>①</sup> روپے میں پکڑوایا تھا کہ جو جی میں آئے ان سے کراؤ۔ یہ وہی ہے جسے قرآن کہتا ہے کہ بس ان کو چند ٹکے دے دیجیے۔ اندازہ لگائیے کہ ان کے علما کا، ان کی مذہبی پیشوائیت کا، کتنا سنگین جرم ہے۔

یہ جو طریقہ تھا، وہ میں ابھی آپ کے سامنے پیش کروں گا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے خلاف ان کے جذبہ انتقام کو کس قدر بے نقاب کرتا تھا کہ موت کی سزا دی، رومن ایمپائر (سلطنت روما) سے Approval (منظوری) لی، انہی میں سے ایک نے کچھ پیسے لے کر اس کو بیچ دیا، اور ان کے حوالے کر دیا۔ جب حضرت عیسیٰؑ کی یہ داستان آئے گی تو میں عرض کروں گا کہ صلیب کا یہ سارا کچھ افسانہ ہے۔ وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔<sup>②</sup> بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم خدا کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، اسی لیے دنیا تمہارے پیچھے لگتی ہے لیکن اس سلسلہ میں دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن یہ کہتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (9:34)۔ یہی چیز تو ہے کہ یہ علما ہوں یا یہ مشائخ ہوں، ارباب شریعت ہوں یا اصحاب طریقت ہوں، ان کی کیفیت یہ ہے کہ خود کچھ کمائی نہیں کرتے، لوگوں کے مال پہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے تو یہی سب سے بڑا جرم ہے کہ معذور تو الگ رہا جو کسب رزق کے قابل ہے وہ خود کمائی نہ کرے اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے۔ اسے ہی تو وہ باطل کہتا ہے۔ ان دونوں (احبار اور رہبان) کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا رزق تو اس طرح سے باطل ہوتا ہے اور اگلا جرم یہ ہے کہ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (9:34)۔ کہتے ہیں کہ ہم تم لوگوں کو خدا کی طرف جانے والے راستے پہ ڈالتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کی طرف لے جانے والے راستے کے اندر سب سے بڑی روک یہی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ روک بن کر

① انجیل متی باب 26، آیت 15

② اس ہجرت کی تفصیل و وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الکہف و سورۃ مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2004ء حصہ سوم مریم۔

کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لوگ اس راستے پر جانے نہ پائیں۔

عزیزانِ من! اس نقطے پر قرآن کریم نے کسی خاص قوم کے احبار اور ہبان نہیں کہے بلکہ جہاں بھی یہ چیز آئے گی وہاں یٰٰسَیِّہَا  
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّہْبَانِ لَیَاکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ  
یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (9:34)۔ دیکھیے ایک ہی آیت میں ایک ہی سانس میں قرآن ان دونوں (احبار اور ہبان) کے متعلق کیا  
کیا گنا گیا ہے: ایک تو یہ کہ خود کمائی نہیں کرتے، دوسروں کی کمائی پر زندہ رہتے ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ خدا کی طرف جانے والے  
راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آیت کا باقی حصہ یہ ہے کہ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّہَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا  
یُنْفِقُوْنَہَا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْہُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (9:34) ان کو بھی اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی جن کے سرمایہ داری کے  
نظام کو یہ شریعت خداوندی کہہ کر فتویٰ دے دیتے ہیں یہ سارے کے سارے جو گروہ ہیں ان کو اس کی خوشخبری دیدیجئے کہ ان کے انجام میں  
بڑا دردناک عذاب ہوتا ہے۔ یہ سب کے متعلق ہے۔ آپ غور کر رہے ہیں کہ کس طرح ہم لوگوں کے لیے یہ چیزیں بطور فریب دی جاتی  
ہیں کہ یہ قصہ تو یہودیوں کے متعلق ہے جی یہ تو عیسائیوں کے متعلق ہے قرآن کی یہ بات مجوسیوں کے متعلق ہے یعنی ہمارے متعلق یہ ہے  
کہ بس جو جی میں آئے کرتے رہیں شفاعت محمدی ﷺ ہمیں جنت میں داخل کر دے گی۔ وہی یہودیوں کا اور نصاریٰ کا جو عقیدہ تھا کہ وہ  
جنت ہمارے لیے مختص (Reserve) ہے ہمارے سوا کوئی دوسرا اس میں داخل ہی نہیں ہو سکے گا جو جی میں آئے ہم کریں جبکہ قرآن  
کریم یہ بتا رہا ہے کہ یہ خدا کی طرف جانے والے راستے کے اندر روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ خدا کی طرف جانے والا جو  
راستہ تھا اس کی شناخت تو یہ تھی کہ وہ قوم میں تفرقے کو مٹا کر وحدت پیدا کرے گا، لیکن ان کا تو وجود ہی تفرقے کی نشانی ہوتا ہے اس لیے قرآن  
کریم نے دین کے اندر جو فرقہ پیدا کرنے والے ہیں ان کو مشرکین کے گروہ کے اندر رکھا ہے: مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ . مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا  
دِیْنَہُمْ وَ کَانُوْا شِیْعًا (30:31-32) دیکھنا اے جماعتِ مومنین! ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرک نہ ہو جانا یعنی ان میں سے نہ  
ہو جانا جو دین میں فرقے پیدا کر لیتے ہیں اور خود اس کا ایک فرقہ بن جاتے ہیں اور پھر کُلِّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْہُمْ فَرِحُوْنَ<sup>①</sup> (32):  
(30)۔ اتنے فرقے ہوتے ہیں اور ہر ایک ہی یہ سمجھتا ہے کہ بس ہم حق پر ہیں دوسرے باطل پر ہیں۔ یہ وہی چیز سے جو قرآن کریم نے ان  
یہود و نصاریٰ کے متعلق کہی ہے۔

① فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں وہی حق و صداقت کی راہ ہے اس لیے وہ اپنے  
آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-937)۔

اب اسی سلسلہ میں آگے ایک دلچسپ چیز بیان کی کہ **وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ** (2:113) وہ اس کتاب کی پیروی کرتے ہیں جس کا سرچشمہ ایک ہے مگر **قَالَتِ الْيَهُودُ** (2:113) یہودی کہتے ہیں کہ **لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ** (2:113) یہ نصاریٰ باطل کے اوپر ہیں، یہ سب جہنم میں جائیں گے **وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ** (2:113) اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہ یہودی سب باطل پہ ہے، جہنم میں جائیں گے۔ اب تماشہ دیکھیے کہ یہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم خدا کی کتاب کے پیرو ہیں۔ خدا کی کتاب کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اس کے خدا کی طرف ہونے کا ثبوت اور دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہوتا، تو دو متضاد گروپ جو ایک دوسرے کو جہنمی بتائیں، وہ جو دعویٰ کریں کہ ہم خدا کی کتاب کے متبع ہیں اور ان کے تفرقے کی باہم کیفیت یہ ہو یہ تو خود اس بات کا ثبوت ہو گیا کہ یہ خدا کی کتاب نہیں۔ اب دوسری جگہ اس نے یہ بتا دیا کہ **فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ** (2:79)۔ یہ بتا ہی اور بربادی کا موجب ہے کہ یہ خود فتویٰ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شریعت خداوندی کا حکم ہے اور **لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا** (2:79) یہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ چار پیسے مل جائیں۔

عزیزان من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ یہ وہ چیز تھی جسے میں نے Crisis (بحران) کہا ہے، یہ چیز حضرت عیسیٰ کے زمانے میں آ کر Climax (نقطہ عروج) پہ پہنچ گئی تھی۔ یہودیوں کے ہاں ان کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی Protection (حفاظت) مل گئی تھی۔ اس میں وہ ان کی محکومی میں رہ رہے تھے ہیکل کو انہوں نے اپنی قوت کا گڑھ بنا رکھا تھا۔ اس دوران حضرت عیسیٰ تشریف لائے۔ قرآن کریم میں تو یہ تفصیل دی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے ہاں کی تورات یا انجیل دونوں ہی بالکل محرف ہیں، اصلی نہیں ہیں لیکن پھر بھی ان میں کچھ باتیں تو رہی جاتی ہیں جن سے نظر آتا ہے کہ صحیح تھیں۔

### حضرت عیسیٰ کے دور نبوت میں مذہبی پیشوائیت کی اجارہ داری کی کیفیت

حضرت عیسیٰ کی زندگی ان کا مشن، ان کی مساعی، ان کی جمعیت انہی احبار اور رہبان کے خلاف ایک کھلا ہوا جہاد تھا۔ ان کے مفاد کے نقطہ نگاہ سے تو وہ سچے تھے کہ وہ ایسا آدمی ہے جسے واقعی اپنے شکنجے میں کس لے لینا چاہیے۔ یہ انانجیل ان کے متعلق کیا کہتی ہیں کہ وہ کرتے کیا تھے؟<sup>1</sup> یہ تو جب میں ان کی زندگی کے متعلق آگے چل کر قرآن میں جو یہ واقعات آئیں گے، تو عرض کروں گا کہ کس طرح بچپن میں ان کی والدہ ان کو لے گئی تھیں۔ یہ جو یہاں ہے کہ **وَأَوَيْنَهُمَا إِلَىٰ رُبُوعٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ** (23:50) بچے کو ان

1 اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز شعلہ مستور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1994، بالخصوص ص 55 تا 65۔

2 ہم نے ان دونوں کو ان کی دستبرد سے محفوظ کر کے ایک مرتفع مقام پہ پناہ دی جو ان کے رہنے کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔ اس میں صاف اور شفاف پانی کے چشمے رواں تھے (جن کی وجہ سے وہ جگہ نہایت سرسبز و شاداب تھی)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 781)۔

یہودیوں سے بچانے کے لیے اس کی والدہ اور وہ<sup>①</sup> وہاں سے فلسطین کی سرزمین کے طرف چلے گئے تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کہیں مصر میں جا کر حضرت مریم اور ان کے شوہر یوسف نجار گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے اور یہ بچہ بھی جو پیدا ہوا تھا۔ وہ میں پھر بتاؤنگا کہ حضرت مریم کو وہ کیا خوف تھا جو وہ یہاں سے گئیں لیکن بہر حال وہ وہاں چلے گئے۔ یہاں قرآن نے لفظ ”ربوہ“ کہا ہے۔ آپ سمجھتے ہوئے کہ پتہ نہیں لاہورریلوے اسٹیشن سے انہوں نے ٹکٹ لی اور ربوہ جا پہنچے۔ یہ آپ کے ہاں کاربوہ تواب بنایا گیا ہے۔

عزیزان من! ربوہ کہتے ہیں سطح مرتفع کو۔ یہ ذرا اونچی زمین ہے، تھوڑا سا پہاڑی علاقہ ہے، اس میں ان کو رہنے کی جگہ بھی ملی اور چشمے بھی تھے۔ اس لیے کہ وہ بنجر زمین نہیں تھی۔ اس زمانے میں اگر کہیں پانی ہوتا تھا اور پانی کے ساتھ تو بہر حال کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان مل جاتا تھا، زندگی بڑی سادہ ہوتی ہے، پھل مل جائیں یا عام طور پر جو پیداوار ہوتی ہے اس میں سے کھانے کو مل جائے اور رہنے کو قرار کی جگہ مل جائے تو گزارہ ہو جاتا تھا۔ یہاں کہا کہ وہاں یہ جگہ مل گئی تھی۔ آپ اس قصے کو چھوڑ دیجیے۔ انجیل بھی یہ بتا رہی ہے کہ اس کے بعد جب آپ کوئی تیس برس کے ہوئے پھر وہاں سے واپس ہیکل میں آئے۔ یہاں آنے کے بعد ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ ہیکل کی سیڑھیوں<sup>②</sup> پر کھڑے ہو کر اپنے عقیدت مندوں کو مخاطب کرتے تھے۔ یہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور ارحیائے بنی اسرائیل کی آخری کوشش تھے۔

### ہیکل کے اندر حضرت عیسیٰ کا انقلابی خطاب

عزیزان من! اب آپ اس میں دیکھیے کہ وہ جو ہیکل تھا، وہ نہ صرف ان کی پرستش گاہ تھی بلکہ ان کی اپنی تھیا کر لیبی (مذہبی حکومت) کا مرکز بھی تھا۔ وہ احبار اور رہبان دونوں کا ہی مرکز تھا۔ آج کی اصطلاح میں یہ ان کی وہ خانقاہ تھی، جہاں حضرت مریم چڑھاوا چڑھانے لگی تھیں۔ انجیل بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ **◆** ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ جو عقیدت مند تھے وہ سارے وہاں آ جاتے اور یہ وہاں کھڑے ہو کر ان کو مخاطب کر کے انجیل کے الفاظ میں اسے یہ کہا جائے گا کہ وہ وعظ کہتے تھے۔ میں کہوں گا کہ اس سے بڑا انقلابی خطاب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ احبار اور رہبان اور ان کے نمائندے ہیکل میں ہوتے اور یہ ان کو کھڑے ہو کر پکار کر کہتے: ”اے ریاکار فقیہو!“ یہ ہوتا ہے ایک انقلابی۔ کس مقام پر کھڑے ہیں؟ ذرا سوچیے تو سہی کہ یہ سارے آنے والے ان کے اتنے بڑے عقیدت مند ہیں اور ادھر وہ فقیہ ہیں جو ان کے ہاں کے یہ رہبان تھے۔ اندازہ لگائیے کہ ادھر وہ موجود ہیں جنہیں اتنے زیادہ اختیارات حاصل ہیں کہ موت

① ڈاکٹر انعام الحق نے داستان فلسفہ تالیف ول ڈیورینٹ، مترجم عابد علی عابد، ص 370 کے حوالے سے ”حکمت کی باتیں“ کے عنوان سے مجلہ طلوع اسلام اگست 2007ء میں لکھا ہے کہ ”ہیکل نے حضرت عیسیٰ کی سوانح حیات قلمبند کی۔ اس تالیف میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ **◆** مریم اور یوسف کے لڑکے تھے اور بعد میں کتاب کو ضائع کر دیا۔“

② ہیکل کی سیڑھیوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقریر کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سوہ الکھف وسورۃ مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2004ء، ص 207۔



سے ورے تو ہر سزا وہ خود دے سکتے ہیں اور موت کی سزا دینے کے لیے صرف ان کو Approval (منظوری) لینے کی ضرورت ہے۔ یہ تو قانونی بات ہوگئی اور قانون کے علاوہ یہ اتنا بڑا ان کا جمہور ہے اور ادھر ان کے عقیدت مند چلے آ رہے ہیں۔ یہ احبار و رہبان اوپر موجود ہیں۔ ان میں یہ شخص کھڑا ہے۔

یہ ہوتا ہے نبی اور عزیزان من! وہ خطاب کر رہا ہے کہ ”اے ریاکار فقیہو! تم پر افسوس ہے“۔ میں نے قرآن کی آیت پڑھی تھی کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف جانے والے راستے کی طرف لے جاتے ہیں اور عمل یہ ہے کہ اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں (9:34)۔ انہوں نے کہا کہ ”اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے<sup>1</sup> ہو۔“ یہ وہی ہے جو قرآن کریم کی آیت ہے کہ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ<sup>2</sup> (9:34)۔ ظاہر ہے کہ جو راستے میں روک بن کر کھڑا ہوا ہوتا ہے وہ نہ تو خود وہاں اندر پہنچا ہوا ہوتا ہے اور نہ کسی اور کو جانے دیتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے کہا تھا کہ اس قسم کی جو تحریک ہے اس کے متعلق کتابوں کے اندر بھی اس قسم کے ٹکڑے موجود ہیں جن سے نظر آتا ہے کہ واقعی یہ خدا کی چیز تھی۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے کہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔“ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دو گنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔ تم تو ہو ہی جہنمی۔“ اپنے سے دو گنا جہنم کا فرزند اس کو بنا دیتے ہو۔“ اصطلاح ملاحظہ فرماؤ عزیزان من! اگرچہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ حرف انجیل ہے مگر حضرت عیسیٰؑ کے خطابات کا انداز اس زمانے کا نظر آتا ہے۔ تمثیلی انداز ہے اور بڑی خوبصورت مثالیں ہیں۔ وہ ساری بات تمثیلات و استعارات میں کرتے ہیں۔ ایک اصطلاح یہ دی کہ ”اے اندھے راہ بتانے والو!“ کیا بات ہے خدا کا رسول یہ ہوتا ہے! عزیزان من! بھولنا نہیں کہ یہ کہاں کھڑے ہیں کس قوم میں کھڑے ہیں کن لوگوں میں کھڑے ہیں اور کہہ یہ رہے ہیں کہ ”اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں“۔ وہ ہیکل کو مقدس کہتے تھے ہم بیت المقدس کہتے ہیں۔ اس مقدس کے معنی ہیں جس میں ایک مقدس چیز رکھی ہوئی ہو۔“ تم یہ کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھالے تو کوئی بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے! سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ پودینے اور

1 یہ جلمے متی کی انجیل میں موجود ہیں (متی: 23:10)

2 خدا کی طرف آنے والے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

سوف اور زیرے پر تو وہ یکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! جو چھڑ کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو،<sup>①</sup>

## قرآن حکیم نے انسانی ذہنیت کی ترجمانی کی ہے

عزیزان من! کیا یہ دو ہزار سال پہلے کی بات ہو رہی ہے؟ میں نے کہا تھا کہ جب قرآن میں احبار اور ہبان کا ذکر آئے تو یہ بات ذہن میں رکھیے کہ یہ کسی خاص قوم کے نہیں ہیں۔ قرآن تو ان کی ذہنیت (Mentality) بیان کرتا ہے، ان کی نفسیات بیان کرتا ہے، ان کا کیریکٹر بیان کرتا ہے، خواہ وہ کسی بھی قوم میں ہو، کسی زمانے میں ہو، کسی مذہب میں ہو، کسی پارٹی میں ہو۔ قرآن خاص طور پر کسی زمانے کی بات نہیں کرتا۔ اس سے پہلے جتنی بھی چیزیں ہم نے دیکھی ہیں، وہ اس قوم کی اضافت کے لحاظ سے، ریفنس یا حوالے کے لحاظ سے، تو نظر آتی ہیں کہ وہ قوم ہود اور قوم ثمود کی ہیں لیکن وہ جو کیریکٹر بیان کرتا ہے، وہ عالمگیر ہے، وہ ہر دور میں پایا جائے گا۔ قرآن کریم نے تو ان کی داستانیں بیان ہی اس لیے کی ہیں کہ تم جو قرآن کے ماننے والے ہو، دیکھنا کہیں یہ کچھ نہ ہو جائے۔ سنیے! حضرت عیسیٰؑ نے کہا ”اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔“ آگے سنیے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کیا کہتے ہیں: ”اے سانپو! اے افی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔“ اپنے متبعین (Followers) کو Warn (تنبیہ) کرتے ہیں کہ ”دیکھنا، یہ فقیہ جو موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں، جو کچھ بتائیں، وہ سب کرو اور مانو لیکن وہ جو کریں وہ بالکل نہ کرو، یہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں، وہ اپنے لیے بڑے بڑے تعویذ اور قبة بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔“ عزیزان من! یہ آج کی بات نہیں ہے۔ یہ مخصوص نظام ہوتا ہے، اس کی خاص وضع قطع ہوتی ہے اور یہ چیز بھی بڑی اہم ہوتی ہے۔

## احبار اور ہبان کی ذہنیت کی بنا پر فرقہ بنتا ہے

یہ جنہیں احبار کہتے تھے (یا کہتے ہیں) یا علما کہتے تھے (یا کہتے ہیں) اس سلسلے میں یاد رکھیے کہ دراصل ہوتا یہ ہے کہ پہلی کتابوں کے اندر جو کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے، اس کی معلومات ان کے پاس ہوتی ہیں۔ بس پھر یہی ہوتا ہے۔ مثلاً انجیل کے پاس معلومات ہوتی ہیں، ڈاکٹر کے پاس معلومات ہوتی ہیں، آرکیٹیکٹر کے پاس معلومات ہوتی ہیں، اپنے فن کے مورخ (Historian)، Professor

① متی (23:1-34)

② یاد رہے یہ 8 جولائی 1977ء کو کہا گیا تھا۔

③

حوالہ (متی 23:1-36)

(پروفیسر) ہوتے ہیں، ان کے پاس بھی ہوتی ہیں۔ اگر ہسٹری (تاریخ) کے پروفیسر ہیں، تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہسٹری (تاریخ) میں کیا لکھا ہے۔ ان معلومات کی بنیاد کیا کبھی آپ نے دیکھا یا کہا کہ انجینئر ایک فرقہ بن گئے ہوں اور ڈاکٹر ایک فرقہ بن گئے ہوں؟ نہیں، لیکن تماشا یہ ہے کہ ان احبار و رہبان کے پاس وہ معلومات ہوتی ہیں، جو دوسروں کو نہیں ہوتیں۔ اب جس کا جی چاہے وہ ان کتابوں کو لے اور وہ معلومات حاصل کر لے لیکن یہ لوگ اپنے ہاں ایک گروہ بندی عنصر کو بھی شامل کر کے باقی لوگوں سے، جو اسی شریعت کے قیام ہوتے ہیں، الگ ایک فرقہ بنا لیتے ہیں اور جو اس میں داخل نہیں ہوتا خواہ اس کی معلومات ان سے بھی زیادہ ہی کیوں نہ ہوں، وہ اسے صاحب اختیار نہیں قرار دیتے بلکہ اس کے خلاف کفر کا فتویٰ دے کر ایک الگ فرقے کی بنیاد رکھ دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ تفرقہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانے والے ہیں۔

### قومیت کے معیار پر علامہ اقبالؒ اور حسین احمد مدنیؒ کی سوچ میں فرق

عزیز ان من! یہ بات دُور کی تاریخ کی نہیں ہے، اپنی ہی تاریخ کی ہے۔ آپ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1879-1957) اور علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938) کے درمیان جو کشمکش ہوئی تھی اسے پڑھیے۔ وہ قومیت کے معیار پر تھی۔<sup>①</sup> آپ اندازہ لگائیے کہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے مقابلے میں دوسری طرف کہنے والا اقبالؒ تھا۔ ہزار برس میں دین خداوندی پہ صحیح نگاہ رکھنے والا، ان جیسا شاید ہی کوئی دوسرا پیدا ہوا ہو۔ کم از کم میری بصیرت میں تو نہیں ہے۔ وہ شخص، یعنی مولانا حسین احمد مدنی مرحوم، جواب میں یہ لکھتے ہیں کہ ”ٹھیک ہے، انہوں<sup>②</sup> نے بہت سی قرآن کی آیات بھی دی ہیں اور احادیث کے حوالے بھی دیئے ہیں، لیکن آپ سوچیے کہ ڈاکٹر سراقبالؒ ایک اسکالر (Scholar) ہو سکتے ہیں، عالم تو نہیں ہو سکتے،“ آپ اسکالر (Scholar) تو جھٹ سے کہہ دیں گے اور بھول جائیں گے کہ صاحب! اس لفظ کا ترجمہ عالم ہے۔ یہ ترجمہ کی بات نہیں ہے۔ بقول ان کے یہ عالم ایک مخصوص گروہ کا فرد ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب عالم یا علما کہتے ہیں تو وہ ایک خاص گروہ ہوتا ہے جو اس سے باہر ہے۔<sup>③</sup> وہ جو کہہ رہے ہیں اس کا اندازہ لگائیے۔ مدنی صاحب<sup>④</sup> نے یہ جواب دیا۔ یہ لکھی ہوئی کتاب میں موجود ہے کہ ”ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن اقبالؒ عالم نہیں ہے، اس لیے دین کے

① قومیں اوطان سے بنتی ہیں، دین سے نہیں، علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے ہاں ”ارمغانِ حجاز (اردو)“ میں حسین احمد کے عنوان سے یہ لکھا تھا:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ  
ز دیو بند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است  
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است  
چہ بے خبر زمقامِ محمدؐ عربی است  
بمصطفیٰ برسائِ خویش را کہ دیں ہمہ اوست  
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

② مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)

③

مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1879-1958)

موضوع پر گفتگو کرنے کا انہیں حق نہیں ہے۔“ جی میں احبار اور ہبان کے متعلق یہ کہہ رہا تھا کہ یہ اپنے لیے بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں، اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں، ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں رکھتے ہیں، اور بازاروں میں سلام لینا اور مولانا کہلانا پسند کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں مولانا عبید اللہ سندھی (1865-1935) آخری دور میں آئے تھے۔ حالانکہ وہ دیوبندے کے بہت بڑے عالم تھے لیکن وہ بڑا انقلابی ذہن لے کر آئے۔ ساری عمر وہ افغانستان، ترکی اور روس میں رہے۔ وہ مسلم امہ میں اتحاد کے لیے کوشاں رہے۔ دیوبند گروہ کے ساتھ شامل ہونے کے جتنے بھی ”شناختی کارڈ“ ہوتے ہیں، ان کے خلاف کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ یہ چیز کہدی کہ یہ خاص قسم کا لباس ایک علامت بن جاتا ہے تو مولانا کفایت اللہ مفتی نے یہ کہا کہ مولانا عبید اللہ سندھی صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں کہ لباس میں کیا رکھا ہے، کوئی سا بھی پہن لیا جائے۔ اس پر انہوں نے<sup>1</sup> جواب دیا کہ ”مجھے خوشی ہوئی کہ مفتی صاحب نے یہ فرمایا ہے، تو میں عرض کروں گا کہ اگر لباس میں کچھ نہیں رکھا، تو اگلے جمعہ کو مفتی صاحب نیکر (Knicker) پہن کر، سر پہ ٹوپ (Hat) رکھ کر، ذرا مسجد میں آئیں۔“

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں، ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں رکھتے ہیں، اور بازاروں میں سلام لینا اور دوسروں سے مولانا کہلانا پسند کرتے ہیں۔ اب آپ غور فرمائیے کہ یہ شخص<sup>2</sup> ہیکل کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو کر ان کے علی الرغم ان لوگوں کو یہ کچھ کہتا ہو تو کیا وہ اس کو چھوڑ دیں گے؟ نظریہ آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا اثر ہو رہا تھا اور وہ بات جو ابھی میں نے کہی ہے کہ وہ تختی<sup>3</sup> پہ لکھی ہوئی تھی کہ ”یہ بادشاہ بننا چاہتا تھا“۔ یہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں اور اس سے نظر آتا ہے کہ ان کا مشن وعظ کہنا نہیں تھا، بلکہ بنی اسرائیل کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی محکومیت کے چنگل سے چھڑا کر ان کی آزاد مملکت یا آزاد حکومت قائم کرنا تھا، اور یہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔

## انجیلوں کی کہانی، حقائق کی زبانی

عزیزان من! سنئے! یہ احبار اور ہبان کیوں مخالفت کرتے تھے۔ یہ جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے، وہ سب انا جیل میں لکھا ہوا ہے۔ یہ

4 مولانا عبید اللہ سندھی (1865-1935)

5 یہاں اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔

6 ”صلیب کے سلسلے میں تختی کی عبارت“ کے لیے مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکھف و سورہ مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2004ء

عبارتیں میں نے پڑھی ہوئی ہیں۔ انا جیل اربعہ (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) عیسائیوں کے نزدیک مستند صحف مقدس ہیں۔ یہ انا جیل کس طرح وجود میں آئیں؟ یہ کہانی بھی بڑی عجیب ہے۔ کبھی وقت آیا تو میں آپ کو عرض کرونگا۔ اس کے متعلق میری کتاب ”مذہب عالم کی آسمانی کتابیں“ دیکھیے۔ اس میں میں نے دنیا کے سارے مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی لکھی ہے کہ یہ کیسے بنیں، کن مراحل سے گزریں، آج ان کا کیا حال ہے اور کیا ان کتابوں کے ماننے والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ وہی انجیل ہے جو ان کو نبی سے ملی تھی؟ یہ ساری کہانیاں میں نے اس کتاب کے اندر لکھ دی ہیں۔ اس میں آپ کو ملے گا کہ انجیل کی یہ چار کتابیں کیسے بنی تھیں۔ یہ 34 کے <sup>1</sup> قریب تھیں جن کے متعلق دعویٰ تھا کہ یہ (Original) (اصلی) ہیں۔ ان کی ایک کونسل <sup>2</sup> ہوئی تھی اور اس میں کوئی متفقہ فیصلہ ہی نہیں ہوا تھا کہ ان میں سے کوئی کتاب Original (اصلی) ہے۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہنشاہ قسطنطین نے خود اس کونسل کی صدارت کی تھی۔ آخر میں اس نے یہ فیصلہ دیا کہ جاؤ یہ فیصلہ خدا پہ چھوڑو۔ انہوں نے فرش کے اوپر وہ کتابیں بکھیر دیں اور کہا کہ صبح آ کے دیکھیں گے کہ ان میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور پھر بقول ان کے وہ تبدیلی روح الامین کی طرف سے ہوئی۔ ان میں سے چار کتابیں اور کچھ خطوط میز کے اوپر رکھے تھے۔ کہا

**1** حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی زبان ارامی تھی لیکن حیرت ہے کہ ان 34 انا جیل میں سے (سوائے ایک کے جواب مفقود ہے) کوئی بھی ارامی زبان میں نہ تھی۔ سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان خطوط کی تھی جو حواریوں کی طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ ان کی تعداد قریب (113) تک شمار ہوتی تھی۔ نیقیہ کی مشہور کونسل (The Council of Nicaea) (منعقدہ 325ء) میں یہ تمام لٹریچر سامنے رکھا گیا اور ان میں سے چار انا جیل (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) رسولوں کے اعمال، پولوس، یعقوب، پطرس، یوحنا اور یہودا کے خطوط اور مکاشفات یوحنا منتخب کر لیے گئے اور باقی انا جیل اور خطوط کو وضعی (Apocrypha) (پوکریفہ) قرار دے دیا گیا۔ جو کچھ منتخب کیا گیا اسے عہد نامہ جدید کہا جاتا ہے۔ (ص 40) نیقیہ کی کونسل (The Council of Nicaea) میں ان کتابوں کا انتخاب بھی عجیب و غریب طریق سے عمل میں آیا۔ یہ کونسل شاہنشاہ قسطنطین کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس میں سلطنت روما کے اطراف و جوانب سے دو ہزار اٹھالیس مندوبین شامل ہوئے۔ قسطنطین نے خود اس کی صدارت کی۔ اس کونسل کے انعقاد سے مقصد یہ تھا کہ کلیسا کے مختلف فرقوں میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ان میں باہمی تطبیق و توثیق کی صورت پیدا کر کے ایک متفقہ علیہ مذہب کی تشکیل ہو جائے۔ کونسل کی بحث و جدل نے ایسی شدت اختیار کی کہ 1730 مندوبین کو باہر نکال دینا پڑا۔ بقایا 318 بھی کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے کہ مختلف فرقوں کی انا جیل میں سے کسے باقی رکھا جائے اور کسے مسترد کر دیا جائے۔ (ص 41)

جس طرح چوتھی صدی عیسوی میں نیقیہ (Nicaea) کی مشہور کونسل منعقد ہوئی تھی، اسی طرح سولہویں صدی (1545ء لغایت 1563ء) میں ٹرنت (Trent) کے مقام پر ایک اور عظیم الشان کونسل منعقد ہوئی۔ (ص 46) اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز: مذہب عالم کی آسمانی کتابیں؛ طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور، 1996ء، ص 40 تا 59۔

**2** اس کونسل کا نام نیقیہ (Nicaea) ہے جو 325ء کو منعقد ہوئی تھی۔

کہ یہ ہیں 4 کتابیں اصل<sup>①</sup>۔ ایک انجیل<sup>②</sup> اور پچ گئی۔ اس کی بھی کہانی خود ان کے ہاں کے ایک حواری کی ہے۔ بہر حال یہ ان کی ان انجیلوں میں سے نہیں ہے۔ عزیزان من! اس کی تفصیل میری کتاب ”مذہب عالم کی آسمانی کتابیں“ میں ملے گی۔ اس میں دیکھ لیجیے۔

### ہیکل میں کاہن کے منصب کی کیفیت اور احبار اور ہبان کی مخالفت کی وجہ

حضرت مسیح ♦ کی بعثت مقدسہ کی غایت ایک طرف بنی اسرائیل کو رومیو کی غلامی و محکومی سے نجات دلانا اور دوسری طرف ان کے معاشرہ کو قوانین خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شدت تکرار سے ”خدا کی بادشاہت“ کا اعلان حضرت مسیح ♦ کی زبان اقدس سے ہوا آپ ♦ سے پیشتر کتب تورات میں اس انداز سے کہیں نہیں ملتا۔ آپ اس حقیقت کو انجیل برناباس میں سینے! لکھا ہے کہ ”تب (ملک کے) لوگوں نے آپس میں صلاح کی کہ یسوع کو اپنا بادشاہ بنانا چاہیے“<sup>③</sup>۔ اس لیے یہودی احبار اور ہبان بھی حضرت مسیح ♦ کی مخالفت میں پرتل گئے۔ ”تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا“<sup>④</sup>۔ یاد رہے کہ ہیکل کے اندر سب سے بڑا منصب کاہن کا ہوتا تھا۔ یہ طبقہ لوگوں کی قسمتیں بتانے والا، تقدیریں بتانے والا، پیش گوئیاں کرنے والا ہوتا ہے جب کہ نبی تو یہ کہتا تھا کہ صاحب! مجھے اپنے متعلق بھی علم غیب نہیں، میں تمہارے متعلق کیا تقدیر بتاؤں گا لیکن مذہب میں آکر یہ سب پیش گوئیاں کرنے والے تقدیریں بتانے والے ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں انہیں کاہن کہتے تھے۔ یہاں ہمارے ہاں انہیں ”حضرت جی“ کہا جاتا ہے۔ بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ ”ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے البتہ ہم

① نیقیہ کی کونسل (The Council of Nicaea) میں بقایا 318 مندوبین نے بالآخر ایک رات تمام کتابوں کو فرش پر بکھیر دیا۔ صبح آکر دیکھا تو کچھ کتابیں اور خطوط میز کے اوپر رکھے تھے۔ ان صحیفوں کو مقدس سمجھ کر منتخب کر لیا اور باقی کتابیں مسترد قرار پا گئیں۔ چنانچہ اس کونسل کی روئیداد میں مذکور ہے کہ ”جو کچھ ان تین سو پادریوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا، اسے خداوند کی خوشنودی سمجھ لینا چاہیے۔ بالخصوص اس لیے کہ ان قابل ہستیوں کے دل میں روح القدس سمار ہا تھا جس نے انہیں خداوند کی مرضی کی طرف راہ نمائی کر دی۔“ (حوالہ پرویز: مذہب عالم کی آسمانی کتابیں، طلوع اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ، لاہور، 1996ء، ص 41)

② یہ انجیل (برناباس) ان متروک اناجیل میں سے ہے جنہیں عیسائیوں نے ایک عرصہ تک دنیا کے سامنے نہیں آنے دیا کیونکہ اس کا اکثر حصہ دیگر اناجیل سے مختلف اور عیسائیت کے مسلمات کے خلاف ہے۔ اس کا ایٹالوی نسخہ وائنا کے کتب خانہ میں موجود ہے جو شروع بیسویں صدی میں بعض مستشرقین کی کوششوں سے دنیا کے سامنے آ گیا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو گئے (برناباس حضرت مسیح کے ایک حواری تھے) (حوالہ پرویز: 1994ء)

شعلہ مستور (پنجم بلا ترمیم ایڈیشن) لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ص 14

③ انجیل برناباس فصل ص 139

④ انجیل برناباس فصل ص 142

پر بڑی مصیبت ہوگی۔ یعنی روٹی کما کے کھانی پڑے گی۔ آگے یہ فقرہ آتا ہے ”ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لیے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے کیونکہ ہماری تقلید (رسومات) باطل سے اس کی بھنبہ نہیں سکتی“۔ یعنی وہ مذہب کو دین سے بدلنا چاہتا ہے۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہونگے کہ اپنی روٹی عطیے کے طور پر مانگیں۔<sup>①</sup>

عزیزان من! مسئلہ ہی سارا یہ ہے۔ یعنی وہ انہیں ان کی محکومی کی زندگی سے نکال کر آزادی کی فضا میں لا رہا ہے رزقِ حلال کی طرف لا رہا ہے اور یہ کانونوں کے سردار سے مشورہ کر رہے ہیں جو روٹی کے معاملے میں سب سے بڑا تھا کہ اگر کل کو یہ حکومت اس کے ہاتھ میں آگئی تو ہم کیا کریں گے ہماری اولاد کیا کرے گی؟ یہ جو سروس (خدمت) کا لفظ ہے یہ وہی چیز ہے۔ یہ اپنے آپ کو دین کے امام کہتے تھے۔ لہذا اس امامت سے تو یہ ہم کو نکال دیں گے اس لیے کہ جو خدا کے قوانین کی حکومت ہوتی ہے اس میں نہ ان کا کوئی مقام ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی وجود ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ”ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔“<sup>①</sup> پھر ہمیں ان سے روٹی مانگ کر کھانی پڑے گی اور آگے سنئے! کہا کہ ”اس وقت یہ خدا کا شکر ہے“ یعنی یہ ان کا شکر ملاحظہ فرماؤ ”کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم“<sup>①</sup> جو یہاں بیت المقدس میں رہتے تھے یہاں گورنر تھا اور بادشاہ روم میں رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ”ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں“<sup>①</sup>، یعنی یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ وہ Interfere (مداخلت) کرتے، وہ یہ کچھ بھی نہیں کرتے ”جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے“<sup>①</sup> یعنی ان کی شریعت میں Interfere (مداخلت) نہیں کرتے۔

سیکولر نظام میں یہی تو سارا سمجھوتہ ہوتا ہے۔ ان کی یہ مملکت دو دائروں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین ہوتے ہیں اور دوسرے میں شریعت کے اعتقادات، نظریے، رسوم، Personal Laws (شخص قوانین) وغیرہ ہوتے ہیں۔ معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان میں Interfere (مداخلت) نہیں کریں گے یہ ان میں Interfere (مداخلت) نہیں کریں گے۔ اس کا جو انہوں نے ترجمہ کیا وہ یہی ہے کہ مداخلت نہیں کرتے۔ آگے کہا کہ ”اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کر لیں“<sup>①</sup>۔ وہ جانتے نہیں ہیں کہ شریعت کیا ہے اور ادھر جو عوام ہیں ان کی کیفیت کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ سوچتے ہی نہیں کہ حقیقت کیا ہے لہذا عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ کتاب کو ناظرہ پڑھنا ہی جانتے ہیں۔ اس کے معنی نہیں جانتے اور یہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی لیے

① حوالہ: انجیل برناباس فصل ص۔ 142

قرآن کریم نے کہا کہ یَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (2:79) خود لکھتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ بھئی! یہ خدا کا ارشاد ہے۔ اور وہ صرف ناظرہ پڑھنا جانتے ہیں۔ ابھی بات بادشاہ اور گورنر کی ہو رہی تھی۔ ان احبار اور ہبان نے کہا کہ ”ہمارا بادشاہ اور گورنر“ یہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ ہماری شریعت حقیقت میں کیا ہے اس لیے ہمیں یہ قدرت حاصل ہے کہ جو ہمارا اختیار ہو وہ کر لیں۔ ”پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے“۔ اس سے تو معافی لے لیں گے، مگر ایہدے کو لوں معافی نہیں ملنی۔<sup>①</sup> وہ ”ہمارا اللہ رحیم ہے“ قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جب یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی بنایا جاسکے گا جب تک اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسی کہ موسیٰؑ نے لکھی<sup>②</sup> ہے۔

عزیزانِ من! یہ تھے مذہب کی دنیا کے حالات جب حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے۔ قرآن کریم نے تو اپنے ہاں یہی کچھ کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور اسے شریعت خداوندی بنا کر بیچتے ہیں: لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (2:79)۔ ذریعہ رزق بنائے ہوئے ہیں۔ وہ خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہوتے ہیں نہ خود وہاں جاتے ہیں نہ کسی کو جانے دیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو ان لوگوں نے گرفتار کرنا چاہا، موت کا فتویٰ دے دیا لیکن وہ جو مشیت کا پروگرام ہوتا ہے کہ اس کے تحت آپ وہاں سے ہجرت کر گئے اور اس طرح ان کی گرفت میں نہیں آئے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں ان یہودیوں کے مظالم جو انہوں نے کیے، کا نتیجہ یہ ہوا کہ حَرَمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ (4:160) زندگی کی وہ تمام خوشگواریاں جو پہلی تعلیم کی رو سے ہم نے ان پر کھول دی تھیں کہ انہیں باافراطی چلی جائیں وہ ان پر حرام کر دیں اور یہ ان سے محروم ہو گئے۔

### نظام سرمایہ داری کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہ لفظ محروم وہی لفظ حرام سے ہی تو ہے۔ قرآن نے ان سے کہا تھا کہ وَ أَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ (4:161)۔ معاوضہ سرمایہ کا نہیں ہوتا، محنت کا ہوتا ہے۔ اس سے انہیں روک دیا گیا تھا کہ روپے کے زور پر دوسرے کی محنت کا استحصال نہ کرو، لیکن کیا یہ باز آنے والے تھے؟ نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم کر دیئے گئے۔ یہ محتاجوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے، انہیں کچھ قرض دیتے تو اصل سے زیادہ واپس لیتے۔ یہ ظلم ہوتا تھا اور اس طرح دولت اکٹھی کی جاتی تھی اور پھر یہ چیز عام ہو گئی تھی۔

① مگر اس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) سے معافی نہیں ملے گی۔

② انجیل برناباس فصل 142



عزیزان من! معاشرے کی عام کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ وَ تَرَى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ أَكْلِهِمُ السُّحْتَ (5:62) تو دیکھے گا کہ وہ سرکشی کے ان کاموں میں جو انسان کو محنت کے قابل نہ رہنے دیں، میں سب سے زیادہ تیز ہیں۔ یہ سارا سرمایہ داری کا نظام تھا یعنی یہ دوسروں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کا نتیجہ تھا۔ وہ اس کام میں ”بیسارعون“ تھے یعنی وہ تیزی سے دوڑ لگا کر آگے آگے چل رہے ہیں۔ اس طرح ان کے اندر حرام کی کمائی کی ریس (Race) ہوتی تھی کہ دیکھیں اس میں کون ان سے آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے اس آیت (5:62) میں کہا ہے کہ تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ جرم و سرکشی اور حرام خوری میں سب سے تیز ہیں۔ اور کیا ہی بُرے ہیں یہ کام جنہیں یہ دن رات کرتے رہتے ہیں اور تماشا یہ ہے کہ لَوْ لَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَ الْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَ أَكْلِهِمُ السُّحْتَ (5:63) ان کے یہ احبار اور رہبان، یہ علما اور مشائخ بھی انہیں ان کے جرائم اور حرام خوری سے نہیں روکتے۔ انہوں نے بھی مذہب کو کاروبار بنا رکھا ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ چونکہ یہ چیزیں بڑے بڑے لوگ کرتے تھے یہ بھی انہیں کبھی نہیں روکتے تھے۔ کیوں نہیں روکتے تھے؟ اس کے لیے عزیزان من! ایک لفظ ہے جو استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ سے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ لَبَسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ<sup>1</sup> (5:63)۔ یہ جو انہوں نے انڈسٹری کھول رکھی تھی وہ کتنی بُری انڈسٹری تھی کس قدر گھناؤنا ہے ان کا یہ کاروبار! یہاں یصنعون آیا ہے یعنی یہ صنعت ہے صرف اس کو Commerce نہیں کہا۔ وہ تو کسی دوسرے کی بنائی ہوئی چیز ہوتی ہے جسے کوئی دوسرا آ کر بناتا ہے اور وہ بیچتا ہے۔ صنعت (Industry) تو وہ ہے جو خود ڈھالتا ہے۔ روزنت نئے ماڈل ڈھالتا ہے۔ اس لیے کہا کہ کس قدر گھناؤنا ہے ان کا یہ کاروبار!

### سامری کا کردار

عزیزان من! قرآن کے الفاظ پر غور کر کے آگے جائیں۔ اگر خدائے خبیر و علیم کی طرف سے نہ بتایا جاتا تو کیا کسی کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی؟ نہیں قطعاً نہیں۔ قرآن ایک لفظ میں یہ ساری بات بتا گیا کہ وہ کرتے کیا ہیں۔ دراصل سامری<sup>2</sup> ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھا جسے قرآن حکیم نے حضرت موسیٰؑ کے قصے میں پکارا ہے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ سامری کسے کہتے ہیں؟ سامری وہ ہے جو قوم کو سلانے کے لیے داستان گوئی کرے۔ یہاں قرآن کریم نے یصنعون (5:63) کہا ہے کہ وہ اپنے پلے سے کچھ خرچ نہیں کرتے تھے بلکہ

① کس قدر گھناؤنا ہے ان کا یہ کاروبار!

② اس کی تشریح و مفہوم کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طہ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء، ص۔ 250 نیز فٹ نوٹ 1۔

اسی قوم بنی اسرائیل سے جو وہاں سے چلے تھے کہا تھا کہ تم جو زیورات وغیرہ وہاں سے لے کر آ رہے ہو تو بھاڑ میں پڑے وہ سونا، جو کانوں کو کھائے، یہ خواخواہ کے لیے بوجھ ہے، آؤ میں تمہیں اس کا خدا بنا کے دکھاؤں۔ اس نے ان کو ڈھالا: یصنعون۔ انہی کے پیسوں سے ان کے لیے خدا بنا دیا۔ یعنی یہ وہ انڈسٹری ہے جس میں انہیں کچھ Investment (لگانا) نہیں پڑتا ان کو صرف ڈھالنا پڑتا ہے اور یہ سارا کچھ جو ہور ہا ہوتا ہے، ”فضل ربی“<sup>①</sup> سے ہوتا ہے۔

عزیزان من! یہ بہت پرانی بات ہے۔ انڈیا کے دور کی نئی نئی یہ فلمیں آئی تھیں، اس میں ایک بڑی عجب فلم تھی۔ اس فلم میں ایک بڑا چار سو بیس قسم کا ایکٹر (اداکار) تھا۔ گھر میں اس کی ایک بہن تھی اور کوئی نہیں تھا۔ گھر قدامت پرست تھا۔ وہ بہن مذہبی تھی۔ اس نے بھائی سے کہا کہ مجھے شیوجی کی پوجا کرنے کے لیے مندر میں جانا پڑتا ہے، یہ مندر دور ہے، میں اکیلی ہوتی ہوں، تم عام طور پہ ہوتے نہیں ہو، میں اکثر جانیں پاتی۔ اگر یہ مورتی ہمارے گھر میں ہی آجائے تو بہت اچھا ہو، میں تکلیف سے بچ جاؤں۔ ان کے ہاں تو ہوتا ہے کہ مورتی گھر میں رکھ دیتے ہیں۔ بھائی کہنے لگے: بہت اچھا، میں تمہیں لا دوں گا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ مندر میں کوئی بڑا بچاری نہیں تھا، تو وہ خوبصورت سونے کی مورتی چرا لایا اور گھر میں رکھ دی۔ بہن نے دیکھا کہ اتنی خوبصورت ہے اور قیمتی بھی ہے۔ اس نے کہا کہ بھائی جی! یہ تو بڑی چنگی مورتی ہے۔ اے کئے دی لے آئے ہو تسی۔<sup>②</sup> کہنے لگا: بھولی! اے بھگوان قیمتیں دے وکدے ہیگے نیں؟ پیسیاں نال اونہ دیں۔ اے جناں تے فضل کرن، اوہدے نال آپ ٹر آوندے نیں۔<sup>③</sup> ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ سب انہیں روکتے نہیں تھے، فتوے دے دیتے تھے۔

ربو کو قرآن نے یہاں کہا ہے کہ ”دوسرے کی کمائی ہو تو اسے لے اؤنا“۔ سود حرام ہے لیکن اگر کوئی غریب مزارع آپ زمیندار کے پاس آ کر کہدے کہ صاحب! وہ زمین کا ٹکڑا ہزار روپے میں بکتا ہے، اگر مجھے مل جائے تو میں محنت کر کے کماؤں گا، بچوں کا پیٹ پالوں گا، اور آپ کے پیسے بھی ادا کرتا چلا جاؤں گا۔ زمیندار نے کہا کہ تمہاری مت ماری ہوئی ہے، یہ خواخواہ کے لیے مول لے رہے ہو۔ ہم تمہیں دیتے ہیں۔ اس پر مزارع نے کہا کہ جی! ہزار روپے آپ دے دیں گے تو میں اس پر دوکان کر سکتا ہوں۔ زمیندار نے کہا کہ نہیں، ارے یہ سود ہے، سود تو حرام ہے۔ یہ بات تو نے کیا کہدی! یہ ٹھیک ہے کہ سود بالکل حرام ہے، لیکن اگر اسی ہزار روپے میں وہ زمین کا ٹکڑا لے کر

① یہ کیسے ہور ہا ہوتا ہے؟ اس کے لیے دیکھیے: صلاح الدین اکبر: ایک قطعہ زمین رہائشی، در ”ہم لوگ“، مکتبہ اخوت، لاہور (سال اشاعت درج نہیں)، ص 1-261۔

② یہ آپ کتنے کی خرید لائے ہیں؟

③ اے معصوم بھولی بھالی بہن! کیا یہ بھگوان قیمتیں بکتے ہیں؟ نہیں، یہ قیمتیں نہیں آتے۔ یہ جن پر ”فضل“ کریں، ان کے پاس یہ خود بخود ہی چلے آتے ہیں۔

دے دیا تو کہا کہ یہ بٹائی پہ لے لو تم محنت کرو یعنی ہزار روپے کے اوپر تو پچاس روپے کاٹنے تھے اور یہ جو بٹائی پہ دی تو آدھی پیداوار گھر لے گیا اور جو انوسٹ (لگایا) کیا تھا وہ اپنی جگہ کھڑا ہے بلکہ اس زمین کی قیمت کچھ اور بڑھ رہی ہے۔ اس کا نام ان کے ہاں ریلو نہیں، مزارعت ہے اور یہ حلال و طیب ہے۔ یہ کاروبار کرنے والے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ”صاحب! کچھ تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔ میں نے کاروبار میں لگائے ہیں۔“ اس کے لیے تو صاحب! پیسے دینا سود ہے۔ یہ حرام ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟ ٹھیک ہے، بھئی! ہم یہ کیے دیتے ہیں، اس کاروبار کے نفع کے اندر ہمارا حصہ بھی ہے، گھر میں بیٹھے ہیں، یہ حصہ مل رہا ہے۔ سو نہیں، ریلو نہیں، یہ مزارعت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جتنا ریلو کے متعلق ان سے کہا تھا ان کی کیفیت یہ ہے۔ یہ پھر اس کے لیے یکتُبُونَ الْکِتَابَ بِأَیْدِیْهِمْ (2:79)۔ اس کے صرف الفاظ بدل دیتے ہیں، یہ اس فتوے کو خود لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شریعت خداوندی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ سود کا لفظ استعمال کیجیے تو وہ حرام ہے۔ یہ ساری شکلیں، جتنی بھی ہوئی ہیں، یہ شریعت کی رو سے حلال ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کے بعد ان کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ زندگی کی ساری خوشگوار یوں سے محروم کر دیئے گئے۔ یہ سندھی کہ وہ یہ کچھ کرتے تھے۔ یہ اس کے جائز اور حلال ہونے کے فتوے دیتے تھے۔ برادران عزیز! وہ جو تھوڑی بہت دل میں کھٹک ہوتی ہے کہ بہر حال یہ ایک ناجائز دولت آگئی ہے، ناجائز پیسہ ہے، کسی برائی کی وہ کھٹک بھی اگر دل سے دور ہو جائے تو پھر اس کو کوئی نہیں روکتا:

کبھی آجاتے تھے ہنسنے میرے رونے کو

تم کو یہ عیش بھی اب میرا گوارہ نہ رہا

کیا انداز ہوتا ہے بات کہنے کا! کہ اس طرح ان پر زندگی کی حلال خوشگواریاں بھی حرام ہو گئیں۔ یہ انسان کی بھول اور غلط فہمی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس قسم کی جو کمائیاں (Earnings) ہیں ان سے بڑی افراط سے عیش سامانیاں ملتی ہیں۔ یہ غلط ہے۔ یہ تو چہرے کی سرخیاں ہوتی ہیں۔ اقبال ؒ (1877-1938) نے یہ کہا تھا کہ

یا غازہ ہے یا ساغرو مینا کی کرامات

لیکن اس سے پہلے اور کرامات بھی ہوتی ہیں۔ یہ جو حکیموں کا خاندان تھا۔ اس میں بھی یہ ڈاکٹر حکیم اجمل خان وغیرہ<sup>①</sup> مغلیہ زمانے کے

① حکیم اجمل خان دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد شہنشاہ بابر کے زمانے میں ہرات سے آئے تھے۔ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں شاہی خاندان سے منسلک ہو گئے۔ ان کے باپ کا نام حکیم محمود خاں تھا جو کہ حکیم محمد شریف خاں کے پوتے تھے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم نے پہلے قرآن پاک حفظ کیا پھر عربی اور فارسی کا مطالعہ کیا، اس کے بعد اپنے بڑے بھائی حکیم محمد واصل خاں کے زیر سرپرستی ادویات زیر مطالعہ لائے۔ 1892 میں نواب آف رام پور کے شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ آپ نے 1916ء میں طیبہ کالج دہلی قائم کیا۔ 1921ء میں خلافت کانفرنس کی صدارت کی۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے چیمپئن (Champion) تھے۔

بڑے مشہور خاندان چلے آتے تھے۔ ان کے ہاں کے جس حکیم کو دیکھیے ان کی رنگت بالکل زعفرانی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ حکیم بھورے یا بھورے میاں ان میں سے ایک تھے۔ برف باری کے زمانے میں مال روڈ پر وہی ململ کا کرتہ پہنے ہوئے اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ دیکھنے کی حد تک ان کی یہ کیفیت ہوتی تھی لیکن کوئی بھی ان میں سے پچاس برس سے زیادہ نہ گیا۔ یہ جو ساری سرخیاں رنگینیاں تھیں، وہ کشتوں کا نتیجہ تھیں۔ دراصل کشتہ خود نہیں مرتا بلکہ دوسرے کو مارتا ہے۔ کشتے تو یہ خود ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، حالانکہ یہ سنکھیے کا جو کشتہ تھا یہ تو اس سے مرتے تھے اور پھر زندگی کی خوشگواریاں ان پر حرام ہو جاتی تھیں۔

### سلطانی و ملائی و پیری کے کشتے نے قوموں کی قوموں کو ہلاک کر دیا

مفکر قرآن اقبالؒ (1877-1938) نے بھی ان کو بتایا ہے کہ تم کو نئے کشتے کے مرے ہوئے ہو، سنو:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری

اے کشتہ سلطانی و ملائی و پیری! <sup>①</sup>

سنکھیے کے کشتے سے مرنے والا تو اچھا ہے کیونکہ عذاب سے تو چھوٹ جاتا ہے لیکن یہ سلطانی و ملائی و پیری والا جو کشتہ ہوتا ہے اس سے تو انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے۔ عزیز ان من! یہ وہی ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ موت آتی ہے، پر نہیں آتی۔ چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے مگر یہ مرتا نہیں ہے:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں

وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

(غالب)

اس کشتہ سلطانی و ملائی و پیری سے نہ معلوم اب تک کتنے سفینے ڈوب چکے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے کہا کہ اس قوم پر زندگی کی خوشگواریاں حرام ہو جاتی ہیں جو کشتہ سلطانی و ملائی و پیری ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ

① اقبالؒ: ارمغانِ حجاز (اردو): نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996ء، ص 47۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُّوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ ① (23:51)۔ اب یہاں رسل کو مخاطب کیا ہے کہ اے خدا کے پیغمبرو! تم اور جو تمہاری متبع قوم ہے، سب طیباتِ زندگی یعنی زندگی کی خوشگوار یوں سے متمتع ہو، خوب کھاؤ لیکن وَاغْمَلُوا صَالِحًا (23:51) کام کرو جو صالح ہوں، انسان کی جو صلاحیتیں ہیں، وہ ان کی نشوونما کرنے والے ہوں۔ یعنی کھاؤ پیو لیکن ایسے کام کرو جن سے انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔ اور یہ نہ سمجھو کہ کھاپی رہے ہیں، عیش سے گزر رہی ہے۔ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ (23:51) ہماری نگاہ ہمارا قانون مکافات عمل تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ تمہارے تمام اعمال سے باخبر سے۔ یہ ہے شریعت: مِنَ الطَّيِّبَاتِ بالکل کھاؤ، زندگی کی خوشگواریاں انسان پہ حلال کی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وَاغْمَلُوا صَالِحًا (23:51) کام بندے آلے کرو، غیر ستے خیراں۔ ② ہاں تو عزیزانِ من! بات چلی آرہی تھی کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً (10:19) نوع انسان ایک امت واحدہ ہے، فَاخْتَلَفُوا (10:19) انہوں نے اختلاف پیدا کیا، اس لیے فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیْنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ③ (2:213)۔

نوع انسانی میں رنگ، نسل، وطن، زبان اور زمان و مکاں کے بعد کے باوجود امت واحدہ کا قرآنی تصور انبیائے کرام کے سلسلہ میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے دنیا کی ہر قوم میں نبی بھیجا، ہر ملک میں نبی بھیجا، اور ہر قوم کی زبان میں نبی آیا ہے۔ تو انبیاء کا زمانہ مختلف ہے، جن قوموں میں وہ آئے وہ قومیں مختلف ہیں، ان کی زبانیں مختلف ہیں، ان کے وطن مختلف تھے۔ ان سارے اختلافات کے بعد ہیں، پھر سوچیے کہ بات وہاں سے شروع ہوئی تھی، جو میں نے ابھی کی ہے کہ وَإِنَّ هٰذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (23:52)۔ ان نسبتوں سے انسانیت کی برادری میں بڑا تفرقہ پڑتا ہے، اختلافات پڑتے ہیں، قوم گروہوں میں، خاندانوں میں، قبیلوں میں، وطنوں میں، بٹ جاتی ہے۔ یہ سب چیزیں تمہارے ساتھ تھیں لیکن اس کے باوجود یہ تمہاری ایک امت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ امت واحدہ کس طرح سے رہی؟ اس کے لیے کہا کہ اَنَا رَبُّكُمْ (23:52) تم نے ایک رب کو رب مانا۔ یعنی اس کے دیئے ہوئے غیر متبدل اصولوں کو علمی اور عملی طور پر تسلیم کیا۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی رو سے معیارِ قومیت۔

① اے خدا کے پیغمبرو! تم زندگی کی تمام پاکیزہ خوشگوار یوں سے متمتع ہو۔

② کام انسانیت کو سنوارنے والے کرو، پھر تو بہتری ہی بہتری ہے۔

③ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو وحی دے کر بھیجا۔ وہ انہیں اختلافی زندگی کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوش خبری سناتے۔ ہر نبی اپنے ساتھ قوانین خداوندی کا ضابطہ (الکتاب) لاتا جو حق پر مبنی ہوتا (پرویز: مفہوم القرآن، ص 79)۔

بات تو قرآن کے ایک ایک لفظ سے حل ہو جاتی ہے۔ ان تمام اختلافات و اختراعات کی بنا کے باوجود جس کی بنا پہ دنیا نے یہ قومیں الگ الگ بنائی ہیں وہ ان انبیائے کرام کے اندر سب چیزیں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ تمہاری یہ امت امت واحدہ تھی۔ یہ کیوں تھی؟ اس لیے کہ **وَإِنَّا رَبُّكُمْ** (23:52) وہ صرف ایک خدا کے قوانین کو ہی اپنا ضابطہ حیات مانتے تھے اور **فَاتَّقُوا** (23:52) یہی تھا وہ قانون جس کا تم اتباع کرتے تھے یہ تمہاری تعلیم تھی۔ اس کے بعد پھر وہی سوال پیدا ہوا کہ تم تو یہ تعلیم دے کر جاتے تھے ہر نبی نے یہ تعلیم دی لیکن اس کے باوجود عزیزان من! یہ سارے کے سارے دین کے خلاف یہ تفرقے اور یہ چیزیں ہیں اور انہی کے نام لیوا دوسروں سے اپنا ایک الگ ٹولہ بنانا تو ایک طرف اپنے اندر تفریق پیدا کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ جیسا میں نے کہا ہے کہ اس پہ کھٹک پیدا ہو کہ صاحب! یہ چیز تو خدا کے دین کے خلاف ہے انبیاء کی تعلیم کے خلاف ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ** (23:52) ان میں سے ہر ایک دین سے برگشتہ ہو کر الگ الگ ٹولہ بناتا ہے اور پھر اس روش پر صرف ہر ایک مطمئن ہی نہیں رہتا بلکہ اپنے اپنے ہاں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ یہ راستہ بالکل صحیح شریعت کا ہی راستہ ہے جس کے اوپر ہم چل رہے ہیں اور پھر کوئی بھی ان میں سے اپنی اس روش کے متعلق نہیں کہتا کہ یہ فرقہ بجائے خویش قرآن کے نزدیک شرک ہے اور انبیاء کی بعثت کے خلاف ہے۔ عزیزان من! میں تو قرآن کی ایک ایک آیت آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ ساری چیزیں سامنے تھیں لیکن ہر ایک اپنے اپنے فرقہ پر مگن ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ میں چالیس پچاس سال سے یہ پکار بلند کر رہا ہوں یعنی قرآن کی یہ آواز پہنچا رہا ہوں جس سے کچھ تھوڑا بہت لوگوں میں احساس بیدار ہو رہا ہے کہ واقعی یہ فرقہ بندی تو بالکل اسلام کے خلاف ہے۔ اب مقام آ رہا ہے کہ لوگوں نے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا ہے۔ جس پر یہ جُز ہوئے ہیں مگر یہ ہیں کہ نئی چالیں چل رہے ہیں۔

### فرقہ بندی کی بنیادیں مستحکم رکھنے کی ایک نئی چال

عزیزان من! قرآن نے کہا ہے کہ **يُؤَسُّوْا فِي صُدُوْرِ النَّاسِ** (114:5) کان میں آ کر پھونک دیتا ہے اور اس طرح لوگوں کے دلوں میں وساوس پیدا کر کے ان کے عزم راسخ کو کمزور کر دیتا ہے۔ یہ ابلیس ہے۔ اس نے آ کر کہا کہ فرقہ بندی کرو حالانکہ اللہ نے اس کو شرک کہا ہے مگر یہ ہیں جو کہتے ہیں کہ فرقے ہیں ہی نہیں یہ تو مکاتب فکر (Schools of Thought) ہیں۔ چل بھی! یہ سارے مکاتب فکر ہو گئے اور مکاتب فکر کہنے والوں کا آپ کو پتہ ہے کہ بھانڈا کہاں پھوٹا۔ انہی اماموں نے یہ کہا تھا کہ یہ فرقے نہیں مکاتب فکر ہیں۔ اسی ملک کے صدر نے ایک دفعہ انہی مکاتب فکر والوں سے کہا کہ اگر تم تین آدمی بھی جو اپنے اپنے فرقوں والے ہو مکاتب فکر والے ہو ایک جگہ اکٹھے ہو کر نماز پڑھ لو تو ہم اپنا دعویٰ مسترد کر دیتے ہیں۔ یہ مکاتب فکر ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ تین اکٹھے ایک

جگہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتے۔

عزیزانِ من! یہ ظاہر ہے کہ جب رسولوں کی تعلیم ایک تھی تو ان کے متبعین کو بھی ایک ہونا چاہیے تھا لیکن امر واقعہ یہ نہیں۔ مختلف انبیائے کرام کے نام لیوا ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کے چلے جانے کے بعد اس کے متبعین اُس کے پیغام کو فراموش کر کے اپنی خود ساختہ شریعتوں کا اتباع کرنے لگ جاتے ہیں جس سے ہوتا یہ کہ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا (23:53) وہ مختلف گروہوں، فرقوں میں بٹ جاتے، ان میں فرقے پیدا ہو جاتے۔ اس کے لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ اس مقام پہنچ گئے ہیں جہاں کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (23:53) ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک پر جم کر بیٹھ جاتا ہے اور اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ وہی فرقہ حق پر ہے باقی فرقے باطل ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ علم کی لائٹ آف کر دو<sup>1</sup>۔ انہوں نے تو اپنے اوپر کیفیت یہ طاری کر رکھی ہے کہ جو بھی خدا کی طرف دعوت دینے والا آتا ہے یہ اس پر متفقہ طور پر کفر کے فتوے لگا دیں گے۔ ایک تو علم کی تاریکی ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ جو تاریکی کے اندر ڈوبنے والا ہوتا ہے اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وہ پانی کے اندر ذرا گرا، اسے باہر کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ اگر پانی شفاف ہو، باہر روشنی ہو تو ہو سکتا ہے کہ کسی حد تک اسے گہرائی میں کچھ نظر تو آئے، اگر تاریکی ہو اور پھر وہ ڈوبا ہو تو نہ آنکھیں کام کریں نہ کان کام کریں:

جاں بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر

افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکلیں ہے

اس وقت اے رسول! ان انبیائے سابقہ کے نام لیوا اسی طرح مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اس دین کی مخالفت کر رہے ہیں جسے تو پیش کرتا ہے اور کسی طرح سمجھائے نہیں سمجھتے سوا اب ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ فَذَرْنَهُمْ فِي غَمَرَاتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ (23:54) تو انہیں کچھ وقت کے لیے غفلت میں مدہوش پڑا رہنے دے تا آنکہ تمہارے دین کا نظام متشکل ہو کر سامنے آ جائے اور اس کے انسانیت ساز نتائج انہیں بتا دیں کہ حق و صداقت پر کون ہے۔ لیکن ذرا ٹھہریے۔ اب ظہور نتائج کا وقت آیا ہی چاہتا ہے أَيْحَسِبُونَ أَنَّمَا نُمِلُّهُمْ بِهِ مِنْ مَّالٍ وَبَيِّنٍ (23:55) کیا یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ دولت اکٹھی کر لی، اتنا بڑا جتھہ بنالیا، ہم ان کو اس قسم کی روش پر بڑھتے چلے جانے دیں گے؟ ٹھیک ہے، ڈھیل دی جاتی ہے لیکن اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ (23:56) اسی طرح سے جتنا کچھ وہ اکٹھا کیے چلے جا رہے ہیں کرتے چلے جائیں گے، کرتے چلے جائیں گے اور ہم ان کے

① علم کی شمع گل کر دو۔

اعمال سے صرفِ نظر کر کے انہیں فی الواقعہ زندگی کی خوشگواریاں عطا کرتے چلے جائیں گے۔ کہا کہ انہیں پیٹہ نہیں کہ جب تباہی آتی ہے تو ان راستوں سے آتی ہے جو بَلْ لَا يَشْعُرُونَ (23:56) ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ وہاں سے تباہیاں آیا کرتی ہیں اور ان کے برعکس ایک دوسرا گروہ بھی ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عذاب سے بچتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسا گروہ ہے؟ عزیزانِ من! سورۃ المومنون کی آیت 56 تک آگئے، آئندہ درس میں 57 ویں آیت سے ہم پھر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط





## گیارہواں باب: سورة المؤمنون (آیات 57 تا 65)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج جولائی 1977ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 57 سے ہو رہا ہے: (23:57)۔

انبیائے کرام کی تعلیم کا مرکزی نکتہ

آپ کو یاد ہے کہ مسلسل موضوع یہ چلا آ رہا تھا کہ دین کا مقصد تمام نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتے میں منسلک کر دینا ہے۔ ان کے اختلافات نے انسانیت ساز معیاروں کے برعکس انہیں خواہ مخواہ مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اب ان اختلافات کو مٹا کر

انہیں پھر سے ایک عالمگیر برادری بنانا ہے اور آخر میں یہ تھا کہ **فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ** (23:53) انبیائے کرام تو یہی تعلیم دے کر جاتے تھے لیکن ان کے بعد ان کے نام لیواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ یہ ان اختلافات کی لکیروں کو مٹاتے، خود اپنے اندر ہی اختلافات پیدا کر لیتے تھے۔ اس طرح ہر دین لانے والے کے بعد ان اختلافات میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ پھر اس کا انجام کیا ہوتا تھا۔ اب اس کے برعکس قرآن ایک دوسرا گروہ سامنے لایا ہے۔

### نوع انسانی کا دو گروہوں میں تقسیم ہونے کا معیار

یہ یاد رکھیے کہ قرآن کی رو سے پوری نوع انسانی تو دو ہی گروہوں کے اندر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو خدا کے دیئے ہوئے ان قوانین اور اصولوں کی صداقت پر یقین رکھتا ہے اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو، کسی ملک میں ہو، کسی نسل سے ہو، کوئی زبان بولتا ہو، ان سب میں وجہ اشتراک یہ ایمان ہے۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ میں وہ تمام انسان ہیں جو ان قوانین اور اصولوں سے انکار کرتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے عربی زبان میں کفر کہا جاتا ہے۔ پوری انسانیت ان دو گروہوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے انسانوں کو پیدا کیا اور وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو ان قوانین کی صداقت کو صحیح تسلیم کرتا، دوسرا وہ ہے جو ان سے انکار کرتا ہے اور اسی کا نام ہماری سیاست میں دو قومی نظریہ ہے۔ اس کا تعلق ہندوستان کی سیاست سے نہیں ہے۔ یہ صرف پاکستان بنانے کے لیے ایک چیز اختیار نہیں کی گئی تھی، یہ قرآن کا بنیادی اصول ہے۔ وہ پوری نوع انسانی کو انہی دو ٹکڑوں میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ کسی اور تقسیم کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ قرآن اس دوسرے گروہ کے متعلق کہتا ہے کہ اس نے دین کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے برعکس پہلا گروہ اس قسم کے طرز عمل کے نتائج سے خائف رہتا تھا۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ **إِنَّ الدِّينَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ** (23:57) یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں۔ اب خوف، خشیت اور خضوع قسم کے الفاظ ہیں جو خدا کے متعلق قرآن میں آتے ہیں۔ آپ کسی آیت کا ترجمہ کسی مترجم قرآن شریف میں دیکھ لیجیے گا، وہاں لکھا ہوگا ”جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔“ یہ خوف ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے نہ کسی تشریح کی ضرورت ہے، نہ کسی توجیح کی۔

### خوف و حزن کے سلسلہ میں پیغام خداوندی

ہمارے ہاں یہ ایک مسلمہ ہے کہ ہم بچوں کو ڈرانے کے لیے بچپن سے خدا کے خوف اور ڈر کی تعلیم دینا شروع کر دیتے ہیں اور ساری عمر دیتے رہتے ہیں حالانکہ ڈروہ چیز ہے جسے دل سے نکالنے کے لیے یا اس احساس کو دور کرنے کے لیے خدا نے اپنی اس وحی کو بھیجا۔ اس

نے تو کہا یہ تھا کہ فَمَنْ تَبَعَ هَذَا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ <sup>①</sup> (2:38)۔ یہاں پہلی چیز جو نوع انسانی سے کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی خدا کے ان قوانین کا اتباع کرے گا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے کسی قسم کا خوف یا غم نہیں ہوگا، خوف ہی نہیں، غم، ملال، پریشانی ہی نہیں بلکہ حزن تک نہ ہوگا۔ یہ ایک عظیم چیز ہے جو قرآن نے چودہ سو سال پہلے بیان کی ہے جب ساری دنیا میں کسی مافوق الفطرت ہستی کا تصور ہی ڈرکا تھا۔ آپ اس مافوق الفطرت ہستی کو دیوتا کہہ لیجیے، God کہہ لیجیے، خدا کہہ لیجیے، یزداں کہہ لیجیے اس کا تصور ہی ڈرکا تھا۔ اصل میں جب خوف یا ڈر کا تصور پیدا کیا تو وہ انسانیت کا اولیٰ دور تھا جو ویسا ہی تھا جیسا ایک فرد کا بچپن کا دور ہوتا ہے۔

### خوف و ہراس کے ماحول میں پرورش پانے سے بچے کی ذہنی کیفیت

بچپن میں بچہ بھی Reason (عقلی استدلال) کو نہیں سمجھ سکتا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کے ذہن میں Reason (عقلی استدلال) نہیں آتا۔ اس سے آپ نے کچھ منوانا ہوتا ہے، تو آپ ڈر سے اس سے منواتے ہیں۔ پھر ”اوہ خوف و ہراس لگ گیا۔ تے فیر تینوں پتہ اے ناکہ فیر کی کردے ہوندے نیں: دساں امی نوں؟ میں نہیں آج سکول جانا، میں کم نہیں سی کتا، ماسٹر جی مار دے ہیگے نے۔“ <sup>①</sup> وہ ڈر اس لیے ہے کہ ابھی وہ Reason (عقلی استدلال) سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہمارے ہاں یہ چیز عام ہے کہ ڈر سے کراتے ہیں۔ یہ بڑی غلط چیز ہے۔ بچے کے دل میں اس دور میں بھی ڈر نہیں ڈالنا چاہیے اور یہاں تو ڈر کے لیے پوچھو نہیں کہ ڈر ڈالنے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے دیوی دیوتاؤں کے نام تھے: وہ کالی دیوی، اور ہیر و دیوی اور اسی قسم کے کہ وہ ”بھاؤ“ <sup>③</sup> آ گیا، وہ بھاگ <sup>④</sup> آ گیا۔“ بچہ ان الفاظ سے سہم جاتا ہے اور آپ کی سائیکولوجی یہ بتاتی ہے کہ ڈر کی وجہ سے اس قدر Psychological complexes پیدا ہو جاتے ہیں، اس قدر نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر ان کے نتیجے میں اس قدر اعصابی امراض پیدا ہو جاتے ہیں کہ جن بچوں کے دل بھی بچپن ہی میں زیادہ ڈر ڈال دیتے ہیں، ڈر کا تصور ڈال دیتے ہیں تو اس کے بعد اگلی عمر میں جا کے دیکھیے کہ ان کے اندر کس قدر نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ نوے فیصدی جو آپ کے ہاں امراض ہوتے ہیں اور ان کا جواب

① جو لوگ (ہماری طرف آنے والی) رہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے (124-123:20) (پرویز):

مفہوم القرآن ص 14۔

② پھر وہ خوف و ہراس لگ گیا۔ پھر تو آپ کو معلوم ہے کہ کیا کرتے ہیں: میں بتاؤں امی کو؟ مجھے آج اسکول نہیں جانا ہے، میں نے اسکول کا کام

(Homework) نہیں کیا ہے، ماسٹر صاحب ماریں گے۔

③ خوف کا چھلاوا

④ بخت، قسمت

سائیکولوجیکل (نفسیاتی) علاج کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے دل سے ڈر کا جذبہ نکالتے ہیں۔ آج یہ چیز سامنے آئی ہے کہ ڈر ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے انسانیت کے جوہر کچلے جاتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اس دور کی بات ہے جو قرآن نے کہی جب دنیا میں انسانیت ابھی عہد طفولیت میں تھی، بچپن میں تھی۔ اس لیے ہر چیز ڈر سے کرائی جاتی تھی۔ جب انسانوں کو ابتدائی تصور دیا گیا تو ابتدا میں انسانوں نے اپنے ذہن سے کسی مافوق الفطرت ہستی کا تصور دیا، اسے آپ دیوی دیوتا کہہ لیجئے اسے اہرمن ویزداں کہہ لیجئے اسے کوئی نام دے لیجئے وہ ایک غیر محسوس ہستی ہے جس کے متعلق ڈر پیدا کیا۔ یہاں تو غنیمت ہے کہ آپ کے ہاں وہ کالی دیوی کے مندر نہیں ہیں۔ وہ تو ہم سے پوچھیے۔ اتفاق سے دہلی میں تو وہ مندر دور دور ہوتا تھا۔ میرا تو پوچھو نہیں میں نے تو ہر حرم اور دیر کے مندروں کی پوجا کی ہوئی ہے۔ وہ راستے میں شملے میں جو مین سڑک دفتروں کو جاتی تھی وہاں مندروں میں ہوتی ہوئی جاتی تھی۔ بنگالیوں کے ہاں جو کالی ماتا ہے وہ سب سے بڑی دیوی ہوتی ہے۔ وہاں شملے میں بالکل عین سڑک کے اوپر ڈرا بلندی پہ مندر تھا۔ مندر کے باہر انہوں نے جو اپنی کالی دیوی ہے یا جس کو کالی ماتا کہتے ہیں اس کا مجسمہ اس کا بت مندر سے باہر رکھا ہوا ہے۔ یہ بہت بڑا مجسمہ ہے۔ ایک تو اس کو بالکل سیاہ پینٹ کیا ہوا ہے اس میں اس کے خون کے رنگ سے رنگے ہوئے اتنی بڑی زبان باہر نکالی ہوئی ہے بالکل خونی آنکھیں بھی سرخ خون کی سی ہوتی ہیں۔ چار ہاتھ اور ان ہاتھوں کے اندر نیزہ اور وہ ایک تلوار سی ہوتی ہے اور یہ پورا زنج کرنے کے اور مار دینے کے اوزار دو میں بھی نہیں بلکہ چاروں ہاتھوں میں اور گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کی مالا ہوتی ہے۔ اب آپ سوچیے کہ جب اس قسم کے خداؤں کے مجسمے سامنے رکھے جائیں اور یہ تو مرنے والے مجسمے تھے جو نظر آتے تھے وہ جو اس کے متعلق ان کا ڈر تھا جو ڈالا جاتا تھا اس کا کیا کہنا!! ہر وہ شے جس سے ڈر آ جائے وہ دیوتا بن جاتی ہے: بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، تند و تیز طغیانیاں، دریاؤں کے سانپ، یہ آگ، یہ شیر ہر ڈرنے والی چیز سب دیوتا تھا۔ تو یہ جو انسانیت کا ابتدائی دور تھا وہ ایسا ہی تھا جیسے آپ بچے سے ہر کام ڈر سے کراتے ہیں۔ وہاں وہ ڈر جو تھا ان کے جو پروہت تھے انہوں نے ذہن میں ایک موہوم ہستی Create (پیدا) کی ہوئی تھی اور جب میں نے موہوم کہا ہے تو وہم تو ہوتا ہی ڈر ہے خوش کن وہم ہوتا ہی نہیں۔ یہ وہم ہے جسے قرآن حکیم نے حزن (Anxiety) کہا ہے۔ یہ اندر ہی اندر کوئی دل گرفتگی ہے یعنی بظاہر اس سے پوچھیے کہ تو کس چیز سے ڈر رہا ہے کہتا ہے کہ پتہ نہیں ہوتا کس چیز سے ڈر رہا ہے:

وہ خود تسکین خاطر کر رہے ہیں

مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

اویوں ڈوبا جا رہا ہے؟ پتہ نہیں۔ یہ وہ نفسیاتی کشیدگی ہوتی ہے۔ یہ تھا خدا کا تصور جو دیا گیا تھا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے اس دور میں آ کر یہ کہا ہے کہ خدا کی اطاعت یا اس کے قوانین کے اتباع کا پہلا لازمی فطری نتیجہ

ہی یہ ہے کہ معاشرے میں **فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (2:38) ہوتا ہے: کوئی خوف (Fear) اور حزن (Anxiety) باقی نہیں رہتا۔ خوف (Fear) باہر کے ڈر کو کہتے ہیں حزن (Anxiety) وہ ہے کہ ”دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے“۔ خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے قطعاً یہ بات نہیں ہوتی۔ وہاں تو قلب مطمئن ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں تو یہ الفاظ ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے؟ قرآن ہی نے یہ بات بتادی جہاں یہ کہا کہ **فَمَنْ تَبَعَ هَذَا فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (2:38) اب قانون کا دور شروع ہو گیا ہے جو بھی اس قانون کا اتباع کرتا چلا جائے گا اسے کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا یعنی قرآن نے اس قدر قانون کی حکمرانی کا تصور دیا اور آج بھی Law abiding citizen کے یہ الفاظ باقی رہ گئے ہیں: یہ الفاظ اس دور کی یادگاریں ہیں جنہیں کھنڈرات کہتے ہیں۔ کہا یہ ہے کہ جتنے بھی Law abiding citizens (قانون کے مطابق چلنے والے شہری) ہوں گے ان کو کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا۔ اگر واقعی کہیں قانون کے مطابق معاشرے کا نظام قائم ہو تو جو Law abiding (قانون پر چلنے والے) ہیں انہیں کسی قسم کا خوف نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن تو چاہتا ہی یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی ہو اور قانون Reason یعنی دلیل و برہان کی بنا پر سمجھایا جائے۔ وہ قانون بھی دھاندلی سے نہیں نافذ ہوگا کیونکہ **لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ** <sup>①</sup> (2:256)۔ اس قانون کے تابع تم نہیں رہنا چاہتے تو نہ سہی ٹھیک ہے چلے جاؤ اگر اس مملکت کے دائرے میں رہتے ہو جہاں یہ قانون ہوگا اور قانون کا اتباع کرتے رہو گے تو پھر **فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (2:38) تمہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ انسانیت بچپن سے عہد طفولیت سے آگے نکل گئی ہے بچہ جوان ہو چکا آپ جوان بچے کو ڈرا کر کام نہیں لے سکتے۔ اس طرح وہ یا تو سرکش ہو جاتا ہے یا کچلا ہی جاتا ہے۔ کیا آپ نے کسی بڑے بچے کو کچلا ہوا ہو دیکھا ہے کہ گھر کے خوف اور ڈر کے مارے اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اس کے سارے جوہر انسانیت جل کر راکھ ہو چکے ہوتے ہیں یا پھر وہ سرکش ہو جاتا ہے۔ قرآن اس دور میں آیا جب اس نے انسانیت کو کہا کہ اب اس کا عہد شباب شروع ہوتا ہے۔ بچپن والے جو ہمارے ہاں کے طریق کار تھے وہ سب غلط تھے۔ اس نے یہ کہا کہ جو بھی قانون کا اتباع کرے گا اس کے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔

عربی لغت میں خوف کے معنی ”کسی عمل کے انجام سے آگاہ ہونا ہے“

عزیزانِ من! اب اگلی بات سے اس کی وضاحت ہو گئی کہ جو قانون شکنی کرے گا اسے اس کے عواقب سے اس کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔ یہ خدا سے ڈرنا نہیں ہے۔ یہ تو جو اس کے قوانین ہیں ان کے توڑنے سے ان کی خلاف ورزی کرنے سے جو انسان کا اپنا نقصان

① دین میں زبردستی نہیں ہے۔

ہوتا ہے یا اس کے جو عواقب ہوتے ہیں ان کے احساس سے خود اس کے اپنے اندر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اس کا تو انجام بڑا خراب ہوگا یہ ہے جسے خوف کہا جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ قرآن کو سمجھنا ہے تو جسے محاورہ عرب کہا گیا ہے اس کی رو سے قرآن کریم سمجھیں۔ یہ میری لغات <sup>①</sup> میں آپ کو ملے گا کہ عرب ان الفاظ کے معنی کیا لیتے تھے۔ وہاں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے ان لفظوں کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ خود لفظ خوف کے معنی عربی محاورہ کے مطابق ”کسی بات کے انجام کا علم ہونا ہے۔“ خوف کے معنی ”علم ہونا“ ہے۔ کیا بات ہے اس زبان کی اور کیا بات ہے اس قرآن کی! ٹھیک ہے کہ آپ نے مصری یا چینی سمجھ کر سنکھیا پھا لیا، وہ علم نہیں تھا۔ آپ کے دل میں کوئی خوف نہیں پیدا ہوگا۔ جونہی کسی نے کہا کہ وہ سنکھیا تھا، آپ دیکھیے کہ اس کے بعد کیا کیفیت تھی: اس کے متعلق یہ علم ہو گیا۔ جو اس طرح کیفیت پیدا ہوتی تھی، عرب اسے خوف کہتے تھے۔ یہ جو چیز ہے کہ قوانین اس نے دے دیئے۔ یہ کہا کہ میں علی وجہ البصیرت سمجھتا ہوں۔ علی بصیرۃ کہا یعنی یہ بھی نہیں کہ اس کی علت نہ بتائی ہوئی The why of it (اس کی علت) نہ بتایا ہو اور قانون نافذ کر دیا ہو۔ قانون سے پہلے یہ سمجھایا کہ یہ ایسا قانون کیوں بنایا گیا ہے اور اس کے بعد کہا کہ اگر اس قانون کے مطابق چلو گے تو یہ نتائج ہوں گے، خلاف ورزی کرو گے تو یہ ہو جائے گا۔ اب اس کے بعد یہ کہا کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے ان قوانین کو مان کر ان کے تابع زندگی بسر کرنے والے معاشرے کے اندر رہیں، جس کا جی نہیں چاہتا وہ دوسرے معاشرے کے اندر جائیں، رہیں، لیکن جب اس معاشرے کے اندر ایمان لا کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر قانون شکنی کے جو نقصان دہ نتائج ہیں، تم ان سے بچ نہیں سکتے۔ اسے ایمان کہتے ہیں اگر کسی سے اس معاملے میں قانون کے خلاف کچھ ہو گیا ہے تو اس کا جو احساس ہے کہ وہ اس سے بچ نہیں سکتا، یہ ہے جس کا نام آپ خوف رکھ لیجیے۔

### انسانی معاشرہ میں نظام عدل کی اہمیت

آج انسانی معاشرہ کے اندر کمزوری اور ستم موجود ہے۔ اس معاشرے کی خلاف ورزی کرنے سے بھی انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کے عواقب سے کس طرح بچوں؟ کیونکہ ہمارے ہاں نظام عدل کمزور ہوتا ہے، اس میں استقام ہوتے ہیں، نقائص ہوتے ہیں، اس لیے قانون شکنی کرنے کے بعد سوال اس طرف جاتا ہے کہ اب کیا کیا جائے جس سے میں اس کے عواقب سے بچ جاؤں۔ یہاں کے اس نظام سے بچ سکتا ہے۔ اصل میں اگلی بات یہ ہے کہ جسے آپ کہیں گے کہ اس کے نتائج سے خوف پیدا ہوتا ہے، وہ یہ بات ہے کہ میں اس کے نتائج سے بچ نہیں سکتا۔ پولیس کے ہاتھوں سے بچ سکتا ہوں، عدالت کے ہاتھوں سے بچ سکتا ہوں، جیل سے بھی بھاگ سکتا ہوں مگر خدا

کے قانون کی گرفت سے میں کہیں بھاگ نہیں سکتا۔

## ایمان بالآخرت کی حقیقت اور اس کے نتائج

یہ جو احساس ہے جسے ایمان بالآخرت یا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان کہتے ہیں اس سے مفر نہیں ہے۔ میں بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ قرآن تو لفظ ہی عجیب لاتا ہے۔ جیل سے دیوار توڑ کر بھاگا ہوا جو مجرم ہے وہ تھانوں سے، جیل سے، عدالتوں سے، سپاہیوں سے، دور دور بھاگتا ہے کہ ان کی نگاہ مجھ پہ نہ پڑ جائے اس کا ہمیشہ یہ کام ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ جو ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل ہے تم اپنے ذہن میں اس سے دور بھاگنے کے لیے قدم اٹھاؤ گے تو تمہارا ہر قدم وہ ہوگا جو تمہیں اس کی طرف لے کر آئے گا، یہ ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ (2:156)۔ جو عجیب چیز ہے وہ یہ بات ہے کہ تم اپنے ذہن میں سمجھتے ہو کہ میں بھاگ کر دور جا رہا ہوں، تمہیں پتہ نہیں۔ تم نے راستہ چھوڑ دیا ہے۔ جس راستے پہ بھاگتے چلے جا رہے ہو کہ میں دور جا رہا ہوں وہ یوں نہیں ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ تمہارا ہر قدم اس کی طرف جا رہا ہے اب آگے جاؤ گے ”تے تہانوں تھانہ نظر آ جائے گا۔“<sup>①</sup> او میرے اللہ! خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ اب یہ سوچ لیجیے کہ قانون کی خلاف ورزی کا جو نتیجہ ہے اس کا علم ہوگا اور علم یہ ہے کہ بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا، یہ نتیجہ تو سامنے آئے گا۔ اس سے آپ کی جو کیفیت پیدا ہوگی وہ خدا کا ڈر نہیں ہے، وہ تو اپنے کیے ہوئے کا جو نتیجہ نکل رہا ہے جس سے مفر نہیں ہے یہ تو وہ احساس ہے۔

عزیزانِ من! اب اگلی چیز اس نے پھر یہی کہہ دی کہ بھاگ کر دور کیوں جا رہے ہو۔ یہاں سے فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے کہ انسان بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ اس لیے جھکی ہوئی نگاہوں سے، خمیدہ گردن سے، ندامت سے، پیشانی کے اوپر عرقِ انفعال کے ساتھ خود ہی آ جاؤ کہ مجھ سے بھول ہوگئی، غلطی ہوگئی، مجھے اس وقت علم نہیں تھا جب میں نے یہ کیا تھا۔ اب مجھے اس کا علم ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس غلطی سے جو میرا نقصان ہوا ہے میں اس کی تلافی بھی کروں گا اور آئندہ کے لیے محتاط بھی رہوں گا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ تم بتاؤ تو سہی کہ کیا تمہیں عذاب دے کر خدا خوش ہوتا ہے؟ نہیں وہ Sadistic (اذیت پسند) نہیں ہے کہ کسی کو اذیت دے کر خوش ہوتا ہو۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ تم نے خود اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا ہے اگر اس کا احساس بیدار ہوا ہے تو اس کی تلافی کرو، ہمارا نہ پہلے تم نے کچھ بگاڑا تھا، نہ اس سے کچھ بگڑے گا۔ یہ ہے قرآن کی رو سے قانونِ جزا و سزا اور یہ ہے کہ جس کو ہم خوف کہتے ہیں۔ میں نے پھر یہ عرض کیا ہے کہ اس کو خدا کا خوف نہیں کہنا چاہیے۔ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنے کے جو نتائج ہیں یہ ان کے احساس اور علم کا نام ہے جسے آپ خوف کہتے

① تو تمہیں تھانہ نظر آئے گا۔

ہیں۔ اب جہاں بھی قرآن میں یہ چیزیں آئیں گی تو انہیں غور سے سمجھیے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو جب ہمارے ہاں ترجمہ ہو جاتا ہے تو اس سے قرآن کریم کے صحیح تصورات سمجھ میں نہیں آتے اور دوسرا یہ کہ وہی بچپن سے خدا کا خوف والا تصور ذہن میں ڈر کے ساتھ ڈالا ہوا ہے اور پھر اس کے بعد آگے چلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں حضرت صاحب ساری عمر خدا کے خوف سے ڈر کے مارے روتے رہے صاحب! ساری عمر رونے میں ہی گزر گئی بس ساری عمر یہی کام کیا۔ اب جتنا زیادہ کسی کے اندر جسے یہ خدا کا ڈر کہتے ہیں ہوتا ہے اتنا ہی وہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ جس سے آپ ڈرتے ہیں کیا کبھی آپ اس کا قرب بھی حاصل کرتے ہیں؟ ”اوتھوں تے ٹھدا ہیگا آدمی“ کہ سامنے ای نا آوے کسی طرح ناں<sup>①</sup>۔“ بچے کو جو ڈر ہوتا ہے آج اسکول میں مار پڑتی ہے تو اس دن وہ اسکول ہی نہیں جانا چاہتا مگر یہاں کہتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے وہ سب سے زیادہ مقرب ہوتا ہے۔ ”اوتے لاگے ای نہیں او نا چاہندا۔“<sup>②</sup> برادران عزیز! قرب تو انسان دوست کا چاہتا ہے دشمن کا قرب تو نہیں چاہتا اور جس سے کوئی ڈرتا ہو اس کا قرب نہیں چاہتا۔ کیا کہیں کہ ہمارے ہاں کیا سے کیا ہو گیا ہے!!

### خدا کے صحیح تصور کا جاننا اور ماننا ایک بنیادی امر ہے

عزیزانِ من! میں نے متعدد بار یہ لکھا ہے کہ دین یا انسانیت یا زندگی سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک خدا کا صحیح تصور سمجھ میں نہ آئے۔ ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ جناب! ”مانتا ہوں“ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہی تو اب آپ کے ذہن میں کچھ نہیں۔ مانتا ہوں کا کیا مطلب ہے؟ یہ مانتا ہوں والی بات نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی بتایا تھا اور قرآن خود بھی یہ کہتا ہے کہ جنہیں وہ کفار پکارتا ہے، مشرک پکارتا ہے ان کے متعلق کہتا ہے کہ ان سے بھی جب پوچھا جائے کہ بادلوں سے یہ بارش کون برساتا ہے تو کہیں گے خدا برساتا ہے۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ کھیتیوں میں یہ فصلیں کون پیدا کرتا ہے کہیں گے خدا پیدا کرتا ہے۔ مشرکین اور کفار کا یہ جواب قرآن دیتا ہے۔ وہ خود اس کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ جو خدا کو مانتے ہیں وہ ہمارا لفظ جو ”مانتا ہے“ اس کو تو وہ مانتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ پھر یہ کہتا ہے کہ جب تمہیں خدا کی طرف بلایا جاتا ہے تو پھر تمہیں کیا موت پڑ جاتی ہے کہ آتے نہیں ہو یعنی وہ مانتے تو ہیں۔ کس چیز کی طرف بلایا جاتا ہے؟ یہ جو کفار اور مشرکین تھے یہ جو اہل کتاب تھے ان کے متعلق تو بہر حال یہ ہے کہ وہ خود اس کے مدعی ہیں کہ وہ نہ صرف خدا بلکہ وہ خدا، وحی، رسالت، کتابیں، آخرت ہر چیز کو مانتے تھے اور قرآن ہے کہ وہ ان کو بھی ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر ماننا ہی اس شرط کو

① وہاں سے تو آدمی بھاگتا ہے کہ کسی طرح سے سامنے ہی نہ آئے۔

② وہ تو نزدیک ہی نہیں آنا چاہتا۔



پورا کر دیتا ہے تو وہ تو اس شرط کو تم سے پہلے پورا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے ہی ماننے والے تھے تو رسول اللہ ﷺ کی تو اس زمانے میں نبوت سے پیشتر یہ کیفیت نہیں تھی وہ تو اہل کتاب میں بھی نہیں تھے۔ وہ تو مانتے تھے۔ ان ماننے والوں سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ۔ کیا بات ہے! کہا کہ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ<sup>①</sup> (2:137) اگر یہ لوگ اس تصور کے مطابق ان چیزوں کو مانیں جو اپنا تصور خدا تعالیٰ نے دیا ہے اور جس کے مطابق تم اسے (خدا کو) مانتے ہو پھر اسے ایمان کہا جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے اہل کتاب سے ہی یہ نہیں کہا، یہود اور نصاریٰ سے ہی یہ نہیں کہا، مشرکین عرب، مجوسیوں اور تابعین سے ہی یہ نہیں کہا، مسلمانوں سے بھی یہ کہا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ<sup>②</sup> (4:136) یہ کہنے والو! کہ ہم تو اللہ کو مانتے ہیں ذرا اُسے مان کے دکھاؤ۔ یہ کچھ ہم سے بھی کہا جا رہا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں یہ خوف کے خشیت کے خشوع کے الفاظ آتے ہیں ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ڈر ہوتا ہے یعنی خدا سے ڈرتے رہتے ہیں، خوف کھاتے رہتے ہیں۔ خدا کا تصور یہ ڈرانے والی ہستی کا ہے اور پھر اس کے عذاب کا پوچھو نہیں کہ اس کی کیا کیا تفصیل بیان کی جاتی ہیں۔ اگر کہیں اس کے ہاں کی کوئی رحمت بھی ہوتی ہے، بخشش بھی ہوتی ہے تو شفاعت کے ذریعے سے ہوتی ہے یعنی خدا خود نہیں کرتا، کوئی جا کرو ہاں اس کو کہنے والا ہوتا ہے کہ ”ٹھنڈا وی ہو تھوڑا جیا“<sup>③</sup> یعنی وہ جا کے ان سے کہتے ہیں ”ورنہ“ اوہدا غصہ ٹھنڈا ای نہیں ہوندا۔“<sup>④</sup> عزیزانِ من! جسے ایمان کہتے ہیں، قرآن جس تصور کو پیش کرتا ہے وہ تصور کیا ہے، وہ Concept کیا ہے، خدا کا وہ تصور کیا ہے؟ قرآن ان چیزوں کے تصورات بدلتا ہے، ورنہ یہ سارے ایمان تو پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں ہر ملک میں ہر زمانے میں ہم نے اپنی طرف سے نبیوں کو بھیجا ہے۔ پھر اسی قوم کی طرف بار بار نبی بھیجنے کے کیا معنی تھے؟ یہی کہ رسول اللہ ﷺ آ کر یہود اور نصاریٰ سے کہتے ہیں کہ ایمان لاؤ، اور وحی کی روشنی میں ان دیئے گئے تصورات کے مطابق ان چیزوں کو مانو۔

① اگر یہ لوگ بھی اُسی طرح اس ضابطہ حیات پر ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تَوَفَّقِدْ اِهْتَدُوا (2:137) اُس وقت یہ خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہوں گے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 49)۔

② اے جماعتِ مومنین! تم بھی ہمیشہ اس نظام کے بنیادی اصولوں کی صداقت پر یقین رکھو (2:62)۔ اور وہ بنیادی اصول ہیں: اللہ پر ایمان، وَرَسُولُهُ (4:136) اس کے رسول پر ایمان، وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلٰی رَسُولِهِ (4:136) اور اس کتاب پر ایمان جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی، وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (4:136) اور ان تمام کتابوں پر ایمان جو اس نے اس سے پہلے نازل کی تھیں۔ (اور ملائکہ اور حیاتِ اخروی پر ایمان)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 223)

③ تھوڑے سے نرم بھی ہو جاؤ۔ غصہ تھوک دو۔

④ ورنہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہوتا۔

## ہمارے ہاں قرآن حکیم کے تراجم کا معیار

اب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ قرآن جب ہم سے بھی کہتا ہے کہ ایمان لاؤ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے ایمان کو ذرا اس پہ پرکھ لیا کرو کہ کیا وہ ایمان ان تصورات کے مطابق ہے، کیا خدا کو تم ان تصورات کے مطابق مانتے ہو جو قرآن نے خدا کے متعلق دیئے ہیں یا وہ تصور جو ذہن انسانی کے پیدا کردہ اور مروج چلے آ رہے تھے۔ اُن کے پیروکاروں سے یہ کہا ہے۔ عزیزانِ من! آج کے درس کی یہ آیت شروع ہی اس سے ہوتی ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ<sup>①</sup> (23:57)۔ آپ کسی بھی ترجمے میں دیکھیں، اس میں لکھا ہوا ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں یعنی خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ایک تو یہی دیکھیے کہ یہ زبان کیا ہوئی۔ ڈر اور خوف تو ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ اب یہاں خَشْيَةِ (23:57) اور مُشْفِقُونَ (23:57) آ گیا تو صاحب! اب ان کے لیے کیا کریں۔ پہلے لفظ خوف کہہ دیا پھر ڈر کہہ دیا یعنی خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ یہ وہی ڈر والا تصور ہے۔ خشیت خداوندی تو ہمارے ہاں بھی عام کہا جاتا ہے۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ اور مشفقون کیا بات ہوتی ہے؟ قرآن کریم صحیح اعمال کے نتائج کو عام طور پہ کھیتی کی، زراعت کی، مثال دے کر بیان کرتا ہے۔ اچھا بیج ہو، زراعت کے قانون کے مطابق اس بیج کو بویا جائے، پرورش کی جائے، مناسب پانی دیا جائے، حرارت ہو، احتیاط برتی جائے، تو پھر وہ ایک ایک دانے کے ساتھ ساتھ سودا نے نکلتے ہیں: مفلقون۔ قرآن نے مومن کے متعلق کہا ہے کہ أُولَئِكَ عَلَى هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ<sup>②</sup> (2:5)۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ وہ مثال ہی یہ دیتا ہے اور یہ صحیح چیز ہے کہ جس دور میں ابھی یہ Industries (صنعتیں) یا اس قسم کی اور چیزیں نہیں تھیں، یہ Agriculture (زراعت) ہے، اسی پہ انسان کی زندگی کا دار و مدار ہے، اب بھی یہی صورت ہے۔ یہ باقی چیزیں تو Wealth Produce (پیداوار دولت) کرتی ہیں، انسان کی زندگی کا جن چیزوں پہ دار و مدار ہے، وہ تو یہی زمین پیدا کرتی ہے لہذا قرآن ہمیشہ یہ مثال دیتا ہے۔ پودے کے ہر ابھرا ہونے کے لیے پروان چڑھنے کے لیے، اور ثمر بار ہونے کے لیے، مناسب پانی کی بڑی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ حرارت بھی کچھ زیادہ نہ ہو جائے، لو بھی اس کو مار دیتی ہے، جن پودوں کو پورا پانی نہ ملے وہ سبز ہونے کی

① (زندگی کی حقیقی خوشگوار یوں کے اہل اور لوگ ہوتے ہیں۔ یعنی) وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 783)۔

② یہ وہ سعادت مند لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کے قانون ربوبیت کی راہ نمائی میں سفر زندگی طے کرتے جاتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں آخر الامر پروان چڑھتی ہیں (23:1-11; 31:2-5) (پرویز: مفہوم القرآن، ص 3)۔

بجائے زرد ہو جاتے ہیں اور جو پودے زرد ہو جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ مرجھا جاتے ہیں، ”کلیاں چھیتی مرجاندیاں نیں۔“<sup>①</sup> خشیت کے معنی ہوتے ہیں ”پورا پانی نہ ملنے سے پودوں کا زرد ہو جانا۔“ یہاں کہا ہے کہ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ (23:57) یہ اس کی ربوبیت ہے جس سے انسانیت اور کائنات کی یہ ساری چیزیں نشوونما پاتی ہیں، ربوبیت نشوونما دینا ہے۔ اس کو نشوونما دینے کے لیے ضروری چیز ہے کہ یہ کھیتیاں جو ہم بوری ہیں سرسبز ہوں، صحیح پانی ملے لیکن اگر کوئی اس ربوبیت سے محروم رہ جاتا ہے، اگر وہ اپنی کھیتی کو پانی نہیں دیتا اور وہ زرد پڑ جاتی ہے، تو ہمیں اور آپ کو تو اس کا احساس نہیں ہوگا کہ کیا ہوتا ہے۔ ”سانوں تے ایناں ای پتہ اے کہ کھیتی زرد پڑ گئی ہے۔“<sup>②</sup> پوچھیے اس کسان سے کہ جس کی کھیتی، جس کے پودے زرد پڑ رہے ہوں، وہ بے قرار ہوتا ہے کہ اب کیا بنے گا۔ دیکھا آپ نے، کہ اس میں جسے آپ خوف کہتے ہیں، وہ پہلو کہاں آ رہا ہے: یہ کھیتیوں کا زرد پڑ جانا، پڑ مردہ ہو جانا ہے۔ اس سے کہا کہ یہ چیز قانون خداوندی کے اتباع نہ کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے ورنہ وہ تورب ہے، اس کی ربوبیت کے خزانے تو عام ہیں۔ کہیں تمہاری کوشش میں کوئی فرق آیا ہے، کوئی نقص پیدا ہوا ہے جس کی وجہ سے تمہاری کھیتی کو پورا پانی نہیں ملا، اس لیے زرد ہو گیا۔ اگر قانون کے سامنے تم جھکتے، اس کا اتباع کرتے، تو پھر یہ ہو نہیں سکتا تھا، وہ تورب ہے۔

### شفق کا قرآنی مفہوم

دیکھیے یہاں (23:57) میں ”ربہم“ کا لفظ آیا ہے۔ وہ تورب ہے اس نے تمہاری کھیتیوں کو پڑ مردہ کیوں کرنا ہے۔ پھر یہ کیا ہوا ہے؟ تم نے سرکشی برتی ہے۔ اب یہاں مشفقون آیا ہے۔ اس کا مادہ شفق (شفق) ہے۔ ہمارا ذہن اس طرف نہیں جا رہا کہ یہ ہوتا کیا ہے۔ جب سورج نصف النہار<sup>③</sup> پہنچے، گرمی ہو، اور سر کے اوپر سورج ہو، اس وقت سورج کی تپش، حرارت ملاحظہ فرمائیے۔ صاحب! اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انتہا ہے، حرارت کی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ جھلنا شروع ہوتا ہے۔ شفق کے زمانے میں، جب وہ غروب ہو رہا ہوتا ہے، اس کی ساری تندی اور تیزی ماند پڑ جاتی ہے، رنگ بھی زرد ہوتا ہے، جھکا ہوا بھی اتنا ہوتا ہے۔ یہ جو اس طرح سے انسان کے اندر جھکاؤ پیدا ہوتا ہے اس کو عرب شفق سے تعبیر کرتے تھے۔ ”مشفقون“ وہ لوگ ہوتے تھے جو اپنی تندی اور تیزی کو چھوڑ کر جھکاؤ پیدا کر لیتے تھے۔ اب قرآن کریم میں اس سلسلے کی پہلی ہی آیت (2:5) آگئی کہ آؤ بتائیں تمہیں کون ہے جن کی کھیتیاں پروان

① کلیاں جلد ہی سوکھ جاتی ہیں۔

② ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ فصل زرد پڑ گئی ہے۔

③ دوپہر کا وقت۔

چڑھتی ہیں وہ تو قانون کے مطابق ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کہیں کوئی نقص رہ جاتا ہے اور وہ نقص بھی کچھ ایسا رہ جاتا ہے جس میں یہ ہوتا ہے کہ کہیں حرارت زیادہ ہوگئی، تندہی زیادہ ہے، سرکشی زیادہ ہے، تکبر زیادہ ہے۔ تمہارے اندر رعونت پیدا ہوگئی، اس کے قانون کی پرواہ نہیں کی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ کھیتی کی طرف نگاہ ڈالی تو وہ زرد ہو رہی ہے پتے خشک ہو رہے ہیں، مرجھا رہی ہے۔ اس احساس سے کہ اب کیا ہوگا، فوراً قانون کی طرف نگاہ گئی ہے اور اس کے سامنے یوں جھکے جیسے یہ اس قدر سرکش سورج غروب ہوتے وقت جھکتا ہے: **إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ** <sup>①</sup> (23:57)۔ اس میں ڈر کا پہلو نہیں ہے اس جھکاؤ کے بعد پھر ان کی کیا کیفیت پیدا ہوئی اس کے لیے کہا کہ **وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ** <sup>②</sup> (23:58)۔ انہوں نے دیکھا کہ اوہو؟ خدا کے قانون ربوبیت سے کہیں سرکشی برتی، کہیں انکار ہو گیا، کہیں اس کی خلاف ورزی ہوگئی تو فوراً وہ سامنے لاتے ہیں کہ اس معاملے کے اندر قانون کیا تھا؟ یہ تھا قانون۔ فوراً وہ جا کے دیکھتے ہیں کہ ”موگے کا منہ بند ہو گیا سی ایس واسطے پانی نہیں گیا۔“ <sup>③</sup> وہ رجوع کرتے ہیں، پھر انہی قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ اب یہاں آیا ہے کہ **وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ** (23:59) یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اطاعت صرف احکام و قوانین خداوندی کی کرتے ہیں اس میں کسی اور کو شریک نہیں کرتے۔

## شرک کی ایک واضح تر مثال

عزیزانِ من! یہاں پھر ایک بڑی چیز ہے جو ہمیشہ قرآن نے بتائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک ہی قانون اپنے سامنے رکھو۔ جب اس پہ آؤ تو یہ نہ کرو کہ ایلو پیٹھک والے ڈاکٹر کے ہاں سے نسخہ لیا اور اس کے ساتھ ہو میو پیٹھک کی گولیاں بھی ملا کے پھانکتے جاؤ اور پیچھے سے مجنوں و مرکب بھی کھاؤ۔ آپ پاکستان کے پرامن شہری رہنا چاہتے ہیں، قانون کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، تو ٹھیک ہے جی، موٹر کا لائسنس تو لے لیا، پاکستان کے قانون کے مطابق سڑک پہ نہیں چلے، صحرائے عرب کے قانون کے مطابق **Keep to the right** (دائیں طرف چلو) چلے۔ اسے کہتے ہیں شرک۔ یہاں پہ پورے کا پورا وہ نظام اور وہ قانون لانا پڑے گا، قانون کی ہر شق ماننی پڑے گی جو پاکستان میں ہے۔ اگر یہاں **Keep to the left** (بائیں طرف چلو) نہیں رکھنا تو امریکہ چلے جائیے۔ ٹھیک ہے، جب تک آپ نے یہاں رہنا ہے تو پھر یہاں کے قوانین ہی کو ماننا ہوگا، ان میں دوسرے قانون کو شریک نہیں کر سکتے، یہ بجائے خویش ایک بغاوت ہوتی ہے۔ یعنی یہ تو آپ

① (زندگی کی حقیقی خوشگوار یوں کے اہل) وہ لوگ ہوتے ہیں جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص-783)۔

② یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی کی صداقت اور حکمیت پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص-783)۔

③ واٹر کورس کا منہ بند ہو گیا تھا اس لیے پانی نہیں پہنچا۔

کہیں گے کہ ہم نے قانون کا اتباع کیا۔ سوال یہ ہے کہ کس کے قانون کا اتباع کیا اور ایک مملکت میں تو اسی ایک مملکت کا جو قانون ہے اسی کا اتباع کرنا ہوگا۔ جب آپ خدا کی مملکت میں رہتے ہیں تو پھر تو صرف خدا کے قوانین کو ماننا ہوگا۔ یہاں جو آمیزش ہے وہ یہی نہیں کہ وہ صحیح نتیجہ نہیں پیدا کرتی۔ بڑی نقصان دہ چیز ہوتی ہے کہ کسی عدالت میں جا کر آپ کہہ دیجیے کہ صاحب! میں نے جو یہ بات کی تھی میں نے وہ امریکہ کے قانون کے مطابق کی تھی، یہاں کا قانون میں نہیں مانتا، میں امریکہ کے قانون کے مطابق چلتا ہوں۔ یہ بھی بغاوت ہے۔ اسے شرک کہتے ہیں۔ یہاں (23:59) میں لَا يُشْرِكُونَ (23:59) کہا ہے یعنی وہ یہ نہیں کرتے۔

### دلفظوں میں قرآن حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت

یہاں تو یہ بتایا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُم إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ (23:60) نظام خداوندی کی تشکیل اور نوع انسان کی نشوونما کے لیے وہ جتنا کچھ دے سکتے ہیں دیتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے دل اس خیال سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ ان کا کوئی قدم اس راستے سے ہٹ نہ جائے جو خدا کی طرف لے جانے والا ہے۔ کہا کہ پھر عملاً کیفیت یہ ہے۔ یہ جو قرآن کا نظام ہے اس کے متعلق پوچھا کرتے ہیں کہ جی! قرآن کا وہ نظام معیشت (Economic system) کیا ہے؟<sup>1</sup> اس میں لمبی چوڑی بحثوں کا سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن تو دونوں میں ساری بات کر جاتا ہے کہ انسان کے جسم کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جس کو وہ خود لیتا ہے، خود رکھتا ہے، خود کھاتا ہے، اور اس کی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو وہ دوسرے کو دیتا ہے۔ جسم کی نشوونما بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے کھانا پینا ضروری ہے لیکن یہاں زندگی کا، قرآن کا، ایمان کا پہلا Concept (تصور) خدا پر ایمان لانے کا ہے۔ یہ پہلی بات ہے۔ یہ Concept (تصور) مانے گا تو یہی بات آگے چلے گی۔ اگر یہی نہیں مانتا تو آگے کچھ نہیں چل سکتا۔ زندگی صرف یہ طبعی زندگی، انسان کے جسم کی ہی زندگی ہے، تو اس میں پھر خدا، رسول، وحی، رسالت کچھ آتی نہیں ہے۔ پھر طبعی قوانین ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قوانین، مملکت کے قوانین ہوتے ہیں، اس میں یہی سیکولر نظام (Secular System) زندگی کے اس Concept (تصور) کا پیدا کردہ ہے یا زندگی کا یہ Concept (تصور) ہی سیکولر نظام ہے۔

1 اس نظام کے مالہ و ماعلیہ کے لیے دیکھیے ڈاکٹر میر مصطفیٰ حسین (مرحوم) کا پرویز کا ترجمہ شدہ پمفلٹ Economic System of the Holy Quran۔ یہ پمفلٹ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور سے چھاپا ہے اور اردو میں بھی دستیاب ہے۔

## انسانی ذات کی نشوونما کے قوانین صرف وحی کے ذریعے ہی ملتے ہیں

دوسرا Concept of life (تصورِ حیات) یہ ہے کہ جسم (Body) تو ہے ہی، لیکن اس کے سوا ایک اور شے بھی ہے جسے انسان کی ذات کہتے ہیں اور یہ وہ ہے جس پر انسانی اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور یہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ یہ لائف (زندگی) کا دوسرا Concept (تصور) ہو گیا۔ جب یہ Concept (تصور) ساتھ آئے گا تو آپ کو ان قوانین کی ضرورت پڑے گی جن سے انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں، جسم کی پرورش کے قوانین وحی کے ذریعے نہیں ملتے۔ انسانی ذات (Human Personality) کے قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں۔ اب وحی یعنی خدا کے قوانین تو خدا کے دیئے ہوئے ہیں۔ اب خدا پہ ایمان کی ضرورت پڑی۔ وحی رسولوں پہ آتی تھی، رسولوں کے ماننے کی ضرورت پڑی۔ وحی اس کتاب میں ہے، اس کتاب کے ماننے کی ضرورت پڑی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ جو زندگی کی جوئے رواں ہے یہ اپنے نتائج کو لے کر آگے چلے گی۔ اسے مکافاتِ عمل (Law of Requital) یا حیاتِ آخرت (Life after life) کہتے ہیں، اس سے آخرت پر ایمان کی ضرورت پڑی۔ اگر زندگی کا یہ تصور چھوڑ دیا جائے تو پھر کہیے کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے جس میں کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ جو ذاتِ انسانی کا Concept (تصور) ہے کہ انسانی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں، اس کی نشوونما مقصود ہے۔ وہ نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو آپ دوسروں کی نشوونما کے لیے دیتے ہیں اَلَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى<sup>①</sup> (92:18) یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو اپنی ذات کی نشوونما کے لیے اپنا مال دیتے ہیں۔

## زکوٰۃ کا ادا کرنا حکومت کا فریضہ ہے

عزیزِ انِ من! میں آپ کو کیا کیا تصور بتاؤں، ہم کہاں سے کہاں چلے گئے۔ ان میں ایک زکوٰۃ کا غلط تصور بھی ہے۔ زکوٰۃ کے لفظ سے ہی یہاں یَسْزَكِّي کا لفظ آیا ہے۔ یہ قرآنِ کریم میں نشوونما کے معنوں سے ہی تو ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ زکوٰۃ آیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہے کہ اگر سال بھر اتنا پیسہ جمع ہو جائے تو اس کے اوپر اتنا نصاب ہے۔ آپ اس میں سے اتنا نکال کے دے دیجیے۔ یہ آپ کے ہاں کی فقہ کی زکوٰۃ ہے۔ قرآن میں زکوٰۃ کے معنی ہی سامانِ نشوونما کے ہیں اور قرآنِ کریم تو اسے اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیتا ہے مگر ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کو اسلامی بنا لوی یعنی انفرادی طور پر بانٹنے کی بجائے حکومت لوگوں سے وصول کرے قرآن کہتا ہے کہ

① یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو عند الضرورت اپنا سب کچھ (مال) نوعِ انسانی کی نشوونما (Nourishment) کے لیے دے دیتے ہیں اور اس طرح ان کی اپنی ذات (Personality) کی بھی نشوونما ہو جاتی ہے (9:111)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1458)۔

حکومت یا مملکت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہے کہ وہ زکوٰۃ دے۔

### مملکت اسلامیہ اور دوسری مملکتوں میں ایک بنیادی فرق ہے

کوئی اس آیت (92:18) کو نہیں دیکھتا کہ صاحب! وہ تو قرآن کریم میں یہ لکھا ہوا ہے کہ زکوٰۃ حکومت دے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کے معنی کیا ہوں گے؟ یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ بڑی بلند چیز ہے۔ دنیا کی مملکتیں حکومتیں اس لیے وجود میں آتی ہیں کہ دوسروں سے لیتی چلی جائیں مگر یہ اسلامی مملکت اس لیے وجود میں آتی ہے کہ وہ سامانِ نشوونما دیتی چلی جائے تاکہ اس کے افراد کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ دنیا کے مملکتوں میں تو یہ ہوتا ہے کہ فلاں نے انکم ٹیکس نہیں دیا، فلاں ٹیکس نہیں دیا اور انکوائریاں کرو اور یہ کچھ کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے وہ انکم ٹیکس نہیں دیتا۔ اور اس کے برعکس قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ یہ عام دنیوی مملکتوں کے افراد کی طرح کے لوگ نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں دینے سے ان کے دل کی کشادگی ایسی ہوتی ہے کہ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟

### ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے دو مختلف میدانوں کی نوعیت

یہ سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لیے دینا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُونَ (23:60) ان کا ہر قدم اس راستے کی طرف اٹھ رہا ہوتا ہے جو خدا کی طرف لے جانے والا ہے۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِی الْخٰیِرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُونَ <sup>①</sup> (23:61)۔ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ انسانوں کے اندر ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہونا چاہیے لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایک تو میدان وہ ہے جس میں انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۝ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ <sup>②</sup> (102:1-2)۔ ایک مکان بنالیا ہے تو اس کے بعد یہ ہے کہ اچھا، اس نے ایک اور مکان بنایا، اور میں دو اور مکان بناؤں گا۔ اس کی چار

① یہ ہیں وہ لوگ جو زندگی کی خوشگوار یوں کے حصول کے لیے تیز گام رہتے ہیں اور یہی ہیں جو شاہراہِ حیات پر سب سے آگے نکل جانے والے ہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 783)۔

② تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں انسانیت کی صحیح منزل مقصود کی طرف سے یکسر غافل کر دیتی ہے؟ وہ چیز ہے مال و دولت اور جاہ و منصب میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس (57:20; 83:26)۔ اگر تم اپنی طلب کو اپنی ضروریات پورا کرنے تک محدود رکھو تو اس کی ایک حد (Limit) ہوگی لیکن جب جذبہ محرکہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانا ہو تو اس کی کوئی حد (Limit) ہی نہیں ہو سکتی۔ اس جذبہ کے ماتحت کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جتنا حاصل کرتے جاؤ اتنی ہی ہوس بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے تک جا پہنچتا ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1478)۔ ان نکات کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006، سورۃ التکاثر۔

کوٹھیاں ہیں اور کتنا بڑا بینک بیلنس ہے۔ اس میں اتنا اور آجائے گا۔ ایک موٹر آئی ہے، دو اور آجائیں گی۔ دیکھتا ہے کہ اس نے وہ ماڈل (Model) منگوایا ہے، اس سے بھی جو Latest (جدید ترین) ہے وہ آجائے۔ یہ ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے، یہ ہونا چاہیے۔ انسان کی سعی و کوشش یہی ہے۔ قرآن اسے Competition (مقابلہ) کہتا ہے لیکن کہتا ہے کہ ہم تمہیں ایک دوسرا میدان بتا دیتے ہیں، تمہارا جذبہ وہاں Satisfy (پورا) ہو جائے گا۔ یہ لوگ یہ سارا کچھ لینے کے اندر ایک دوسرے سے مسابقت<sup>1</sup> رکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ لے لوں، اس سے زیادہ لے لوں۔ سنو! تم دینے کے اندر ایک دوسرے سے مسابقت کیوں نہیں کرتے۔ بڑھنا ہی تو ہے اس میدان میں ایک دوسرے سے، بڑھو اسی لیے قرآن کریم نے کہا کہ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَ هُمْ لَهَا سَبِقُونَ (23:61) دوسروں پہ سبقت لے جانا چاہتے ہو تو یہ جو دوسروں کو دینے کا کام ہے ان کے اندر سبقت لے کر جاؤ۔ قرآن کریم نے یہاں یسارعون کہا ہے۔ اس کے معنی ہی دوڑ کے ہوتے ہیں، اس کے اندر جسے آج ہم Race کہتے ہیں وہ ہوا کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تیزی سے بھاگنا چاہتے ہو تو اس کے لیے ہم تم کو ایک دوسرا میدان دیتے ہیں۔

### قرآن حکیم میں لفظ ’وسعت‘ کی حدود کا تعین

دوسروں کو دینے کے لیے مسابقت کا میدان دینے کے بعد کہا کہ ایک اگلی چیز یہ ہے کہ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا<sup>2</sup> (6:153)۔ ان الفاظ میں یہ جملہ قرآن کریم میں متعدد مقامات<sup>3</sup> پر آتا ہے۔ اس کا عام ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلف نہیں ٹھہراتا۔ یعنی خدا کسی پہ کوئی ذمہ داری اس کی وسعت سے زیادہ نہیں ڈالتا۔ یہ جو اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ابھی! کچھ اور بھی نہیں ”میں تے ایناں ای جوگا ہیگا۔“<sup>4</sup> اپنی وسعت کو خود طے کر لیتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ صاحب! اس سے زیادہ اور کیا دوں، خدا نے خود کہا ہے کہ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (23:62) اس کی وسعت سے زیادہ ہم اس کے اوپر بار ہی نہیں ڈالتے، تو ذمہ داری نہیں آتی۔ میں جو کہتا ہوں کہ میری اتنی وسعت ہے، اس سے زیادہ کیسے دوں۔ اس سے زیادہ وہ مانتا نہیں۔ یعنی وسعت ہم اپنی آپ متعین کر لیتے ہیں۔ تو پھر سیدھی سی بات ہے کہ ٹھیک ہے جی! ”اپنی وسعت انی ای ہیگی اے۔“<sup>5</sup>

1 ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا، سبقت لے جانا۔

2 ہمارے احکام اور قوانین کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات میں وسعتیں پیدا ہوں۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 331)۔

3 یہ ان تین مقامات پر آیا ہے: (6:153; 7:42; 23:62)

4 میں تو اسی لائق ہوں۔

5 اتنی وسعت پس اتنی سی ہی ہے۔



اتنی استطاعت ہے اس سے زیادہ کوئی ہے نہیں اور یہ آیت آگئی۔ یہ دیئے جانے کی بات تو کچھ اور ہی ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تو واقعی بہت بڑی ذمہ داری، فریضہ عائد کر رہا ہے، خدا پابندیاں عائد کر رہا ہے کہ اس قسم کا مال اور یہ رزقِ حلال اور رزقِ حرام نہ لؤ حلال میں سے طیب لؤ طیب میں سے دوسروں کو زیادہ سے زیادہ دو پابندی پہ پابندی پہ پابندی ہے۔ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر یہ پابندیاں گراں نہیں گزرتیں۔ یہ جانتے ہیں اور اس کی وہ مثال ہے کہ جب کبھی ہمیں کسی نہر کی رفتار سست لگتی ہے تو اس کے آگے ایک ٹھوکر (Fall) بنا دیتے ہیں۔ جس زمانے میں نہر ذرا خشک ہو اور وہاں پتھر رکھ کے بنارہے ہوں تو آپ سب یہ کہیں گے کہ شاید یہ تو نہر بند کرنے لگے ہیں۔ نہر کے آگے بند بنا دینا ہے قرآن کہتا ہے کہ جن پابندیوں کو تم سمجھتے ہو کہ یہ نہر میں بند لگا دیا ہے یہ تو تمہاری روانی میں تیزی پیدا کرنے کے لیے ہم یہ بند لگاتے ہیں: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (23:62) جو پابندی بھی کسی کے اوپر عائد کی جاتی ہے وہ اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی رفتار میں وسعت پیدا ہو جائے اس لیے یہاں يُسَارِعُونَ (23:61) کہا تھا کہ یہ ایک ریس (Race) ہے۔ تم خیرات کے کاموں میں، یعنی اچھے کاموں میں، تعمیری امور میں، ایک دوسرے کے بالمقابل بھاگ رہے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کہیں کہیں دیکھتے ہیں کہ کچھ پابندی بھی ہے، ٹھوکر بھی ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ اسے پابندی نہ سمجھو یہ تو رفتار میں تیزی پیدا کرنے کے لیے ایک بند لگایا ہے، ٹھوکر لگائی ہے۔ اب جتنے احکامات خداوندی ہوئے یا پابندیاں یا فرائض یا واجبات ہوئے جب ان کے متعلق یہ تصور ہوا کہ یہ چیز تو میری رفتار کو تیز کرنے کے لیے ہے نہ کہ میرے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے تو آپ دیکھیے کہ آپ کس تیزی سے اس کی طرف جاتے ہیں اور آپ اسے کیسے حسن کارانہ انداز سے پھاند جاتے ہیں رفتار میں تیزی ہو جاتی ہے کیونکہ انسان جانتا ہے کہ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (23:62) یہ پابندیاں میری وسعتوں میں اور زیادہ تیزی پیدا کرنے کے لیے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ باتیں وہ نہیں ہیں جو بظاہر نظر آتی ہیں۔ یہ تو وسعت پیدا کر کے عمل میں اور زیادہ تیزی کا باعث بنتی ہیں۔

عزیزانِ من! میں نے یہی عرض کیا ہے کہ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا <sup>①</sup> (6:153) میں دیکھیے لفظ نکلّف آیا ہے ہمارے ہاں اس نُكَلِّف سے یہ لفظ تکلیف نکالا ہوا ہے یعنی کسی کو تکلیف دینا۔ آپ جانتے ہیں کہ خواہ یہ خدا ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو یہ کسی کو تکلیف دیتا ہے۔ ہمارے ہاں اگر خدا کا یہ ڈر اور خوف کا تصور نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ خوف اور ڈر کے اس تصور کے مارے آپ

① امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ”المفردات فی غریب القرآن“ میں لکھا ہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا انسان پر جو پابندیاں عاید کرتا ہے تو وہ اس لیے ہوتی ہیں کہ ان سے انسانی ذات میں وسعت اور کشادہ پیدا ہو یعنی وہ پابندیاں اس کی آزادی سلب کرنے کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ اس کی ذات کی قوتوں اور صلاحیتوں میں وسعتیں پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہیں جس طرح نہر کی ٹھوکر (Fall) اس کے پانی کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ (حوالہ: لغات القرآن جلد سوم 1966ء ص 1451)

یہ کچھ کرتے ہیں کہ صبح ہی اس نے تہجد کے لیے بھی کہا ہے پھر اس کے بعد یعنی تہجد میں تو بہر حال چار بجے ہی آپ کے ہاں فجر کی اذان ہو رہی ہے۔ سردیوں کا موسم ہے۔ ٹھنڈا پانی ہے۔ اس سے وضو کر رہے ہیں۔ نہانا بھی ہوتا ہے۔ ابھی سوئے تھے پھر اس کے بعد رات کو عشاء بھی ہے۔ تراویح ہیں۔ سارا دن کا روزہ ہے۔ پھر یہ دینا بھی ہے۔ یعنی آپ دیکھتے ہیں کہ اگر یہ خوف اور ڈر سے ہو تو یہ تو ہر چیز دیکھتے ہیں کہ آپ کو کس قدر تکلیف دینے والی ہے۔ یہ مشقتیں ہیں۔ اس کا ترجمہ ہی مشقت کیا جاتا ہے۔ وہ مشقتوں میں ڈال رہا ہے۔ یہ ہے تو شعر ذرا فراز کے شعر میں شوخی ہوا کرتی ہے۔ یہ ہے تو چھوٹی سی بات مگر بات بڑی پتے کی کہہ گیا ہے۔ انہی میں سے اس نے کسی کو دیکھا تو بے ساختہ زبان سے یہ نکلا:

مر رہے ہیں نجات کے غم میں  
ایسی جنت گئی جہنم میں  
(فراز)

ان کو مشقت سمجھنا اور مشقت سمجھ کر یہ کچھ کرنا اور ڈر کے مارے یہ کچھ کہنا تو ٹھیک کہا اس نے کہ ”ایسی جنت گئی جہنم میں۔“ عزیزانِ من! اس آیت میں کہا کہ یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے اسے ذہن نشین کر لو۔ اس سے کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں اس سے تمہارے اختیارات کی وسعتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اب مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں تو ان الفاظ کے وہ معنی بھی نہیں رہے۔ اب یہاں عربی زبان میں خیرات کا لفظ آیا ہے۔ آپ کے ہاں خیرات کے معنی کا تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ بخشش ہے اور سب سے زیادہ ذلیل کرنے والی چیز ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ عربی زبان کی رو سے خیر کی جمع خیرات بھی آئی ہے۔ خیر اور اختیار کا تو ایک ہی مادہ ہے۔ ”وسعہا“ ہر وہ عمل ہے جس سے تمہارے اختیارات میں وسعت پیدا ہو۔ اسے نیکی کہتے ہیں۔ ہم نے نیکی ترجمہ کیا اور اپنے ذہن میں ہی پھر سمجھ لیا کہ نیک کام کیا ہے۔ آپ نے اپنے ذہن میں سمجھ لیا ہندو نے اپنے ذہن میں سمجھ لیا، صبح سویرے اٹھ کر چلے آ رہے ہیں۔ اب تو یہاں ہندو ہوتا نہیں۔ ہم نے ان کے ہاں وہ دیکھے تھے جو پن<sup>1</sup> کرنے والے ہیں آٹا لیا ہوا ہے چلے جا رہے ہیں، چیونٹے نکل آتے ہیں۔ برسات میں زیادہ نکلتے ہیں، بہت زیادہ ہوتے ہیں تو وہ ایک چٹکی آٹے کی لی اور ان کے آگے ڈال دی، کچھ آٹے کی چٹکی تو روز چڑیاں دے چوگے واسطے رکھ دیندے ہیں۔<sup>2</sup> گھوڑوں کی پانی پلانے کی سبیلیں تو یہاں ان کے زمانے کی آپ نے ابھی تک دیکھی ہوں گی اگرچہ اب وہ کھنڈرات ہو گئے۔ ”بندیاں نوں پانی لبد انہیں، گھوڑیاں نوں کتھوں لہجے گا۔“<sup>3</sup>

1 خیرات صدقہ۔ نیک کام۔

2 آٹے کی مٹی تو روزانہ چڑیوں کے چوگے کے لیے رکھ دیتے ہیں۔

3 اب تو انسانوں کو پانی نصیب نہیں ہوتا گھوڑوں کو کہاں ملے گا!

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں

وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

وہ گائے بھینسوں کے لیے اتنے اتنے بڑے نمک کے ڈلے رکھ دیتے تھے۔ اپنے ہاں یہ صبح ہی صبح سارا پن کا کام کر کے خیرات کر کے بیٹھ جاتے تھے اور پھر کاروبار کے لحاظ سے جو بھی ان کے پاس آتا تھا اس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے تھے۔ اے کاروباری گل ہوئی ناجی! پن دی گل تے ہوگئی۔<sup>①</sup> جب سویرے سویرے آپ کہیں گے کہ پن کا، نیکی کا کام کرو۔ یہ پن کا کام کچھ نیکی نہیں ہے۔ یہ تو الفاظ ہی عجیب ہیں۔ قرآن کریم میں تو نیکی کے لیے لفظ ”خیر“ آیا ہوا ہے اور خیر کے معنی ہی یہ ہیں کہ جہاں تمہارے اختیارات میں وسعتوں کا اظہار ہو اس لیے لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (23:62)۔ اب اس کے معنی سمجھ میں آئے جب خیرات (23:61) کا لفظ پہلے آیا۔ کہا کہ یہ چیزیں جو ہم کہہ رہے ہیں تم انہیں اب یونہی نہ سمجھ لینا کہ خیر یہ کچھ ایسا ڈر کے مارے کر رہے ہیں۔ یہ وہ بات نہیں بالکل نہیں ہے۔ یہ وہ یقین محکم ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ، نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے اپنا سب کچھ دے دینے میں بھی اپنے دل میں گرائی محسوس نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور وہ بالکل صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ وَلَدَيْنَا مَكْتُبٌ (23:62)۔ ہم نے تو تمہارا اکاؤنٹ کھول رکھا ہے ہمارے پاس قانونِ مکافات کا رجسٹر ہے جس میں ہر ایک کے اعمال کا ریکارڈ رہتا ہے اور يَنْطِقُ بِالْحَقِّ (23:62) اس کی کوئی انٹری غلط نہیں ہوتی اور ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (23:62) کسی میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی نا انصافی ہو۔ ظلم کے معنی کمی کے ہوتے ہیں اسے ہی ہم زیادتی کرنا، کسی کے حق میں کمی کر دینا کہتے ہیں، جیسا یہ کہا جائے کہ اس پر بڑی زیادتی ہوئی، ان کے ہاں کا یہ عجیب لفظ ہے۔ میں نے جیسے بتایا ہوا ہے کہ ظلم کے معنی ہوتا ہے جس شے کو جہاں اور جیسے ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو اور ویسے نہ ہو وہ ظلم ہوتا ہے۔ کوئی نا اہل ہو کسی کو اس کے اوپر آپ لگا دیں، یہ بھی ظلم ہے۔ اہل کو وہاں نہ لگائیں کسی دوسری جگہ لگا دیں، وہ بھی ظلم ہے۔ ان کے ہاں کے یہ عجیب لفظ تھے۔ کہا کہ وَلَدَيْنَا مَكْتُبٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ (23:62) ہمارے پاس رجسٹر ہے آپ کے پاس بھی رجسٹر ہے۔<sup>②</sup> وہ سمجھانے کے انداز میں یہ کہتا ہے کہ

① جی، یہ تو کاروباری بات ہوئی۔ نیکی کی بات تو (صبح) ہوگئی تھی۔

② یعنی مرزا اسد اللہ خان غالب (1797-1869ء)

پکڑتے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق  
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یعنی اوجیہڑے لکھن والے نے اسی اوٹاں نوں دیکھ دے دی نہیں ہیگے۔ او آپے ای کچھ لکھ لیندے نیں، آپے تیرے کول اوٹاں نے پیش کردتا، آپے ای فرد جرم لادتی تو یہ تو ساڈا بند انہیں سی<sup>①</sup>۔ اس نے کہا ہے کہ اس کی ضرورت نہیں تھی وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ (23:62) تہاڈے کسے بندے دے او تھے نال لاگے ہون دی ضرورت نہیں سی۔ جیہڑی اے کتاب ہیگی۔ اے یہ یہ نہیں ہے کہ یہ بینک والے میجر نے اپنے ہاں تمہارے اکاؤنٹ کارجرٹر کہیں بند کر کے رکھا ہوا ہے تمہیں پتہ ہی نہیں چلے کہ اس میں یہ کیا ہے اکاؤنٹ کارجرٹر (17:13)۔ اے نامہ اعمال آ<sup>②</sup>۔

ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لپیٹا ہوا ہوگا

عزیزانِ من! قرآن کریم کہتا ہے کہ وَكُلُّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (17:13) یہ دستاویز اس کا یہ اعمال نامہ ہر انسان کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ پہلے زمانے میں جو دستاویز ہوتی تھی۔ اس کو یوں لپیٹ لیتے تھے اور وہ لپیٹ کی نالیاں تو ہمارے ہاں ٹین کی بنائی ہوئی تھیں ان میں محفوظ رکھنے کے لیے ڈال دیتے تھے یوں نہیں رکھ دیتے تھے وہ لپیٹ ہوئی ہوتی تھی۔ ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لپیٹا ہوا ہے۔ اب جسے آپ حساب کتاب کا دن، قیامت کا دن، کہتے ہیں اس دن بات اتنی ہی ہوگی کہ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مِنْشُورًا (17:13) یہاں وہ دستاویز لپیٹ ہوئی ہے وہاں کھول دی جائے گی۔ بس اب کھولنے کے بعد کیا کہا جائے گا کہ یہ کھل گئی تو دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں ہے اِقْرَأْ كِتَابَكَ (17:13) آپ ہی اپنا اعمال نامہ پڑھ، اچھا جی! پڑھ دیا۔ میں نے یہ سہرا کچھ دیکھ لیا، ادھر اور ادھر Debit (ادا کردہ رقم) اور Credit (جمع کرائی گئی رقم) میں کیا چیزیں ہیں دیکھ لیں پھر اس کے بعد کیا کوئی چارٹرڈ اکاؤنٹ آئے گا جو آگے بتائے گا کہ صاحب! اس میں کتنا نفع یا نقصان ہوا۔ کہنے لگے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے اب كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (17:14) آپ ہی حساب کرلو۔ اپنا لکھا ہوا، جو گردن میں لپیٹا ہے ہوئے پھر رہا تھا، اس کو ہم نے کھول کے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ بس اتنا ہی کیا ہے۔ پھر تم سے خود کہا ہے کہ پڑھ لو اور تم ہی سے کہا ہے کہ اپنا حساب تم ہی کرلو۔

① وہ جو (نامہ اعمال) لکھنے والے ہیں ہم تو انہیں دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ وہ خود ہی لکھ لیتے ہیں، خود ہی تمہارے سامنے پیش کر دیا، خود ہی فرد جرم عائد کر دی، یہ تو ہمارا بند انہیں تھا۔

② تمہارے کسی بندے کے وہاں ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جو کتاب ہے یہ وہ عام کتاب نہیں ہے جیسے کہ تمہارے ہاں بینک میجر نے تمہارے اکاؤنٹ کارجرٹر کہیں بند کر کے رکھا ہوا تھا اور تمہیں اس کا علم ہی نہیں کہ یہ اکاؤنٹ کارجرٹر کیا ہے (17:13)۔ یہ تو نامہ اعمال ہے۔

واہ! اب یہاں کہا ہے کہ **وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ** (23:62) یہ ہے وہ حساب کار جسٹرس جسے ہم نے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ سچی بات کہتا ہے، غلط بات نہیں کہتا۔ اب حساب میں کسی سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ آپ اپنا حساب لکھا ہوا خود ہی پڑھیں، خود ہی حساب کریں پھر کہا: بات تو ایسی نہیں جو سمجھ میں نہ آئے بل **قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِّنْ هَذَا وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّنْ دُونِ ذَلِكَ هُمْ لَهَا عَمَلُونَ**<sup>①</sup> (23:63) لیکن تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔ یہ خود ہی ان تارکیوں کے اندر ڈوبے ہوئے رہنا چاہتے ہیں اور اسی لیے یہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کے خلاف کرتے ہیں جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پوچھنے والا نہیں۔

### معاشرے کے مترفین کا انجام

آگے بڑی عجیب آیت آرہی ہے عزیزانِ من! سمجھتے ہیں کہ پوچھنے والا کوئی نہیں اور وہ اسی قسم کا کام کرتے رہیں گے حتیٰ اِذَا **أَخَذْنَا مُتَرْفِعِينَ بِالْعَذَابِ**<sup>②</sup> (23:64)۔ آپ کو یاد ہے کہ انبیائے سابقہ میں کے سلسلے میں **الْمَلُؤُا الدِّينَ** (23:24) آیا تھا۔ اس میں لفظ ”الْمَلُؤُا“<sup>③</sup> ہے۔ میں نے کہا ہے کہ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوتے ہیں انہیں ”الْمَلُؤُا“ کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے مترف کا لفظ بھی ان کے لیے استعمال کیا ہے جو دوسروں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جب قوم پہ عذاب یعنی تباہی آتی ہے تو سب سے پہلے یہ جو مترفین تھے ان کو پکڑا جاتا ہے اور کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ **إِذَا هُمْ يَجْتَرُونَ** (23:64) وہ بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ جب ان کی گرفت ہوتی ہے تو چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں، رونے پٹینے لگ جاتے ہیں۔ صاحب! ان سے کہہ دیا جاتا ہے کہ **لَا تَجْتَرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُمْ مِنَّا لَا تَنْصُرُونَ** (23:65) آج اس گڑگڑانے اور رونے اور چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس سے بہت پہلے تمہیں کہتے رہے کہ یہ جو کچھ کر رہے ہو اس کے متعلق سوچو کہ یہ تمہیں کہاں لے جا رہا ہے، تم سرکشی کرتے چلے گئے۔ اب جو وہ نتائج برآمد ہونے کا وقت آ گیا ہے اس وقت تمہارے لیے کون کچھ کر سکتا ہے؟ اب تو ہم بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ تمہیں اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔

- 
- ① لیکن ان مخالفین کے دل اس حقیقت کی طرف سے یکسر غافل ہیں۔ یہ اپنی مفاد پرستیوں کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایسے کام کرتے ہیں جو صحیح روش زندگی سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ اور یہ اسی قسم کے کام کرتے رہیں گے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-184)۔
  - ② تا آنکہ ہم ان کے مرفہ الحال، سہولت پسند، سرمایہ دار طبقہ کو عذاب میں گرفتار کر لیں گے (23:33)۔ اُس وقت تم دیکھو گے کہ ان کا تکبر کس طرح ٹوٹتا ہے اور وہ کیسے چیختے چلاتے اور آہ و زاری کرتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص-784)۔
  - ③ وہ جن کے پاس ضرورت کی تمام چیزیں بھری ہوئی ہوں، جن کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں، مالدار لوگ (تاج العروس)۔ اُس وقت تمہارا جس سے کوئی چیز بھر جائے (تاج العروس) (پرویز: لغات القرآن، ص-1554)۔

## انجام کار کے سلسلہ میں قرآن کا محاکاتی<sup>1</sup> انداز

قرآن کہتا ہے کہ یہ جو اس قبیل کے لوگ ہیں وہ پھر اس ظہورِ نتائج کے وقت چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں۔ قرآن میں بڑے محاکاتی انداز میں اس چیز کو بیان کیا ہے۔ دوسری طرف ڈرامائی انداز ہوتا ہے۔ قرآن کا محاکاتی انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک منظر سامنے لاتا ہے مثلاً وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ (21:11) آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ بستیاں جن کے کھنڈرات کی ٹھیکریوں کے اوپر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں، کیسے تباہ ہوئیں۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ اپنے ان خلافِ قانون خداوندی کاموں کے اندر پڑتے چلے جاتے تھے۔ ہم انہیں کہتے تھے، ان کی طرف انبیاء بھیجتے تھے، قانون بتانے والے ان کی طرف آتے تھے، بتاتے تھے کہ اس کا نتیجہ یہ کچھ ہوگا، انہیں اس کا احساس تک نہیں تھا۔ کہا کہ یہ نہیں ہے کہ اس دوران ہمارا قانون مکافات غافل بیٹھا ہوا تھا، وہ کچھ نہیں کر رہا تھا۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ نتائج مرتب کیے چلا جا رہا تھا اور وہ Slow Poisoning (ست روزہر) والی بات تھی کہ انہیں محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں بھی جا کے کہیے کہ ڈاکٹر صاحب! رات اچھا بھلا سو یا تھا صبح اٹھا تو یہ حالت ہے کہ یہاں اتنا سخت درد بتا رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ رات ہی رات میں کچھ ہو گیا۔ کل تک اچھا بھلا تھا، لیکن ڈاکٹر یہ بتاتے ہیں کہ یہ رات ہی رات میں کچھ نہیں ہو گیا۔ یہ تو اس سے بہت پہلے کی بات ہے جب اس کو درد کا Attack (حملہ) ہوا تھا۔ اس کے لیے تم لوگ پہلے کیوں نہ آ گئے۔ کہا کہ جی، کچھ محسوس ہی نہیں کیا۔ انسان محسوس اس وقت کرتا ہے جب وہ آخری وقت آنے لگتا ہے۔ اس وقت پھر جب وہ درد اٹھتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے۔

## ظہورِ نتائج کے موقع پر انسان کی نفسیاتی کیفیت

عزیزانِ من! اب دیکھیے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ کر رہے تھے اور ان کے ذہن میں یہ تھا کہ نہیں، کوئی خرابی کی بات نہیں۔ مگر ان کی غلط روش کے نتائج، غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ فَلَمَّا أَحْسَسُوا بِأَسَاسِهَا (21:12)۔ وہ تباہی جو تھی جب ان کو اس کا احساس ہوا کہ آ رہی ہے، اور معلوم ہوا کہ باہر سپاہی بھی پھر رہے ہیں، مگر نے انہیں بتایا کہ تمہارے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں، تو اس چیز کا احساس ہوا پھر اِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ (21:12)

① باہمی بات چیت کا۔ باہمی داستان گوئی کا۔

② جب ان کے غلط اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آ گئے۔

اس وقت وہ بھاگ اٹھے۔ ان کا پہلا Reaction (رد عمل) بھاگ اٹھنے کا تھا گویا وہ اس سے بچ جائیں گے۔ وہ بھاگ اٹھے۔ یہاں کہا کہ وہ بھاگے جارہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ کوئی پیچھا کرنے والا نہیں ہے۔ کیا بات ہے! کہا کہ لَا تَرْكُضُوا (21:13) وہ بھاگے جارہے تھے تو پیچھے سے ہمارے قانون مکافات کے سپاہیوں نے آواز دی کہ کھڑے ہو جاؤ مت بھاگو۔ وَ ارْجِعُوا إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَ مَسْكِنُكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ <sup>①</sup> (21:13)۔ دیکھیے عزیزانِ من! کیا محاکاتی انداز ہے! کہا کہ وَ ارْجِعُوا (21:13) واپس آؤ الٰی مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ (21:13) آؤ واپس۔ وہ سارا کچھ جو تم نے لوگوں کی محنتوں کی کمائی کا استحصال کر کے اپنے لیے الگ رکھا ہے آؤ اس کی طرف ان چیزوں کو دیکھو وَ مَسْكِنُكُمْ (21:13) اور بڑے بڑے محلات جو اس دوران تعمیر کر لیے تھے آؤ ان کی طرف چلو واپس۔ کاہے کے لیے واپس آؤ؟ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ (21:13) تاکہ تم سے کچھ پوچھا جائے کہ یہ کہاں سے دولت لی ہے یہ اتنے ہی دنوں کے اندر کیسے حاصل کی یہ ماربل (سنگ مرمر) کا اتنا بڑا گھر کیسے بن گیا تمہارے پاس تو مکان کا کرایہ دینے کے لیے بھی نہیں ہوتا تھا اور سارا راز اس لَعَلَّكُمْ میں ہے۔ عزیزانِ من! کہ اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ نشہ اقتدار میں یہ جس قدر ذہن میں بد مستیاں ہوتی ہیں کہ ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا ورنہ اگر پوچھنے والے کا یہ احساس ہو تو پھر وہ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ اسے آج کی اصطلاح میں Accountability (جوابدہی) کہتے ہیں۔ یہ جو آپ کے ہاں کے ماتحت (Sub-ordinates) ہوتے ہیں ان کے متعلق تو یہ ہوتا ہے کہ ہاں صاحب! انہوں نے اپنا کاؤنٹ Render (چلانا) کرنا ہے۔

### اسلامی مملکت اور ملوکیت میں ایک بنیادی فرق

اس وقت ساری دنیا میں جو نظام رائج ہے اس میں یہ ایک ایسا مقام Accountable to none (کسی کے آگے جوابدہ نہیں) رکھ لیتے ہیں کہ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ اسے Sovereign authority یا Sovereignty کہتے ہیں۔ اس کی Definition <sup>②</sup> (تعریف) یہ ہے کہ وہ Accountable to none (کسی کے آگے جوابدہ نہیں) ہے۔ دیکھیے قرآن کریم اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟ میں نے ابھی کہا کہ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ (21:13) تاکہ تم سے پوچھا جائے۔ عزیزانِ من! یہ جسے آپ نظام اسلامی کہتے ہیں یا

① مت بھاگو۔ اب الٹے پاؤں انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (جن کی سرشاریاں تمہیں اس طرح مدہوش کیے تھیں) اور اپنے ان محلات کی طرف پلٹو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنایا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا؟ (102:8) (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 729)۔

② Sovereignty (اقتدارِ اعلیٰ) کی Definition (تعریف) یوں کی گئی ہے:

The power to do all things without accountability, (Robert Lansing:

Notes on sovereignty, p.3, Quoted by Jacques, in "Man and the State" P.51).

جسے اسلامی مملکت کا نظام کہتے ہیں اور جس کے لیے کہتے ہیں کہ پتہ نہیں اس کے لیے کتنی کتابیں لکھنی پڑیں گی اور اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں قرآن حکیم نے تو اسے ایک آیت کے چار الفاظ میں بتا دیا کہ جسے آپ نظام اسلامی کہتے ہیں حکومت کا نظام کہتے ہیں وہ ہوتا کیا ہے؟ یہاں کہا تھا کہ آؤ تا کہ تم سے پوچھا جائے۔ یہ Accountability (جوابدہی) ہے۔ یہ کیسے ہوا؟ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر قرآن کہتا ہے کہ یاد رکھو! لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ<sup>①</sup> (21:23) دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو Accountability (جوابدہی) سے Above (ماوراء) ہو جائے صرف خدا کی ذات ہے کہ جس سے پوچھا نہیں جاسکتا۔ یہ نظام خداوندی یعنی اسلامی مملکت کی چار لفظوں میں ساری بات ہو گئی۔ اگر آپ کسی نظام میں بھی کہیں رک کر یہ کہہ دیں کہ یہ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) ہو گئی تو اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ جو فیصلے کرتا ہے جو قانون بناتا ہے جو حکم دیتا ہے اس سے نہیں پوچھا جاسکتا۔ یہ چیز غیر اسلامی ہو گئی خلاف اسلام ہو گئی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ (21:23)۔ انسانوں میں کوئی ایسا نہیں ہو سکتا۔ لہذا قرآن حکیم کا کہنا یہ ہے کہ Accountable (جواب دہ) نہ ہونا تو صرف خدا کے لیے ہے: لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (21:23) وہ Accountable (جواب دہ) نہیں ہے۔ یہ جملہ آپ کے ہاں آئین پاکستان میں آیا ہوا تھا کہ Sovereignty belongs to Allah (اقتدارِ مطلق خدا کو حاصل ہے) لیکن خدا کا وہ اقتدارِ مطلق In the Universe (کائنات میں) ہے۔ یہ وہ ہے جو بقول سعدی مکان کی تقسیم میں چھوٹے بھائی کو دے رہا تھا کہ تمہارا حصہ خدا کی دنیا کے اندر چھت سے لے کر آسمان تک ہے۔ کائنات کے اندر جو Sovereignty ہے وہ خدا کی ہے اور ہماری دنیا میں ہماری ہے۔ وہ تو آپ جانتے ہیں کہ صاحب مملکت کو Sovereign (صاحب اقتدارِ اعلیٰ) ہونا چاہیے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ (21:23) اور وَهُمْ يُسْئَلُونَ (21:23) کے متعلق کہا ہے کہ تم جو کچھ کرتے تھے اس وقت ذہن میں یہ تھا کہ ہم اس مقام پر ہیں جو Accountable to none (کسی کے آگے جوابدہ نہیں) ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے قانون بھی ایسا بنا دیا تھا لیکن خود قانون بنادینے سے تو ایسی بات نہیں ہو جاتی۔ اگر یہ کچھ کرنا ہے تو دنیا میں سیکولر نظام ہی ایسا ہوتا ہے۔ سیکولر نظام کے معنی ہی یہ ہیں کہ کوئی ایسا مقام ہوتا ہے جو Accountable to none (کسی کے سامنے جواب دہ نہیں) ہوتا ہے یہ Final authority ہے۔ یہاں اسلامی نظام میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہاں فاعل اتھارٹی ہے یعنی وہ اتھارٹی جو آگے Accountable (جواب دہ) نہیں ہے۔ وہ صرف خدا ہے۔ اور پھر یہ نہیں ہے کہ یہ محض ایک ذہنی یا اعتقادی

① اُس کے اقتدار کا یہ عالم ہے کہ اُس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے اس سلسلہ کائنات کو کیوں ایسا بنایا ہے اور اس کے لیے اس قسم کے قوانین کیوں نافذ کیے ہیں۔ اس کے برعکس اور سب سے پوچھا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے لیے جداگانہ نظام زندگی کیوں وضع کر رکھا ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 731-732)۔



بات ہے کہ ہاں صاحب! ہم نے یہ کہہ دیا کہ وہ خدا ہے بس مان لیا ہم نے کہ جی خدا ہے بس اب اس کے بعد Sovereign state تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہاں تو قرآن نے کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ<sup>①</sup> (5:44)۔ ہماری Sovereignty (اقتدارِ مطلق) وہ ہے جو ہم نے تم کو قانون دیا ہے آئین دیا ہے جس کو اب کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ ہے ہماری Sovereignty (اقتدارِ مطلق)۔

### Accountability (جواب دہی) کا ذریعہ صرف قرآن حکیم ہے

ہمارا وہ آئین جس کے بنانے میں کسی کے آگے Accountable (جواب دہ) نہیں ہیں اب جو اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا اُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5:44) ان کو کافر کہتے ہیں۔ سیکولر اسٹیٹ وہ ہے جہاں کوئی انسان بھی ایسے مقام پر رکھ دیا جائے کہ وہ Accountable to none (کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو) ہو جائے اور ایک Accountability (جواب دہی) وہ ہے جو اللہ کی طرف ہے وہ ذہنی اور اعتقادی نہیں ہے وہ عملاً ہے اس کتاب کے مطابق پوچھا جاسکتا ہے اور یہی چیز تھی جو واقعی قائم کی۔ یہ وہ نظام ہے جو ایک ایک فقرے میں بات بتا دیتا ہے۔ حضرت عمر ♦ (581-44/45AD) سے پوچھا گیا کہ صاحب! یہ جسے آپ استخلاف یا خلافت کہتے ہیں حکومت کہتے ہیں نظامِ اسلامی کہتے ہیں خدا کی حکومت کہتے ہیں اسلام کہتے ہیں یہ کیا ہے؟ جواب یہ تھا کہ ”کہاں سے لیا تھا اور کہاں دیا تھا۔“

### ہر کسی کو خدا کے ہاں یہ جواب دینا ہوگا کہ کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا

عزیزانِ من! حضرت عمر ♦ (581-44/45AD) کا کہنا یہ تھا کہ میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں جا کر اس کا جواب دینا ہے کہ ”کہاں سے لیا تھا اور کہاں دیا تھا۔“ تو میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں اس سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو اتنا سمجھتا ہے وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ دنیاوی حکومت میں اور اس حکومت میں فرق اتنا ہی ہے کہ جہاں صاحب اقتدار کو اس کے ہاں جا کے یہ بتانا پڑے کہ کہاں سے لیا تھا اور کہاں دیا تھا۔ کہا کہ آؤ تم سے پوچھیں کہ تم نے یہ سب کہاں سے حاصل کیا؟ قَالُوا يُوْنُسُ اِنَّا كُنَّا ظَالِمِيْنَ (21:14)۔ یہ اس وقت اقرار کریں گے کہ ہاں صاحب! زیادتی ہوئی ہے دھاندلی ہوئی ہے واقعی ہم نے یہ کچھ کیا تھا۔ وہ یہ اس وقت پکارتے چلے جائیں گے لیکن اس وقت اس پکار کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا تا نکہ وہ قوم واقعی ان چیزوں سے باز نہ آجائے۔ اس انجام کے لیے دو الفاظ ہیں اور وہ یہ کہ اس قوم کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کٹی ہوئی کھیتی کی طرح بجھے ہوئے شعلے کی طرح ہو جاتی ہے۔ وہ

① جو شخص خدا کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے وہ کافر ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 255)۔

دوالفاظ ہیں: حَصِيدًا خُمِدَيْنِ (21:15) ہائے! اس کسان کی محنت کہ وہ فصل پکنے سے پہلے ہی کوئی کاٹ کے لے جائے وہ شعلہ کہ جو راکھ بن کے بجھ جائے اور ہوا اُسے اڑائے پھرے۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر وہ قوم اس طرح سے ہو جاتی ہے۔  
ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 65 تک آگئے۔ عزیزانِ من! 66 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



## بارھواں باب: سورۃ المؤمنون (آیت 66 تا 75)



عزیزانِ من! آج جولائی 1977ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 66 سے ہوتا ہے: (23:66)۔

### دھاندلی اور اس کی نوعیت کا انجام

سابقہ آیات میں آپ کو یاد ہوگا بات یہاں تک چلی آ رہی تھی کہ یہ جو لوگ دھاندلی، ظلم، غصب، مہب و سلب، استتصال اور مظالم کی بنا پر بڑی ہی عیش فراوانیوں کی زندگی بسر کرتے تھے ان سے بار بار کہا جاتا تھا کہ اس روش کا آخری نتیجہ بڑا تباہ کن ہوتا ہے لیکن یہ بات

جیسے کہا جاتا ہے ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کے بعد قرآن نے کہا کہ پھر جب وہ نتیجہ کچے ہوئے پھل کی طرح ٹپکنے پہ آ گیا یعنی ظہور نتائج کا وقت آ گیا تو پھر وہ چلانے، بھاگنے، دوڑنے لگے۔ ان کو پیچھے سے آواز دی کہ اب تم ہمارے قانونِ مکافات سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے، واپس آؤ اور ان محلات کی طرف چلو ان ایوانات کی طرف، جہاں تم نے اپنے لیے یہ سارا سامان اکٹھا کیا تھا، اور چلو تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ کہاں سے لیا تھا۔ اب تمہیں اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔

اب عزیزانِ من! وہاں ان سے یہ کہا جائے گا کہ قَدْ كَانَتْ اٰیَتٰی تَتْلٰی عَلَیْكُمْ (23:66) یہ بات کوئی پہلی دفعہ تم سے نہیں کہی جا رہی جو آج تم کہو کہ پہلے ہمیں اس کا علم نہیں تھا۔ یہ تو بار بار تم سے کہا جاتا تھا اور تم اسے سننا تک گوارا نہیں کرتے تھے کہ غلط تدبیریں کرنے والوں کی یہ تدبیریں آخر الامر انہی پر پلٹ کر آیا کرتی ہیں، تم کسی اور کے ہاتھوں سے محکوم نہیں ہو رہے، یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے بنے ہوئے جال ہیں لیکن تمہاری کیفیت یہ تھی کہ فَكُنْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ تَنْكِبُوْنَ o مُسْتَكْبِرٰیْنَ (23:66-67) تم انتہائی سرکشی اور تکبر سے اٹے پاؤں چل دیتے تھے۔ تم سرکشی ہنسی، ہنس کر چل دیتے تھے: مُسْتَكْبِرٰیْنَ (23:67) نہایت تکبر سے، رعونت سے، انانیت سے، چل دیتے تھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے، تو بہ سَمِرًا تَهْجُرُوْنَ (23:67) پرانے زمانے کی باتیں سن رہا ہے۔ اس طرح سے تم پلٹ جایا کرتے تھے اور پھر بہ سَمِرًا تَهْجُرُوْنَ (23:67) اپنی مجلسوں میں جا کے انہیں خوش گپیوں اور داستانِ سرائیوں کا موضوع بنایا کرتے تھے اور ان کے متعلق ایسا ہنسیاں بکتے تھے جسے کوئی شریف آدمی تک سننا گوارا نہ کرے۔ کیا بات ہے ان دو لفظوں کی! میں نے آپ کو عرض کیا تھا کہ سامری کہتے ہیں افسانہ گو کو داستان گو کو باتیں بنانے والے کو قصے گھڑنے والے اور خوش گپیاں کرنے والے کو۔ یہ ہے ”سمرا“۔ یہ لوگ اپنی مجلس میں بیٹھ کر اس کے متعلق عجیب عجیب قسم کے افسانے گھڑا کرتے تھے، خوش گپیاں اڑایا کرتے تھے، مذاق اڑایا کرتے تھے اور کیفیت یہ تھی کہ شرافت اور نجابت <sup>1</sup> کو بھی بالائے طاق رکھ کر وہ ایسی باتیں کرتے تھے کہ شریف آدمی تمہارے پاس بیٹھنا تک پسند نہ کرے۔ یہ کیفیت تھی تمہاری۔ اور آج تمہاری بزدلی کی کیفیت یہ ہے کہ جب اس غلط روش کے نتائج، عواقب اور تباہیاں سامنے آرہی ہیں تو تمہاری حالت یہ ہے کہ تَهْجُرُوْنَ <sup>2</sup> (23:67) چلا رہے ہو، چیخ رہے ہو، بھاگ رہے ہو۔ اگر اتنا ہی بڑا دم ختم تھا تو پھر ان مصائب کا ان مشکلات کا سامنا کرو۔

#### 1 شرافت، اصالت

2 ابن قتیبہ نے القرطین جلد 2، ص 49 پر ھَجْرُ کے معنی ”ہذیان بکنا“ بھی لکھے ہیں۔ پرویز نے صاحب تاج العروس کے حوالے سے تَهْجُرُوْنَ کے معنی ”بکواس کرنا“ لکھے ہیں۔ (لغات القرآن جلد چہارم، ادارہ طُلوع اسلام لاہور، 1961ء، ص 1753)۔

اب آگے قرآن یہ بتا رہا ہے، عجیب چیزیں سامنے آرہی ہیں، عزیزانِ من! کہ یہ کیا بات ہے کہ ان سے اتنی کھلی ہوئی چیز کہی جا رہی ہے کہ

گندم از گندم بروید جو ز جو

جس قسم کا بوؤ گے اس کا پھل کا ٹٹا پڑے گا تو کیوں بات سمجھ میں نہیں آتی: اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ (23:68) کیا یہ بات ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، کبھی اس پہ کھڑے ہو کر غور و فکر ہی کرنے اور سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ اس پہ غور و فکر نہیں کرتے، تدبیر نہیں کرتے، اسے Lightly (ہلکے پھلکے انداز میں) لیتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ اسے Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتے۔ اس وقت جو سامنے تھے وہ زیادہ تر اہل کتاب تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ اَمْ جَاءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمْ اِلَّا وَلٰئِن (23:68) اے رسول! کیا تو ان سے کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جو بالکل نئی ہے کہ انہوں نے ابھی سنی یا ان کے آباؤ اجداد نے کبھی پہلے یہ سنا ہی نہیں تھا کہ ظلم کا نتیجہ تباہی ہوا کرتا ہے؟ یہ کون سی نئی بات ہے جو تم ان سے کہہ رہے ہو؟ یہ یوں کہا گیا ہے جیسے کوئی شخص حیرت میں ہو کہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ کیفیت ہے! کیا یہ اس چیز پہ کبھی غور نہیں کرتے؟ کیا یہ بالکل نئی چیزیں ہیں جو کہی جا رہی ہیں کہ ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے؟ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ (6:21) ظالم کی کھیتی پروان نہیں چڑھتی۔ کیا یہ باتیں پہلی دفعہ ان کے سامنے آئی ہیں؟ پہلی اقوام میں خود ان کے اسلاف نے ان کے بڑے بوڑھوں نے یہ بات کسی نے نہیں کہی تھی!!!

حضور ﷺ کی چالیس سالہ زندگی بطور شہادت سچائی کا ثبوت تھی

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكَرُوْنَ (23:69) یا کیا یہ رسول ان میں کہیں باہر سے آ گیا ہے اور اس کے متعلق انہیں کچھ پتہ نہیں، اس لیے یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید یہ کوئی فریب کار ہی ہو؟ مگر تمہارے متعلق تو یہ بات نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے انہی میں اپنی پوری زندگی بسر کی، زمانہ قبل از نبوت انہی میں بڑھے، پھلے پھولے پروان چڑھے، نبوت کا دعویٰ کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ اس کی شہادت کیا ہے کہ تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ اس شہادت میں جیسا کہ کئی دفعہ یہ بات سامنے آ چکی ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک ہی چیز پیش کی اور وہ یہ کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمْرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16) میں نے تو تمہارے اندر اپنی پوری عمر بسر کی ہے، میں اپنے متعلق خود اپنی زبان سے کچھ کہنا ہی نہیں چاہتا، تم بتاؤ کہ میری پہلی چالیس سالہ زندگی تمہیں کس نتیجے پہ پہنچاتی ہے۔ اور اس کے بعد نہ تو قرآن میں اور نہ ہی تاریخ میں یہ بات ہے کہ انہوں نے کہیں بھی انگشت نمائی کی ہو، حضور ﷺ کے کسی کیریکٹر پر، سیرت پر، کچھ کہا ہو۔ جس رسول کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے اپنی عمر ان میں بسر کی ہے وہ اپنی پہلی زندگی کو بطور شہادت پیش کر رہا ہے اس کے خلاف

ایک لفظ یہ نہیں کہہ سکتے نہ کہے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جواب کیا دیا گیا؟ عزیزانِ من! یہ بڑی غور سے سننے کی بات ہے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تو ٹھیک ہے، یہ اچھا بھلا تھا مگر اَمَّ يَقُولُونَ بِهٖ جَنَّةٌ (23:70)۔ کیا کیا جائے پاگل ہو گیا ہے اسے جنون ہو گیا ہے، پگلا پن تو ایک رات میں آ جاتا ہے، دورہ پڑ جاتا ہے پہلے بالکل ٹھیک تھا اب ہی کچھ پاگل سا ہو گیا ہے۔ کہا کہ یہ کہہ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ کئی دفعہ یہ چیز آئی ہے: وہ کہتے تھے کہ یہ دیوانہ ہو گیا ہے پاگل ہو گیا ہے۔

### خود ساختہ روایات پر مبنی ہماری سوچ کا معیار

ہمیں افسوس ہے کہ جو ہماری روایات ہیں، وہ ہر قسم کے امکانات کو دوسروں کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے خلاف مستشرقین عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کو..... معاذ اللہ..... مرگی کے دورے پڑتے تھے اور یہ چیز آپ کی روایات پر مبنی ہے، ان میں کیفیت یہ ہے۔ یہ اسے مرگی تو نہیں کہتے، البتہ کہتے یہ ہیں کہ جب آپ ﷺ پر وحی آتی تھی تو آپ کی کچھ کیفیت ایسی ہو جایا کرتی تھی..... معاذ اللہ..... اب وہاں سے تو یہ چیز سامنے آگئی، وہاں سے تو یہ سنڈل جاتی ہے۔

### طبعی طور پر آپ ﷺ کی یہ کیفیت کبھی نہیں تھی

عزیزانِ من! یہ کسی نے نہیں سوچا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ طبعی قانون نہیں ہے کہ جسے وہ دماغ کا پاگل پن کہہ رہے ہیں۔ یہ وہ پاگل پن نہیں ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ پاگل کسے کہتے ہیں؟ آج بھی ہمارے ہاں یہ چیز ہے کہ ”او پاگل ہو گیا اس“ تینوں اپنے نقصان دا وی پتہ نہیں ہیگا۔<sup>1</sup> یہ تھی وہ بات کہ اسے اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں رہا۔ جس قوم قریش کا یہ اتنا بڑا عظیم فرد ہے، یہ اس کے نفع نقصان کا ہی کچھ خیال نہیں کر رہا، بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، پاگلوں جیسی باتیں کر رہا ہے، پاگل ہو گیا ہے، دیوانہ ہو گیا ہے۔ یہ نئی بات نہیں ہے، ہر نبی کے ساتھ یہ ہوتا تھا اور ہر نبی سے یہ کہا جاتا تھا۔ جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے یہ کہا تھا کہ یہ جو تم خدا کی زمین پہ اس طرح سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہو اور ان غریبوں کی بھیڑوں کو پانی تک نہیں پینے دیتے، یہ کیا انسانیت ہے اور کیا شرافت ہے، زمین تو کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی، اس کو کھلا چھوڑ دو۔ وہ کہنے لگے کہ اے صالحؑ! تمہارے ساتھ تو قوم کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ اگر اس گاؤں میں اب پانچ سو ایکڑ زمین ہے تو تم اس کا رقبہ ہزار ایکڑ بنا دو گے۔ آپ تو بڑے سمجھ دار تھے اور تم سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیا کہہ رہے ہو کہ کسی کی ملکیت ہی نہیں ہو سکتی، پاگل ہو گئے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ”پاگل ہو گئے ہو“ کا مطلب کیا ہے؟

1 ارے! تو عقل و ہوش کھو بیٹھا، تجھے اپنے نقصان کا بھی علم نہیں۔

## قرآن فہمی کے لیے محاورہ عرب کا سمجھنا ایک لازمی امر ہے

عزیزانِ من! ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے محاورہ عرب کی ضرورت ہے۔ ہر زبان کا محاورہ سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک ہم بیسیوں دفعہ کہتے ہیں ”پاگل ہو گیا ہے۔“ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے پاگل خانے (Mental Hospital) میں جا کر داخل کراؤ، یا اسے ڈاکٹر صاحب کو دکھاؤ کہ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ دراصل وہ یہ لفظ تو کہتے تھے اور یہ ان کا اپنا پگلا پن تھا۔ انبیائے کرام ؑ کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ یہ جن گھرانوں سے متعلق ہوتے تھے وہ اپنی قوم میں بڑے ممتاز گھرانے ہوتے تھے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ان کے گھرانے کا ہی آدمی یہ کہتا ہے کہ یہ جنہیں تم کمینے اور رذیل سمجھتے ہو، یہ تمہارے جیسے انسان ہیں۔ اگر وہ ان میں سے ہوتا اور یہ بات کہتا تو وہ کہتے کہ ٹھیک ہے، اپنے مفاد کی بات کہہ رہا ہے۔

## وحی کے نزدیک نوع انسانی میں مراتب کا معیار

اگر مانگئے والا فقیر، غریب، بھکاری، تمہارے دروازے پہ آ کر تمہیں سلام کہتا ہے اور جھک کر بھی سلام کہتا ہے تو وہ ٹھیک ہے، لیکن حقیقی طور پر سلام تو اس کا ہے جو سواری پہ چڑھا ہوا ہے اور پیدل چلنے والے کو سلام کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے یہی فرمایا تھا کہ یوں کیا کرو۔ یہ انبیائے کرام بڑے اونچے گھرانے کے لوگ ہوتے تھے۔ حضرت نوح ؑ سے بات شروع ہوتی ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جنہیں تم اپنے معاشرے میں کمین یا کمی کہتے ہو ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں اور اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ یہ جو کمی ہیں اگر ان کی سیرت و کردار اونچی ہے تو وہ تم سے بلند مرتبے کے انسان ہیں۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ تم پاگل ہو گئے ہو کیا بات کہہ رہے ہو۔ یعنی وہ بات تمہارے اور تمہارے خاندان کے تمہارے اپنے قبیلے کے خلاف جاتی ہے پاگل ہو گئے ہو۔ حضرت شعیب ؑ نے جب ان سے یہ بات کہی تھی کہ جو اس قسم کی تجارت تم کر رہے ہو یہ دیکھتی ہے یہ Robery ہے یہ تجارت نہیں ہے، وہ ان سے کہہ رہے ہیں کہ یار! کیا کر رہے ہو اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑی مار رہے ہو اگر ہمیں تمہارے خاندان کا ڈرنہ ہوتا تو ہم تمہیں ختم کر دیتے، تم نے ہماری تجارت کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ اگر تمہارے اہل خاندان کا ڈرنہ ہوتا تو ہم تمہیں ختم کر دیتے۔“ دیکھا کہ اس بات کا انہیں ڈر تھا۔

## دنیاۓ عرب میں نبی اکرم ﷺ کی خاندانی اور معاشرتی حیثیت

عزیزانِ من! نبی اکرم ﷺ تو قریش اور قریش کے بھی ممتاز ترین گھرانے کے فرد تھے۔ محض قریش ہونے کی نسبت سے پہلی چیز کعبے کے متولی ہونا تھا۔ اور ”سائیں گھوڑے شاہ مزاردا متولی مان نہیں ہوندا“ جناب اپنے پنڈ وچ۔“<sup>①</sup> آپ ﷺ تو کعبے کے متولی تھے۔

① جناب! اپنے گاؤں میں تو حضرت گھوڑے شاہ صاحب کے مزار کا متولی بھی کسی سے کم نہیں ہوتا۔

ان لوگوں نے کعبے کو پورے عرب کے اندر بلکہ عرب سے باہر کے علاقے کے لوگوں کے لیے بھی مرکز بنا رکھا تھا۔ وہ تجارت کا مرکز تھا۔ حسب نسب کے اعتبار سے خود عرب کے قبائل میں سے قریش ممتاز ترین گھرانہ تھا اور ان میں سے یہ بنو ہاشم تو بہت ہی اونچے تھے اور پھر ان میں بھی نبی اکرم ﷺ کے گھرانہ کا تو پوچھیے نہیں کہ کیا کیفیت تھی۔ ان کی تجارت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ ساری دنیا کے قافلے لوٹے جاتے تھے مگر ان کے نہیں۔ یہ محض اس لیے تھا کہ یہ کعبے کے مجاوروں کے متولیوں کے قافلے ہیں۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (106:2) سردی گرمی سارا سال ان کے قافلے چلتے رہتے ہیں، کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا، بس ایک نشانی کے طور پر کوئی چیز باندھ دینی پڑتی تھی۔ یہ کیفیت تھی اس قریش کی، اس گھرانے کی، جس کے یہ ممتاز فرد تھے اور پھر یہ فرد بھی ایک گوبریک دانہ تھا۔ چالیس سال تک آپ کی زندگی یہ تھی۔ یہ بڑے بوڑھے اپنے تمام الجھے ہوئے معاملات کے لیے حضور ﷺ سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ یہ مشورہ ہی نہیں تھا بلکہ آپ کو ثالث مقرر کیا کرتے تھے اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھا کرتے تھے۔ یعنی یہ سمجھ دار بھی اتنے تھے اور آپ کے کیریئر کی بھی یہ کیفیت تھی۔ گھرانہ بھی یہ تھا۔ جس کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ وہ حضرت ابراہیم ﷺ جسے اپنے زمانے کے اس وقت کے آج کی اصطلاح میں وزیر اعظم کہہ لیجیے، اس باپ کے بیٹے اور یہ وزارت عظمیٰ وراثت میں آیا کرتی تھی اور وزارت بھی وہ جو مذہب کی حیثیت سے ملی ہوئی ہو، وہ تو بادشاہ سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ اس کے بیٹے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اٹھ کر اپنے ہی باپ سے کہے کہ تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ باقی لوگوں سے سلام لیتے پھر اور ان سے خراج لیتے پھر، تم دوسرے انسانوں جیسے انسان ہو، بادشاہ سے جا کر یہ کہہ دو کہ تمہیں کیا اقتدارات و اختیارات حاصل ہیں، تم باقی انسانوں جیسے ہی ایک انسان ہو، نیچے اترو آؤ۔ عزیزانِ من! کہیے کہ یہ لوگ اس بیٹے کو بھائی کو پاگل نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے!

### نبی اکرم ﷺ کا پیغام اہل عرب کے نام

عزیزانِ من! اب آپ ﷺ کھڑے ہو کر ان قریش سے کہہ رہے ہیں کہ حسب نسب کوئی شے نہیں ہے۔ سب انسان ایک جیسے ہیں اور پھر یہ کعبہ اور اس کی تولیت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ قرآن نے اسے وضع للناس کہا ہے۔ تم اس پر قبضہ کر کے بیٹھ جانے والے اور اس کو ایک کمائی کا ذریعہ بنالینے والے کون ہوتے ہو۔ یہ ایسا کچھ قطعاً غلط ہے۔ تجارت کے قافلے تمہارے ہی کیوں محفوظ ہوں، ساری دنیا کے محفوظ ہونے چاہئیں۔ آپ سوچیے کہ جو شخص انہی میں سے اٹھ کر یہ کچھ کہے وہ بڑی چیز



ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) نے جو نوحہ<sup>۱</sup> ابو جہل کہا ہے وہ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہ جا کر کعبے کا غلاف پکڑ کر بتوں کو مخاطب کر کے کہتا تھا کہ تم میں سے کسی نے اس شخص کو بدو عادی دی ہے جو اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ اس کو سنبھالیے یہ کیا کر رہا ہے۔ اب جس کی یہ کیفیت تھی اس نے یہ کہا تھا کہ میں نے تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے۔ بتاؤ، یہ اس قسم کی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟ اب اس کا جواب تو کوئی نہیں تھا کہ تمہاری پہلی زندگی میں یہ بات ہے۔ جواب یہ تھا کہ وہ تو ٹھیک تھا لیکن اب تم بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو بالکل پاگل ہو گئے ہو۔ یہ باتیں تو پگلے پن کی ہیں۔ ٹھیک ہے پہلی زندگی میں وحی نہیں آئی ہے پہلی زندگی میں خدا کی بات ابھی نہیں آئی، اس لیے اس زندگی میں وہ پگلا پن نظر نہیں آتا۔ کیا کہا ہے اس نے:

۱ ابو جہل غلاف کعبہ تھام تھام کر فریاد کرتا تھا:

سینہ ما از محمد داغ داغ از دم او کعبہ را گل شد چراغ  
ساحرو اندر کلامش ساحری است این دو حرف لا الہ خود کافری است  
تابساط دین آبا در نورد با خدا و ندان ما کرد آنچہ کرد

وہ چلاتا تھا کہ

مذہب او قاطع ملک و نسب از قریش و منکر از فضل عرب  
درنگاہ او یکے بالا و پست با غلام خویش بریک خواں نشست  
اس کے نزدیک یہ سانحہ قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔

قدر احرار عرب نشاختہ با کلفتان حبش در ساختہ  
احرام با اسوداں آمیختند آبروئے دودمانے ریختند

اس لیے وہ حجر اسود کو پکار کر کہتا تھا:

باز گو اسے سنگ اسود باز گو آنچہ دیدم از محمد باز گو

اور کبھی کعبہ کے سب سے بڑے ”خدا“ سے فریاد کرتا تھا:

اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر خانہ خود راز بے کیشاں بگیر  
گلہ شاں را ہرگاں کن سبیل تلخ کن خرمائے ساں را بر نخیل

اور اس نالہ و فریاد اور سب و شتم سے اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرتا تھا۔

خوشی میں ہر بات بن جائے ہے

جو بولے تو دیوانہ کہلائے ہے

”جو بولے تو دیوانہ کہلائے ہے“ تو کیا یہ واقعی اپنے نفع نقصان کا خیال نہیں رکھتے، ان کو خیال ہی نہیں ہوتا، سمجھ ہی نہیں تھی، سوچ ہی نہیں تھی کہ نفع کیا ہے یا نقصان کیا ہے؟ وہ یہی کہہ رہے تھے۔ اس قسم کے فرزانے کے متعلق یہ کہنا کہ اسے نفع نقصان کا خیال نہیں ہے بڑی زیادتی ہے۔ بات کیا تھی؟ نفع اور نقصان کے پیمانے بدل گئے، ان کی Values (اقدار) بدل گئیں۔ ان کا پیمانہ صرف اسی طبعی دنیا کا نفع اور نقصان تھا۔ یہ شخص نفع اور نقصان کو اقدارِ خداوندی کے ترازو میں رکھ کر ناپتا تھا۔ اب ان کے پیمانے کی رو سے ذرا سافرِ یب دینے سے یونہی ایک لاکھ روپیہ آجاتا ہے مگر اس کے پیمانے کی رو سے وہ قطعاً حرام ہے۔ اب اسے تو نقصان ہو گیا جسے یہ کہا کہ یہ کچھ قطعاً حرام ہے یہ جائز نہیں ہے۔ اس کا تو لاکھ روپیہ گیا، نقصان ہوا۔ اس کے نزدیک دنیا کی ہر متاع، قرآن کہتا ہے، ثمنِ قلیل ہوتی ہے۔ یہ جو اقدارِ خداوندی ہیں یہ جو خداوندی Values ہیں یہ پیمانے ہیں۔ اقدار کے معنی ہی پیمانے ہیں۔ ان کو محفوظ رکھنے کے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی متاع کو بھی قربان کر دینا پڑے، تو یہ نفع کا سودا ہوتا ہے۔ یہ بات تھی جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پیمانہ دوسرا آ گیا تھا Exchange Values بدل گئی تھیں، جسے آج کی اصطلاح میں آپ کہتے ہیں۔ ان پیمانوں کی رو سے یہ مال و دولت تو ایک طرف رہی، طبعی زندگی جسے آپ حیات کا سیکولر تصور کہتے ہیں، کی رو سے جان سب سے زیادہ قیمتی تھی اس سے زیادہ تو کوئی قیمتی چیز ہوتی نہیں۔ جان کو بچانے کے لیے تو وہ بہر حال مال کو بھی لٹا دیتے ہیں۔ یہ بڑی عزیز ترین چیز ہوتی ہے اور یہ جو نئے پیمانے آتے ہیں، ان پیمانوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایسا وقت آجاتا ہے جہاں اقدارِ خداوندی یا حق کی حفاظت کے لیے جان جیسی چیز بطیب خاطر دے دی جاتی ہے۔ سچ کہا تھا اس مرد درویش، مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938) نے کہ

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

سود و زیاں کے سلسلہ میں انبیائے کرام کی سوچ کے پیمانے اور ہمارے ہاں کی روایات

دنیا کے اپنے پیمانے ہیں۔ ان پیمانوں کی رو سے جب جان دے دی جائے تو پھر زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر خدا کے پیمانے کی رو سے زندگی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب جان دے دی جاتی ہے اور پھر جان دے کر زندگی حاصل کرنے کا سودا ان کے نزدیک ایسا ہے کہ اس جیسا منفعت بخش سود دنیا میں اور کوئی نہیں۔ کیا کہہ دیا ہے!

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں

اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

جہاں کہیں بھی دنیا کے ترازو اور پیمانے آجائیں، وہاں یہ جو طبعی زندگی کے پیمانے ہیں، ان کے لحاظ سے، اس طبعی زندگی کے سود و زیاں میں سود تو ہوتا ہی نہیں۔ ان کے نزدیک زیاں ہی ہوتا ہے۔ وہ تو اگر کبھی زندگی دے دینے کا اس قسم کا تصور بھی آجاتا ہے تو اسے روکتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کے پیانوں کی رو سے تو یہ ہے کہ بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے۔ ”بھٹک بھٹک“ ان کے خوب انداز ہوتے ہیں!

بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے

مقامِ سود و زیاں آ گیا ہے دیوانے

عزیزانِ من! یہ وہ دیوانگی ہے جس پر ہزاروں فرزانگیاں قربان کی جاسکتی ہیں اور یہ ہوتی ہے انبیائے کرام □ کی صداقت کو بلند کرنے والوں کی وہ دیوانگی جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو ہر چیز نفع کی کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار

یہ بڑے ”بکارِ خویش“ ہوشیار دیوانے ہوتے ہیں۔ صاحب! یہ تھی وہ دیوانگی..... معاذ اللہ..... یہ وہ نہیں جو آپ کی روایتوں نے کہا کہ وحی کے وقت آپ کی کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی تھی جیسے مرگی والے کی..... معاذ اللہ..... ہوتی ہے اور روایات کے اندر یہاں تک بھی ہے کہ مدینے میں وہ ایک یہودیوں کا لڑکا تھا۔ اس پر بھی اس قسم کے دورے پڑا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اسے ہی دیکھنے کے لیے گئے تھے کہ وہ بھی کچھ نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک حضور ﷺ یہ بھی یہی ایک تائیداً کیفیت تھی۔ کیا بتائیں کیا کچھ ہے ان کتابوں کے اندر!!! وہ عالم الناس ہستی کہ جس پہ علم کی بلندیاں ختم ہو جائیں اس کی کیفیت یہ ہے!! یا للعجب!!!

بہر حال بات ہو رہی تھی کہ اُمُّ یَقُولُونَ بِهٖ جَنَّةٌ (23:70) کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ اسے جنون ہو گیا ہے؟ نہیں قطعاً نہیں۔ کہا یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ بَلْ جَاءَهُمُ بِالْحَقِّ (23:70) یہ نبی ان کے پاس افسانے لے کر نہیں آیا حقیقتیں لے کر آیا ہے Reality (حقیقت) کا Face (سامنا) کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے عزیزانِ من! انسان خود فریبی میں رہنا چاہتا ہے۔ اس میں بڑا لطف ہوتا ہے۔ حق یا Reality (حقیقت) کا سامنا کرنا واقعی مشکل ہے۔ کہا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ رسول ان کے سامنے حق لے کر آیا ہے وَ أَكْثَرُهُمْ لِّلْحَقِّ كَرْهُونَ (23:70) اور یہ بات ان کے اوپر بڑی ناگوار گزرتی ہے۔ یعنی اس حقیقت کو اس زمانے میں سامنے رکھنا کہ تمام انسان یکساں واجب الاحترام ہیں بڑی مشکل ہے۔ وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور

چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ ان کے جذبات و مفاد کی رعایت سے اس میں کچھ تبدیلی کر دیں اور پھر ان سے مفاہمت کر لیں۔

ہم نے آج بھی سید اور جولاہے میں امتیاز روار کھے ہوئے ہیں

میں نے ”قریش“ اور ”ہاشمی“ کہا ہے اسے تو چھوڑ دیجیے۔ آج کے اس دور میں بھی آپ کسی سید سے کہہ کر دیکھیے کہ تو اور جولاہا ایک جیسے ہیں تو وہ کس بری طرح آپ کے گلے پڑتا ہے حالانکہ آج یہ تصورات بہت کچھ بدل گئے ہیں لیکن اس دور میں بھی یہ کیفیت ہے۔ میرے پاس استفسارات آتے ہیں کہ کیا ایک سید زادی لڑکی کی شادی غیر سید زادے سے جائز ہے۔ یعنی غیر سید زادہ وہ کوئی موچی ہو جولاہا ہو..... معاذ اللہ..... میں ان کی زبان میں کہہ رہا ہوں خواہ وہ پٹھان راجپوت ہی کیوں نہ ہو سید زادی سے شادی نہیں کر سکتا۔ غیر سید زادے سے سید زادی کی شادی آج بھی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ہاں اس دور میں آج بھی یہ تصور ہے۔ آپ پوچھیے نہیں کہ اس حق کو تسلیم کرنا کتنا مشکل ہے کہ ہر شخص یکساں واجب الاحترام ہے۔ یہ سیرت و کردار کے اعتبار سے اس سید زادی سے کتنا زیادہ اچھا بھی کیوں نہ ہو اس کی شادی آج بھی کسی سید زادی سے محال ہے۔ بردار ان عزیز! یہ ہے وہ حق جس کا ہم سامنا (Face) نہیں کرنا چاہتے اور اپنے آپ کو فریب میں رکھے ہوئے ہیں۔ قرآن نے اس سلسلہ میں ایک ہی بات کہہ دی ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہ حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جائے اور یہ بھی کہے کہ نہیں صاحب! سید سید ہوتا ہے جولاہا جولاہا ہوتا ہے دونوں برابر نہیں ہوتے۔ قرآن نے انہیں ایک لفظ کہہ دیا کہ سید اور جولاہا ہونا تو صرف پیشہ ہے۔ وَلَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَ الْأَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ (23:71) اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع چلنے لگ جائے تو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی شے اپنے مقام پر نہ رہے ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے اور نظام کائنات تہ و بالا ہو جائے۔ اگر سورج کسی گراں خواب کے تابع ہو جائے جو صبح اٹھنا نہیں چاہتا تو سوچے تو سہی کہ اس سحر خیز کا کیا ہوگا اور پھر اگر سورج نے گراں خواب کی بات ماننی ہو جو اکثریت (Majority) میں ہوں تو پھر تو وہ جمہوریت کے تابع ہی چلے گا۔ یہاں قرآن نے اس چیز کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ کہا کہ وَ أَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَرِهُونَ (23:70) یہ رسول ان کے سامنے حق پیش کرتا ہے اس لیے یہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں اگر اکثریت (Majority) ان کے خیالات کا اتباع کرنے لگ جائے تو پھر بات جمہوریت میں سیکولر نظام کی آگئی جہاں انسانوں کے فیصلے حق بن جاتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ بہترین نظام تو یہی آپ نے کہا ہے کہ جہاں اکیاون (51) فی صد کا کوئی فیصلہ ہو جائے وہ الحق ہو جاتا ہے تو اس طرح حق اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ ہم سے نہیں آج پوری دنیا سے پوچھیے۔ وہ یہی ہے کہ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَ الْأَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ (23:71) پھر کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی شے اپنے مقام پر نہ رہے۔ ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے اور نظام

کائنات تہہ وبالا ہو جائے۔

## خارجی کائنات میں قانون سازی کی اہمیت کا حاصل

عزیزانِ من! کائنات کے متعلق اب مغرب کے یہ سارے سائنٹسٹ، علی وجہ البصیرت، اپنی تحقیقات کی رو سے اس نتیجے پہ پہنچ گئے ہیں کہ اس کائنات کی متناہیت ذہن انسانی کے اندر آ ہی نہیں سکتی۔ اس کا عالم یہ ہے کہ وہ جو حق پر مبنی قانونِ خداوندی ہے اگر اس میں ایک سیکنڈ کے کروڑ ویں حصے کے برابر بھی ذرا سی بغاوت ہو جائے تو اس کے متعلق جیمز جینز<sup>1</sup> سے پوچھیے، وہ کہتا ہے کہ اس اتنے سے تفاوت سے اس قدر ٹکراؤ ہو جائے کہ ایک ثانیے میں ان تمام کڑوں کے اندر کائنات ختم ہو جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ کائنات کے متعلق قوانین تک تو پہنچ گئے انسانی دنیا میں دیئے گئے قوانین تک نہ پہنچ سکے۔

## انسانی سوچ کی متضاد کیفیات کا نتیجہ

مغرب کے سائنسدانوں کے نزدیک کائنات کے متعلق قوانین اور انسانیت کے متعلق قوانین میں بس فرق صرف اتنا ہی ہے کہ دنیا کے انسانیت کے متعلق بھی یہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ یہاں بھی حق پر مبنی کوئی قانون کا فرما ہونا چاہیے اور اگر حق پر مبنی قانون نہیں ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے قانون کی اطاعت ہوتی ہے تو یہاں بھی فساد برپا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ سارا فرق اتنا ہی کیا جاتا ہے کہ جسے آپ سیکولر نظام کہتے ہیں اس میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین چلتے ہیں اور خارجی کائنات میں خدا کے۔ انہوں نے یہ ثنویت (Dualism) قائم کر رکھی ہے۔ دینِ خداوندی یا نظامِ خداوندی اس کا کچھ بھی نام رکھ لیجیے، اور سیکولر نظام میں فرق اتنا ہی ہے کہ یہ جتنے بھی مغرب کے سائنٹسٹ نہیں بلکہ سیکولر نظام والے بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ جو آپ کے ہاں پہلی شق آئی تھی کہ Sovereignty in the entire Universe belongs to God (خارجی کائنات میں جو اقتدار مطلق ہے وہ خدا کا ہے) تو وہ خارجی کائنات میں اس کے قائل ہیں البتہ دنیا میں ان تھوڑے سے دہریوں کو چھوڑ دیجیے جو آج نمایاں طور پہ کہتے ہیں کہ خدا کی ہستی نہیں ہے باقی سب مانتے ہیں کہ خارجی کائنات کے اندر قوانینِ خداوندی جاری و ساری ہیں۔ یہ انہیں قوانینِ فطرت کہہ دیتے ہیں۔ یہ سائنسدان اور دہریے دونوں اس پہ متفق ہیں کہ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نہیں ہیں۔ اس پہ دنیا کا ہر شخص متفق ہے کہ خارجی کائنات میں ایسے قوانین ہیں جو کسی دوسرے کی خواہشات کا اتباع تو ایک طرف، اپنی بھی کسی خواہش یا خیال کا اتباع نہیں کرتے، وہ ان قوانین کے تابع چلنے پر مجبور ہیں لیکن وہی جب انسانی دنیا کی طرف آتے ہیں تو وہاں ان کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔

1 Sir James Jeans کی کتاب The Mysterious Universe بڑی ہی پرازمفید معلومات پر مبنی ہے۔

ہم ذرا آگے بڑھ آئے تھے پھر میں دوبارہ ان آیات پہ آتا ہوں بلکہ اسی سورۃ المؤمنون میں ذرا آگے چلیے۔ کہا کہ قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (23:84) کہو کہ تمہارا علم تمہیں کیا بات کہتا ہے کہ اس کائنات کے اندر کس کا قانون چل رہا ہے، کس کا اقتدار ہے؟ کہا کہ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ (23:85) یہ تسلیم کریں گے کہ یہ خدا کا ہے۔ یہ انہیں مخاطب کیے جا رہا ہے جو اسلام سے حضور ﷺ کے پیش کردہ دین سے قرآن سے وحی سے انکار کر رہے تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کو مانتے ہیں۔ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (23:86) تو پوچھو ان سے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں انتہا درجے تک ان کی ربوبیت کس کے قانون کی رو سے ہوتی ہے؟ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ (23:87) یہ اعتراف کریں گے کہ یہ بھی اللہ کے قانون سے ہوتی ہے۔ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (23:88) کہا کہ بتاؤ علم کی بارگاہ سے پوچھ کے کہ کائنات کا اقتدار مطلق کس کے ہاتھ میں ہے، کون ہے کہ جس کے قانون کی رو سے ہر ایک کو پناہ ملتی ہے، حفاظت ملتی ہے اور اس کے خلاف چلنے سے کسی کو پناہ نہیں مل سکتی؟ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ (23:89) یہ کہیں گے کہ یہاں خدا کا قانون ہے۔ کہا کہ قُلْ فَأَنِّي تُسْحَرُونَ (23:89) اب ان سے پوچھو کہ جب ہم تمہیں پھر انسانی دنیا کی طرف لاتے ہیں تو یہاں آ کر تمہیں کیوں موت پڑ جاتی ہے، کیا چیز ہے جو تمہیں دھوکا دے دیتی ہے کہ یہاں تم نے یہ تقسیم کی ہوئی ہے کہ کائنات تک تو اس کا اقتدار چلتا ہے اور اس سے ذرا نیچے تم اپنی دنیا کی طرف آتے ہو تو یہاں انسانوں کو صاحب اقتدار مانتے ہو۔ فَأَنِّي تُسْحَرُونَ (23:89) وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے تمہیں دھوکا لگتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق نہیں ہے، خدا کے جو قوانین میں تمہیں دیتا ہوں وہ تم انسانی دنیا میں نہیں مانتے۔ انسانی دنیا میں اپنے قوانین بناتے ہو۔

### دنیاۓ مذاہب سراپا تو اہم پرستیوں کا کھیل ہے

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ بات بڑی صاف سی ہے۔ تم اس کائنات کو دو ٹکڑوں میں بانٹ رہے ہو؟ عزیزانِ من! یاد رکھو یہ ایک ایسا نکتہ تھا جو اہل مذاہب کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ مذاہب والوں کے نزدیک نہ باہر کی کائنات میں خدا ہوتا ہے نہ ان کی یعنی انسانوں کی زندگی میں خدا ہوتا ہے۔ وہاں باہر کی کائنات میں تو اہم پرستیاں ہوتی ہیں اور یہاں انسانوں کی زندگی میں انسان پرستیاں ہوتی ہیں۔ آپ غور کیجیے گا کہ قرآن کو یہ کہنے کی کیوں ضرورت پڑی کہ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌُ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌُ<sup>①</sup> (43:84)۔ غور

① خدا کا قانون خارجی کائنات (السماء) میں بھی کارفرما ہے اور خود انسانی دنیا (الارض) میں بھی۔ ساری کائنات کی زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1155)۔

کیجیے گا کہ اس قدر نکھار کر کہنے کی ضرورت کیوں پڑی کہ یاد رکھو! خارجی کائنات میں بھی وہی اللہ ہے اور تمہاری اپنی انسانی زندگی کے اندر بھی وہی اللہ ہے۔ گویا انہوں نے دو زندگیوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ پہلی زندگی جو خارجی کائنات کی ہے اس میں تو خدا خود کہہ رہا ہے کہ یہ اللہ کو مانتے ہیں اللہ کا تصور تھا، ان کے ہاں نام بھی اللہ ہی تھا، خود نبی اکرم ﷺ کے والد ماجد کا نام عبد اللہ تھا۔ وہ کیا بات تھی کہ اس کے باوجود ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ پر ایمان لاؤ یعنی وہ جو اللہ کو مانتے ہیں، ان سے یہ کہنا کہ اللہ پر ایمان لاؤ تو اس کے کیا معنی ہیں؟ کہا یہ کہ تم ”الہ فی السماء“ کو تو مانتے ہو یعنی خدا کو تو مانتے ہو جس کا خارجی کائنات میں اقتدار ہے اور وہ اس کے قوانین کے تابع چلتی ہے مگر ”الہ فی الارض“ کو نہیں مانتے۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہوئے کہ انسانوں کی زندگی کے اندر انسانوں کی دنیا کے اندر قوانین خداوندی کی حکمرانی ہو جیسی خارجی کائنات میں ہے۔

### سوال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات کے اقرار اور انکار میں آخر فرق کیا ہے؟

میں نے پچھلے جمعہ <sup>①</sup> درس میں کہا تھا کہ یہ جملہ جو ہمارے ہاں ہے کہ ”جی میں خدا کو مانتا ہوں“ اس پر نہ کبھی کسی نے کھڑے ہو کر سوچا ہے نہ پوچھا ہے کہ ”مانتا ہوں“ کے معنی کیا ہوئے؟ یعنی یہ مانتے ہو کہ خدا ہے۔ بالفرض اگر تم کہتے ہو کہ خدا نہیں ہے اور اس کے برعکس ساری کائنات ساری دنیا یہ کہہ دے کہ خدا نہیں ہے تو اس سے بگڑتا کیا ہے؟ اور اگر تم نے کہہ دیا کہ خدا ہے اور ساری دنیا کہہ دے کہ خدا ہے تو پھر بنتا کیا ہے؟ اس کو ماننے کے معنی کیا ہیں؟ خدا کی ذات کے اقرار اور انکار سے آخر زندگی میں فرق کیا پڑتا ہے؟ یہ بڑا ہی اہم نکتہ ہے کہ ایمان باللہ کا حقیقی تصور کیا ہے اور اس کے مضمرات (Implications) کیا ہیں؟

### ایمان باللہ کا حقیقی تصور اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! صرف یہ کہنا کہ ”میں خدا کو مانتا ہوں“ اور جو اپنے بچوں کے نام عبد اللہ رکھتے تھے تو کیا وہ خدا کو نہیں مانتے تھے؟ اہل کتاب کے متعلق تو پوچھیے ہی نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ یہ تو خدا کو رسولوں کو وحی کو آخرت کو سب کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود قرآن کہتا تھا کہ نہیں، تم ایمان لاؤ جیسے اے جماعتِ مومنین! تم ایمان لاؤ ہو۔ لہذا اگر یہ اس طرح ایمان لائیں تو پھر یہ ہدایت پہ ہوں گے۔ یہ ایمان باللہ کیا تھا؟ یہ اسے اللہ فی الارض ماننا ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے۔ انہیں تو آپ چھوڑ دیجیے جنہیں آپ غیر مسلم کہتے ہیں، کافر کہتے ہیں، مشرک کہتے ہیں۔ مومن تو خیر آج ایک فرقہ کا نام ہو گیا۔ جسے مسلمان کہتے ہیں، مسلم کہتے ہیں، جس کا ایمان اللہ فی الارض ہے، وہ ایمان کہاں ہے؟ آج آپ کے ہاں کی ساری مسلم ورلڈ (دنیا) انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہی کے تابع زندگی بسر کر رہی ہے۔

① یعنی جولائی 1977ء کی 15 تاریخ۔

در اصل یہ سماء میں الگ خدا اور ارض میں الگ خدا والی چیز تھی جس سے خدا نے انہیں منع کیا تھا۔ برادرانِ عزیز! اب اس سے یہ واضح ہو گیا کہ جب ہم کہیں گے کہ میں خدا کو مانتا ہوں تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَنْ عِنْدَهُ (21:19) سماء و الارض اور ان کے درمیان جو کچھ ہے سب کے سب اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سراپا سرگرم عمل ہیں۔ یہاں براہِ راست اس کا قانون چلتا ہے اور یہ مَنْ عِنْدَهُ (21:19) بڑی عجیب ترکیب (Phrase) ہے۔ یعنی وہ جو السماء اور الارض کے درمیان ہے۔ وہاں کیفیت یہ ہے کہ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ (21:19) وہ اس کے قوانین کی اطاعت اور محکومیت سے کبھی سرکشی نہیں برتتے بلکہ یوں کہیں کہ سرکشی برتنا تو ایک طرف، ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ رات دن گردش میں ہیں سات آسمان۔<sup>①</sup> اور پھر قرآن کہتا ہے کہ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ (21:19) وہ کبھی تھکتے نہیں ہیں۔ کبھی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ ”دو گھڑیاں آرام وی کر لین دیو۔“<sup>②</sup> وہ تو اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے تھکتے ہی نہیں ہیں۔ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (21:20) وہ سب دن اور رات اس کے قوانین کی اطاعت کے لیے مصروف رہتے ہیں۔ کہا کہ اب انسانوں سے پوچھو کہ اَمْ اتَّخَذُوا اِلٰهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُونَ (21:21) انہوں نے اپنی زمینی دنیا کے اندر اور خدا بنار کھے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ ہیں وہ خدا جو ہمارے لیے سامانِ زیست یعنی ہمارے بڑھنے، پھولنے کا سامان رکھتے ہیں۔ انہوں نے ارض میں اپنے لیے اور خدا بنار کھے ہیں۔

عزیزانِ من! مسلمان قرآن کی ان آیات کے ان الفاظ پہ کبھی غور ہی نہیں کرتا کہ وہ کائنات کے اندر خدا کو تو مانتے ہیں لیکن ارض کے اندر انہوں نے اپنے لیے اور خدا بنار کھے ہیں اور بناوہ رکھے ہیں جو هُمْ يُنْشِرُونَ (21:21) ہیں۔ یعنی جن کے سہارے ہم بڑھتے، پھولتے پھلتے پھیلتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے ارض کی دنیا میں، یعنی اپنی انسانی زندگی کے اندر اور خدا بنار کھا ہے بالفاظِ دیگر آسمانوں کا خدا اور ہے اور زمین کا خدا اور۔ آسمانوں میں خدا کی بادشاہت اور زمین پر انسانوں کی۔ یہ ان کی بڑی بھول ہے۔ کہا کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اِلٰهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا<sup>③</sup> (21:22) یاد رکھو! جب اس طرح تم نے دو خدا بنا لیے کہ کائنات کا خدا اور ہے اور تمہاری تمدنی

① رات دن گردش میں ہیں سات آسمان ہور ہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا (غالب)

② پل بھر آرام بھی کر لینے دیں۔

③ اگر کائنات میں خدا کے علاوہ اور الہ بھی ہوں یعنی اس کے ایک گوشے (Aspect) میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے تو

کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے (پرویز: مفہوم القرآن ص 731)۔



زندگی کا خدا دوسرا یعنی ارض کا خدا اور ہے تو اس تصور سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات میں کچھ بگڑے گا نہیں کیونکہ وہاں خارجی کائنات میں تو کوئی ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا اس لیے کہا کہ یہاں اپنی انسانی دنیا میں جب تم نے دوسروں کو معبود بنالیا تو اس کے بعد پھر تمہاری زندگی کے اندر اتنا فساد برپا ہوگا کہ تم سنبھال نہ سکو گے۔

### قرآن حکیم کا قابل غور و فکر پیغام

عزیزانِ من! سوچئے کہ قرآن کا پیغام کیا تھا؟ اسلام کسے کہتے ہیں؟ دین الحق کیا ہوتا ہے؟ نظام خداوندی کسے کہتے ہیں؟ قرآنی تعلیمات کی رو سے انسانی دنیا کے اندر خدا کے قوانین کی حکمرانی کا نام ”اللہ پر ایمان لانا ہے“ اسی کا نام اسلام ہے، یہی دین اللہ ہے۔ اب پھر ہم درس کی اس آیت پہ آ جاتے ہیں جس میں کہا ہے کہ **بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ أَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كِرْهُونَ ۝ وَلَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمُوتُ وَ الْأَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ (23:70-71)** حق آ گیا ہے اور یہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع چلنے لگ جائے تو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کوئی شے اپنے مقام پر نہ رہے، ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ اس طرح سیدھی سی بات ہے کہ اگر حق لوگوں کی خواہشات، مفادات، آرزوؤں اور خیالات کے تابع ہو جائے تو پھر یقینی طور پر کائنات کے اندر فساد ہی فساد برپا ہو جائے اور نظام کائنات تہہ وبالا ہو جائے۔

### قرآن حکیم کے نزدیک پاگل کون ہے؟

بات شروع سے یہ چلی آرہی تھی کہ کیا یہ تمہیں پہنچانتے نہیں ہیں؟ کیا تو ان سے کچھ انوکھی باتیں کر رہا ہے جو یہ تمہیں پاگل کہہ رہے ہیں۔ کہا کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ پاگل کون ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ کہا کہ **بَلْ آتَيْنَهُمْ بَذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ (23:71)**۔ انہیں کون بتائے کہ ہم انہیں وہ کچھ کہہ رہے جو انہیں ان ذلتوں سے اور خوار یوں سے نکال کر شرفِ انسانیت<sup>❶</sup> کی بلندیوں پر لے جائے گا اور یہ ہیں کہ اس سے اعراض برت رہے ہیں، اس سے منہ موڑ کر جا رہے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ کیا پاگل میں ہوں؟ یہاں کہا ہے کہ **بَلْ آتَيْنَهُمْ بَذِكْرِهِمْ (23:71)**۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کو محاورہ عرب سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ذکر کے معنی شرف اور بلندی ہوتا ہے۔ یہاں **بَذِكْرِهِمْ (23:71)** کے معنی ان کا شرف اور ان کی بلندی ہے۔ قرآن کریم ان کے شرف اور بلندیوں کی باتیں کر رہا ہے۔

❶ ”ذکر“ شرف و عزت، موعظت بڑائی اور عظمت، شرف و مجد اور سرفرازی و سر بلندی کو بھی کہتے ہیں (تاج العروس)۔

عزیزانِ من! انسان کو انسان کی محکومیت سے بچانا اس کے لیے سب سے بڑا شرف اور سب سے بڑی تکریم کا باعث ہے جب کہ انسان کے سامنے جھک جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ من تیرا نہ تن <sup>①</sup>۔ کہا کہ میں تو تمہیں پہ پیغام دے رہا ہوں کہ کسی انسان کے سامنے نہ جھکو اور تم ہو کہ یہی بات مجھے کہہ رہے ہو کہ یہ پاگل پن کی بات ہے۔ تنہی بتاؤ کہ یہ پاگل پن کی بات ہے یا تمہارے نفع کی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ یہ تو قرآن نے کئی بار دہرایا ہے کہ قرآن کے اندر خود تمہارا اپنا ذکر ہے۔ <sup>②</sup> ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ ”ذکر“ کے معنی شرف اور بلندی کے ہیں اور میں پھر یہ عرض کر دوں کہ انسان کے لیے اس سے بڑا شرف، عزت اور بلندی کا مقام اور کیا ہوگا کہ قرآن نے کہا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا، خواہ خدا اس کو ضابطہ قوانین حکومت اور نبوت بھی عطا کرے کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ خدا سے ورے تم میرے سامنے جھکو۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ اگر انسانوں کی دنیا میں یہ قانون خداوندی نافذ ہو جائے تو سوچیے عزیزانِ من! شرف اور مجدی کن بلندیوں پہ انسان پہنچ جائے۔

انسانیت کی دنیا میں سب سے بڑا ظلم تکریم انسانیت کا نہ ہونا ہے

مجھ سے پوچھیے کہ جسے آپ ظلم اور استبداد کہتے ہیں وہ کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ Physical (طبعی) طور پر بھی ظلم اور استبداد ہے لیکن سب سے بڑا ظلم اور استبداد یہ ہے کہ کسی کی بھی تکریم انسانیت باقی نہ رہے انسان ہونے کی حیثیت سے جو واجب العزت ہے وہ تکریم چھین لی جائے کسی فرد کو ذلیل کر دیا جائے اور یہ صرف اسی صورت میں ہی ہے جب انسانی دنیا کے اندر خدا کا یہ قانون کارفرما ہو کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (17:70) ہر انسانی بچہ محض انسانی بننے کی وجہ سے یکساں واجب التکریم ہے۔ یہ اتنا اہم قانون ہے کہ کسی جہت سے بھی اگر کسی فرد انسانیت کی دوسرے کے ہاتھوں سے تذلیل ہو جائے تو عزیزانِ من! اس سے بڑا جرم بارگاہ خداوندی میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔

① پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن (اقبال: بال جبریل)

② لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ (21:10) ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطہ قوانین نازل کیا ہے۔ اس میں خود تمہارے شرف اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص-729)۔

## قوانین خداوندی سے بے اعتنائی کا نتیجہ

قرآن تو آیا ہی تکریم انسانیت کو قائم (Establish) کرنے کے لیے تھا۔ اس کا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے، کہا کہ **وَآتِلْ عَلَيْهِم نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا** <sup>①</sup> (7:175) انہیں اس شخص کی بات سناؤ اور بات عزیزانِ من! اس شخص کی نہیں ہے بات ہماری ہے جو سنائی جا رہی ہے۔ قرآن کا انداز بھی عجیب ہے، نام لے کر ہم سے بھی نہیں کہتا کہ اس سے بھی کچھ ان کے جذبات کو ٹھیس لگ جائے گی۔ کیا عجیب پیارا انداز ہے! لہذا کہا کہ انہیں اس شخص کی بات سناؤ جسے ہم نے اپنے قوانین دیئے۔ پھر کیا ہوا؟ اس کے لیے کیا لفظ ہے: **فَانْسَلَخْ مِنْهَا** (7:175) وہ انہیں پیچھے چھوڑ کر کچھ یوں نکل گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے کہ اس کے اوپر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ کیا تشبیہ ہے قرآن کی! جب وہ کینچلی تھی تو وہ محیط تھی کیونکہ وہ سانپ کے اوپر پوری طرح اسے Cover (ڈھانپے) کیے ہوئی ہوتی ہے اور جب سانپ اس میں سے نکلتا ہے تو اس کے اوپر اس کا کسی قسم کا کوئی نقش تک باقی نہیں رہتا۔ قرآن کہتا ہے کہ انہیں اس قوم کی کہانی سناؤ کہ جسے ہم نے اپنے قوانین دیئے تو وہ انہیں پیچھے چھوڑ کر یوں نکل گئی جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے۔ اس کینچلی کے اندر یہ قوم بہت محفوظ تھی۔ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ **فَاتَّبَعَهُ الشَّيْطَانُ** (7:175) تو ان کے پست جذبات ان کے پیچھے لگ گئے، انہوں نے اس کو بہکانا شروع کر دیا اور اگلی بات یہ کہی کہ انہیں بتاؤ کہ **وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا** (7:176) ہم تو چاہتے تھے کہ اس کتاب کے ذریعے اسے آسمان کی بلندیوں تک لے جائیں **وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ** (7:176) لیکن یہ کم بخت زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ کہا کہ اتنی کھلی ہوئی بات تھی اور ہے لیکن پھر بھی یہ ایسی بلندیوں سے اتنی پستیوں کے اوپر کیوں آیا؟ کیا ہوا؟ اس کے لیے جواب دیا کہ **وَاتَّبَعَهُ هُوَ** (7:176) اس نے اپنی مفاد پرستیوں کو خدا بنا لیا۔ <sup>②</sup> سارا مسئلہ یہ تھا۔ **ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا** (7:176)۔ کتنی بری مثال ہے اس قوم کی کہ جس نے یوں ہمارے قوانین کی تکذیب کی! ہمارا کیا بگڑا! کسی کا

① ہم اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اے رسول! تم اپنی جماعت (مومنین) کے سامنے پیش کرو اور ان سے کہو کہ اسے دل کے کانوں سے سن لیں۔ ایک شخص کو خدا نے اپنے احکام و قوانین دیئے (وہ ان پر کاربند ہوا تو اُسے خوش حالی اور عروج نصیب ہو گیا۔) (پرویز: مفہوم القرآن ص 384)۔

② اس کی زندگی کا سارا مقصد دنیاوی مفاد کا حصول رہ گیا۔ قرآن کریم نے اس کی یہ مثال دی ہے کہ **فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَنْبِ ۚ إِنَّ تَحْمِيلَ عَلَيْهِ يَلْهَثُ أَوْ تَتْرُكُهُ يَلْهَثُ** <sup>ط</sup> (7:176) اب اس کی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ اُسے دوڑاؤ اور اکساؤ تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور اگر ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ (یعنی پھر انسان کی ہوس کی تسکین ہی نہیں ہوتی خواہ وہ کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو اُسے اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا۔) **ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ** (7:176) یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی **الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا** (7:176) جو ہمارے قانونِ ربوبیت کو جھٹلاتی ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 384)۔

کیا بگڑا! اَنْفُسُهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ (7:177) انہوں نے اپنے آپ پہ ظلم کیا نہ کہ ہم پہ ظلم۔ وہ جو پہلے کہا تھا کہ انہیں اس قوم کی بات سناؤ، تو کہا کہ ان کو کہو کہ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (7:176) ذرا غور و فکر سے کام لو اور دیکھو کہ شاید یہ بات یوں سمجھ جائیں۔ ارے دل! یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے۔<sup>❶</sup> ان کو کہو بات ہم نے سنائی ہے، غور و فکر تم کرو۔

### قرآن حکیم کی تعلیم کا عطا کردہ مقام بلند

قرآن انسان کو بڑی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے لیکن یہ خود ہی زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ یہیں سے ہم پھر زیر درس آیت کی طرف آتے ہیں جہاں کہا گیا کہ بَلْ أَتَيْنَهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ (23:71) ہم انہیں ان کے شرف اور بلندیوں کی طرف بلا رہے ہیں اور یہ دیکھ تو سہی یہ اس سے بھاگ کر پستیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ پاگل کون ہے۔ اے رسول! کیا یہ بات ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَجُ رِبِّكَ خَيْرٌ (23:72) تو ان سے کچھ مال و دولت چاہتا ہے؟ یا کوئی ایسی چیز ہے کہ تم ان سے کوئی ٹیکس مانگتے ہو، کوئی بیگار کے پیسے اکٹھے کرنا چاہتے ہو؟ عجیب بات ہے!!

### نبی کے مدعا میں ”خَرْج“ کی کیفیت نہیں ہوتی

عربی زبان میں ”خَرْج“ وہ ہے جو دوسروں سے ٹیکس وصول کیا جائے اور خراج وہ ہوتا ہے جو دوسرا از خود کسی کو دے۔ یہاں کہا ہے کہ ان سے کہو کہ میں تم سے ”خَرْج“ نہیں مانگ رہا، کوئی ٹیکس نہیں مانگ رہا، زبردستی تم سے کچھ رقم نہیں مانگ رہا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ یہ دل بے مدعا ہے۔ یہ چیز تو ناممکنات میں سے ہے کیونکہ یہ تو ایک شاعری ہوگی جو تصوف نے گھڑ لی ہے۔ اگر یہ دل ہی بے مدعا ہو جائے تو وہ تو موت ہوتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ میرا مدعا اس میں نہیں ہے: فَخَرَجُ رِبِّكَ خَيْرٌ (23:72) مجھے خدا دیتا ہے میں ان سے زبردستی نہیں لیتا، مجھے دینے والا دیتا ہے اور بہت دیتا ہے۔ ”خیر“ کے سلسلہ میں میں نے کہا تھا کہ اختیار اور خیر کا ایک ہی مادہ (خ ی ر) ہے۔ پوچھو نہیں ان سے لو تو خیرات ہو جائے۔ یہ خیر تو ہمارے ہاں آ کر خیرات ہو گئی۔ برادران عزیز! خیرات سے زیادہ تذلیل انسانیت کسی کی نہیں ہو سکتی۔

### خیرات کے سلسلہ میں ایک حدیث مبارک

وہ بڑی صحیح بات کہی ہے۔ یہ بات کسی Psychologist (ماہر نفسیات) نے نہیں کی بلکہ یہ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ

❶ یہ خود ہماری یعنی مسلمانوں کی داستان ہے جسے قرآن کریم فرقان حمید نے اس انداز میں بیان کیا ہے۔

خیرات سے لوگوں کے دل شاید پتھر یا مردہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے دینے والے کے دل کے اندر تکبر پیدا ہو جاتا ہے، لینے والا ذلت محسوس کرتا ہے۔“ خدا نے ”خیر“ کہا تھا، خیرات نہیں کہا۔ وہ تو ہم ہیں جو اس خیر کو خیرات میں لے آئے۔ وہ تو کہتا ہے کہ جو کسی انسان سے کچھ لیتے ہو تو تمہارے اختیارات سمٹ کے سکڑ جاتے ہیں، ہم سے لیتے ہو تو ان میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ پھر تم کسی انسان کے دروازے کے محتاج نہیں رہتے: **وَهُوَ خَيْرُ الرَّزَاقِينَ** (23:72) اس آیت میں رازقین کہا ہے۔ قرآن کریم میں کئی صفات ایسی ہیں جن میں کہا ہے کہ خدا ان میں سب سے بہتر ہے مثلاً خدا احسن الخالقین ہے، خیر الرازقین ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ واقعی رزق دوسرے لوگ بھی دیتے ہیں، دوسروں کو کھانا کھانے کے لیے دیتے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ خیر الرازقین کون ہے؟ کس کے دینے سے تمہاری اپنی ذات کی وسعتیں، تمہاری ذات کے اختیارات کی وسعتیں بڑھتی ہیں؟ اس کے علاوہ کسی کے ہاں سے بھی تم اگر لوگوں کو تو وہ اس کی ایسی قیمت لے گا جس کے لیے مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے کہا کہ

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

رزقِ حلال کے اثرات کی کیفیت صراطِ مستقیم کی شکل میں ہوتی ہے

یہ ❶ عجیب شخص تھا۔ آپ نے یہ دیکھا کہ وہ قرآنی حقائق کو کیسے مؤثر انداز میں بیان کر جاتا ہے۔ وہ جو خیر ہے، اختیارات سمیٹے ہوئے ہے۔ جس رزق سے اختیارات میں غامی آتی ہے اس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے۔ حلال کے تو معنی یہ ہیں کہ رسیاں کھول دی جائیں۔ رزقِ حلال وہ ہے جس سے انسان کے ہر قسم کے بندھ کھل جاتے ہیں۔ یہ اس کے لفظی معنی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ **وَهُوَ خَيْرُ الرَّزَاقِينَ** (23:72) وہ ایسا رزق دینے والا ہے کہ جس کے رزق دینے سے انسان کے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے بہتر روزی دینے والا اور کوئی نہیں۔ **وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** (23:73) تو انہیں ایک ایسے راستے کی طرف دعوت دے رہا ہے جو سیدھا ہے، جس میں پیچ و خم نہیں ہے، واضح ہے، نمایاں ہے، اس میں Confusion (الجھاؤ) نہیں ہوتی۔ اس راستے کے متعلق کہا کہ اس کی مثال سیڑھیوں کی سی ہے۔ اُسے ذی المعارج (70:3) کہا ہے یعنی اس سیڑھی کا سیدھا ہونا بھی ہے، اس کا مستقیم ہونا بھی ہے اور پھر یہ بھی کہ وہ سیڑھی اپنے پاؤں پہ کھڑی بھی ہوتی ہے، قائم بھی ہوتی ہے اور عجیب چیز یہ ہے کہ اس پر چلنے سے بلندیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اسے قرآن نے کہا ہے کہ اس راستے پہ چلنے سے **طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ** (84:19) تم بلندیوں کی طرف بڑھتے چلے جاؤ، ہر قدم جو تم

❶ یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

اس سیڑھی کے اوپر رکھتے ہو ایک قدم تمہیں پہلے قدم کے مقابلے میں زیادہ بلندی پر لے جاتا ہے۔ کیا عجیب راستہ ہے یہ برادرانِ عزیز! قرآن کی مثالیں اور قرآن کی تمثیلات بڑی ہی جامع ہوتی ہیں۔

خدا نے تو اپنے آپ کو سیڑھیوں والا خدا بھی کہا ہے

یہ صراطِ مستقیم سیدھا بھی ہے اور قائم بھی ایسا ہے کہ اس سے ہر قدم پہ بلندی حاصل ہوتی ہے۔ خدا کے متعلق ذی المعارج کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔ آؤ! ہم اوپر کھڑے ہیں، تمہیں آواز دے رہے ہیں چلے آؤ، تم اس راستے سے آسکتے ہو اور پھر عزیزانِ من! کیا بات ہے اس زبان کی! سیڑھی وہی ہوتی ہے اس سیڑھی کے وہ جنہیں ہمارے ہاں ڈنڈے کہتے ہیں جب کوئی شخص اس سیڑھی کے ان ڈنڈوں پر چڑھتا ہے تو عرب ان ڈنڈوں کو درجات کہتے ہیں۔ یہ جو مدارج ہیں اور جسے آپ درجہ کہتے ہیں یہ سیڑھی کا وہی ڈنڈا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیڑھی وہی ہوتی ہے مگر جب کوئی نیچے اتر رہا ہو تو انہی ڈنڈوں کو درکات (پستی) کہتے ہیں کہ آخری ڈنڈے پہ پہنچے ہو تو جہنم کی پستیوں میں جا گرتے ہو یعنی اس سے منہ موڑ کے اگر تم سفر حیات طے کرو گے تو ہر قدم تمہیں نیچے کی طرف لے آئے گا حتیٰ کہ تم ناز کا جو درکِ اسفل ہے اس میں جا پہنچو گے۔ اللہ کا یہ رسول تو تمہیں بلا مزد و معاوضہ لَتَدْعُوهُمْ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (23:73) زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

آخر انسان اس صراطِ مستقیم کو قبول کیوں نہیں کرتے؟

آگے ایک ہی بات کہی ہے۔ کہا کہ یہ سارا قصہ جو ہم نے تمہیں بتایا ہے یہ اس کی مخالف کیوں کرتے ہیں اور پاگل کیوں کہتے ہیں یہ ادھر کیوں نہیں آتے، اپنے شرف سے کیوں اعراض برتتے ہیں؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ کہا کہ بات صاف ہے اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنُکِبُوْنَ (23:74)۔ بات صرف یہ ہے کہ اگر کوئی اس زندگی کو، یہی طبعی زندگی ہی سمجھے، تو پھر یہ سب کچھ ہوگا جو ہم نے بتایا ہے۔ انفرادی طور پر ذلت اور رسوائیاں بھی ہوں گی، اجتماعی طور پر فسادات بھی برپا ہوں گے لیکن ان کے نزدیک قانونِ مکافاتِ عمل کا کوئی تصور نہیں کہ غلط کام کا نتیجہ ہمیشہ غلط نکلے گا۔ آخرت کے یہ معنی بھی ٹھیک ہیں کہ مرنے کے بعد بھی آخرت ہے لیکن عربوں کے ہاں تو ہر بعد کا آنے والا سانس پہلے کے مقابلے میں آخرت کہلاتا ہے، ہر بعد میں آنے والی نسل پہلے کے مقابلے میں آخرت کہلاتی ہے، ایک ہی فرد کی زندگی کے اندر جو دور آتے ہیں وہ جسے آپ مستقبل (Futurity) کہہ لیجئے وہ جو مستقبل ہے، وہ آخرت ہے۔ یہاں ہر سانس میں آخرت ہے، زندگی کے ہر دور میں آخرت ہے، ہر نسل میں آخرت ہے، ہر قوم کے بعد دوسری قوم آتی ہے تو آخرت ہے، مرنے کے بعد کی زندگی اس زندگی کے مقابلے میں آخرت ہے۔ یہاں بات یہ ہے کہ جو سیکولر (Seculatr) نظام یا طبعی (Physical)

نظام کے ماننے والے ہیں ان کی منزل ہمیشہ حال (Present) تک محدود ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ حال (Present) کی خوشحالیوں کے اوپر نگاہ رکھتے ہیں ان کا مٹح نگاہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت مل جائے آخرت کی خبر خدا جانے۔ لہذا لو! یہ بھی لو وہ بھی لو! ارے بھئی! انجام اس کا؟ دیکھا جائے گا۔

### نبی کے زیر تربیت تیار ہونے والی قوم کی خصوصیت

سیکولر (Secular) نظام حیات کے برعکس نبی ایک قوم تیار کرتا ہے جسے وہ ضابطہ ہدایت دیتا ہے۔ قرآن کریم کا پہلا ورق الیہ اور اس میں دیکھیے کہ وہ کیا کہتا ہے: **وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (2:4) وہ مستقبل پہ نگاہ رکھتے ہیں کہ اس ضابطہ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال (Present) کی جدوجہد سے انسان کا مستقبل (Future) روشن ہو جاتا ہے۔ وہ مستقبل (Future) جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔ غالباً یہ وہ قصہ ہے جس کے لیے کہا ہے کہ **Future is purchased by the Present** یعنی مستقبل کو حال کی زندگی سے خریدا جاتا ہے۔ آج آپ جو کچھ کرتے ہیں وہی آپ کا آنے والا کل جو مستقبل ہے بن رہا ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ پہلی آواز تھی جس میں کہا گیا تھا کہ **وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (2:4) یہ قوم مستقبل پہ نگاہ رکھتی ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ وہ اب یعنی اپنا حال ترک کر دیتی ہے۔ وہ اپنا حال اس قسم کا بناتی ہے کہ اس سے جو مستقبل بنتا ہے وہ خود خوشگوار ہوتا ہے:

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا  
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے  
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا  
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے! <sup>①</sup>

### آخرت کے لمحات دراصل حال کا ہی پرتو ہوتے ہیں

عزیزانِ من! قرآن کریم نے کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ **إِنَّ الَّذِينَ** (23:74) یہ وہ لوگ ہیں جو **لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ** (23:74) مستقبل پہ یقین نہیں رکھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ **عَنِ الصِّرَاطِ لَنُكْبِتُونَ** <sup>②</sup> (23:74)۔ سیڑھی کے اوپر ہم لے جا رہے ہیں

① اقبال: ضربِ کلیم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد 1996ء، ص 163

② وہ اس راستے سے دور ہٹتے رہتے ہیں (اور ادھر آنا نہیں چاہتے)۔

یہ لٹے پاؤں نیچے اترتے چلے جا رہے ہیں۔ اس پہ ایمان نہیں رکھ رہے۔ ایمان اسی کے اوپر رکھ رہے ہیں جس زمین سے گئے تھے۔ ہم اوپر کھینچ رہے ہیں یہ پیچھے کی طرف، نیچے کی طرف، گر رہے ہیں۔ یہاں عَنِ الصِّرَاطِ (23:74) آیا ہے۔ یہ وہی صراط ہے۔ خدا جسے عذاب کہتا ہے وہ درحقیقت انسانی اعمال کے فطری تخریبی نتائج ہوتے ہیں۔ جب ان کے ظہور کا وقت آتا ہے یا جب وہ محسوس طور پر سامنے آتے ہیں تو پھر اس وقت اس کو عذاب کہا جاتا ہے۔ کہا کہ اس کا انداز یہ ہوتا ہے۔ ہمارے مکافات عمل کا پروگرام یہ ہے کہ ہم انہیں فوراً نہیں پکڑیں گے بلکہ اس سے پیشتر انہیں وارنگ دیتے رہتے ہیں، قوموں کو تنبیہ کرتے رہتے ہیں، ہلکی ہلکی سی کچھ تباہیاں پہلے آتی ہیں لیکن انسان اس سے بھی ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ لَلْجُورِ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (23:75) یہ چیز آتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ سمجھ لے کہ یہ غلط چیز تھی اس کو چھوڑ دینا چاہیے، صحیح راستہ اختیار کرنا چاہیے، وہ سمجھتا ہے کہ اب یہ جانے والی چیز ہے اس لیے اور زیادہ ہاتھ مارو وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ یہاں الفاظ یہ ہیں کہ من ضر۔ وہ جو آنے والی بتا رہا ہے اس سے چھوٹا سا جھکا آتا ہے مگر یہ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور آگے الفاظ آئے ہیں کہ فِي طُغْيَانِهِمْ (23:75) اپنی طغیانی میں ہوتے ہیں۔ یہ طغیانی وہی ہے جسے سیلاب کہتے ہیں تو یہاں کہا کہ پہلے ذرا ہلکی سی وارنگ آتی ہے اور پھر، اور زیادہ تیزی سے طغیان یعنی سیلاب آ رہا ہوتا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اس کے روکنے کے لیے بند باندھ لیں، وہ اس سیلاب کے اندر اور زیادہ تیزی سے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ جتنا کچھ ہاتھ میں آئے لے جاؤ اُسے لے لو۔ اب اگلا لفظ ہے يَعْمَهُونَ (23:75)۔ کیا بات ہے عربی زبان کی! عربی کا ایک مادہ (Root) ہے: ع م ی۔ یہ جو ”ع م ی“ ہوتا ہے اسی سے ع م ی کا لفظ ہوتا ہے یعنی آنکھوں سے ناہینا ہونا، اندھا ہونا اور اس کے علاوہ ایک دوسرا مادہ (Root) ہے: ع م ہ۔ اسی مادہ (Root) سے يَعْمَهُونَ کا لفظ ہے۔ یہ جو ”ع م ہ“ ہے یہ وہ ہوتا ہے جو بصیرت سے ناہینا ہو۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ آنکھوں سے اندھے ہو جاتے ہیں نظر تو آ رہا ہوتا ہے وہ بصیرت سے اندھے ہو جاتے ہیں اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ ① (23:76)۔ یعنی اس کے بعد وہ وقت آ جاتا ہے جس کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ المؤمنون کی آیت 75 تک پہنچ گئے۔ 76 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط





## تيرهواں باب: سورة المؤمنون (آيت 76 تا 90)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج جولائی 1977ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 76 سے ہو رہا ہے: (23:76)۔

### مادی تصورِ حیات کا دوسرا نام سیکولر نظام بھی ہے

سابقہ آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ یہ لوگ جو غلط روش اختیار کرتے ہیں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ جو زندگی کا سیکولر Concept (تصور) ہے اور میں بار بار اس کا ذکر کرتا ہوں کیونکہ اس دور میں بات اسی سے سمجھ میں آتی ہے اسے Materialistic Concept (مادی تصورِ حیات) بھی کہا جاتا ہے۔ اس تصورِ حیات میں بات ساری اتنی ہے کہ انسانی زندگی اسی طبعی جسم کی زندگی ہے اور یہ طبعی قوانین کے تابع چلتا ہے۔ جب طبعی جسم کی یہ مشین ختم ہو جائے گی، انسان مر جائے گا تو قصہ ختم ہو جائے گا لہذا جو کچھ انسان کرتا ہے اس میں تمدنی قوانین اس کے اپنے بنائے ہوئے ہوتے ہیں یعنی یہ حکومت کے بنائے ہوئے انسانوں کے قوانین ہیں جو کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر کسی طرح سے ایسا کوئی انتظام کر لے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے اور سزا نہ پائے تو اس کے بعد پھر کوئی پوچھنے والا ہوتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ زندگی اسی طبعی زندگی کا نام نہیں ہے، اور آپ احباب کے سامنے اب اس چیز کو بار بار Repeat (دہرانے) کی ضرورت نہیں ہے کہ زندگی اس جسم کے مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہوتی بلکہ آگے چلتی ہے اور اس زندگی میں جو کچھ کیا ہوتا ہے حتیٰ کہ دل میں گزرنے والے غلط خیالات اور نگاہ کی خیانت تک وہ جو کچھ آگے جانے والی چیز ہے جسے نفس یا ذات کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ ان تمام اعمال کے اثرات اپنے ساتھ لے کر جاتی ہے اور ان کے نتائج اس کے سامنے آتے ہیں اور وہ نتائج بھگتتے ہیں۔

### سیکولر نظام کا قوموں کی موت و حیات پر اثر

قرآنِ حکیم کا کہنا یہ ہے کہ یہ نظام جو ہم تمہیں دیتے ہیں اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج اس دنیا میں بھی نہایت خوشگوار سرفرازیاں، شادابیاں اور خوشحالیاں لیے ہوئے مرتب ہوتے ہیں اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو اس زندگی میں بھی تباہیاں آتی ہیں۔ قوموں سے متعلق بھی یہی وہ قوانین ہیں جو قرآن نے دیئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر قوموں کی زندگی اور موت کے متعلق بھی قرآن نے قوانین دیئے ہیں یعنی افراد ہی کے متعلق نہیں بلکہ اقوام کے متعلق بھی۔ غلط نظام کے مطابق اپنا معاشرہ قائم کرنے والی قوم کچھ وقت کے لیے غلط تدابیر سے جسے قرآن مکروسی کہتا ہے، استحصال Exploit کر سکتی ہے، دولت سمیٹ سکتی ہے، استبداد سے لوگوں کو مغلوب کر سکتی ہے اور بظاہر بہت خوشحال ہو سکتی ہے لیکن انجام کار اس سے تباہی آتی ہے۔ یہ چیزیں ہیں جنہیں قرآنِ کریم بڑی ہی شرح

وسط سے اسی زندگی کے تعلق سے بیان کرتا ہے لیکن جب یہ دین مذہب میں تبدیل ہوتا ہے تو اس میں دو تین بنیادی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ پھر انسان اپنے اعمال کے نتائج ہمیشہ اگلی زندگی پر قیامت پر اٹھا رکھتا ہے۔ یہاں کی زندگی کے ساتھ ان اعمال کے اثرات کا کوئی تعلق ہی نہیں رہتا۔ بہر حال یہ تو وہی سیکولر نظام ہے جس کے تابع یہاں کی زندگی رہ جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ پھر کچھ اعتقادات، کچھ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مناسک، شعائر اور رسومات کو مکینکلی ادا کیا اور کہہ دیا کہ ہم ان سے الگ ہو گئے حالانکہ یہ چیزیں مکینکلی کر لینے سے انسان الگ نہیں ہوتا۔ الگ تو آپ اس وقت ہوں گے جب یہ مانیں گے کہ یہاں کے قوانین صرف آپ کے بنائے ہوئے یا انسانوں کے بنائے ہوئے یا اپنی حکومت کے بنائے ہوئے ہی نہیں ہیں بلکہ یہ وہ قوانین ہیں جو خدا نے یہاں کی زندگی کے متعلق بھی دیئے ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا ان قوانین کو یہاں بھی تسلیم کیا جاتا ہے؟ تیسری بات یہ ہے کہ مذہب میں قرآن کریم کی اصطلاحات کے معنی بدل جاتے ہیں۔

### غلط اور متضاد تصورات کی مثال

عزیزانِ من! جب یہ تصورات مذہب میں آ جاتے ہیں تو ان کی رو سے قرآن کی جو اصطلاحات ہیں ان کے معنی ہی بدل جاتے ہیں مثلاً جب آپ کہیں کہ مجرم کو سزا ملی تو آپ کے ذہن میں یہ بات آ جاتی ہے کہ اگر ایسا کرو گے تو گناہ ہوگا اور خدا کا عذاب مسلط ہو جائے گا، خدا کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ عذاب کے اس تصور سے کچھ متعین بات ذہن میں آتی نہیں ہے۔ اب یہ جملے عام بولے جاتے ہیں کہ عذاب الہی میں گرفتار ہے، اللہ کا عذاب آ جاتا ہے، لیکن اگر ہم اس کی بجائے یہ کہیں کہ تباہی آ جاتی ہے تو پھر بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ دراصل مذہب کرتا یہ ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات تو وہ ہیں سے لیتا ہے لیکن ان کا مفہوم متعین نہیں کرتا۔ جب یہ کہا جائے کہ صاحب! یہ دیکھیے زندگی میں غریبی ہے، مفلسی ہے، ذلت ہے، رسوائی ہے، یہ سارا کچھ ہے تو کہہ دیا جائے گا کہ نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو آزما کر رہتا ہے۔ چل بھئی! قصہ ختم ہوا۔ اس کے برعکس دوسری قوم کے افراد میں جو خدا کو نہیں مانتے۔ جب ان کے اوپر یہ چیز آتی ہے تو کہتے ہیں کہ دیکھا، ان پر خدا کا عذاب آ گیا اور اگر اپنے ہاں وہی کچھ ہو تو یہ تقربِ بارگاہِ الہی ہو گیا، اگر ان کے ہاں عذاب آ گیا تو یہ پھر سزا نہیں کہی جاتی۔

دیکھیے یہ کتنے غلط اور متضاد تصورات ہیں جنہیں ہم سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ آیت یہ آئی تھی کہ یہ لوگ جو اس طرح خدا کے قوانین مکافاتِ عمل کو نہیں مانتے، ان کی صورت یہ ہو جاتی ہے کہ وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا

يَتَضَرَّعُونَ<sup>①</sup> (23:76)۔ اب یہاں عذاب کا لفظ آیا ہے۔ آپ تراجم میں بھی، تفاسیر میں بھی، دیکھ لیجیے وہ کہیں گے کہ صاحب! پہلے تو اللہ تعالیٰ تھوڑے چھوٹے جھکے دیتا ہے۔ کاہے کے لیے جھکے دیتا ہے؟ کہ پھر وہ ہماری طرف آتے ہیں یا نہیں؟ نمازیں پڑھتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے ہاں جھکتے ہیں یا نہیں؟ یعنی وہ جھکانے کے لیے نمازیں پڑھوانے کے لیے آتے ہیں، وہ اپنا کوئی کام کرانے کے لیے ہے۔ جب یہ سیدھے طور پر نہیں مانتے تو ٹیڑھی انگلیوں سے وہ گھنی نکالتا ہے اور وہ کچھ جھکے دیتا ہے کہ آتے ہیں یا نہیں آتے؟ اور اس کے بعد ہے کہ حَتَّىٰ اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيدٍ اِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ (23:77) اور جب پھر اس پہ بھی وہ نہیں مانتے تو پھر وہ جناب! روڈ رولر پھیر دیتا ہے، پھر وہ تباہی کے دروازے عذاب کے دروازے کھول دیتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ Concept (تصور) ہی غلط ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ اگر تم اپنے ہاں زندگی کا غلط نظام قائم کرو گے جس میں تکریم انسانیت نہیں رہتی تو پھر اس نظام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ ایک ایسی آنے والی تباہی بن جائے گا جو سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ<sup>②</sup> (7:182) کی شکل اختیار کر لے گا۔

### سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کا اور عذاب کا قرآنی مفہوم

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کے اس لفظ کو پڑھتے ہوئے بھی کیسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ لفظ تدریج سے ہے یعنی یہ چیز Gradually (تدریجاً) ہوتی ہے۔ پہلے یہ چیزیں ہلکی سی شکل میں آتی ہیں مثلاً مہنگائیاں ہو گئیں، بھوک آگئی، خطرے پیدا ہوئے۔ مختلف قسم کے نظام تھوڑا تھوڑا کر کے بگڑتے ہیں تاکہ وہ دیکھ لیں کہ اس غلط نظام کے یہ اس قسم کے نتائج نکل رہے ہیں اور وہ انہیں سنوار لیں یعنی اپنے نظام (Systems) صحیح کر لیں لیکن جب وہ اس طرف توجہ نہیں دیتے اور اپنی روش میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں تو پھر قرآن کے الفاظ میں یوں ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہیں کہ اب شدید عذاب کے پھاٹک کھل گئے ہیں۔ اسے تباہی کیوں نہ کہیے۔ قرآن نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ استبدالِ قومی ہے۔ کہا ہے کہ اگر تم یہ نہ کرو گے تو تمہاری یہ کیفیت ہو جائے گی۔ هَآنَتُمْ هَآؤَلَا تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (47:38) تم سے کہا جاتا ہے کہ اس صحیح نظام کے استحکام کے لیے تمہیں اپنی محنت کی کمائی کو خود بطیب خاطر کھلا رکھنا ہوگا، اس سے یہ معاشرہ استوار رہے گا، اس سے تمہاری بقاء ہوگی لیکن تمہاری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَبْخُلُ (47:38) تم اس روپے کو سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہو۔ تو یہ کہا ہے کہ جب بھی کسی نظام میں کیفیت یہ ہو جائے کہ اس کے بقاء اور استحکام کے لیے اس

① ہم نے انہیں عذاب میں مبتلا کیا تھا، تو اس پر بھی یہ اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کے سامنے نہ جھکے اور نہ ہی ان کے دل میں ذرا سا بھی گداز پیدا ہوا (پرویز: مفہوم القرآن، ص 786-785)۔

② ہم انہیں آہستہ آہستہ تدریجاً تباہی و بربادی کے اُس مقام تک لے آتے ہیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا (پرویز: مفہوم القرآن، ص 386)۔

طرح بطیب خاطر یہ Wealth (دولت) Open (کھلی) نہ رکھی جائے تو اس کا نتیجہ عذاب ہوتا ہے۔ اسے ہی بتایا کہتے ہیں۔ یہ بتایا آہستہ آہستہ بتدریج آتی ہے اور اس انداز سے آتی ہے کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔

### غلط نظام کا تباہ کن نتیجہ

سوال یہ ہے کہ عذاب ہوتا کیا ہے؟ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَإِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ** (47:38) اگر تم اسی طرح سے اس صحیح روش سے اعراض برتنے رہے اور تم میں سے ہر شخص ساری دولت سمیٹ کر اپنی ذات کے لیے بنک بھرتا رہا، تو یاد رکھو! اس کے بعد یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ عذاب کی کیا تشریح ہو رہی ہے۔ یہ ہے انتہائی شکل۔ ابتدائی شکلیں تو یہ ہیں کہ تمہارے اپنے اندر ہی یہ چیزیں آئیں گی تاکہ تمہیں فطرت کی طرف سے وارننگ ہوتی رہے کہ بھئی! یہ نظام غلط ہے۔ پہلے ہلکا ہلکا سر در شروع ہوتا ہے اس کے بعد وہ زیادہ Painful (تکلیف دہ) ہو جاتا ہے۔ یہ چیز فطرت کے اندر ہے۔

اس کا قانون یہ ہے کہ وہ یہ چیزیں Gradually (بتدریج) کرتا ہے۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ **يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ** (47:38) تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی۔ ذہن میں یہ آتا ہوگا کہ وہ بہر حال جیسے ہم ہیں ویسے ہی وہ قوم آجائے گی تو یہ تبدیلی کیا ہوئی؟ کہا کہ یہ غلط ہے۔ **ثُمَّ لَا يَكُونُ نَوًا امثالكم** (47:38) پھر وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ یہ بات یوں نہیں ہے کہ ہم ایک قوم کی جگہ اسی قسم کی دوسری قوم لے آتے ہیں۔ اے کوئی چوٹھے دین والی گل تھوڑی ہیگی اے کہ اتر بابا میں چڑھاں۔ <sup>①</sup> اللہ میاں کہتا ہے کہ صاحب! اتنے سال تم نے حکومت کر لی ہے۔ اوٹھیک اتر تھکے پنج سال پورے ہو گئے۔ ہن نویں الیکشن سنانوں آن دیو۔ <sup>②</sup> یہاں قرآن کریم نے کہا ہے کہ **ثُمَّ لَا يَكُونُ نَوًا امثالكم** (47:38) پھر اس قوم کی جگہ وہ قوم لیتی ہے جو اس کی مثل نہیں ہوتی۔ <sup>③</sup> پھر دوسری جگہ کہا ہے کہ **وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا** (10:13) ہم نے قانون مہلت اور مکافات کے مطابق اس سے پہلے بہت سی قوموں کو تباہ کر دیا جب انہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کر کے لوگوں پر ظلم اور زیادتی شروع کر دی۔ **وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ** (10:13) ان کی طرف ہمارے پیغمبر واضح قوانین اور کھلے کھلے دلائل لے کر آئے۔ **وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا** (10:13)

① یہ کوئی جھولا جھلانے والی بات نہیں ہے کہ ارے بھئی! اتر باب میری باری ہے۔

② نیچے آؤ تمہارے پانچ سال پورے ہوئے۔ اب نئے انتخابات (Election) میں ہمیں آنے دو۔

③ یہ اس لیے کہ قوموں کی موت و حیات اور استخلاف و استبدال کا قانون (Law of Substitution and Succession) یہ ہے کہ جو قوم صحیح نظام زندگی کی حامل ہو وہ باقی رہتی ہے جو غلط نظام رائج کرے وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو بہتر نظام کی حامل ہو۔ قوموں کی موت و حیات کے فیصلے زندگی کے متعلق ان کے نظریات اور عملی نظام کی رو سے ہوتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 1193)۔

لیکن انہوں نے ان کی صدقت کو تسلیم نہیں کیا اور وہ تباہ ہو گئے۔ کَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ (10:13) اسی طرح ہم سر درد کے مجرمین کو ان کے کیے کا بدلہ دیتے ہیں اور ایسی قوم لاتے ہیں جو تم سے بہتر ہوتی ہے۔ اس کے لیے استبدال و استخلاف قومی کا قانون (Law of Succession and Substitution) یہ ہے کہ جو قوم غلط نظام قائم کرے اس کی تباہی جاتی ہے۔ تباہی کی ایک شکل یہ ہے کہ دوسری قوم آجاتی ہے اور وہ قوم اس سے بہتر ہوتی ہے، جیسی تو وہ اس کی جگہ لیتی ہے۔ اس جگہ لینے والی قوم کے متعلق کہا ہے کہ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ (10:14) پھر ہم نے تمہیں تمکن عطا کیا لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (10:14) تاکہ دیکھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو۔

یہ جو قرآن نے ایسا صاف غیر متبدل قانون دیا ہوا ہے کہ ساری تاریخ ہمارے سامنے اس کی شہادت دیتی ہے لیکن جونہی ہم نے عذاب کا یہ تصور مبہم رکھا اور اس کے بعد اس کو ہم نے آخرت پر اٹھا رکھا تو اس زندگی کے ساتھ تو تعلق ہی نہ رہا، نہ ہی خدا کی ان ہدایات کا رہا حالانکہ یہ ہدایت خداوندی اس لیے آتی تھی کہ اس دنیا کی زندگی میں تم کیسے عمل کرتے ہو۔ کس قدر جامع الفاظ میں یہ شخص کہہ جاتا <sup>①</sup> ہے کہ اس سارے سلسلہ رشد و ہدایت کا، رسالت کا، بعثت انبیاء کا، خدا کی طرف سے یہ قانون آنے کا، مقصد یہ تھا کہ

از کلید دیں در دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا جائے۔ بات عذاب کے لفظ سے ہوتی ہے۔ یہ تو انتہائی شکل ہے اور قرآن نے جو ابتدائی شکل بتائی ہے میں اس کی تفصیل میں اس مقام پر آؤں گا جب قرآن میں عذاب کا لفظ آئے گا۔ قرآن کے اندر درمیان میں یہ ضمنی بات آجاتی ہے تو ضمناً ہی کچھ کہنا ہوتا ہے۔

### ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آنے کی صورت کیا ہوتی ہے؟

سنیے عزیزانِ من! وہ جو کہا تھا کہ ابتداً معاشرے کے اندر اس تباہی سے پہلے کہ استبدال قومی ہو، تمہیں ہلکے ہلکے سے جھٹکے لگتے ہیں، تم خفا ہو جاتے ہو مگر صحیح نظام نہیں لاتے تو تمہاری جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے اس جگہ لینے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ انہیں اٹھا کے سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ جگہ لینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوسری قوم والے غالب آجاتے ہیں، تم پہ مسلط ہو جاتے ہیں، وہ حکمران ہو جاتے ہیں، تم محکوم ہو جاتے ہو۔ اس سے پہلے کی جو کیفیت بیان کی ہے اس میں پہلے ہلکے ہلکے جھٹکے آتے ہیں۔ یہ بھی وہی ہے جسے عذاب کہا ہے۔ دیکھیے، عزیزانِ من! کن الفاظ میں قرآن کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ پھر ایسے غلط معاشرے میں ہوتا ہے، جہاں عدل نہیں ہوتا، تکریم انسانیت نہیں

① یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

ہوتی، انسانوں کی Exploitation (سلب و مہب) ہوتی ہے۔ الغرض غلط نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔

## قوم و ملک کی تباہی کی شکلیں

استبدالِ قومی کے اس سلسلے میں (6:65) بڑی اہم آیت ہے۔ اس میں کہا کہ قُلْ (6:65) اے رسول! ان کو Warn (تنبیہ) کر دو ان کے لیے یہ اعلان کر دو کہ هُوَ الْقَادِرُ (6:65) اس کے قانون کے اندر پاور ہے طاقت ہے۔ قرآن کریم نے اسے ”القادر“ کہا ہے۔ آگے کہا کہ وَهَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ<sup>①</sup> (6:65)۔ اس آیت میں عذاب کا لفظ آگیا، اگر حکمران عدل و انصاف اور تکریم انسانیت سے کام نہیں لیتے تو قوم کے عذاب کی ایک شکل یہ ہے کہ تمہارے اوپر اس قسم کے حاکم مسلط ہو جائیں جو تمہارا کچھ مر نکال دیں۔ یعنی حاکم کی ایک شکل یہ ہوتی ہے یا پھر یہ شکل ہوتی ہے کہ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْضِكُمْ (6:65) یا پھر ان کے حاکموں کے ہاتھوں تنگ آنے کے بعد ان کے پاؤں تلے روندے ہوئے عوام ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ قوم کے لیے یہ بھی تباہی ہوتی ہے۔ یہ اس عذاب کی دوسری شکل ہوتی ہے کہ یہ جَوْ تَحْتِ اَرْضِكُمْ (6:65) ہیں یعنی پاؤں تلے روندے ہوئے ہیں، یہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سے قوم کی تباہی ہوتی ہے ملک کی تباہی آتی ہے۔ یہاں بات تو عذاب کی ہے جس کے معنی تباہی ہیں۔ یاد رکھیے! کسی قوم یا ملک یا مملکت کی تباہی کے لیے یہ دو شکلیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ابھی تیسری شکل بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيْعًا (6:65) یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ یہ جو اوپر کا لیڈروں کا طبقہ ہے اس کا ہر لیڈر اپنے ساتھ نیچے کے طبقے کے کچھ لوگ ملا لیتا ہے ان کی پارٹیاں بن جاتی ہیں اور پھر وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (6:65)۔ ایسی صورت میں پھر کوئی دوسری قوم آ جاتی ہے اور اسے اچک کر لے جاتی ہے۔ یہ استبدالِ قومی تو پہلے بتا دیا ہے کہ پھر ملک کے اندر یہ کچھ ہوتا ہے۔ اس عذاب کی تیسری شکل یہ ہے کہ وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (6:65) آپس میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ پارٹیاں بنتی کیسے ہیں؟ قرآن کریم نے کیا عجیب چیز کہی ہے! پہلے تو کہا: اوپر کا طبقہ پھر کہا: نیچے کا طبقہ۔ وہ تو دونوں الگ الگ رہتے ہیں اور تیسری شکل یہ ہے کہ اوپر والوں میں سے کوئی ان نیچے والوں کو اپنے ساتھ ملاتا ہے۔ یہ بلبسکم ہے۔ اس طرح وہ ایک مخلوط شکل ہو جاتی ہے۔ اب یہ ان کے Followers (متبعین) ہیں اور یہ ان کا لیڈر ہے۔ یہ عوام ہیں اور اس طرح یہ ان کا رہنما ہے۔ یہ رہنما اپنی اپنی الگ پارٹیاں بنا کے ایک دوسرے کے ساتھ الجھ پڑتے ہیں کہ خانہ جنگی کی نوبت آ جاتی ہے۔ یہ تباہی کی آخری انتہائی شکل ہوتی ہے۔

① معاشرے کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اس کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔

کہا کہ یہ ابتدائی شکلیں ہوتی ہیں اور خانہ جنگی ان کی انتہائی شکل اور پھر آگے وہ استبدال قومی ہوتا ہے۔ پھر کوئی دوسری قوم جو ان جیسی نہیں ہوتی، اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اگر وہ بھی ایسی ہوتی یعنی ان کے ہاں بھی اسی طرح خوں ریزیاں اور ظلم و بربریت، خانہ جنگی اور سلب و نہب ہو رہی ہوتی تو اس نے آ کے کیا حصہ لینا ہے۔ جو قوم تمہارے جیسی نہیں ہوتی وہ قوم آ جاتی ہے۔

### تباہ حال قوم کے خلاف ظالم قوموں کا اتحاد اور ان کا طریق کار

قرآن نے ایک جگہ اور بھی بڑی گہری بات کہی ہے۔ سورۃ الانعام یعنی (6:130) میں کہا ہے کہ آخر ہوتا تو یہی ہے جو ہم نے کہا ہے کہ کوئی دوسری قوم جو تمہارے جیسی نہیں ہوتی، آ جاتی ہے۔ وہ تمہیں اچک کر لے جاتی ہے۔ کہا کہ اگر کوئی ایک قوم ایسی نہ ہو جس میں اتنی ہمت نہ ہو تو بعض مختلف قومیں، جن میں سے ہر ایک ظالم قوم ہوتی ہے وہ آپس میں اتحاد کر لیتی ہیں۔ اب دیکھیے کہ یہ کیفیت ہے کہ وہ ظالم قومیں، جب کسی ایک قوم کو اس طرح سے دیکھتی ہیں کہ وہ ہمت نہ ہونے کے باعث یوں الجھی ہوئی ہے تو وَكَذَلِكَ نُؤَلِّيُ بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (6:129) یہ جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں اس کی بنا یہ مختلف ظالم قومیں آپس میں اتحاد کر لیتی ہیں اور مل کر ان کے متحدہ محاذ بنا کر انہیں اچک کر لے جاتی ہیں یعنی ملاحظہ کیجیے کہ آپس میں تو ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے لیکن اس مقصد کے لیے کہ اس قوم کو اچک کے لے جانا ہے، وہ ایک متحدہ محاذ بنا لیتی ہیں حالانکہ ایک قوم جو آتی تھی اس کے لیے کہا تھا کہ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی، بہتر ہوگی لیکن کیا کیا انداز ہیں صاحب! اگر وقت ہو تو میں آپ کے سامنے تاریخ بیان کروں، بتاؤں کہ کس طرح سے تاریخی واقعات و شواہد اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ آج آپ کے سامنے ہے۔ عزیزانِ من! کہیں تو کوئی ایک ہی قوم ہوتی ہے جو چھوٹ لیتی ہے۔ یہ آپ کے ہاں جتنی قومیں ہیں جنہیں آج کل ترقی پذیر قومیں (Developing Countries) کہا جاتا ہے، یہ جن کو نئی نئی آزادیاں دی جاتی ہیں، پھر ان آزادیوں کے بعد جو کچھ ان کا حشر کیا جاتا ہے وہ یہی قومیں ہوتی ہیں، کبھی تو الگ الگ ہوتی ہیں اور کبھی یہ آپس میں متحدہ محاذ بنا کے اتحاد کر لیتی ہیں۔ یہ جتنی نئی نئی قومیں دنیا میں آزاد ہوئی ہیں آپ دیکھیے کہ ان کی کیا کیفیت ہے۔ بات تو اس کی سی نہیں ہے لیکن ہے بڑی دلچسپ۔ یہ جنہیں نئی نئی آزادیاں دیتے ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ پکاراٹھتی ہیں کہ

مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا

کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے!

دنیا نے انسانیت میں سب سے بڑا ظلم انسان کی تذلیل کرنا ہے

اس Colonization (کالونیاں بنانے) کے بعد یہ جو آزادیاں دے رہے ہیں وہ یہی ہے کہ مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا۔ اف!



عزیزانِ من! یہ بات سوچ کر میری چیخ نکل جاتی ہے: مجھ کو اپنا بنانے کے چھوڑ دیا۔ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے! کس قدر سچ کہا ہے قرآن کریم نے کہ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا (6:129)۔ تو اس وقت یہ جو ظالم قومیں ہیں یہ کم بخت ان کو لوٹنے کے لیے آپس میں اتحاد کر لیتی ہیں۔ کہا کہ یہ ہیں عذاب کی شکلیں جو آیا کرتی ہیں۔ یہ تو ساری باتیں یہیں کی کی جارہی ہیں۔ یہ ہوتا ہے قوموں میں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے سب سے بڑا جرم یہ ہے عزیزانِ من! کہ تکبریم انسانیت نہیں ہوتی۔ یہاں انسان کی عزت، انسان ہونے کی جہت سے نہیں کی جاتی۔ جو نہی کسی ابنِ آدم کی تذلیل ہوتی ہے خدا کا عرش ہل جاتا ہے۔

عزیزانِ من! دنیا میں کوئی ظلم اس سے زیادہ ظلم نہیں ہے کہ کسی انسان کی تذلیل کی جائے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (17:70)۔ بڑا اہم انعام ہے کہ ہر ”ابنِ آدم“ ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔“ قرآن کریم نے عذاب کی یہ شکلیں بتائی ہیں۔

### انسان کے اندر فیصلہ کرنے والی قوت کا تذکرہ

کہا ہے کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ ایسے ہی نہیں ہے کہ ہم نے کچھ کہہ دیا اور ہمارا کچھ جی چاہتا تھا کہ عذاب میں مبتلا کریں تو وہ آگیا اور یہ کہ یہ سمجھ میں بھی نہ آئے۔ کہنے لگے کہ یہ بات ہی نہیں ہے کہ یہ چیز سمجھ میں نہ آئے۔ کہا کہ هُوَ الَّذِيْ اَنْشَاَ لَكُمْ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ (23:78) ان قوموں میں سننے، دیکھنے، بھالنے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ ان کے اندر سماعت، بصارت کی صلاحیتیں موجود تھیں تو اس سے مراد یہ جتنے بھی ذرائع ہوتے ہیں جن سے انسان کو انفرمیشن ملتی ہے وہ سب آ جاتے ہیں اور اس سے مقصود ہوتا ہے کہ انسان تک انفرمیشن پہنچنی چاہیے اس کے سامنے معلومات آنی چاہئیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے باہر آپ کے دوست کے ساتھ کچھ ہو رہا ہو آپ کو علم ہی نہیں ہے اس پہ اگر کوئی چیختی آواز آئے گی تو اس سے آپ سمجھیں گے کہ کچھ ہوا ہے۔ یہ انفرمیشن ہے۔

سب سے پہلے تو انفرمیشن (معلومات) کا آنا ضروری ہے۔ یہ جو سمع بصر قرآن کہتا ہے یہ اطلاعات اور معلومات کے ذرائع ہوتے ہیں۔ اس سے آگے پھر آپ کے اندر فیصلہ کرنے والی ایک چیز اور ہے مثلاً چیخ کی آواز آئی اور آپ نے یہ پہچانا کہ وہ آپ کے دوست کی آواز ہے۔ فیصلہ کیا کہ فوراً مدد کے لیے جانا چاہیے۔ یہ آپ کے کان اور آنکھ کا فریضہ نہیں تھا۔ اندر ایک اور چیز ہے۔ اسے قرآن ”افئدة“ کہتا ہے۔ اس کا کچھ نام رکھ لیجیے۔ یہ تو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ صاحب! ایک Term (اصطلاح) ہے جو اس نے رکھی۔ آج بیسویں صدی میں علم اتنی ترقی کر گیا ہے اور پھر سائنٹولوجی (علم نفسیات) وغیرہ اتنی آگے بڑھ گئی ہیں۔ اس چیز کا نام ابھی تک متعین

نہیں ہوسکا کہ وہ ہے کیا جو اندر فیصلہ کرتی ہے۔ پہلے انہوں نے اس کے لیے مائنڈ (Mind) کا لفظ قائم کیا تھا۔ آہستہ آہستہ گھس گھسا کے پھر اس کے معنی ہی کچھ اور ہو گئے۔ آپ دیکھیے کہ جب آپ کہتے ہیں کہ تم مائنڈ تو نہیں کرو گے؟ اس سے کچھ پوچھا ہے۔ اور پھر اس Mind کے لفظ سے انہوں نے Adjective (اسم صفت) بنایا۔ وہ مائنٹل ہوا اور پھر وہ مائنٹل ہاسپٹل ہوا تو پاگل پن کی بات ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے لیے آج کوئی اور لفظ ڈھونڈ لیجیے۔ سائیکولوجی والوں نے Psyche کا ایک لفظ تو ڈھونڈا ہے۔ امریکہ میں سائیکولوجی والوں نے کمرشل سائیکولوجی کی اصطلاح وضع کر لی۔ آج وہاں تو خدا بھی کمرشل ہوتا ہے مگر بات وہاں بھی نہیں بنی۔

### قرآنی لفظ افندہ کا اور شکر کا مفہوم

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے بھی ”قلب“ اور ”افندہ“ کے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ عربی زبان وسعت رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں قلب عام طور پر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا تھا جس کا تعلق Intellect یعنی ادراک سے، عقل اور فہم سے اور شعور سے ہو۔ افندہ کا لفظ وہاں استعمال ہوتا تھا جہاں جذبات کا تعلق ہو۔ اس کے معنی سوز و گداز ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ دو باتیں تھیں لیکن بہر حال قرآن سمع اور بصر اور افندہ کہتا ہے۔ یہ قوموں کو معلوم تھا، یہ سارا کچھ ان کے سامنے ہو رہا ہے۔ تاریخی شواہد ان کے پاس تھے لیکن اس کے بعد قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (23:78) بہت تھوڑے ہوتے ہیں جو ان کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔ شکر کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ یہ یا اللہ! شکر تیرا والی زبانی بات نہیں ہے۔ یہ ان کے صحیح استعمال کی بات ہے۔ کہا کہ بہت تھوڑے ہیں جو ان کا صحیح استعمال جانتے ہیں بلکہ استعمال صحیح جاننا تو رہا ایک طرف، آپ کو معلوم ہے کہ یہ سمع اور بصر اور افندہ کا صحیح استعمال ہی نہیں کرتے یا یوں کہیے کہ یہ انہیں استعمال ہی نہیں کرتے۔

### تقلید پرست قوموں کی زبوں حالی

عزیز برادران! اب میں نے یہاں دو الفاظ ”قلب“ اور ”افندہ“ استعمال کیے ہیں۔ اب ایک تو وہ لوگ ہیں جو سمع اور بصر کا استعمال تو کرتے ہیں لیکن ان کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ چلیے اپنے ذاتی فائدے کے لیے ہی سہی ان کے ہاں عقل خود ہیں تو ہوتی ہے۔ عقل جہاں ہیں تو بڑی چیز ہے۔ وہ کچھ اپنا فائدہ تو کرتے ہیں۔ ایک وہ قوم ہوتی ہے جو ان سے کام ہی نہیں لیتی۔ یہ وہ قوم ہے جن کے ہاں تقلید ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ یہ قوم انسانیت کی سطح پر نہیں پہنچتی۔ یہ بھیڑیں ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ مقلد بھیڑ ہوتی ہے۔ کسی کچھلی بھیڑ سے پوچھو کہ آگے کیوں جا رہی ہو وہ کہتی ہے اگلی جو جا رہی ہے اس لیے میں بھی جا رہی ہوں اور جو سب سے آگے ہے اس سے پوچھو تو وہ ”اوہوں“ کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔ بات ختم ہو گئی۔ جواب تو اس کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ بس وہ چلی جا رہی ہیں۔

## قرآن حکیم کے غلط تراجم کی ایک واضح مثال

کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن ان کے متعلق کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ (7:179)۔ اس آیت کا عام ترجمہ یہ کر لیا جاتا ہے کہ ”ہم نے پیدا کیا ہے بہت سے لوگوں کو جہنم کے لیے۔“ چل، بھئی! قصہ ہی ختم۔ پیدا ہی تم نے انہیں جہنم کے لیے کیا تو وہ بیچارے کیا کریں گے، تمہارے علی الرغم وہ کیسے جنت میں جاسکتے ہیں؟ اس کے باوجود وہ ساری عمر جنت میں جانے کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دیکھ تو سہی تو کہتا ہے کہ یہ ”پیدا کیے“ ہیں ”نمازاں پڑھنے آں روزے رکھنے آں اسی جنت اچ ضرور جا کے رہنا اے۔“<sup>1</sup> بس ایک لفظ کا ترجمہ کر دینے سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”تم ایسے لوگ دیکھو گے جن کی زندگی بتا دیتی ہے کہ یہ تو ہیں ہی جہنم والے۔“ صاف نظر آتا ہے بھئی! کہ یہ کون ہیں۔ پھر کہوں کہ یہاں صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ تو ہیں ہی جہنم والے شخص۔ یہ وہ ہیں کہ لَهِمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا (7:179) ہم نے انہیں دل دیا ہے سمجھنے کی صلاحیت دی۔ یہ اس صلاحیت کو استعمال ہی نہیں کرتے۔ یہ تھا وہ جو (23:78) میں کہا تھا کہ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (23:78) تم میں سے بہت تھوڑے ہیں جو اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ صحیح تو یوں ہے کہ وہ اس کا صحیح استعمال ہی نہیں کرتے۔

## انسان اور حیوان میں صرف بصیرت کا فرق ہے

ان کے لیے پھر بھی توقع تھی کہ اگر صحیح اور غلط میں کبھی بھی ان کے سامنے امتیاز آ گیا تو وہ ظالم کی کلائی مروڑ دیں گے کیونکہ وہ اس کا استعمال تو کرتے ہیں، تلوار چلانا تو جانتے ہیں، آج وہ تلوار مظلوم کے سینے میں گھونپتے ہیں، جب بھی کبھی بات سمجھ میں آ گئی تو پھر وہ اس سے ظالم کی کلائی مروڑیں گے اور جسے یہ تلوار چلانا آتا ہی نہیں، اس کو استعمال ہی نہیں کرنا آتا، تو وہ کیا کرے گا۔ یہ وہ ہیں جنہیں ہم نے سمجھنے کی صلاحیت تو دی۔ وہ اس سے کام ہی نہیں لیتے، اچھا جی وَلَهِمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا (7:179) ہم نے آنکھیں دی تھیں کہ دیکھ کے چلا کر وہ آنکھیں کھولتے ہی نہیں، ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے بصارت اور بصیرت میں کتنا فرق کر دیا ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ فزیکلی وہ آنکھ نہیں کھولتے اور فزیکلی چیزوں کو نہیں دیکھتے۔ وہ آنکھیں تو کھلی رکھتے ہیں، پھر وہ کیا ہے جس کو کہا ہے کہ استعمال نہیں کرتے۔ بصیرت ہے جس کو کہتے ہیں کہ آنکھیں نہیں کھولتے۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ وَلَهِمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا (7:179) ہم نے کان دیئے تھے کہ سنا کر وہ اس سے سننے کا کام ہی نہیں لیتے۔ کہا کہ یہ تمہیں چلتے پھرتے نظر آئیں گے کہ انسان ہیں۔ مگر أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ (7:179) انسان نہیں، یہ تو بالکل حیوان ہیں۔ عزیزانِ من! ”انعام“ کہہ کر اگلی بات یہ کہہ

1 (ہم) نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، جنت میں ضرور جا کر رہیں گے۔

دی کہ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) یہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ حیوان اپنی جبلت (Instinct) کے تقاضوں کے مطابق تو چلتا ہے، فطرت (Nature) نے اس کے اندر جو Instinct (جبلت) دی ہوئی ہے وہ کبھی اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ جیسا میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ شیر اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود جنگل میں اگر اس کے آس پاس انگوروں کی بیلے ہوں اور ان کے خوشے بھی لٹک رہے ہوں تو بھی وہ بھوکا مر جاتا ہے آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھتا اس لیے کہ یہ چیز اس پر حرام ہے۔ وہ رزق حرام نہیں کھا سکتا۔ وہ گوشت کی تلاش کرے گا۔ بکری کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی خواہ کتنے ہی دنوں کی بھوک کیوں نہ ہو۔ وہ حرام اور حلال میں تمیز کرتی ہے۔ یہ ہیں بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ گم کردہ۔ عقل و فکر سے کام نہ لینے کے اعتبار سے تو کہا کہ حیوان کی مانند ہے بلکہ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) اس سے بھی زیادہ گمراہ اس لیے کہ حیوان کم از کم اپنے جبلتی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں۔ اور اس قسم کے انسان ان حدود سے بھی اُولَئِكَ هُمُ الْغٰفِلُونَ (7:179) بے خبر رہتے ہیں۔ اس سے بھی اَضَلُّ اس لیے کہ ان کے پاس یہ صلاحیت تھی نہیں کہ وہ اس میں امتیاز کر سکتے۔

اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے پاس یہ صلاحیت ہے مگر وہ اس صلاحیت سے کام نہیں لے رہا۔ یہ ہے کہ وہ جو چلتے پھرتے نظر آتے ہیں کہ جہنم میں جانے والے ہیں اور یہاں تو (7:179) میں لمبی بات کی ہے۔ ایک اور مقام ہے جہاں قرآن اس سے بھی مختصر تر الفاظ میں بات کہہ گیا ہے۔ سورۃ الملک میں کہا کہ جب یہ لوگ گروہ درگروہ تباہیوں کے جہنم میں ڈالے جائیں گے تو اس سے چیخ و پکار کی کرب انگیز آوازیں سنائی دیں گی اور وہ جہنم بڑا پر جوش اور طوفان انگیز ہوگا (67:7)۔ ایسا طوفان انگیز کہ یوں دکھائی دے گا گویا وہ جوش غضب سے پھٹ جائے گا۔ جب کوئی قوم اس میں ڈالی جاتی ہے تو اُس سے جہنم کے چوکیدار پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا شخص آیا تھا جو تمہیں تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا (67:8)؟ عزیزانِ من! قرآن کا بات سمجھانے کا محاکاتی انداز ہے۔ وہاں ان سے جہنم کے دروغے پوچھیں گے کہ کیا کوئی ایسا تمہارے پاس نہیں آیا تھا جو بتاتا کہ صحیح راستہ کون سا ہے اور غلط راستہ کون سا ہے انسان جہنم میں کیوں چلا جاتا ہے اور جنت میں جانے کا کون سا راستہ ہے؟ کیا کوئی بتانے والا نہیں آیا تھا؟ ایسی صوت بھی تو ہو سکتی ہے کہ کوئی بتانے والا آئے ہی نہیں۔ کہا کہ قَالُوا بَلٰی قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ (67:9) وہ کہتے ہیں کہ ہاں! ہمارے پاس ایسا آگاہ کرنے والا آیا تھا لیکن ہماری بدبختی کہ ہم نے اس کی بات کو سچ نہ مانا۔ اس سے کہا کہ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (67:9) تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم خود اپنی طرف سے ہی یہ باتیں بنا کر رہے ہو۔ یہ کوئی خدا کا حکم نہیں ہے اس قسم کے احکام وہ بھی نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اسے یونہی جھٹلادیا۔ ہم نے کہا کہ تم نے سوچا ہی نہیں، ہم تمہیں کیا کہیں! قَالُوا وَهٰمْ كٰفِرٌ لَّوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (67:10)۔ یہاں ”نسمع“ اور ”نعقل“ کے دو الفاظ آئے ہیں جن سے ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ انہوں نے

کہا کہ اگر ہم ان کی بات دل کے کانوں سے سن لیتے ”سمع“ اور پھر اس پہ غور کر لیتے ”نعقل“ تو آج کبھی جہنم میں نہ آتے۔ بات تو ساری سن لینے اور غور کرنے کی ہے۔ اور ادھر وہ جو جنت میں جانے والے ہیں ان کے لیے قرآن میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ سَمِعْنَا وَاطَعْنَا<sup>①</sup> (24:51) یہ ”سمعنا“ کا ہے کہ لیے ہے؟ اس سننے میں آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک تو یہ سننا ہے جسے آپ Hearing کہتے ہیں۔ یعنی میں نے آواز نکالی آپ کے کان میں پہنچ گئی۔ یہ تو آپ کو کوئی Effort (کوشش) ہی نہیں کرنا پڑی۔ وہ تو اس کا قانون ہے جس میں وہ آواز آپ کے کان کے اندر خود چلی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اس کے لیے دو الفاظ ہیں۔ ایک Hearing ہے اور دوسرا Listening ہے۔ Listening میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اللہ کہہ رہا ہے اسے توجہ سے سنا جائے اس پہ غور کیا جائے۔ پھر یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ سمعنا کے معنی یہ ہوتا ہے۔ یہاں (67:10) میں کہا ہے کہ ہم اگر توجہ سے سنتے جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اور اس کے اوپر پھر غور و فکر کرتے، ہم عقل سے کام لیتے تو اس کے بعد ہے کہ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (67:10) آج اس جہنم میں کیوں ہوتے؟ کس قدر Definite (متعین) بات ہے کہ آج ہم جہنم والوں کے اندر ہوتے ہی نہیں۔ کہا یہی ہے کہ اگر عذاب آیا تو یہ بات نہیں ہے کہ یہ سمجھ سوچ نہیں رکھتے سب جانتے ہیں سمجھ سوچ رکھتے ہیں مگر مفاد پرستیوں کے جذبات اس قدر طوفان کی طرح اٹھ چلے آتے تھے کہ وہ دوسری طرف دیکھنے یا سننے کی فرصت ہی نہیں دیتے تھے اگر کسی کی بات سنتے بھی تو اس پہ غور و فکر نہیں کرتے تھے کرتے بھی تھے تو تکذیب کرتے تھے کہ نہیں صاحب! کہاں ہوتا ہے جانے دو۔

### سامان زیت کی اس قدر فراوانی اور انسان کی غلط جذباتی کیفیت کا نتیجہ

قرآن کریم نے کہا کہ وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ (23:79) تمہیں پیدا کیا تو ہم نے زمین پر اتنا سامان زیت پھیلا دیا۔ بس یہی چیز تمہارے لیے عذاب کا موجب بن گئی۔ یہ جو کچھ پھیلا یا تھا اگر تم اسے پوری نوع انسانی کے لیے کھلا رہنے دیتے تو کبھی یہ تباہی نہیں آتی۔ وہاں تم نے جا کر جتنا جتنا کسی سے بن پڑا اس نے سمیٹنے کی فکر کی یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس پہ کوئی مواخذہ نہیں کرے گا کوئی گرفت نہیں کرے گا۔ تم بھول گئے کہ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (23:79)۔ تمہارا ہر قدم تو ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے مگر یہ تم ہو کہ اس کے متعلق سوچتے ہو کہ کوئی پوچھنے والا مواخذہ کرنے والا ہی نہیں ہے حالانکہ یہ کہا گیا ہے کہ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (2:46); (2:156) یہ اپنے قدم سے کشاں کشاں اس کی طرف چلے آ رہے ہیں خود بخود اس طرف چلے آ رہا ہے۔

① ہم نے اس بلاوے کو سن لیا اور ہم اس کی فرمانبرداری کے لیے تیار ہیں۔ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (24:51) یہ ہیں وہ لوگ جن کی کھیتیاں بار آور ہوں گی اور وہ کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے (پرویز: مفہوم القرآن ص 809)۔

## قوموں کی موت و حیات خدا کے عطا کردہ پیمانوں کے مطابق ہوتی ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ اس کی بارگاہ کی طرف چلے آ رہے ہیں **هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ** (23:80) جس کے قانون کے تابع قوموں کی موت و حیات چلتی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم پہ سورج طلوع ہوا ہے اور روشنی آگئی ہے تو ہم پہ رات نہیں آئے گی اور یہ جن کو ہم نے تاریکیوں میں رکھا ہوا ہے ان پہ کہیں سحر طلوع ہی نہیں ہوگی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تاریکی اور روشنی یہ دن اور رات ان کے قوانین کے تابع چلتے ہیں۔ یہ تو استدلال ہے کہ **لَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ** (23:80) یہ دن ہے اور اس کے بعد رات بھی ہے اور جن پہ رات ہے اس کے بعد دن بھی ہے۔ یہ ان کے قوانین کے تابع نہیں ہوتا۔ یہ جسے استدلال قومی کہا گیا ہے یہ قوموں کے اندر تبدیلیاں ہیں جو ہمارے قوانین کے تابع واقع ہوتی ہیں اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ **أَفَلَا تَعْقِلُونَ** (23:80) یہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

جب ہم لیل و نہار کا تغیر کہتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چوبیس گھنٹے کے دن اور رات ہیں۔ اس میں تو عقل سے کام لینے کا کچھ سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ جو تغیرات ہیں یہ ہمارے قوانین کے تابع واقع ہوتے ہیں۔ ان سے یہ کچھ کہو اور انہیں کھل کر بتادو کہ عقل و فکر سے کام لو مگر یہ ہیں کہ **بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ** (23:81) کسی دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ مولوی صاحب! دیکھنا ذرا کتاب میں کہ ہمارے اسلاف نے اس کے متعلق کیا کہا ہے۔ قرآن کریم ان سے کہتا ہے کہ عقل و فکر سے کام لو مگر وہ ہیں کہ بھیڑ کی طرح کرتے ہیں مثلاً اگلی بھیڑ جدھر چلی جا رہی ہے وہ بھی اسی سمت چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! انہوں نے یہ کہا تھا کہ یہ اس قسم کی باتیں کرنے والے ہنستے ہی رہتے ہیں اس قسم کے ڈراوے دیتے ہی رہتے ہیں۔ **قَالُوا إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ۖ إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ** (23:82) یہ کہہ رہا ہے کہ مر جاؤ گے مٹی اور ہڈیوں کا ڈھیر ہو جاؤ گے تو پھر بھی اٹھائے جاؤ گے زندگی ہوگی تم سے پوچھا جائے گا تمہارا مواخذہ کیا جائے گا حساب کتاب ہوگا Accountability (جوابدہی) ہوگی۔ **لَقَدْ وَعَدْنَا نَحْنُ وَ آبَاؤُنَا هَذَا مِنْ قَبْلُ** (23:83) اس سے پہلے ہمارے ہاں کے اسلاف کو بھی یہ کچھ کہنے والے آئے تھے۔ کہتے چلے گئے یہ شخص بھی یہی دہرا رہا ہے جو ہم سے یہ کچھ کہہ رہا ہے۔ کہا کہ **إِنْ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ** (23:83) یہ وہ کہانیاں ہیں جو شروع سے اسی طرح سے چلی آ رہی ہیں بس کہانیاں ہیں جو کہہ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! گھڑی پرانی ہو جائے تو اس کا ایک فائدہ تو ہوتا ہے کہ چلنی بند ہو جاتی ہے۔ جہاں سے ہم نے شروع کیا تھا میری گھڑی اب بھی وہیں کھڑی ہے تو اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ میں ابھی سمجھتا ہوں کہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔<sup>①</sup>

① یاد رہے اس زمانے میں درس ڈیڑھ گھنٹہ کا ہوا کرتا تھا۔

## قرآن حکیم کے نزدیک خدا تعالیٰ کو ماننے کا ایک الگ تصور ہے

عزیزانِ من! کہا کہ بات یہ نہیں ہے کہ وہ کیونٹ ہیں، یہ ملحد ہیں، اور خدا کو نہیں مانتے۔ یہ بات پہلے بھی آگئی ہوئی ہے مگر وہ آیات آج آئی ہیں۔ اس لیے اسے میں دہرا دوں کیونکہ وہ بات کہ میں خدا کو مانتا ہوں بڑی بنیادی ہے، عزیزانِ من! ہم سب یہ بات کہتے ہیں کہ ”میں خدا کو مانتا ہوں“ کیا کبھی آپ نے سوچا بھی ہے کہ خدا کو مانتا ہوں کے معنی کیا ہے؟ اسے دہرا دوں جو میں نے اس دن نزولِ قرآن کے جشن کے وقت کہا تھا۔ نزولِ قرآن کریم کے وقت رسول اللہ ﷺ کے سامنے اہل کتاب تھے، یہودی تھے، نصاریٰ تھے۔ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ وہ خدا کو مانتے تھے، وحی کو مانتے تھے، رسولوں کو مانتے تھے، کتابوں کو مانتے تھے، آخرت پہ بھی ایمان رکھتے تھے پھر بھی انہیں دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ، خدا پر ایمان لاؤ اور میں نے کہا کہ جنہیں ہم آج قریش کہتے ہیں یا جنہیں مشرکین کہا جاتا ہے وہ اہل کتاب سے الگ کہا جاتا ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ وہ بھی خدا کو مانتے تھے۔ لمبی چوڑی تاریخ میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے والد ماجد کا نام تو عبد اللہ تھا، اللہ کو وہ بھی مانتے تھے یعنی ان کے ہاں نام بھی اللہ ہی تھا۔ وہ اس عربی زبان میں اللہ کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود ساری عمر حضور ﷺ ان کو دعوت دیتے رہے کہ آؤ، اللہ کو مانو۔ یہ کیا بات ہے؟ یورپ کے سارے سائنٹسٹ خدا کو مانتے ہیں۔ اس میں چند ایک مستثنیات نکلیں گی کہ جو یوں نہیں مانتے لیکن ان کے ہاں بھی لفظ کا فرق ہے۔ وہ خدا نہیں کہتے وہ اس کو قانونِ فطرت کہہ دیتے ہیں۔ چلیے باقی تو سارے خدا کو مانتے ہیں تو پھر آپ بھی کہتے ہیں ہم خدا کو مانتے ہیں، وہ بھی کہتے ہیں خدا کو مانتے ہیں۔ انہیں آپ کا فر کہتے ہیں، تو وہ کیا بات ہے، وہ تو انکار نہیں کرتے۔ یہ جو ایک لفظ ماننا ہے اس کے لیے سن رکھیے کہ یہ الفاظ بڑے گمراہ کن ہوتے ہیں کیونکہ ان سے Self deception (خود فریبی، فریب نفس) ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ بات کہ انسان مرنے کے بعد زندہ ہوتا ہے وہی ہے جس کا ہم سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد سے اسی طرح وعدہ ہوتا چلا آ رہا ہے لیکن آج تک کسی نے مردے کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا اس لیے جو کچھ ہم سے کہا جا رہا ہے بجز ایں نیست کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں دہرایا جا رہا ہے۔ تم ان سے اس باب میں زیادہ بحث نہ کرو۔ ان کے نظامِ زندگی کے متعلق بات کرو۔ ان سے پوچھو کہ قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (23:84) اگر تم جانتے ہو تو یہ بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ کس کی ملکیت ہے؟ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ (23:85) یہ تسلیم کریں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ تو پھر ان سے کہو کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (23:85) کیا اس کے بعد حقیقت کو بھی سامنے رکھتے ہو یا بس اتنی سی بات ہی کہہ دیتے ہو کہ ہاں خدا نے وہ بنایا ہے؟ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (23:86) ان سے پوچھو کہ کائنات کی بلندیوں میں

یہ جو اتنے عظیم فضائی کرّے ہیں ان کے اوپر کس کا کنٹرول ہے؟ سَيَقُولُونَ لِلّٰہ (23:87) کہیں گے کہ اللہ کا کنٹرول ہے۔ وہ تمام یہ کہتے ہیں کہ

### ① Sovereignty in the outer Universe belongs to Allah

دیکھتے ہیں کہ اس کا ترجمہ ہو رہا ہے کہ خارجی کائنات میں اقتدار اعلیٰ خدا کا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ (23:87) آخر کیا تم اس کی نگہداشت بھی کرتے ہو جو کچھ تم کہتے ہو؟ تم جو اشیائے کائنات پر اُس کے کنٹرول کے بجائے اپنا کنٹرول رکھنا چاہتے ہو تو تم اس طرح خدا کا مقابلہ کرنے کے انجام سے ڈرتے ہو؟ کیا تم اس تباہی سے بچنا نہیں چاہتے جو تمہاری اس غلط روش کا لازمی نتیجہ ہے؟ آگے بات آئے گی کہ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (23:88) کہتا ہے کہ علم کی بارگاہ سے پوچھ کر بتاؤ کہ یہ قوانین کس کے اقتدار میں کس کے قبضہ قدرت میں ہیں؟ یہ قوانین جس کے اقتدار میں ہیں اس کے ماتحت یہ کارگہ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہی ہے۔ یہ ایسا اقتدار ہے کہ جو اس کی پناہ میں آجائے اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا، لیکن جو اس کے قوانین سے سرکشی اختیار کرے اسے کائنات میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ وہ کون ہے کہ جب خطرات کا سامنا ہوتا ہے، سیلاب آتا ہے تو اس سے بچ کے بھاگ کے جاتے ہو؟ کہاں جاتے ہو؟ اس کے بتائے ہوئے قانون کے تابع تم پناہ لیتے ہو اور جو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے کہیں پناہ نہیں ملتی۔ کہو کہ وہ کون ہے؟ اس پر کہا کہ سَيَقُولُونَ لِلّٰہ (23:89) کہیں گے یہ بھی خدا ہے۔ کہا کہ قُلْ فَأَنِّي تُسْحَرُونَ (23:89) پھر ان سے پوچھو کہ یہاں تک تو سارا خدا کو مانتے ہو جب اپنی دنیا میں آتے ہو تو وہاں کیا تمہیں موت پڑ جاتی ہے، تمہیں دھوکا لگتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق نہیں۔ یہاں تسحرون کا لفظ آیا ہے۔ یعنی وہاں کون سی چیز ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی، تمہیں دھوکا لگ جاتا ہے، سحر ہو جاتا ہے، تمہاری مت ماری جاتی ہے؟ کیا بات ہے جو آگے ایک قدم بھی نہیں اٹھاتے؟ اپنی دنیا کی طرف بھی تو آؤ، اَللّٰہُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ مَن ذُو الْعَرْشِ الْمُبِیْنُ (2:255) خدا کو تو مانتے ہو، خدا کو تسلیم کرتے ہو، خدا خدا کہتے ہو، کیا اسے اللہ الارض مانتے ہوئے تمہیں موت پڑ جاتی ہے؟ اسے اللہ الارض بھی تو مانو۔

ہمیں بھی قرآن کریم میں دیئے گئے خدا کے تصور پر عملاً ایمان لانا ہوگا

عزیزانِ من! خدا نے اللہ السماء اور اللہ الارض کی دو باتیں خود کہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا بات تھی جو قرآن ان اہل کتاب سے بھی کہتا تھا کہ ایمان لاؤ، ان مشرکین سے بھی کہتا تھا کہ ایمان لاؤ اور اگر میں ایک قدم آگے بڑھوں تو وہ کہتا ہے کہ یا ایہا الذین امنوا



امنوا بالله (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! ایمان لاؤ خدا پہ۔ چل بھی! وہ قریش اور اہل کتاب کی باتیں تو پرانی ہو گئی تھیں، وہ تو ہمیں بھی کہہ رہا ہے کہ خدا پر ایمان لاؤ۔ میں خدا کو مانتا ہوں کہنے سے بات پوری نہیں ہوتی۔ اس باب میں سنئے، قرآن کیا کہتا ہے؟ آپ اس میں ایمان کے ایک لفظ کا اضافہ کر لیں گے یعنی آپ مانتا ہوں سے پہلے ایمان کے لفظ کا اضافہ کر لیں تو پھر وہ بات صاف ہو جائے گی۔ وہ ہوگا قرآن کا مطالبہ: ایمان اور خدا کو مانتا ہوں۔ اے گل جیہڑی اسی سندے ترے اونے آں اسی طرح سے کہہ دیتے ہیں۔<sup>①</sup> ہم کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں۔ ”ایمان سے کہو کبھی کھڑے ہو کر سوچا کہ جیسا کہتا ہوں میں خدا کو مانتا ہوں تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ بس اسے دہرا دیتے ہیں۔

عزیزانِ من! میں اس قسم کی بیسیوں آیات پیش کر سکتا ہوں۔ اس وقت ایک ہی آیت پیش کروں گا۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اَفْغَيِّرَ اللَّهُ اَبْتَغِي حَكَمًا (6:114) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو فیصلہ دینے والا، حکومت کرنے والا، حکم چلانے والا، ماننے لگ جاؤں؟ نہیں اب حکم آ گیا۔ میں خدا کو حاکم مانتا ہوں۔ یہ ہو گیا جی ایمان! کہ اسے حکم مانتا ہوں، اُسے فیصلہ دینے والا مانتا ہوں، مانتا ہوں کہ حکومت اُسی کی ہے، مانتا یہ ہوں کہ تمام معاملات کے فیصلے اسی کی رو سے کرانے ہوں گے۔ خدا کو میں حاکم مانتا ہوں: اَفْغَيِّرَ اللَّهُ اَبْتَغِي حَكَمًا (6:114) کیا تم مجھے یہ کہتے ہو یہ جو کائنات خدا کو ماننے والے تھے، کیا تم اپنی طرح مجھے بھی یہ کہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو حکم تسلیم کر لوں؟ اب یہ بات بھی Abstract (غیر محسوس) رہ جاتی ہے کہ ٹھیک ہے جی ہم تو خدا کو احکم الحاکمین مانتے ہیں کہ تیرے اوپر کوئی حاکم نہیں ہے جو تیرے فیصلوں کو بدل دے۔ احکم الحاکمین (8:95; 11:45) قرآن میں آیا ہے۔ ہم تو یہ مانتے ہیں کہ وَهُوَ الَّذِي اَنْزَلَ اِلَيْكُمْ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (6:114) اس نے اپنا ضابطہ قوانین تمہاری طرف بھیج دیا ہے جو بڑا ہی نکھیر<sup>②</sup> کربات بیان کرتا ہے۔ اس کا جو حکم ماننا ہے وہ خدا کو حکم ماننا ہے۔ اس کا نام ہے خدا پر ایمان، خدا کی کتاب کو ضابطہ حکومت ماننا۔ یہ ہے خدا پر ایمان۔

دو ٹوک بات ہے، عزیزانِ من! اگر اس خدا کے سوا آپ نے کسی اور کو بھی حکم مان لیا تو خدا پر ایمان نہیں رہا، خدا کو ماننا نہیں رہا۔ یہ بالکل کفر ہی ہو گیا، انکار ہی ہو گیا۔ اگر کچھ اس سے بھی لے لیا اور کچھ اپنے بنائے ہوئے قوانین لے لیے تو یہ شرک ہو گیا۔ دونوں ہی خدا سے انکار ہیں تو خدا کا ماننا یہ ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اَفْغَيِّرَ اللَّهُ اَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي اَنْزَلَ اِلَيْكُمْ الْكِتَابَ

① یہ بات جو ہم سنتے چلے آ رہے ہیں اسی طرح کہہ دیتے ہیں۔

② واضح اور نکھار کر۔

مُفَصَّلًا ط وَ الَّذِينَ آتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنْزَلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ (6:114)۔ جنہیں یہ کتاب دی گئی ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب کسی انسانی حکومت کا ضابطہ قوانین نہیں ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ وہ اسے مانتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے خدا کا ماننا۔ کہا کہ یہ سارا کچھ خدا کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بھی خدا کرتا ہے وہ بھی خدا کرتا ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ انہیں اس بات میں کہیں دھوکا لگتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ رسول ان کے سامنے حق پیش کرتا ہے اور چونکہ حق ان کی مفاد پرستیوں کے خلاف جاتا ہے اس لیے یہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں حالانکہ بَلْ آتَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (23:90) اس نے جو یہ کتاب بالحق نازل کی ہے وہ اسے حکم نہیں مانتے۔ بات ختم ہو گئی۔

### روس میں مسلمانوں کے لیے مذہبی آزادی کی کیفیت

یہ جو قرآن نے کہا تھا کہ قُلْ فَإِنِّي تُسْحَرُونَ (23:89) ان سے پوچھو کہ تمہیں کہاں دھوکا لگتا ہے یا کہاں دھوکا دیا جاتا ہے یا کہاں فریب دیتے ہو؟ یہ جو آج کا نظام ہے جسے سیکولر نظام (Secular system) کہتے ہیں اس میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی جاتی ہے۔ یہ ابھی دو چار دن <sup>2</sup> ہی ہوئے ہیں کہ (USSR) Russia کی طرف سے کچھ سیکولر اسٹائل چیزیں آنی شروع ہوئی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ریشیا (روس) تو بہر حال وہ ملک ہے جو خدا کو اتنا بھی نہیں مانتا۔ آپ کے ہاں سب سے بڑا ملحد بے دین، کافر، خدا کا نہ ماننے والا وہ کمیونسٹ ہے۔ انہوں نے اس سیکولر اسٹائل چیزوں میں لکھا ہے کہ ”سوویت یونین (USSR) میں مسلمانوں کی انجمنوں کی بڑی تعداد کا تعلق سنی فرقے سے ہے۔ یہاں ہمارے ہاں مساجد میں روزانہ نمازوں کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے، مسلمان اپنی عیدین بڑے ہی اہتمام سے مناتے ہیں، ماسکو کی مسجد میں عید کے موقع پر عموماً پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ سوویت یونین (USSR) کے مسلمان اپنے عقائد کے مطابق ساری مذہبی رسمیں ادا کرتے ہیں، نماز جنازہ وغیرہ اور مسلمان خاندانوں میں شادیاں اسلامی عقائد کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ سوویت یونین کے مسلمان فریضہ حج ادا کرتے ہیں۔ مساجد میں لائبریریاں ہیں، ان کتابوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں کے مسلمان جنتریاں فتوے وغیرہ بھی شائع کرتے ہیں۔ آپ کے قرآن شریف کے اور ایڈیشن کی اشاعت

① ان سے پوچھو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر کسی اور کے قانون کے مطابق تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھر ا ہوا ضابطہ قوانین بھیج دیا ہے۔ جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے (یعنی جماعت مومنین کے ارباب علم و بصیرت: 74:31) وہ اس حقیقت کو پاگئے ہیں کہ یہ فی الواقعہ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 317)۔

② یاد رہے یہ بات جولائی 1977ء کی 29 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مذہبی آزادی کی باتیں کی جارہی ہیں۔ آخر میں جا کر لکھا ہے کہ سوویت یونین نے ریاست کو مذہب سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ بس اینی جی، گل سی۔<sup>①</sup> پہلا خدا کو ماننے کا سارا حصہ ریاست کو مذہب سے الگ کرنے کا ہے۔ انہیں تو اتنا ہی پتہ ہے کہ یہ لوگ مذہب کے نام پر خواہ مخواہ دخل نہ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں بھی پتہ نہیں ہے کہ بات کیا ہے۔

## تحریک پاکستان کی جنگ اور علامہ اقبالؒ کا ”خواب“

”مذہب اور ریاست ایک ہوتا ہے“ کے معنی کیا ہوتے ہیں، ہمیں بھی اس کا پتہ نہیں ہے۔ اب بات یاد آگئی، عزیزانِ من! تحریک پاکستان کی تاریخیں تو بہت لکھی گئیں مگر آپ کو کوئی ایک تاریخ بھی ایسی نہیں ملے گی جو یہ بتائے کہ اصل جھگڑا کیا تھا۔ سارا جھگڑا ہی یہ تھا کہ مذہب اور ریاست کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔ وہاں ہندو مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا تھا اور ہمارے ہاں کے نیشنلسٹ علمائے کرام اس معاملے میں مسلم لیگ یا محمد علی جناحؒ (1876-948) سے جھگڑتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہاں کا اکثریت میں رہنے والا ہندو ہمیں ضمانت دیتا ہے۔ انہوں نے لکھ کے دے دیا تھا کہ آپ کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ وہ بحث جو ”معرکہ دین و وطن“<sup>②</sup> کے نام سے علامہ اقبالؒ (1877-1938) اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) (1879-1957) میں جاری ہوئی تھی اس کی تفصیل پڑھ کے دیکھیے۔ مولانا مدنی<sup>③</sup> بار بار یہی کہتے تھے کہ آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھیے، کانگریس کی طرف سے چارٹر پاس ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو نماز روزہ حج، زکوٰۃ اور مناسک عیدین وغیرہ کی اجازت ہے، وہ اس کی گارنٹی دے رہے ہیں، اسلام کی اجازت مل رہی ہے باقی یہاں جو حکومت ہے وہ جمہوری طریقے پر ہوگی، آپ کو اس پر کیا اعتراض؟ ادھر سے اس کا جواب یہ تھا کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

[اقبالؒ]

① بس بات اتنی سی ہی تھی۔

② علامہ محمد اقبالؒ نے ارغمانِ حجاز (اردو) میں حسین احمدؒ کے زیر عنوان یہ اشعار کہے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ، ورنہ	ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بواجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است	چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست	اگر بہ او نرسیدی ، تمام بولہبی است

③ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) (1879-1957ء)

## قرآن کی ضوابط کو عملی شکل دیئے بغیر خدا پر ایمان قابل قبول ہی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مناسکِ حج اور شادی، طلاق وغیرہ کی یہ ساری اجازتیں ہوں اور خدا کی کتاب کو فیصلہ کرنے والا قانون نہ تسلیم کیا جائے تو قرآن اسے خدا پر ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ نماز روزہ تو بعد کی بات آتی ہے۔ اور خدا ہی کو نہیں مانتے تو نماز کس کی پڑھتے ہو۔ ماننے کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ اس کی کتاب کو حکم مانا جائے۔ تحریک پاکستان میں جھگڑا ہی یہ تھا لیکن ہمارے ہاں تو عجیب تماشا ہوتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ بیچارہ وہی بھولا بھالا<sup>1</sup> سا، کیا کہہ گیا؟ کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس<sup>1</sup> نے تو اس کا ترجمہ کیا تھا کہ اگر آپ کے ہاں مملکت کا مدار قانونِ خداوندی پر نہیں ہے، خدا کی کتاب آپ کی مملکت کا ضابطہ آئین و قانون نہیں ہے، تو پھر آپ جس طرز کی بھی حکومت قائم کریں گے چنگیزیت ہی ہوگی۔ انہوں نے بڑی صحیح بات کی۔ میں تو کسی خاص ضابطہ پر تبصرہ نہیں کیا کرتا۔ پچھلے دنوں یہاں جو کچھ ہنگامے ہوئے ان سے کہا گیا کہ اے مسیت انج اینے روڑے جمع کر دے ہو اینا ایناں جمع کر دے پئے ہیگے اڈاے سارا کچھ جیہڑا ہیگا اڈاے جھگڑا ہوں واسطے فساد دنگا خون ریزی واسطے!<sup>2</sup> کہا کہ مسجد کا احترام تو کرو۔ تم لوگ ہم سے یہ کیا کہتے ہو! کہا گیا کہ صاحب! جدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔ اسلام تو دین ہے، اسلام میں تو دین اور سیاست الگ الگ ہوتے ہی نہیں۔ اب آ کے کہنے لگے کہ آپ تو چالیس برس سے ہمیں یہ وعظ کہتے ہوئے تھکتے نہیں تھے کہ اسلام میں سیاست اور دین کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ عزیزانِ من! یہ تھی وہاں مذہبی آزادی کی بات۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ رشیا کو تو یہ سارے ملحد و بے دین کہیں گے سب سے زیادہ کمیونسٹ ہے۔ اس کمیونسٹ نے یہ اعلان کر دیا کہ ہمارے ہاں بھی اس کی آزادی ہے اور تم تو اسی کا نام اسلام رکھ رہے ہو۔ یہ کل کی بات ہے اور آج آپ کے ہاں بھی عزیزانِ من! کون سی خدا کی کتاب حکم ہے؟ وہی آزادیاں ہیں، دو چار شقیں اور اس میں اضافہ کر دیجیے۔ بات تو یہ ہے جو قرآن خدا پر ایمان کی کہہ گیا ہے۔

اب میں یہ دہرا دوں کہ خدا پر ایمان کے معنی ہیں کہ خدا کی کتاب کو حکم، ضابطہ قانون، فیصلہ کن حقیقت، Sovereignty (اقتدار اعلیٰ) تسلیم کر لیا جائے گا۔ عملاً یہ خدا پر ایمان ہوگا اور اگر اسے حکم تسلیم نہیں کیا جائے گا تو میں خدا کو مانتا ہوں، خدا کے میزان میں کوئی وزن

<sup>1</sup> یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

<sup>2</sup> یہ جو مسجد میں اتنے اینٹوں کے ٹکڑے جمع کر رہے ہو، اتنی اینٹیں جمع کر رہے یہ سارا کچھ مسجد میں دنگا فساد اور خون ریزی کے لیے ہے۔

نہیں رکھتا۔ یہودی مانتے تھے عیسائی بھی مانتے تھے مشرکین بھی مانتے تھے آج آپ کے ہاں کمیونسٹ رشتیا میں رہنے والا مسلمان بھی مانتا ہے مگر یاد رکھیے! جہاں بھی خدا کی کتاب حکم نہیں ایمان نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ تم خدا پر ایمان کے مدعی ہو اور اپنے معاملات کو غیر خداوندی قوتوں اور قوانین سے طے کراتے ہو اور اس کا نام ایمان رکھتے ہو۔ تو اسلام میں یہ ایمان نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دین اور سیاست الگ الگ نہیں ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ المؤمنون کی آیت 90 تک ہم آگئے 91 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ



## چودھواں باب: سورة المؤمنون (آیات 91 تا 98)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج اگست 1977ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 91 سے ہوتا ہے: (23:91)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں بات یہ چلی آ رہی تھی کہ جس سے بھی پوچھیے وہ کہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں لیکن ذرا کھڑے ہو کر اس سے پوچھیے کہ یہ آپ مانتے کیا ہیں؟ خدا کو مانتا ہوں کے معنی کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ صرف اسی ایک بات پہ ہی نہیں، یہ جو روزمرہ اس قسم کی اصطلاحات اور الفاظ استعمال کرتے ہیں، کبھی کسی سے پوچھیے گا کہ صاحب! اس کا ذرا مفہوم تو بتا دیجیے۔ خدا کو مانتا ہوں مسلمانوں ہونے کی دلیل ہوگئی اور میں نے کہا تھا کہ نزولِ قرآن کے وقت سے ہی اگر اسے لے لیجیے تو یہ اہل کتاب، عیسائی، یہودی وغیرہ خدا کو تو ایک طرف رہا، یہ تو خدا کو رسولوں کو ملائکہ کو آخرت کو کتابوں کو جو آپ پانچ اجزائے ایمان کہتے ہیں، وہ تو سب انہیں مانتے

تھے۔ مشرکین کے متعلق آپ کہیں گے کہ وہ دوسرے تھے، ان سے الگ تھے۔ میں نے کہا تھا کہ مشرکین کے متعلق خدا خود کہہ رہا ہے کہ ان سے بھی پوچھو کہ بارش کون برساتا ہے؟ وہ کہیں گے کہ خدا برساتا ہے۔ ان سے پوچھو کہ یہ کائنات کس نے تخلیق کی؟ یہ کہیں گے کہ کائنات خدا نے تخلیق کی حتیٰ کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ مشرکین عرب، جنہیں آپ ججاز کے یا قریش کے یا جتنے بھی یہ قبائل تھے، ان میں خود رسول اللہ ﷺ کے والد ماجد کا نام عبد اللہ تھا۔ یہ تو حضور ﷺ کی پیدائش سے بھی پہلے کا نام رکھا ہوا ہے۔ نبوت اور رسالت تو ایک طرف رہی یہ عبد اللہ تو وہ نام رکھتے تھے۔ وہ اللہ کو مانتے تھے۔ قرآن شہادت دیتا ہے کہ مانتے تھے تو پھر یہ کیا بات ہوئی؟

آپ بھی کہتے ہیں کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور قرآن انہیں دعوت دیتا ہے کہ یہ مانتا ہوں والی بات میں نہیں مانتا۔ پھر میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے خود ہی بتایا کہ خدا کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب کو زندگی کے ہر معاملے میں قول فیصل، حکم اور فیصلہ کرنے والا مانیں۔ یہ اگر مانتے ہو تو یہ خدا کا ماننا ہے۔ اگر وہ یہ نہیں ہے تو پھر وہ یہود و نصاریٰ، مجوس، بت پرست، مشرک اور کافر سب خدا کو مانتے ہیں تم بھی مانتے ہو اور اسی لیے جب اس نے اہل کتاب سے کہا تھا کہ ایمان لاؤ، قریش سے کہا تھا اور مشرکین سے کہا تھا کہ ایمان لاؤ تو کہا تھا کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! تم بھی خدا پر ایمان لاؤ۔ خدا تو ہم سے بھی یہی مطالبہ کرتا ہے لیکن جس سے پوچھیے وہ کہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ عزیزانِ من! جو کچھ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے، جو کچھ آپ کہتے چلے جا رہے ہیں، جو کچھ سنتے چلے جا رہے ہیں، جب تک کھڑے ہو کر آپ اس پر غور نہیں کریں گے آپ دین تک نہیں آ سکتے۔ آنکھیں بند کیے مذہب کی روش پہ تو چلتے جائیے۔ اب وہ یہ کہتا ہے کہ اس کا تکرار اور تضاد اس بات پہ تھا، مطالبہ یہ تھا، تقاضا یہ تھا کہ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا<sup>①</sup> (2:137) یہ جو ہم نے بات کہی ہے کہ یہ ہے خدا کا ماننا، اس طرح سے اگر خدا کو مانیں تو پھر سمجھا جائے گا کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ اسے ہی حق پہنچتا ہے یہ کہنے کا کہ میں خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہوں ورنہ نہیں۔ خدا کہتا ہے ہم تو مانتے ہی نہیں کہ تم خدا کو مانتے ہو۔

## خدا تعالیٰ کے متعلق انجیل کا بیان

قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب کی بات لے لیجیے مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَ مَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ إِذَا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَهٍ بِمَا

① ان سے کہو کہ یہ ہے ہماری دعوت۔ اگر یہ لوگ بھی اسی طرح اس ضابطہ حیات پر ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو اس وقت یہ خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہوں گے (پرویز: مفہوم القرآن ص 49)۔

خَلَقَ وَ لَعَلَّا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ ط سُبْحَنَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ<sup>①</sup> (23:91)۔ یہ کہتا ہے کہ ان عیسائیوں کو لے لیجئے: صاحب! خدا کو ماننا ہوں سب سے پہلے۔ آگے بڑھتے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ کہیں وہ اپنے نبی کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، کہیں اسے خود خدا ہی بنا لیتے ہیں، کہیں اس کی ہمسر صاحب اقتدار ہستی بنا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں تیسرا حصہ خدا ہی کا ہے، اس کی الوہیت کا ہے۔ یہ تینوں چیزیں ان کے ہاں انجیل میں موجود ہیں۔ خدا کا بیٹا تو وہ خود کہتے چلے آ رہے ہیں۔ میں اور میرا خدا ایک ہیں۔ یہ ان کی انجیل میں ہے کہ

I and my father are one<sup>②</sup>

یعنی میں اور میرا باپ، ہم دونوں ایک ہی ہیں، خدا کو وہ باپ کہتے تھے، گویا یہ ان کے عقائد تھے۔ انہیں قرآن مسترد قرار دیتا ہے اور کہتا ہے اویہ خدا کو ماننا نہیں ہے، غضب خدا کا، یہ کیا کیا عقائد تم لیے بیٹھے ہو۔ پھر اگلی چیز یہ ہے کہ مَا كَانَ مَعَهُ مِنَ اللَّهِ (23:91) اس کے ساتھ کوئی الہ نہیں ہے۔

### عیسائیت کی پیروی میں مسلمانوں کے وضع کردہ عقائد

یہاں تک کے بعد تو آپ کہیں گے کہ یہ بات آگے چلی۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ سمجھ میں آئی ہوئی ہے اور پھر سمجھ میں نہ آنے والی بات کون سی ہے۔ ہمارے ہاں تو عیسائیوں کے ساتھ بہت سے مناظرے<sup>③</sup> ہوتے ہیں۔ اب تو وہ روش کم ہو گئی ہے اور ان مناظروں کے موضوع بھی بدل گئے ہیں۔ وہ تو گزشتہ تین چار مہینے میں آپ نے ہوتے دیکھے ہیں۔ مناظروں کے موضوع جب مذہب کے ہوتے تھے تو عیسائیوں کے ساتھ مناظرہ ابن اللہ پہ، تصلیب پہ، الوہیت مسیح پہ ہوتا تھا اور مسلمان مناظر اس جرأت اور بیباکی سے ان کی تردید کرتے تھے۔ حق بھی یہی تھا اور پھر بڑے فاتحانہ انداز سے وہاں آتے تھے۔ ٹھیک ہے کہ کدی اپنی منجی تے بہہ کے نہیں سوچا۔<sup>④</sup> مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔

① (ان سے پوچھو کہ خدا کے علاوہ وہ کون ہے جس کے اقتدار و اختیار کے ماتحت تم رہنا چاہتے ہو؟) اُس کا کوئی بیٹا نہیں (کہ تم بادشاہ کو چھوڑ کر دوسرے کی حکمرانی تسلیم کر لو اور اس کی مملکت میں چلے جاؤ۔) ان سے کہو کہ اگر ایسا ہوتا کہ یہاں ایک سے زیادہ صاحب اقتدار ہستیاں ہوتیں تو ہر ”خدا“ اپنی اپنی مخلوق کو اپنے ساتھ لے لیتا اور اس طرح یہ سب ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے (جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں میں ہوتا ہے۔) بہر حال یہ لوگ خدا کے متعلق جس قسم کا تصور رکھتے ہیں، وہ اس سے بہت بلند اور منزہ ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 788)۔

② میں اور میرا خدا ایک ہی ہیں۔

③ یاد رہے کہ یہ بات اگست 1977ء کی 5 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

④ کبھی فارغ ہو کر خود نہیں سوچا (کہ یہ ہے کیا؟)



## عقیدہ حلول کے متعلق پائے جانے والے تصورات

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں اعتقادات و عقائد کیا ہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ مسیح<sup>1</sup> خدا کا عبد اور اس کا رسول ہے۔ آپ کے ہاں بھی خدا کا ایک عبد اور رسول ہے۔ ہم عبدہ و رسولہ کہتے ہیں۔ آپ نبی اکرم ﷺ کو عبد اور رسول کہتے ہیں وہ جو عیسائی ہیں وہ حضرت عیسیٰؑ کے مقدس اور بزرگ رسول کو Apostles کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ انہیں اپنے رسول بنائے ہوئے تھے۔ وہ درحقیقت ہیکل کے اعلیٰ منصب دار تھے جو پیشین گوئیاں کرتے اور قسمت کا حال بتاتے تھے۔ ان کے ہاں نبی غیب کی خبریں دینے والا تھا۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے۔ عبد اور رسول آپ کے ہاں اسلام میں ہیں۔ نبی اکرم ﷺ آخری عبد اور رسول ہیں یہ قرآن کہتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ جو خدا ہے وہی مسیح کی شکل میں دنیا میں آ گیا ہے۔ یہ بات نظری سی ہو جائے گی۔ میں عرض کروں کہ ایک چیز تھی وہ تھا کوئی پرانا عقیدہ جاہلیت کا جو چلا آ رہا تھا اور اب بھی چلا آ رہا ہے۔ وہ اسے حلول کہتے تھے کہ خدا نے اپنے آپ کو اس میں حل کر دیا ہے اور ادھر اتار<sup>2</sup> کا ایک عقیدہ ہوتا تھا کہ وہ خود خدا ہی ہے جو اس طرح سے آ گیا ہے۔ عیسائی تو پھر بھی حلول تک ہی مانتے تھے۔ یہ جو عقیدہ ہے کہ خود خدا ہی اس رسول اللہ نبی اکرم ﷺ کی شکل میں آ گیا ہے یہ عیسائی نہیں مانتے تھے۔ خیر سے مسلمان کا ایک

1 نزول قرآن کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں کی افراط و تفریط انتہائی گوشوں تک پہنچ چکی تھی۔ عقائد کے

لحاظ سے عیسائی: (1) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ مانتے تھے۔

(2) ابن اللہ ہی نہیں بلکہ خود خدا بھی۔ (3) تثلیث کے اقامت ثلاثہ (باپ، بیٹا، روح القدس) پر عقیدہ رکھتے تھے۔

(4) آپ کے اور حضرت مریمؑ کے مجسموں کی پرستش ہوتی تھی۔ (5) آپ کی تصلیب کو نوع انسانی کے گناہوں کا کفارہ تصور کرتے تھے۔

(6) آپ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ (7) اور آپ کی واپسی کے منتظر تھے۔

(پرویز: شعلہ مستور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور، 1994ء، ص 27)

2 ہندوؤں کے اس عقیدہ اوتار کے معنی یہ ہیں کہ خود الہی طور (خدا) مادی مخلوق کے پیکروں میں نمودار ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں پرہلاد (بھگت کے واقعہ سے متعلق) جیوٹی سے لے کر رام اور کرشن تک اوتار مانے جاتے ہیں۔ یہی عقیدہ مسلمانوں کے ہاں اہل تشیع کے غالی فرقوں میں در آیا۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ حضرت علیؑ کی ذات میں اور ان کی اولاد میں حلول کر آیا تھا۔ اس کے بعد نصیریہ، کیسانیہ، قرامطہ اور باطنیہ فرقوں میں یہ عقیدہ اور بھی تشدد ہوتا چلا گیا۔ وہیں سے یہ عقیدہ صوفیاء کے عقائد میں داخل ہو گیا۔ ان میں حسین بن حلاج اس کا پہلا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کی ذات اس میں حلول کر گئی ہے۔ اسی وجہ سے وہ انا الحق کا نعرہ بلند کرتا تھا۔ اس کی کتاب کا نام ”کتاب الطواسین“ ہے۔

چھوٹا سا فرقہ <sup>①</sup> اسے مانتا ہے۔ انہی میں ان سے مناظرے کرنے والے میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ کس تعجب اور حیرت سے میری طرف تک رہے ہیں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے! جی آپ کے ہاں یہ بڑے دھڑلے سے مانا جاتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر

اس میں قرآن کریم کے الفاظ میں مستوی کے معنی استوا علی العرش (4:57; 4:32; 59:25; 2:13; 54:7) کے ہیں یعنی وہ عرش پہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ پورا شعر یوں ہے:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر  
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

(معاذ اللہ)

اندازہ لگائیے عزیزانِ من! عیسائیوں کے خلاف، الوہیت مسیح کے خلاف، مناظرے کرنے والے ہمارے ہاں یہ اتنی کھلی ہوئی شکل میں غلو کو کس حد تک پہنچا رہے ہیں۔ ہندوؤں کا اوتار ہونے کا عقیدہ تو عیسائیت میں بھی نہیں ہے مگر ہمارے ہاں کے وہ مناظر اس کو بڑے فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں وہ زیادہ سے زیادہ حلول <sup>②</sup> تک پہنچتے ہیں لیکن بہر حال یہاں سوچیے تو سہی

① یہ ہے برصغیر ہندو پاک میں مولانا احمد رضا خاں مرحوم کا فرقہ جو اپنے آپ کو سوادِ اعظم اہل سنت والجماعت سے تعبیر کرتا ہے، لیکن عام طور پر رضائیہ یا بریلوی فرقہ کے نام سے متعارف ہے۔ یہ اس باب میں تشدد عقائد رکھتا ہے۔ رسول اللہ کے ”عین حق“ کے متعلق ان کے اکثر اقوال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ان کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خاں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

هو الاول هو الاخر هو الظاهر هو الباطل      بكل شيء علیم لوح محفوظ خدا تم ہو  
نہ ہو سکتے ہیں دو اول نہ ہو سکتے ہیں دو آخر      تم اول اور آخر ابتدا تم انتہا تم ہو  
خدا کہتے نہیں بنتی جدا کہتے نہیں بنتی      خدا پر ہی یہ چھوڑا ہے خدا جانے کہ کیا تم ہو

(حدائق بخشش، حصہ دوم، ص-104)

② اصولی طور پر ان عقائد کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) حلول: مسلمان صوفیائے کرام میں حسین بن منصور حلاج اس کا پہلا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ (۲) وحدت الوجود: عام الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ جو کچھ نظر آتا ہے سب خدا ہی ہے۔ یعنی خدا ہر شے ہے اور ہر شے خدا ہے۔ اسے شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی نے ایک بڑی مغالطہ آفریں شکل میں پیش کیا ہے۔ (۳) وحدت الشہود: اس عقیدے کی رو سے (۱) کائنات خود خدا تو نہیں لیکن اس کا ظل یا سایہ ہے۔ (ب) جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس کی روح خداوندی کا جزو تو نہیں لیکن انسانی کشف و وجدان کے ذریعے ایسی بلند یوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی ذات ذات خداوندی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اسے ”فانی فی اللہ۔ باقی اللہ“ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غالب کے الفاظ میں ..... عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اسی لیے اولیاء اللہ یا صوفیائے کرام کی وفات کو وصال کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جس کے معنی واصل بالحق ہو جانے کے ہیں۔ اور ان کے یوم وفات کی تقریب کو عرس کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از پرویز: تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ، (رجسٹرڈ) لاہور 1992ء، ص-77, 78, 97)

کہ وہی جو ”مستوی عرش تھا خدا ہو کر“ اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر“ جھوم جھوم کر قوالوں کی زبان سے سنتے ہیں اور ”بزرگان دین سر دھنتے اور وجد میں آتے ہیں۔ اب اور ذرا آگے بڑھے۔ بات شاعروں کے ہتھے چڑھ گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ خدا کی ایک صفت احد ہے۔ اسی لیے خدا کو احد کہتے ہیں یعنی واحد یگانہ Unique۔ نبی اکرم ﷺ کا ایک اسم گرامی احمد بھی ہے۔ دونوں میں حرف ”م“ کا فرق ہے۔<sup>①</sup> اب آئی شاعری۔ بات وہی ہے کہ یہ جو مستوی عرش ہے اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر۔ اب انہوں نے یہ کہا کہ صاحب! احمد میں ”م“ کا وہ حصہ درمیان میں سے کاٹ دو تو احد رہ جاتا ہے۔ خدا مادی پیکر میں دنیا میں نہیں آتا۔ جب وہ مادی پیکر اختیار کرتا ہے تو یوں یہ مادی پیکر ہے جو ”م“ ہے اور یوں بنایا ہے۔ اصل میں یہ وہی احد ہے بس اس نے درمیان میں ”م“ کا پردہ تھوڑا سا رکھ لیا ہے۔ اور اس کو تو پوچھیے نہیں کہ کون کون کس کس انداز میں کیا کیا کہتا ہے کہ

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردہ م کو اٹھا کر

وہ بزم یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ چھپا چھپا کر

آپ اپنے ہاں عقائد دیکھ رہے ہیں۔ وہ صرف پردہ ہے جو پیکر ہے۔ یہ مادی پردہ ہے اور یہ ”م“ کا پردہ ہے جو مادی پیکر آیا تو پھر پوچھیے نہیں کہ اس عقیدے نے کیا کچھ کیا۔ عیسائیت پہ پہنچ کر تصوف نے ایک منظم مسلک (Organised system) کی شکل اختیار کر لی۔ ادھر ہندوؤں کے ہاں عقیدہ اوتار آیا۔ عقیدہ حلولیت نے جڑیں پکڑیں۔ یہ تمام اوتار یا حلولیت شرک تھے، کفر تھے لہذا مسترد کرنے کے قابل۔ یہ آپ کے ہاں کی ساری چیزیں تھیں جنہیں کہتے ہیں کہ جھوم جھوم کے پڑھنے والی ہیں کیونکہ یہ پردہ م کو دیکھ لیتی ہیں، یہ عرب نبی اکرم ﷺ بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر چہ ظاہر میں وہ عرب ہے مگر حقیقت میں ”عرب“ مادی ہے، جی! اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ یہ جھومتے ہیں، پڑھتے ہیں۔ میں فرقہ وارانہ الجھنوں میں نہیں جایا کرتا کیونکہ وہ مرحلہ بڑا نازک سا ہوتا ہے ورنہ میں آپ حضرات کو بتاؤں کہ یہ عقائد کہاں سے آئے۔ شیعہ حضرات کے ہاں کے کچھ غالی فرقے جو ہیں ان کی تفصیل میری کتاب ”شاہکار رسالت“ میں آپ دیکھ لیجیے گا کہ یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں۔ حضرت علیؓ (662-600ء) کے متعلق تو ان کے ہاں وہ عقائد موجود ہیں جن کی رو سے

① ان حضرات نے اس م (میم) کے گرد وہ تانا تبا ہے کہ ”احد“ اور ”احمد“ کو ایک بنا کر چھوڑا ہے۔ مثلاً:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردہ م کو اٹھا کر

وہ بزم یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

جب میم کا پردہ پنجابی صوفیا کے ہاتھ آیا تو انہوں نے اسے نوح کرا لگ پھینک دیا۔ بابا بلھے شاہ کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

احد احمد وچہ فرق نہ بلھیا اک رتی بھر مروڑی دا۔

(احد اور احمد میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ جو تم فرق دیکھتے ہو وہ ایک ذرا ”مروڑی“ (پیچ) کا ہے اور بس۔)

وہ بالکل خدا کے اوتار ہیں۔ آپ یہ سب کچھ دیکھیے اور غور کیجیے۔

### سنی حضرات کے عقائد

عزیزانِ من! امام شافعیؒ نے وحی خفی کا عقیدہ وضع کیا۔<sup>①</sup> جنہوں نے شیعیت کی فضا میں پروان پائی۔ ان پر شیعیت کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ سنیوں کے چار جید امام (امام ابوحنیفہؒ، (80-1500) امام مالکؒ، (93-179) امام حنبلؒ، (164-341) امام شافعیؒ (150-204)) ہیں۔ ان کے ہاں بھی شاہِ ولایت حضرت علیؑ کا متصوفانہ لقب مانا جاتا ہے۔ انہیں سنی بھی جو مقام دیتے ہیں اس پر غور کیجیے گا۔ یہ کہنے والا سنی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”نجد میرا مدینہ ہے“ تو وہ حضرت علیؑ تو مدینے والے رسالت میں آ گئے۔

نجد میرا مدینہ ہے مدینہ میرا کعبہ ہے۔

یہاں سے انہیں منتقل کیا ہے تو وہاں مدینے میں بھیجا اور وہاں سے بھیجا تو پھر ان کو کہاں Accomodate کیا جائے گا۔

نجد میرا مدینہ ہے، مدینہ میرا کعبہ ہے

میں بندہ اور کا ہوں، امت شاہِ ولایت<sup>②</sup> ہوں

شاہِ ولایت حضرت علیؑ (600-662ء) ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسالت تو یہاں آ گئی۔ کہا ہے کہ امت شاہِ ولایت ہوں، میں بندہ اور کا ہوں۔

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو

مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں

آپ اپنے ہاں کے اوتار دیکھ رہے ہیں! وہ رسول اللہ کو خدا اور حضرت علیؑ ♦ کو رسول قرار دیتے ہیں۔ اگر میں یہ پردہ اٹھاؤں تو آپ دیکھیں کہ آپ کے ہاں کے کتنے کتنے بڑے امام، محدث، مفسر، اہل طریقت، اہل تصوف، قطب اور ابدال ہیں کہ ”وہ ہیں کون کون؟“ فیرتے پوچھو ای ناں۔ اوتھے تے گل ای اگاں ہو آ<sup>③</sup>۔ وہاں تو احد اور احمد میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ ذات اور صفات دونوں کے لحاظ سے وہ ایک ہی ہیں۔ حضور کے معراج کے سلسلہ میں یہ کہا گیا ہے کہ

① اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز: تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1992ء، ص 51-70

② شاہِ ولایت حضرت علیؑ کا متصوفانہ لقب ہے۔

③ پھر تو پوچھو ہی نہیں۔ وہاں تو پھر بات ہی کچھ اور ہے۔

اوہو شہر مکے وچہ رہندا، تے آپے عرش بریں تے بہندا  
آپے آپ نوں ویکھن چلیا، ویکھ وکھا کے گل مک گئی<sup>①</sup>

جی! یہ روحانیت کی محفلیں ہیں، جس کا قرآن کریم میں کہیں ذکر تک نہیں آیا مگر یہ سارے وہ ہیں جو ببا ننگ دہل کہتے ہیں، محاورے میں نہیں بلکہ ببا ننگ دہل یہ سب کچھ پکارا جاتا ہے۔ کیا آپ نے یہ اشعار تو الوں کی زبان سے نہیں سنے اور ان پر ”بزرگانِ دین“ کو سر دھنتے اور وجد میں آتے نہیں دیکھا؟ بس یہ سب کچھ چلا آ رہا ہے۔ کہیں کفر کا فتویٰ لگتا ہے تو اس بات کے لیے وہ ایک پرویز رکھا ہوا ہے کہ یہ کچھ کہتا کیوں ہے۔ یہاں تک تو معاملہ صرف نبی اکرم ﷺ تک ہی ہے۔

وہ عیسائیت کی بات کچھ یوں ہے کہ عیسائیوں کے مختلف فرقے مختلف انداز سے حضرت مسیحؑ میں صفاتِ الوہیت کے قائل ہیں۔ ان میں اسکندریہ کے عیسائی آپ کو لوگاس کہتے تھے۔ عیسائیوں نے اس نظریہ پر اپنے فلسفہ الہیات کی عظیم عمارت قائم کی ہے، جس کی رو سے لوگاس تثلیث کے اقامتِ ثلاثہ کا اقنوم<sup>②</sup> ثانی ہے۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا دیا<sup>③</sup>۔ یہ عیسائیت ہے۔ اسلام تو بہت آگے جاتا ہے۔ اس میں تو خدا کے ساتھ ہم کلامی کی سند لائی جاتی ہے اور اسی قسم کی سندوں کے سہارے ہمارے صوفیائے کرام نے اپنے الہامات اور مکالماتِ خداوندی کے دعاوی پیش کیے ہیں۔ مثلاً سرخیل صوفیاء محی الدین ابن عربی (1165-1240ء) جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے، سب سے بڑا سرچشمہ تصوف<sup>④</sup> ہیں۔ خانقاہیں تو اس سے پہلے آپ کے ہاں اس زمانے میں وجود میں آ گئی تھیں جب شام کے عیسائی راہب مسلمان ہوئے ہیں۔ ایران کے مجوسی تو آپ کو اپنے ہاں سیاست میں لے گئے تو یہ شام کے عیسائی مسلمان ہونے والے راہب

① یہ خواجہ غلام فرید کا فرمان ہے۔ اس کا رواں مفہوم یہ ہے کہ وہی مکہ میں رہتا تھا، وہی عرش پہ بیٹھا تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو دیکھنے گیا۔ اپنے آپ کو دیکھ لیا تو قصہ ختم ہو گیا۔

② دین مسیحی خدا کا ہر جز (باپ، بیٹے اور روح القدس میں سے ہر ایک) کو اقنوم کہتے ہیں۔ جمع: اقامت۔

③ عیسائیوں نے ابتداً فرط عقیدت سے حضرت عیسیٰؑ کی شان میں غلو اور مبالغہ سے کام لیا۔ یہی مبالغہ سینٹ پال کے وقت حقیقت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ نیکیا (Nicaea) کی کونسل نے اسے عقائد کا رنگ دیا اور ٹرنٹ کی کونسل میں اس نے اس ایمان کی صورت اختیار کر لی کہ ”ہم ایمان لائے (۱) خدا قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے اور (۲) رب یسوع مسیح ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے، الہ الہ ہے اور نور نور ہے، عین خدا ہے۔ مولود ہے مخلوق نہیں۔ باپ اور اس کا جو ہر ایک ہے..... ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا۔ (پرویر: شعلہ مستور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور، 1994ء، ص 138)۔

④ ابن عربی کو سلسلہ تصوف میں سند کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ اپنی مشہور کتاب ”فصوص الحکم“ میں لکھتے ہیں کہ ”جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل صاحب الزماں، غوث قطب لیتے ہیں۔“ ”صاحب کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ہیں..... ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے۔“

آپ کو تصوف میں لے گئے۔ سب سے پہلی خانقاہ<sup>①</sup> قائم ہی اس زمانے میں ہوئی تھی لیکن تصوف تو باقاعدہ ایک فلسفے کی حیثیت سے ایک School of Thought کی حیثیت سے آیا۔ یہ جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے یہ محی الدین ابن عربی (1165-1240ء) ہیں۔ انہوں نے اس چیز کو لیا۔ فتوحات مکیہ ان کی بڑی الجھی ہوئی بڑی مشکل ترین کتاب ہے۔ یہ تصوف کی وہ کتاب ہے جسے بائبل کہتے ہیں۔

### لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مفتی محمد شفیع مرحوم کا فتویٰ

اس بات پہ آپ ہنس پڑے۔ آپ کو پتہ نہیں کہ ایک عرصے تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے جب یہ نئے نئے لائوڈ اسپیکر آئے تھے کہ لائوڈ اسپیکر کا استعمال حرام ہے یا حلال ہے؟ اس بارے میں شریعت حقہ کیا فیصلہ دیتی ہے؟ آپ نے پڑھا ہوگا۔ یہ مفتی محمد شفیع مرحوم جن کا ابھی انتقال ہوا ہے، دیوبند کے ہیں۔ یہ سب سے بڑے مفتی صاحب تھے۔ ان سے یہ سوال فتویٰ پوچھا گیا تھا۔ انہوں نے فتویٰ دیا تھا۔ ان کے یہ فتوے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ فتویٰ ان کے اندر درج ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ لائوڈ اسپیکر کیا ہوتا ہے اور کیسے یہ کچھ ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے پھر Jubilee High School بنارس کے پنڈت<sup>②</sup>..... (یا کیا نام تھا) ان سے پوچھا۔ وہ وہاں سائنس ماسٹر تھے۔ یعنی ہائی اسکول کے سائنس ماسٹر ایک ہندو ہیں، ان سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ جو اس میں آواز ہوتی ہے یہ بولنے والے کی آواز ہوتی ہے یا وہ کچھ اور بن گئی ہوئی ہوتی، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ کہیں انہیں خود پتہ نہیں، وہ ہندو سائنس ماسٹر سے پوچھتے ہیں۔ وہ بھی یہ کہتا ہے کہ پتہ تو مجھے بھی نہیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ بہر حال یہ بات مشتبہ ہے اس لیے اس کا استعمال حرام ہے اور پھر ساری عمر اسی لائوڈ اسپیکر کے اوپر وہ فتوے بھی دیتے رہے، وعظ بھی کہتے رہے۔

① قرآن اور حدیث میں تصوف اور حدیث کے الفاظ تک نہیں ملتے۔ اس لیے اس دور میں مسلمان صوفیاء کے وجود کا بھی پتہ و نشان نہیں ملتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص جو صوفی کے لفظ سے مشہور ہوا (وہ) ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ 140ھ میں رملہ کے قریب (جو فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی۔ ابو ہاشم کوفہ کا رہنے والا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آ گیا جہاں 160ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد تاریخ میں بہت سے اشخاص کے ساتھ یہ لقب (صوفی) دیکھنے میں آتا ہے۔ ان میں بعض زیادہ مشہور ہیں مثلاً جابر ابن حیان اور اس کا شاگرد صالح ابن علوی، ابراہیم ابن بشار خراسانی، ابو جعفر جو عبد الصمد کے مرید تھے۔ اکثر مغربی محققین حارث بن اسد الحاسبی (160-225ھ) کو متقدمین صوفیاء کے گردہ کا سرخیل قرار دیتے ہیں۔ (پرویز: تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور 1992ء، ص 73-72)۔

② پرویز نے دسمبر 1939 کو سلیم کے نام لکھے گئے دوسرے خط بعنوان ”ہمارے مذہبی اجتماعات“ میں یوں لکھا ہے کہ ”دارالعلوم دیوبند کے ایک مفتی صاحب نے فتاویٰ کا ایک مجموعہ شائع فرمایا ہے جن میں ”عبادات مقصودہ“ کے لیے اس آلہ (لائوڈ اسپیکر) کی حرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس رسالہ (البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ) کے صفحہ 20 پر درج ہے کہ الگز نڈر ہائی اسکول، بھوپال کے سائنس ماسٹر جناب برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔“ (پرویز: سلیم کے نام، ادارہ طلوع اسلام لاہور 1981ء، ص 16)

## محی الدین ابن عربی کا نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے متعلق تصور اور ان کی تعلیم کا ماخذ

محی الدین ابن عربی (1165-1240ء) کی فتوحات مکیہ ہے۔ اس میں انہوں نے یہ کہا کہ صاحب! یہ سوال ہی نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ خدا ہیں یا خدا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب خدا ہی ہے۔ سیپا مکا دتا<sup>1</sup>۔ اسے کہتے ہیں ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا نظریہ۔ آپ نے یہ الفاظ سنے ہوں گے۔ پہلے ہندوؤں کے ویدانت کی بات شروع ہوئی۔ یہودیوں نے اس کو اپنایا تھا۔ سپین میں یہودیوں کا ایک بہت بڑا گروہ رہتا تھا۔ ابن عربی سپین میں انہی سے متاثر ہوئے۔ انہی کا فلسفہ وحدت الوجود اور انداز بیان اپنایا۔ یہودیوں کی ایک کتاب تصوف زہار<sup>2</sup> ہے۔ وہاں سے انہوں نے اس تصوف کو مستعار لیا۔ یاد رکھیے! جو شخص بھی زیادہ Intelligent (ذہین) ہو، زیادہ Genius (فطین) ہو، جب وہ گمراہ ہوتا ہے تو پوچھو نہیں اس کی گمراہی کتنوں کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اس زمانے میں ہسپانیہ میں متصوفین فلاسفہ کا ایک گروہ تھا جو وحدت الوجود کا قائل تھا وہ اپنی کیفیات اور احوال کو تشبیہ اور استعارہ کے رنگ میں بیان کرتے اور

1 الجھن ہی ختم کر دی۔

2 اس تمام تر تفصیل کا پس منظر یہ ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد بابل کی اسیری کے زمانہ میں، یہودی مذہب میں کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا تو وہاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا۔ فیلو (Philo) اس مذہب کا امام ہے۔ تصوف کا ابوالاء افلاطون (Plato) ہے۔ یہ عجیب حقیقت ہے کہ فلسفہ (عقلیت پسندی) اور اس کی ضد باطنیت دونوں کی ابتدا یونان سے ہوئی اور قریب قریب ایک ہی زمانے میں ہوئی۔ عقلیت پسندی کی ابتدا دیما قریطس (C460-370BC) اور اپیتورس (C341-270BC) جیسے فلاسفرز سے ہوئی اور باطنیت کا آغاز فیثاغورث سے۔ اس کے بعد افلاطون (Plato: C.427-347 BC) کے ہاں عقلیت اور باطنیت دونوں جمع ہو گئے لیکن اس کی اہمیت عقلیت سے زیادہ باطنیت کی وجہ سے ہوئی۔ باطنیت نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا تھا کہ اس عالم محسوس کے اوپر ایک عالم امثال ہے۔ وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ہے اور یہ عالم محض اس کا پرتو ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی حقیقت سراب (Mirage) سے زیادہ کچھ نہیں۔ اُس حقیقی عالم کے متعلق علم حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ باطنی طریق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ افلاطون (Plato) کے اس فلسفہ (یا بالفاظِ صحیح، تصوف) کی نشاۃ ثانیہ کے بعد کے فلاسفوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلاطینس (Plotinus: 204-296AD) تھا۔ ان فلاسفرز میں ایک Apollonius of Tyana نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے برہمنوں سے ہندی تصوف (ویدانت) سیکھا۔ فلاطینس، رومی لشکر کے ساتھ ایران گیا اور وہاں کے مغوں سے مجوسی تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان فلاسفوں نے فلاطینس کی زیر سرکردگی، افلاطون (Plato) کے فلسفہ قدیم کو ہندی اور ایرانی تصورات کے ساتھ ملا کر ایک جدید قالب میں ڈھالا۔ اس کا نام نوافلاطینی فلسفہ (Neo Platinism) ہے۔ اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے فیلو (Philo) کا یہودی تصوف متاثر ہوا۔ اس تصوف کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت، معرفت اور حقیقت میں بدل گئی۔ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب ”زہار“ ہے۔ تورات کی شریعت ہر بنی اسرائیل کے لیے کھلی تھی لیکن اس کے ذریعے تورات کے باطنی معنی صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے۔ (ماخوذ از پرویز: تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1992ء، ص 26-27)

اپنے عشق حقیقی کو عشق مجازی کے جاذب نگاہ لباس میں پیش کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی (1165-1240ء) انہی سے متاثر ہوئے۔

## محمی الدین ابن عربی کے عشق کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی

وہاں سے وحدت الوجود کا نظریہ<sup>①</sup> یعنی اس تصوف کا فلسفہ آیا کہ سب خدا ہی ہے، میں بھی خدا تو بھی خدا، یہ بھی خدا وہ بھی خدا۔ اور آپ کے ہاں یہ وحدت الوجود اب مسلمہ چلا آ رہا ہے۔ میں نے تین دفعہ سوچا ہے کہ یہ بات زبان پہ لاؤں یا نہ لاؤں لیکن لانی پڑتی ہے کہ یہ کیوں کہا گیا۔ یہ سارا کچھ ذہن میں رکھیے گا۔ ابن عربی (1165-1240ء) کا مقام تصوف کی دنیا کے اندر پوچھو نہیں کہ کتنا بلند مقام ہے۔ میری بیٹیاں مجھے معاف رکھیں بات کہنی پڑتی ہے۔ ”فتوحات مکیہ“ میں نے کہا کہ ان کی تصوف میں بلند ترین کتاب ہے۔ اس میں وہ خود لکھتے ہیں کہ وہ وہاں سے مکے گئے تھے۔ مکے میں بیٹھ کے یہ کتاب لکھی۔ لکھا ہے کہ وہاں ایک دوشیزہ تھی۔ وہ اس کے دام عشق میں گرفتار ہو گئے اور یہ کہا کہ اس کے عشق نے مجھے یہ مقام عطا کیا کہ اب یہ سب چیز جو میں لکھ رہا ہوں وہ مکاشفات کا روحانی جذبہ ہیں۔ وہاں ان پر اعتراض آ سکتا تھا کہ صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اتنا بڑا یہ مقام مکہ ہے۔ مکے میں بیٹھے ہوئے ایک کتاب لکھ رہے ہیں اور ایک دوشیزہ ہے اس کے اوپر آپ فریفتہ ہو رہے ہیں، ایک خوبصورت لڑکی کے پیچھے یہ کیا ہے؟ اب دیکھیں کہ اس کا جواب کیسے ملتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ سن لو کہ جو محسوسات کی دنیا میں پھر رہے ہو تمہارے نزدیک یہ ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ یہ وہی ہے جو وہ وہاں ہے، جو وہاں ہے وہ کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ صاحب! یہ ہوا عشق مجازی، جو عشق حقیقی تک پہنچنے کی سیڑھی ہوتی ہے اور سارا تصوف اسی سیڑھی سے آگے پہنچتا ہے۔ فارسی کی ساری شاعری تصوف<sup>②</sup> کی ہے۔ آپ کے ہاں کی شاعری میں خط و خال، گیسو اور پیکر، میکدے اور سارا قصہ جو ہے وہ عشق مجازی ہے جو عشق حقیقی تک پہنچنے کی سیڑھی ہے۔ اس نے کہا کہ شراب پی رہے ہو وہ کہتا ہے کہ مت ماری ہوئی ہے یہ تو اس کے اندر وہی ہے۔ کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ وجود صرف خدا کا ہے اس لیے ہر شے خدا ہی ہے۔<sup>③</sup> آپ دیکھ رہے ہیں آپ کے ہاں کے عقائد کیا ہیں؟ سوچ رہے ہیں کہ قرآن نے کیوں تیرہ سو سال پہلے تمہیں کہہ دیا تھا کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا**

① عام الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ جو کچھ نظر آتا ہے، سب خدا ہی ہے، یعنی خدا ہر شے ہے اور ہر شے خدا ہے۔

② اسی لیے علی حزیں نے کہا ہے کہ ”تصوف برائے شعر گفتن خوب است“ چنانچہ وحدت الوجود جیسا رنگین عقیدہ جب شاعروں کے ہتھے چڑھا تو انہوں نے وہ گل کھلائے کہ تو بہ بھلی۔ ہماری فارسی اور اردو شاعری کی لطافت نگاری اسی عقیدہ کی رہین منت ہے۔ مثلاً حافظ شیرازی کہتا ہے کہ

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست خیال آب و گل در رہ بہانہ

(حوالہ پرویز: تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور 1992ء، ص 81)

③ اسے ”ہمہ اوست“ بھی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سب خدا ہی ہے تو پھر مختلف اشیاء مختلف افراد حتیٰ کہ مختلف عقائد میں تفریق و تمیز کا تصور ہی غلط ہے۔ رام بھی وہی ہے، رجم بھی وہی۔



اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) اے اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے! ایمان لاؤ خدا کے اوپر یہ ایمان رکھو۔ یہاں کہا جائے گا کہ صاحب! پھر قرآن یہ کہاں سے لایا؟ کیا ان کے پاس قرآن نہیں تھا؟ قرآن تھا، میں نے پوری جلدیں تو نہیں دیکھیں، کہا جاتا ہے کہ محی الدین شیخ اکبرؒ (1165-1240ء) نے سو جلدوں میں قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ <sup>①</sup> جو کچھ آپ سے کہہ رہا ہے تو اس کی پہلی آدھی عمر اسی میں گزری ہے۔ یہ ساری چیزیں عقیدہ ہی نہیں، ایمان کے طور پہ مان لی ہوئی تھیں۔ صاحب! پوچھو نہیں کہ وہ دور کیا تھا، الحمد للہ کہ وہ دور گزر گیا۔

### اہل تصوف کے ہاں لکھی گئی تفاسیر کی بنیاد

عزیزانِ من! ان تفاسیر کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ یہ جو آپ کے ہاں قرآن کے الفاظ ہیں، ان کی رو سے قرآن کے معنی سمجھ میں نہیں آتے، نہ ہی الفاظ مخصوص ہیں۔ قرآن کے ان الفاظ کے اندر باطن میں معنی ہیں۔ اصل میں ہر لفظ کے معنی باطن میں ہوتے ہیں اور وہ باطنی معنی ہیں جو صحیح معنی ہیں، جو منشاء خداوندی ہے، وہ کسی ظاہری دنیاوی علم سے حاصل نہیں ہوتے۔ وہ جو خدا کے ہاں سے براہِ راست علم لدنی ملتا ہے بغیر کسی وسیلے کے براہِ راست ملتا ہے، اس سے وہ معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ اب دیکھیں کہ ختم نبوت بھی ہے اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ براہِ راست بھی اس کے ساتھ خدا سے علم ملتا چلا ہے۔ اس کی رو سے یہ جو باطنی معنی ہیں، قرآن کی تفسیر پھر ان باطنی معنوں کی رو سے ہوئی۔ ذرا سی مثال لیجیے۔ بات نظری سی ہو جائے گی لیکن بہر حال کچھ تو آپ کو بھی معلوم ہو کہ یہ جن کے سامنے پتھر کے مزار ہیں جن کو جو آپ جا کے سجدے کرتے ہیں، آپ کو عقائد کیا دے رہے ہیں، کیا کیا عقائد آج بھی آپ کے ہاں یہ سب موجود ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ سے ہوئی: یہی مٹی اور جہاں تک اس کے جسم کا تعلق ہے، مرنے کے بعد وہ یہی بے جان مادہ ہو جاتا ہے۔ تم اگر انسان کے متعلق یہی Concept (تصور) رکھتے تو یہ تو بڑا گھٹیا قسم کا Concept (تصور) ہے۔ قرآن کی آیت ہے کہ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخِرٰی (20:55) ”اسی زمین سے ہم نے تمہیں نکال رکھا ہے اور اسی میں تم پلٹ جاؤ گے اور اسی سے بار دیگر نکالیں گے۔“ باطنی معنی کی رو سے ابن عربیؒ (1165-1240ء) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب احدیت سے نکلے تھے اور اس کے بعد فنا ہو کر احدیت میں ہی جا کے مل جائیں گے پھر بقا ملے گی اور دوبارہ نمودار ہوں گے۔ <sup>②</sup>

① یہ اشارہ پرویز کا اپنی ہی طرف ہے۔

② حوالہ فصوص الحکم

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

یہ قرآن کی آیت کے باطنی معنی ہیں۔ سارے قرآن کے معنی اسی طرح سے باطن سے لیے ہوئے ہیں۔ اس عقیدے کی رو سے وہ کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ انا ربکم الاعلیٰ قرآن میں فرعون کے متعلق ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ صاحب! فرعون کو ایک طرح حق حاصل تھا کہ وہ کہے کہ انا ربکم الاعلیٰ کیونکہ فرعون ذات حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی سی تھی۔ ابن عربیؒ<sup>1</sup> نے کہا تھا کہ وحدت الوجود کی رو سے حضرت موسیٰ اور فرعون میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہیں رومیؒ<sup>2</sup> کہتے ہیں:

چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد  
موسیٰ باموسیٰ درجنگ شد

آپ کو تو معلوم ہے یہ تو پھر ہر جگہ چلتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ”می گفتم در بیابان رند دین در بدہ“ یعنی بیابان میں ایک رند پکار رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟ کہ صوفی خدا نہ داراؤنیست آفریدہ۔ صوفی کسی کی مخلوق نہیں ہے یہ بات ہی نہیں ہے وہ تو جس طرح سے خدا موجود ہے وہ بھی موجود ہے۔ خدا اور بندہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ نہ عقل و قیاس اس کا احاطہ کر سکتی ہے نہ کیف و نشاط کے ذریعے اسے بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں کی شاعری۔ یہ سارے جوشِ اکبرؒ (1165-1240ء) اور مولانا رومیؒ (1207-1273ء) ہیں سارے آپ کے ہاں کے جو بڑے بڑے شیخ طریقت اور اولیاء ہیں ان سب کے یہ عقائد ہیں۔ ان سب کی کتابوں کے اندر یہ کچھ لکھا ہوا ہے۔ اور پھر وہ رومیؒ (604-672ھ) کی شاعری کی مشہور غزل ہے:

ہر لحظہ بشکلِ بتِ عیارِ برآمدِ دل بردو نہاں شد  
ہر دم بلباسِ دگر آں یارِ برآمدِ گہ پیر و جواں شد  
خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ خود رند و سبکدوش  
خود بر سرِ آں کوزہ خریدارِ برآمدِ بشکست و رواں شد  
خود گشتِ صراحی و مے و ساغر و ساقی خود بزمِ نشیں شد  
خورد آں مے و سرمست ببا زارِ برآمدِ شورِ دل و جاں شد

① یعنی محی الدین ابن عربیؒ (638-560ء بمطابق 1165-1240ء)

② محمد جلال الدین رومیؒ (604-672ھ بمطابق 1207-1273ء)

پیالہ آپ ہی پیالہ بنانے والا بھی آپ ہی اس پیالے کی مٹی آپ ہی اس پیالے سے شراب پینے والا خود برسرِ آں کوزہ خریدار برآمد  
آپ ہی اس پیالے کا خریدار بن کے آیا۔ ہمہ دوست یعنی پیالہ اور وہ ایک ہی ہے۔ پھر بابا بلھے شاہ کا کلام دیکھیے۔ وحدت الوجود کو لیجیے۔ اس  
کا ترجمہ کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ وہ اکثر مبہم استعارات میں بات کہتے اور نادرا اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں۔ بلھے شاہ فرماتے ہیں:

اربع عناصر محل بتایو ، وچہ وڑ بیٹھا آپے  
آپے کڑیاں ، آپے ٹنگر ، آپے بنیاں ماپے  
آپے مریں ، تے آپے جیویں ، آپے کریں سیاپے  
بلھیا! جو کچھ قدرت رب دی ، آپے آپ نچاپے<sup>1</sup>

### اہل تصوف کے نزدیک شرک خفی اور شرک جلی کی نوعیت

عزیزانِ من! ہنسی نہیں، خون کے آنسو روئیے۔ ہزار سال سے آپ کا یہ اسلام چلا آ رہا ہے، اسلام ہی نہیں بلکہ یہ وہ عقائد ہیں جنہیں  
اسلام کا مغز قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ کس قسم کا اسلام ہے جس کے مغز کا نمونہ یہ ہے۔ اہل تصوف کہتے ہیں کہ ہم نے  
قرآن سے مغز لے لیا ہے۔ یہ جتنے الفاظ کی رو سے قرآن لیے پھرتے ہوئے تو نچوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں جو کتوں کے آگے ڈال دی ہیں۔  
صاحب! اب جو سب وہی ہوا تو پھر یہ کفر اور اسلام اور یہ اور وہ نہیں ہے۔ صاحب! یہ سوال ہی نہیں ہے۔ یہ محض محسوسات کے پردے ہیں:

کفر و دیں است در رہت پویاں

کفر ہو یا دین، یہ سارے اسی کے راستے کے اوپر ہیں۔

وحده لا شریک لہ گویاں

کافر بھی خدا کو لا شریک کہتا ہے، مسلمان بھی وحدہ لا شریک ہی کہتا ہے۔ اور آگے بڑھے۔ انہوں<sup>2</sup> نے کہا کہ

اے پر لا الہ الا اللہ

ایں ز شرک خفی است آئینہ دار

<sup>1</sup> ان اشعار کا ٹیٹھ ترجمہ نہیں تو کم از کم اردو مفہوم یہ ہے: ”اس نے خود ہی مادی کائنات کو پیدا کیا اور خود ہی اس کے اندر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ خود ہی لڑکا ہوتا ہے  
خود ہی لڑکی اور خود ہی ماں باپ۔ وہ خود ہی زندہ ہوتا ہے اور خود ہی مرتا ہے اور اپنے مرنے پر آپ ہی سیا پے کرتا ہے۔ یہ وہ بھید ہیں جو کسی کی سمجھ میں اپنے  
آپ آ نہیں سکتے۔“

<sup>2</sup> حافظ شیرازی

لا الہ الا اللہ کہنا شرک ہے، شرک خفی ہے، اس شعر میں یہ لفظ ہے کیونکہ اس میں لا الہ الا اللہ کے معنی مانتے ہیں کہ اللہ کے سوا یہ جو باقی الہ ہیں، یہ کوئی حقیقی نہیں ہیں لیکن ان کو مانتے تو ہو کہ یہ ہیں۔ وہ تو یہ شرک ہو گیا، ذرا سا شرک خفی کہا۔ آپ کہیں گے کہ شرک جلی کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ

ہست شرک جلی رسول اللہؐ

(معاذ اللہ) حضور ﷺ کو اللہ کا رسول کہنا یہ شرک جلی ہے۔ اگلے مصرعہ میں کہا کہ

خویشتن را ازیں دو شرک برار

(معاذ اللہ) بیباک شاعری کہاں تک جاتی ہے!! برہنہ الفاظ میں کیا کچھ کہتی ہے!! اپنے آپ کو ان دو شرکوں سے نکال کے لے جا۔ ان کے نزدیک لا الہ الا اللہ کے معنی یہ ہیں کہ مشرکین جس جس چیز یا جس جس انسان کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں، وہ سب خدا ہی ہوتے ہیں کیونکہ خدا کے سوا کائنات میں کسی کا وجود ہی نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ لا الہ الا اللہ کے معنی کیا ہے؟ ان کے ہاں قرآن کی رو سے الفاظ کی رو سے تو معنی یہ ہیں کہ الہ وہی ہے، اس کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے۔ ان کے ہاں یہ اس کا عقیدہ اور یہ اس کے معنی کیے جاتے ہیں: لا الہ الا اللہ، یہ دنیا میں جتنے الہ کہے جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک اللہ ہی ہے۔ لا الہ الا اللہ کے یہ معنی کیے جاتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ، یہ الہ یہ الہ نہیں ہیں جن کو تم لوگ یہ الہ کہتے ہو، صاحب! لا الہ الا اللہ یہ سب اللہ ہی ہیں، اللہ ہی نہیں، یونہی یہ محسوس کے پردے میں تم نے ان کو الگ الگ بنا رکھا ہے: گنگا ایک گھاٹ بہتر ہے۔<sup>①</sup> بس یہاں آگئی وہ تشبیہ۔ تصوف کا سارا مدار تشبیہات پہ ہوتا ہے۔ چپک جانے والی تشبیہ ہے۔ نہ اس میں سمجھ نہ دلیل ہے۔ بس گنگا ایک گھاٹ بہتر ہے۔ کفر، دین، اسلام اور شرک سب ایک ہی ہیں۔ گنگا ایک ہے یہ سب گھاٹ ہیں۔ گنگا ایک گھاٹ بہتر ہے، کہتے کبیر عقل کے پھیرے۔ اسی لیے تو یہ عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ یہاں مغز اسلام تصوف ہے۔ ادھر سے اسے رام اور کرشن کے بھگتوں نے عام لیا اور ادھر صوفی شاعروں نے شطاریہ، قادریہ کا گٹھ جوڑ ہوا، چشتیہ خانوادہ نے سمند ناز پر ایک اور تازیانے کا کام کیا۔ اس طرح وحدت الوجود ان شاعروں کی رگ رگ میں سمو گیا۔

ان تصورات کی سند کے لیے خود ساختہ روایات کا سہارا

اب آپ کہیں گے کہ صاحب! اس کی آخر کوئی سند تو ہو۔ کسی بھی قسم کی سند بنا لینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ عربی کا ایک فقرہ بنایا اور اس

① یہ بھگت کبیر (1440-1518ء) کے الفاظ ہیں: گنگا ایک گھاٹ بہتر ہے کہتے کبیر عقل کے پھیرے

رام بھی وہی، رحیم بھی وہی اس لیے کفر اور اسلام میں کوئی فرق نہیں۔ (معاذ اللہ)

کے ساتھ قائل رسول اللہ کا دیالیں سند ہوگئی اب جو اس سے انکار کرے، منکر حدیث ہو۔ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا تھا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے دو برتن عطا فرمائے۔ بند تھے ایک کو تو میں نے کھول کے عام کر دیا۔ یہ ہے جو لوگوں میں ظاہر ہے اور دوسرا وہ ہے کہ اگر میں اس کو عوام میں عام کروں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے<sup>①</sup>۔ یہ بند کا بند سینہ بہ سینہ آگے چلے گا۔ یہ ہے وہ علم لدنی اور باطنی علم جس کی رو سے یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں کا ”جنوں دین کا ت کڈیا ہو یا کیندے نیں“۔<sup>②</sup> یعنی مغز دین جسے مولانا ردی کہتے ہیں۔ یہ چیز کہنے والے تو کہیں گے کہ صاحب! اہل طریقت الگ ہوتے ہیں اہل شریعت نہیں۔

### تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہابی اور گلابی وہابی ایک ہی ہیں

یہ جو آپ کے ہاں اہل شریعت ہے، ان کے ہاں بھی تو کچھ کم نہیں یعنی ان کے ہاں اگر منظرہ چلتا ہے تو اتنا ہی ہے کہ وہاں جا کے یا عبدالقادر کہنا چاہیے یا ساتھ ہی جیلانی معروف بہ حضرت غوث الاعظم کہنا چاہیے یا نہیں؟ وہ ان کے ہاں بھی وہی ہے، اُن کے ہاں بھی وہی ہوتا ہے۔ اس پر بحثیں چلتی ہیں۔ ان کے ہاں یہ جو سارا کچھ ہے ان کے ہاں کی کتابوں کے اندر انبار لگے ہوئے ہیں پڑھائی جاتی ہیں درس دیئے جاتے ہیں ان کے ورد کیے جاتے ہیں۔ ان کے اہل شریعت میں آپ کے ہاں جو دیوبندی حضرات ہیں ہمارے ہاں تو ان کو گلابی وہابی کہتے تھے یعنی جو اہل حدیث تھے ان کو پکا وہابی کہتے تھے اور یہ ذرا سے جو ان سے ہٹے ہوئے تھے ان کو گلابی وہابی کہتے تھے۔ وہ اتنا ہی فرق تھا کہ یہ مزاروں پہ جا کے یہ کہنا یا نیاز دینا یا ختم درود دینا منع تھا یعنی یہ صرف اتنا ہی نہیں مانتے تھے باقی جو کچھ بھی ہے وہ یہ سب کچھ مانتے ہیں۔

### مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات کی ایک جھلک

آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو آپ کے ہاں کے گلابی وہابی ہیں یہ بیعت لیتے تھے ان کے مرید تھے یہ مراقبہ کرتے تھے یہ ورد وظیفہ کرتے تھے ان کی کرامات ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957ء) کی اپنی لکھی ہوئی خود نوشت سوانح حیات کے اندر ان کی اپنی کرامات لکھی ہوئی ہیں کہ کتنی زور کی بارش ہو حضرت چلے جایا کرتے تھے تو بارش کا ایک قطرہ بھی ان پہ نہیں پڑتا تھا دائیں بائیں چلا جاتا تھا کتنی ہی دھوپ میں چلے جایا کرتے تھے دھوپ ان پہ نہیں پڑا کرتی تھی دائیں بائیں پڑا کرتی تھی۔ یہ مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957ء) تھے۔<sup>③</sup>

① ان تمام نکات کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر) مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ النور ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2007ء، ص 137 تا 165 (مع انہی صفحات کے فٹ نوٹ)

② جسے دین کا مغز کہتے ہیں۔

③ مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957) کی کرامات کے لیے دیکھیے: دیوبند، شیخ الاسلام نمبر

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ بات نہ کہہ دیجیے کہ صاحب! یہ بھگڑ خانے کے بھنگی ہیں جن کے متعلق یہ باتیں (معاذ اللہ) ہیں۔ نہیں، قطعاً نہیں۔ آپ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ ہیں۔ اور آپ نظام الدین اولیاءؒ ہیں۔ ان کے ملفوظات ہیں جنہیں امیر خسرو نے مرتب کیا تھا۔ اور یہ وہ آپ کے ہاں کے جلیل القدر ہیں جن کے نام کے ساتھ احترام میں بے ساختہ نظریں جھک جاتی ہیں۔ یہ سارے اور ان سب کے ماننے والے یا رباب شریعت تھے۔ بات یہ چلی تھی کہ یہ انسانوں کا عقیدہ ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا ہے کہ خدا کسی کو بیٹا بھی بنادیتا ہے یا ان کا عقیدہ الوہیت مسیح کا ہے کہ یہ تین میں ایک اور ایک میں تین ماننے ہیں یا ان کے ہاں ایسے فرقے بھی ہیں جو خود اس کو ہی خدا مانتے ہیں۔ اس پہ ہمارے ہاں ہزار برس سے ان کی تردید میں ان کے ساتھ مناظرے چلے آ رہے ہیں اور یہ آپ کے ہاں کے عقائد ہیں۔ ان کا ماننے والا مشرک ہے مگر ان کو ماننے والے کہتے ہیں کہ اصل دین، مغز دین یہی ہے۔

عزیزانِ من! کبھی کسی نے کھڑے ہو کر سوچا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا سوچ ہی کے دیئے ہوئے یہ چراغ جلتے ہیں؟ یہاں جب آیت آئی، کہا کہ یہ انسانوں کے متعلق ہے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ صاحب! حضرت مسیح کے متعلق یہ عقیدہ بڑا باطل ہے، مشرکانه ہے، ملحدانہ ہے۔ صاحب! اس کے خلاف مناظرے کرو مگر یہ سب کچھ اپنے ہاں ہے اس کے خلاف ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ کوئی سوچتا ہی نہیں ہے کہ ہمارے ہاں یہ کیا عقیدہ ہے<sup>①</sup>۔ کہو تو کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ روحانیت کی باتیں ہیں۔ مجھے معاف رکھیں قرآن تو یہ کہتا ہے کہ مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ (23:91) اللہ کا کوئی بیٹا نہیں اور وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ (23:91) نہ ہی اس کی ہمسر کوئی صاحب اقتدار ہستی ہے کہ تم ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی حکمرانی تسلیم کر لو اور اس کی مملکت میں چلے جاؤ مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں یہ سب کچھ قطعاً اور تماماً غلط ہے۔

### خدا کی پرستش کا تصور ایک باطل تصور ہے

میں نے کہا ہے کہ جب اللہ کا ترجمہ ہمارے ہاں معبود کیا تو سارے مسئلے خود ہی یوں ہوئے کہ پرستش کے قابل کوئی نہیں ہے، پرستش کے قابل صرف خدا ہے اور بس یعنی اب خدا کا اور آپ کا اتنا ہی تعلق ہے کہ آپ اس کی پرستش کر لیتے ہیں کسی اور کی پرستش نہیں کی جاتی۔ پرستش کا تو لفظ ہی فارسی ہے، آپ پرستش کہتے ہیں۔ نماز کا لفظ فارسی ہے، درود کا لفظ فارسی ہے۔ دیکھیے قرآن کیسے اللہ کو واضح کرتا ہے۔ اللہ کے معنی صاحب اقتدار کے ہیں۔ اقتدار، اختیار، قانون، ضابطہ، احکام صرف ایک خدا کے ہیں، کسی اور کے نہیں، پھر کہا کہ مَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ (23:91) کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہے اور یہ بھی کہ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدٌ (18:26) وہ اپنے اس حق حکومت

① یہاں اس عقیدہ سے مراد عقیدہ حلول، عقیدہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ہے۔ ان وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ النور (2007ء)، ص 137 تا 165 (مع فٹ نوٹ)۔

میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہ تو حق حکومت کی بات ہے۔ اب اقتدار کے بعد دیکھیے کہ قرآن وحی نازل کرنے کا کہتا ہے کہ سوچو تو سہی کہ اگر ایسی بات ہوتی، کہ کوئی اور بھی اللہ ہوتا تو پھر اس کائنات کی حالت کیا ہوتی۔ یہ جو اللہ کا ترجمہ معبود کیا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ پرستش کرلو، کہا کہ سوچو تو سہی، اگر کہہ دیا جائے کہ صاحب! یہ اور بھی معبود ہیں تو اس کائنات کا حلیہ بگڑ جاتا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ آپ کہیں گے کہ یہ ان لوگوں کی جہالت ہے بس وہ اتنا ہی ہے کچھ اور تو اثر نہیں پڑتا مگر قرآن کہتا ہے کہ اگر کوئی اور اللہ بھی ہوتا اِذَا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَّ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ<sup>①</sup> (23:91)۔ تو اللہ کے تو معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا صاحب اقتدار ہو کہ اگر اور بھی کوئی اللہ ہوتا تو یہ صاحب اقتدار دونوں آپس کے اندر اس طرح سے لڑتے جھگڑتے، ایک دوسرے کے اوپر چڑھ دوڑتے، اپنی اپنی مخلوق کو ساتھ لے کر۔ یہ ہے اللہ۔ کہا کہ سوچو کہ پھر کائنات کا حشر کیا ہوتا؟ اب اللہ کے معنی سمجھ لیے کہ اس کے ساتھ اس کی مخلوق ہے اور وہ اقتدار رکھتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ لَعَلَّ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (23:91) ایک دوسرے کے اوپر اپنی اپنی فوج لے کر چڑھ دوڑتے ہیں تو اللہ تو وہ ہے کہ جو چڑھ دوڑنے کے قابل ہوتا ہے۔ کہا کہ اس کائنات کا یہ ہو جاتا حشر اگر یہاں اللہ کوئی اور بھی ہوتے۔ کہا کہ یہ مانو گے تو پھر خدا پر ایمان ہوگا کہ اللہ تو وہ ایک ہی ہے، قانون تو صرف اسی کا ہی ہے، حکومت صرف اس کی ہے، اقتدار صرف اس کا ہے۔ اگر انسانوں کی دنیا کے اندر کسی اور کا اقتدار آپ نے شریک کر لیا تو یہ شرک ہی نہیں ہوگا کفر ہوگا، انکار ہوگا بغاوت ہوگی۔

### انسانی دنیا میں تصورِ خدا کا تجزیہ

عزیزانِ من! قرآن اس قسم کے ایمان والوں کی نفی کرتا چلا جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ سُبْحَنَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ (23:91) یہ تسلیم کرنے والے جو تصورات (Concepts) بھی یہ خدا کے متعلق قائم کیے ہوئے ہیں، وہ ان سے بہت اونچا ہے، بہت دور ہے، بہت پاکیزہ ہے، بہت منزہ ہے۔ خدا کے متعلق جتنے تصورات بھی انسان نے قائم کیے ہیں وہ ان سے پاکیزہ ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں خدا کے متعلق جو تصورات ہیں وہ قرآن کے سوا خدا کے متعلق کوئی اور تصور آ گیا تو شرک ہو گیا، کفر ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے متعلق جو ہر انسانی تصور (Concept) ہے، وہ اس سے بلند اور بالا پاکیزہ اور منزہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک خدا کا کوئی نہ کوئی تصور رکھتا ہے۔ ذہن میں تصور کے بغیر تو اس چیز کے ماننے یا نہ ماننے کا یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ چیز محسوسات میں سے ہے تو اس کو یوں محسوس طور کے اوپر دیکھنے بھالنے سے نظریات میں سے ہے۔ کوئی تصور ہی سہی لیکن تصور تو ہوتا ہے۔ اگر تصور ایسا ہے کہ جس میں انسانوں کے متعین کیے

① ان سے کہو کہ اگر ایسا ہوتا کہ یہاں ایک سے زیادہ صاحب اقتدار ہستیاں ہوتیں تو ہر ”خدا“ اپنی اپنی مخلوق کو اپنے ساتھ لے لیتا اور اس طرح یہ سب ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے (جیسا کہ دنیا کے عام بادشاہوں میں ہوتا ہے۔) (پرویز: مفہوم القرآن ص 788)۔

ہوئے تصور کی آلائش بھی ہو جاتی ہے تو شرک ہے، عزیزانِ من! کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ہونا آسان ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ تو خیالات اور تصورات کی دنیا کو بھی پکڑتا ہے۔

### خدا کے صحیح تصور کو سمجھے بغیر قرآن حکیم سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا

عزیزانِ من! خدا کا تصور وہ ہے جو قرآن نے دیا ہے۔ اس میں کسی انسان کے وضع کردہ تصور کی کوئی آلائش نہیں۔ اگر یہ تصور قائم ہو جائے تو خدا کے دیئے ہوئے اس تصور کے مطابق سارا ہی قرآن سمجھ میں آ جاتا ہے۔ وہ تو اس کی بنیاد ہی خدا کے تصور پہ ہے۔ خدا پہ ایمان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں خدا کو مانتا ہوں بلکہ یہ ہیں کہ وہ عَلِيمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (23:92) تمہارے ظواہر پہ بھی نگاہ رکھنے والا ہے، تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک کے دیکھنے والا ہے، تمہارے تصورات تک پہ نگاہ رکھنے والا ہے۔ سوچتے ہو کہ وہ کیا ہے؟ اس لیے تصورات میں بھی اگر تم نے کسی قسم کا شرک کر لیا تو وہ اس سے بہت اونچا ہے۔ وہ صحیح کہا تھا سعدیؒ نے کہ

ہے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم

یہ وہی Concept of God ہے، یعنی خدا کا تصور ہے، معاف رکھیے گا، میں نے God کہہ دیا، اللہ کے لفظ کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے، اللہ کا جو تصور ہے، اس کے مختلف گوشے (Facets) ایسے ہیں کہ ان سے وہ تصور متعین ہوتا ہے جس میں ذہن انسانی کے کسی قسم کے خیال و قیاس و گمان و وہم کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ہے توحید۔

### نبی اکرم ﷺ کی 23 سال تک کی داستانِ کشمکش حیات

اب کشمکش کی ٹکراؤ کی، ساری دنیا کے خلاف ٹکراؤ کی بات پیچھے سے چلی آ رہی تھی۔ یہ تو ہے ہی ساری دنیا کے خلاف ٹکراؤ۔ ایک کافر، مشرک، ملحد تو ایک طرف رہے یہ تو خدا کو ماننے والوں کے خلاف بھی ٹکراؤ ہے، یہ تو اس ستر کروڑ مسلمانوں<sup>①</sup> کی آبادی کے خلاف بھی ٹکراؤ ہے، یہ ٹکراؤ چلا آ رہا تھا اور وہ آپ کو یاد ہوگا، جو ایک بات آتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی مکے کی تیرہ سالہ زندگی کی ابتدا اس ٹکراؤ سے ہوئی۔ اس دور میں ہر قسم کی مسلسل تکالیف، مصائب، صعوبتیں، پریشانیاں آتی رہیں گی۔ خدا کا یہ وعدہ آ رہا ہے کہ کوئی بات نہیں ہے، انجامِ کار تم دیکھو گے کہ یہ کیسے تباہ ہوں گے۔ اس تباہی کے متعلق پہلی چیز تو یہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی یہ بات پہلے (13:40) میں بھی آ چکی

① یاد رہے یہ بات اگست 1977ء کی پانچ تاریخ کو لکھی گئی تھی۔



ہے کیونکہ قرآن کی آیات بار بار آتی رہتی ہیں کہ نبوت کی زندگی کا قریباً 60% مصائب و تکالیف برداشت کرتے ہوئے گزر گیا۔ ایک وعدہ ہی تھا جو ادھر سے آیا ہوا تھا کہ یہ تباہ ہوں گے اور انجام تیرے حق میں ہوگا، کامیابی آخر الامر یہ ہوگی۔ یہاں ہی نہیں، مدینے کی زندگی میں بھی جا کر یہ ٹکراؤ تو پھر عمل میں آ گیا تھا۔ یہاں تو صرف مار ہی پڑتی تھی وہاں میدان جنگ میں آ گئے۔ فتح مکہ تک تو سات سال اور گزر گئے تھے۔ تیرہ سال وہ اور سات سال وہ، کل بیس سال ہو گئے۔ تیس سالوں میں یہ بیس سال تو مسلسل جہاد مسلسل لڑائی رہی۔ مدنی زندگی تو اس سے بھی زیادہ اس قسم کے تصادمات سے بھری ہوئی تھی۔

### حضور ﷺ کی ایک حسین آرزو

وعدے پہ بڑا یقین تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا مگر ایک معصوم سی آرزو قلبِ مطہر میں ابھری۔ عزیزانِ من! ابھرنی بھی چاہیے تھی: دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔ اس قسم کے جہادِ مسلسل کرنے والوں کے دل میں بھی آرزو ابھرتی ہے کہ یا اللہ! میری ساری عمر اس طرح سے پٹے پٹاتے گزر جائے گی یا جو کچھ مجھ سے کہا جا رہا ہے میں اس کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ سکوں گا۔ بڑی فطری آرزو ہے بڑی معصوم سی آرزو ہے کہ کیا میں اپنی بات کی عملی تکمیل دیکھ بھی سکوں گا؟ مجھے شروع میں قرآن کریم سے محبت تھی اور آج بھی اسی طرح زندہ و تابندہ ہے۔ بے ساختہ دل کے اندر یہ جذبہ آیا کہ اللہ تعالیٰ! کیا اس کی تکمیل و تشکیل میری اس حیاتِ طبعہ (Physical Life) میں ہو سکے گی؟ جواب تھا کہ فکر نہ کر یہ ضرور ہوگا، یہ ہمارا وعدہ ہے۔ لیکن یہ تو ایک انسان کی آرزو کے مقابلے میں کوئی انسان کا ہی دوسرا جذبہ تھا اور خدا تو اسے کہتے ہیں جو جذبات سے بلند ہوتا ہے۔ تمہاری یہ آرزو ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ **وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا (13:40)** تیری زندگی میں ہی یہ سب ہو جائے۔ وعدہ تو تو کہتا ہے، تیرا سچا ہے، اس پہ تو مجھے یقین ہے، اس پہ مجھے شک نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ بات تو اتنی ہے مگر یہ بتا کہ میری زندگی میں یہ آئے گا یا میرے بعد؟ اور ازاں کہ من نہ مانم۔ حضور ﷺ تو یہ نہیں کہہ سکتے تھے، میں بھی یہ جرات نہیں کرتا لیکن یہ آرزو ضرور تھی۔ خدا کی طرف سے جواب آیا کہ اے رسول ﷺ! جو وعدہ ہم کر رہے ہیں، وہ تیری زندگی میں پورا ہو یا تیرے مرنے کے بعد پورا ہو، یہ دیکھنا تیرا کام نہیں ہے کہ تو اس کو متعین کرے لہذا اس کا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ نتائج کب برآمد ہوتے ہیں، تیرا کام **فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40)** اس کو پہنچائے چلے جانا ہے اور ہوگا۔ کب نتائج نکلیں گے ہمارے قانون کے مطابق اس کا حساب ہوگا تو کرتا جا یہ کام۔ میرے اللہ! جی چاہتا ہے کہ تھوڑی جی وی تے رعایت دے دے۔ جے اور رعایت دیدوے تے اور بن دے قابل ای نہیں رہندا ①۔

① میرے اللہ! جی چاہتا تھا کہ تھوڑی سی ہی رعایت (Favour) دے جا۔ اگر وہ رعایت (Favour) مرحمت فرمادے تو وہ رب بننے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

عزیزانِ من! یہ شہادت کہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ رسول کی آرزو کا بھی یہ جواب ملا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ کچھ کرنے والے چار قدم چلنے کے بعد ہی مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ صاحب! وہ خدا کس قسم کا ہے؟ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، ہم مر رہے ہیں، روزِ مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں، تکلیفیں ہی تکلیفیں ہیں، اور یہ ہے کہ کہتا ہے کہ **فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ** (13:40) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطہ ہدایت کو لوگوں تک پہنچائے جا۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق نتائج کب ظہور میں آتے ہیں، کوئی بات نہیں۔ **فَإِنَّمَا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ** **أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُونَ** (43:41-42) یہ سمجھ رکھ کہ تیرے جانے کے بعد یہ ہوا تیرے سامنے یہ بات ہو، ہم ان دونوں چیزوں پر

قادر ہیں لیکن یہ تیرا کام نہیں ہے کہ تو ان کے لیے بیٹھ کے حساب کرے۔ وہ جو خدا نے کہا ہوا ہے کہ وہ بغیر حساب رزق دیتا ہے ہم اس بغیر حساب کو یہ سمجھتے ہیں کہ اے اللہ دی و نڈاے۔ اللہ دی و نڈا سارے کہندے نیں، تے جی جنوں چاہے لکھوں لکھ کر دے جنوں چاہے لکھوں لکھ کر دے۔<sup>①</sup> بغیر حساب کے معنی یہ نہیں ہوتے، وہ معنی یہ ہوتے ہیں کہ تمہارے حساب کے مطابق نہیں ہوگا وہ ہمارے حساب کے مطابق ہوگا۔ رسول کے لیے کہا کہ ہم اس چیز کے اوپر قادر ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ **فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ إِنَّكَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** (43:43) تو اُس وحی کے مطابق لازمی طور پر کرتا رہ۔ اس کے مطابق اپنا جو پروگرام ہے جاری رکھ۔ یہ یقین رکھو کہ تیرا جو راستہ ہے یہ سیدھا ہے، منزل تک پہنچا کر رہے گا۔ تھک کر نہ بیٹھ جاؤ، راستہ سیدھا ہے۔

عزیزانِ من! ایک آرزو اور ابھری کہ یا اللہ! مجھے اس کا یقین تو ہے کہ ضرور ان کی تباہی آئے گی۔ نظر آئے گا کہ یہ مکے کی زندگی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ **قُلْ رَبِّ اِمَّا تُرِيْنِي مَا يُوْعَدُوْنَ** **و رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي فِي الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ** (23:93-94) بارِ الہی! اگر ان پہ تباہی آئی ہے تو ایسا کیجیے کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے نہ آئے، مجھے یہاں سے پہلے نکال کر لے جا۔ نبی کا لطیف اور شفیق قلب ہوتا ہے۔ یا اللہ! تباہی آئی ہے اف، اگر یہ تباہی آئی ہے تو میری آنکھوں کے سامنے نہ آئے۔ انتقام کا جذبہ نہیں تھا۔ جذبہ تو سارا ہی اصلاح کا تھا، شفقت کا تھا، محبت کا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نہ ہو لیکن یہاں پہنچ کر یہ بات کہی کہ **وَ اِنَّا عَلٰی اَنْ نُّرِيْكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ** (23:95) ہم اس پہ قادر ہیں کہ تیری زندگی میں یہ کچھ ہو جائے، اس پہ بھی قادر ہیں کہ تو یہاں نہ ہو اور تیری بات بھی پوری کر دیتے ہیں تیری آنکھوں کے سامنے۔ یہ بات ہماری بھی پوری ہو جائے گی کہ یہ کر سکتا ہے۔

① یہ اللہ کی تقسیم ہے اور اللہ کی اس تقسیم کو سبھی یہ کہتے ہیں کہ وہ چاہے تو سوا ہوگا، کوئی نکال کر دے اور نکال کو سوا ہوگا۔

## دین خداوندی مدافعت کا سبق دیتا ہے طمانچہ کھانے کا نہیں

لیکن تیرے ذمے ایک پروگرام ہے۔ سینے عزیزانِ من! یہ پروگرام کیا ہے؟ کہا کہ یہ ساری ناہمواریاں، یہ ظلم، یہ استبداد، یہ زیادتیاں، یہ دھاندلیاں، یہ ناانصافیاں، سب کچھ ان کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ان کے جواب میں کہیں تم بھی ان ہتھیاروں پہ نہ اتر آنا۔ اسلام کا پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے طریق کار کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ اِذْفَعُ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ السِّيَةِ (23:96) مدافعت کر۔ طمانچہ کھا کر دوسری گال سامنے کرنے والی بات نہیں ہے، مدافعت کر۔ یہ ہے فرق عزیزانِ من! محرف شدہ دین میں اور خدا کے منہ دین میں۔ وہاں عیسائیت میں بھی یہ چیز ہے کہ یہ محرف ہے۔ کہا کہ مدافعت کر اس کی مدافعت کا طریق اور ہے کہ یہ جتنی ناہمواریاں پیدا کرتے جاتے ہیں، یہ گڑھے کھودتے ہیں، تو ان گڑھوں کو بھرتا چلا جا، تو اپنے حسنِ عمل سے ہمواریاں پیدا کرتا چلا جا، حسن کا راند انداز سے مدافعت کر۔ اس کا یہ جواب دے۔

## انسانیت کے لیے سیاست کا واحد علاج حسنات سے ہی ممکن ہے

قرآن کا وہ اصول میں بار بار دہرایا کرتا ہوں، ہر شخص یہ پوچھتا ہے کہ صاحب! یہ بڑے مظالم ہو رہے ہیں، بڑی ناانصافیاں ہیں، معاشرہ دیکھو کس طرح تباہی اور بربادی پہ اتر آیا ہے، کیا کیا جائے؟ ارے مجھ سے کیوں پوچھتے ہو اس سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (11:114)۔ میں نے کہا ہوا ہے کہ یہ چار الفاظ تو آپ کے ہاں حکومت کے ہر دفتر میں، ہر جگہ، جلی حروف میں لکھنے چاہئیں۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ (11:114) اس بات پہ یقین رکھو کہ برائیاں اور ناہمواریاں دور ہوتی ہیں حسنات کے ذریعے سے۔ حسن کہتے ہیں کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کر دینا۔ تو کہا کہ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ وہ کرسی پہ بیٹھا ہے اور وہ اب گرا یا اب گرا، تو کرسی کا اس کا توازن ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ کرسی کے پائے تلے ایک ٹکڑا دیدیو یعنی جو اس کا بگڑا ہوا توازن ہے اس توازن کو ٹھیک کر دیں، کرسی کو متوازن بنا دیں، علاج ہو گیا۔ قرآن سیات کا علاج حسنات سے کرتا ہے۔ جتنی زیادہ کسی معاشرے میں سیات عام ہو رہی ہیں اس معاشرے کے اندر اس سے زیادہ حسنات پیدا کرتے چلے جاؤ، سارا معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں ایک سیات کے مقابلے میں کہتے ہیں کہ دس سجدہ کرو یا اینٹ مارو یا پتھر مارو۔ اس سے تو صرف وہ پوری کی پوری عمارت گرا دو گے۔ یہاں مرض کا یہ علاج ہوتا ہے۔ برائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اگر ہلکی قسم کی برائی تھی، یہ اس سے زیادہ قسم کی برائی ہے۔ ہوتی یہ بھی برائی ہے۔ برائی کا علاج برائی نہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ برائی اور نیکی، بدی اور نیکی تو الفاظ ہی فارسی کے ہیں۔ قرآن تو ایک طرف، یہ عربی کے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ یہ الفاظ ہی تو ہیں جنہوں نے ان کو جھوٹا اطمینان بھی دلادیا، تباہیاں بھی لے آ رہے ہیں۔

ہمارے ہاں نیکی لفظ ہے۔ اس سے زیادہ تو لفظ ہی ہماری زبان میں نہیں ہیں اور نیکی کا اپنا Concept (تصور) اپنے ذہن کے اندر ہے۔ سیات اور حسنات آپ لے آئے اور ان کے معنی قرآن سے پوچھیے بات کہیں کی کہیں چلی جاتی ہے۔ جہاں ناہمواری پیدا ہوگی وہاں وہ ہزار نمازیں پڑھو لاکھ حج کیجئے وہ سیات میں داخل ہوگی اس کا علاج؟ حسنات کی طرف آپ کی توجہ ہونی چاہیے یہ اس کا علاج ہے۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجئے عزیزانِ من! معاشرے میں، میں اپنے معاشرے میں نہیں کہہ رہا، ساری دنیا میں سیات پھیلی ہوئی ہیں۔ دنیا سیات کا مقابلہ یا اس کی مدافعت سیات سے کر رہی ہے۔ سیات بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ میرے سامنے تو آج سے بیس تیس سال پہلے کے بھی یورپ کا جو ویلا ہے وہ بھی موجود ہے۔ اس کو اقبالؒ (1877-1938ء) یورپ کا واویلا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابھی نچلے سر میں ہے۔ وہ کب آئے گا؟ میں نے اس زمانے میں بھی ان کے ہاں کی تحقیقات کی کتابیں پڑھی ہیں، کچھ کم تھیں۔ جوں جوں یہ ان کی مدافعت کی تدبیریں کرتے جا رہے ہیں اپنے ذہن میں برائی کا مقابلہ اس سے زیادہ بڑھ کر برائی میں اور زیادہ برائیاں پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ ان معاشروں کے اندر یہ علاج ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (11:114) اجتماعی طور پر، تو عزیزانِ من! بہر حال معاشرہ یہ کرے گا، انفرادی طور پر آپ یہ کچھ حسن کا رانہ انداز میں کر کے دیکھیے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کر کے دیکھو بدترین دشمن، عزیز ترین دوست ہو جاتے ہیں۔ قرآن کا یہ ارشاد ہے کہ تم سیات کی مدافعت حسنات کے ذریعے سے کرتے رہو اجتماعی طور پر اپنی جماعت کو بھی تیار کرو۔ یہ سب من مارنے کی بات ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آپ ﷺ فاتح کی حیثیت سے آخر الامر جب مکے میں داخل ہوئے ہیں تو جنہوں نے اس سارے بیس سال میں کہہ لیجئے ہر قسم کی اذیت پہنچائی، مقابلہ کیا، تصادم کیا، جنگ تک میں اتر آئے، سب کچھ کیا، یہ سارے کے سارے قریش مکہ اس طرح پابجولاں سامنے کھڑے تھے اور دوسری طرف پوری مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ گئے۔ فاتح مکہ کی حیثیت سے حضور ﷺ تھے۔ وہاں دشمن اس طرح سے سامنے آ کر پابہ زنجیر کھڑے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ کہو، کیا سزا ہے تمہاری؟ حضور ﷺ بھی تو بہر حال حضور تھے مکہ والوں کے غیر نہیں تھے۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے جو فریق دشمن کی سزا ہوتی ہے وہ سزا دو۔ انہوں نے دشمن کا لفظ استعمال کیا۔ کہا کہ میں تو انسانیت کا دوست ہوں، دشمن نہیں ہوں: لَا تَشْرِبْ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92) کوئی سزا نہیں، یہ تھوڑی سزا تھی جو تمہیں مل گئی ہے اس کے بعد کوئی اور سزا باقی نہیں رہ جاتی، میرا کام زنجیروں کو توڑنا ہے، میرا کام زنجیریں پہنانا نہیں ہے۔ اِذْفَعُ بِالْأُتَى هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةِ ① (23:96)۔ یہ سارے کے سارے اس قدر وفادار اور ہمدرد اور ایثار شعار ہوئے کہ اس کے ساتھ کی صفوں کے اندر

① ان کی پیدہ کردہ ناہمواریاں اپنے حسن عمل سے دور کرتے رہا کرو۔ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ (23:96) ہم ان کی سب باتوں کو جانتے ہیں۔

سب سے آگے یہ لوگ تھے۔ لیکن اپنی جماعت کے متعلق ایک بات کی کہ اتنا بڑا فریضہ میرے ذمہ ہے۔ وَقُلْ رَبِّ اَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ (23:97)۔ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ کیا بات ہے۔ یا اللہ! میں صرف تجھ سے ایک چیز مانگتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میری مدافعت تو کر مجھے حفاظت دے مجھے پناہ میں رکھ۔ کس چیز سے؟ اس چیز سے کہ میری جماعت کے اندر آ کر کچھ لگا کر جو اس قسم کی بددلیاں اور منافرتیں اور سرکشیوں کے جذبات پھیلانے والے ہیں ان سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں باقی میں سب سنبھال لوں گا۔ یہ ہے جن سے پناہ مانگتے ہیں کہ یہ جو اس قسم کی سازشیں کرنے والے ہیں جب مستحکم جماعت ہوتی ہے نہایت متحمل ہوتی ہے وہ آتے ہیں اور ان کے نہایت ہمدرد اور شفیق اور یہی خواہ بن کر جماعت کے اندر سازشیں پیدا کرتے ہیں۔ انداز یہ ہوتا ہے کہ ”کیوں تینوں کی لب جانا اے ساری عمر تیری مار کھاندے آں گزر گئی“؟<sup>①</sup> یہ جو کچھ بھی ہے باپ بچے اور وہاں عزیز اور اقارب وہ سارے گرفتار بلا ہیں تم یہاں اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہو مل کیا رہا ہے ساری عمر گزر گئی باقی بھی گزر جائے گی بڑے ہمدرد بنے پھرتے ہو۔ یہ جو ہمدرد ہیں یہ ہیں جماعت کے اندر سازشیں پیدا کرنے والے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ جواب کیا تھا اور اب آپ نے دیکھا کہ یہ جو ہمیں کہا گیا ہے کہ اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ کس چیز سے Protection (حفاظت پناہ) مانگی جا رہی ہے؟ وَقُلْ رَبِّ اَعُوذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (23:98) اور میں اس چیز سے تمہاری پناہ مانگتا ہوں کہ یہ وہ جو محضرون کہہ کر کہا ہے کہ جو کچھ بھی تیرے قانون کے مطابق ان کو سزا ملنے والی ہے وہ میرے سامنے نہ ہو اور میری جماعت کی Protection (حفاظت) اس سے ہو جائے یہ تو بس میری دعا ہے۔ باقی جو کہا گیا ہے کہ جو میرا کام ہے میں وہ کرتا چلا جاؤں گا تو پھر وہ اس کے بعد نتائج تاریخ کے اوراق سے پوچھیے عزیزان من! پھر کیا برآمد ہوئے آج کا وقت پورا ہو گیا۔ انہیں ہم آئندہ لیں گے۔

سورة المؤمنون کی آیت 98 تک ہم آگئے 99 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



① کیوں آخر تجھے کیا ملے گا؟ کیا تیری ساری عمر ماری کھاتے گزر جائے گی؟

## پندرھواں باب: سورة المؤمنون (آیت 99 تا 107)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج اگست 1977ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة المؤمنون کی آیت 99 سے ہو رہا ہے: (23:99)۔

## مہلت کے وقت کی اہمیت

پیچھے سے ذکر یہ چلا آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو وارنگ دی جاتی رہی کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ یہ بڑا سائنٹفک طریق جاری و ساری ہے۔ ایک ایسا مرض جس کے متعلق آپ کو خیال تک نہ ہو کہ یہ مرض بھی آپ کو ہو سکتا ہے لیکن کچھ ایسی علامات ہوں کہ جنہیں دیکھ کر وہ یہ کہہ دے گا کہ دیکھو بھئی! تمہیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، ان ان چیزوں سے احتیاط برتو، ان ان قسم کی چیزیں کرو اگر ایسا نہیں ہوگا تو ایک دن یہ مرض بڑھ جائے گا اور اس کے بعد پھر شاید یہ لا علاج ہو جائے۔ عام طور پر اس قسم کی وارنگ پہ کان نہیں دھرا جاتا اور وہ مرض بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اس نکتے پہ پہنچ جاتا ہے جہاں وہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ وہ مریض تو چیختا روتا ہوا پھر ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور وہاں یہ کہتا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ میں نے تو تمہیں اتنا عرصہ پہلے اس کے متعلق وارنگ دیدی تھی لیکن تم نے اس پہ دھیان ہی نہیں دیا، کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ اب یہ بڑھتا گیا اور اس مقام تک آ گیا ہے۔ پھر یہ مریض بے ساختہ ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! اس دفعہ تو کسی طرح اس کا علاج کر دیجئے آئندہ کے لیے آپ دیکھیے گا کہ میں کس طرح اس کی احتیاط برتتا ہوں، میری توبہ میرے بڑوں کی بھی توبہ اگر میں یہ کچھ کروں۔ وہ جو اس تکلیف کی شدت ہوتی ہے اور اس درد کے جو نتائج سامنے آتے ہیں تو اس وقت یہ چیز بے ساختہ آتی ہے۔ یہ اندر کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی حفاظت چاہتا ہے اور فرق تو اتنا ہی ہے کہ پہلے سے جب یہ کہا جائے تو دھیان نہیں دھرتا اور جب وہ بالکل تباہی کے منہ پہ آ جاتا ہے تو اس وقت وہ چیختا ہے۔

پیچھے سے یہی بات چلی آ رہی تھی کہ ان کو وارنگ پہ وارنگ دی جاتی رہی کہ یہ غلط نظام ہے اور اس کا نتیجہ تباہی ہوگا لیکن وہ اس پر کان نہیں دھرتے، انہوں نے اس پر توجہ نہیں کی حَتَّىٰ اِذَا جَاءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ (23:99) جب موت ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے یا وہ مر جاتے ہیں تو قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۝ لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ (23:99-100) تو اس وقت یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں مہلت دے، ہمیں اس زندگی میں اس دنیا میں واپس بھیج دے تاکہ جو کچھ ہم نے پہلے نہیں کیا تھا، وہ کریں، اس کی اور نقصان کو پورا کریں، ہمیں کسی طرح واپس بھیج دے۔ آپ دیکھیے بات تو بڑی آسانی سے سمجھ آ جانے والی ہے اور بالکل سیدھی سادی سی ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ روزمرہ کے دیکھنے کی چیزیں ہیں۔

## موت کے بعد مختلف چکروں کا تصور یونان کا پیدا کردہ ہے

قرآن کریم تو سیدھی سادی بات کرتا ہے اور پھر بڑی گہرائی میں جا کر اہم قسم کے نظریات اور غلط معتقدات کی تردید بھی ساتھ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا انداز ہی یہ ہے۔ زندگی کے متعلق یہ واپس آنے کا ایک عقیدہ Transmigration of Soul (تسخیر روح) ہے۔ یونان سے اس کی ابتدا ہوئی۔ بات ذرا لمبی چلی جائے گی، میں بالکل مختصر الفاظ میں یہ عرض کروں گا۔ یونان کے فلاسفر نے دیکھا کہ یہ بڑے بڑے کرے جتنے بھی ہیں، یہ سب گول ہیں، چاند سورج گول ہیں۔ یہ ان کو زمین سے چلتے نظر آتے تھے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ جو سائیکل (دائرہ) ہے، یہ اصل میں کائنات کی بنیاد ہے لہذا اس چکر اور گول دائرے کے ساتھ انہوں نے زندگی کے متعلق بھی یہی تصور قائم کیا کہ یہ سائیکل آرڈر (Cyclic Order) میں چلتی ہے یعنی یہ زندگی دائرے کے اندر چلتی ہے۔ اب دائرے میں چلنے کے معنی یہ ہیں کہ جب دائرہ ختم کر کے پھر اس مقام پہ آئے تو پھر وہ چکر شروع ہو جائے یعنی وہ آگے نہیں بڑھتی بلکہ اسی چکر کے اندر رہتی ہے۔ انہوں نے یہ تصور کیا تو اس تصور کا پہلا ہی نتیجہ یہ تھا کہ پرستش کا کوئی راستہ ہی ان کے سامنے نہ رہا۔ جب کولہو کے تیل کی طرح آپ سارا دن ایک چکر میں چلتے رہیں، وہ تیل شاید تیس چالیس پچاس ساٹھ میل کا سفر طے کرتا ہے لیکن صبح جہاں سے چلا تھا شام کو وہیں سے اس کی رسی کھول دی جاتی ہے اور ساری عمر وہ اسی طرح سے چلتا رہتا ہے لہذا اب ان کے سامنے اگلی چیز یہ آئی کہ موت کے بعد زندگی مختلف چکروں میں رہتی ہے۔

زندگی کے سلسلہ میں انسانی سوچ آج بھی افلاطون، ارسطو اور فیثاغورث کے پیدا کردہ اسی چکر میں گرفتار ہے

ضمناً میں یہ عرض کر دوں کہ وجہ یہ ہے کہ یونان نظری طور پر (Theoretically) دنیا کے اندر تو فلسفے میں اُس دور میں ہی نہیں، بلکہ آج تک اس دور سے بھی بہت بلندیوں کے اوپر ہے۔ افلاطون (347-428 ق م)، ارسطو (322-348 ق م) وغیرہ کے مقابلہ کے فلسفہ دان آج تک پیدا نہیں ہوئے۔ یہ آپ کے ہاں کی جو Logic (منطق) ہے اس کی بنیاد آج بھی ارسطو کے کلیات پر ہے، وہ نظری طور پر بہت اونچے ہیں لیکن وہ اہل یونان سوئی تک نہیں بنانا جانتے تھے۔ وہ اس لیے کہ ان کے ہاں زندگی کا جو آگے بڑھنا تھا، اس کا یہ تصور ہی نہیں تھا۔ وہ زندگی کو دائری حرکت کے اندر لیتے تھے اور اب جب موت ان کے سامنے آئی تو انہوں نے کہا کہ اب کیا کیا جائے دائرہ ختم ہوا۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، مرنے کے بعد پھر انسان اس دنیا میں آتا ہے۔ انہوں نے مرنے کے بعد سائیکل آرڈر



(Cyclic Order) 'مسئلہ آواگون رکھنا تھا' پھر گردشِ دورلابی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ تھا ان کے ہاں وہ تصور جسے آپ Transmigration of Soul (تناسخ روح) کہتے ہیں۔ فیثاغورث (580-500 ق م)<sup>1</sup> نے اس چیز کی بنیاد کی رکھی جس کا نام ہندوؤں کے ہاں آواگون ہے۔

ہندو دھرم کی ساری بنیاد آج بھی اسی چکر کے عقیدہ پر ہے

آواگون کا یہ لفظ ہندی ہے۔ یہ ہندوؤں کے ہاں چکر ہے۔ ان کے ہاں تو کوئی چیز اپنی ہے ہی نہیں:

آنکھ نرگس کی ، دہن غنچے کا ، حیرت میری

ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

ان کے ہاں کوئی چیز اپنی نہیں ہے۔ ذرائع (Trace) کیجیے تو نظر آ جاتا ہے کہ وہ جتنے لوگ ان کے ہاں حملہ آور آتے رہے وہ تو تباہ و برباد کر کے چلے جاتے رہے۔ ان کے نظریات اور کلیات جو کچھ تھے وہ یہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ یہ جسے آپ ہندو دھرم کہتے ہیں انہوں نے یہ جو آواگون یا تناسخ کا چکر لیا ہے اس نے ہندوؤں کے ہاں دھرم کی شکل اختیار کی اور وہ آج تک یہ مانتے ہیں۔ وہ یونان والے تو مر مر گئے کہیں مٹ مٹ گئے یہ جو ن پلٹ پلٹ کے آتی ہے پھر واپس آنا پھر واپس آنا یہ تصور ان کے ہاں ابھی تک چلا آ رہا ہے۔

تصورِ آواگون کے برعکس قرآن حکیم کا پیش کردہ ایک عظیم تصور حیات 'صراطِ مستقیم' ہے

قرآن کریم نے آکر زندگی کے متعلق ایک لفظ دیا کہ زندگی صراطِ مستقیم پر چلتی ہے سیدھی لائن کے اوپر چلتی ہے چکر میں نہیں چلتی۔ چکر میں چلنے سے تو کوئی پروگریس (ترقی) نہیں ہوتی انسان وہیں کا وہیں رہتا ہے سیدھی لائن پہ چلنے سے آپ کا ہر قدم آگے کی طرف جاتا ہے سیدھی لائن بھی آگے کو جاتی ہے اور قرآن نے خدا کو ذی المعارج بھی کہا ہے۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اس میں ہر قدم ہر ڈنڈے پہ آگے بھی جاتا ہے بلندیوں کی طرف بھی جاتا ہے۔

<sup>1</sup> Pythagoras (c.580-500 B.C). Greek philosopher, theologian, and mathematician. The school he founded in southern Italy taught spiritual growth through asceticism and the study of musical harmony and geometry. Though his famous theorem was known previously, he was the first to prove its universal validity. His insight into the relationship between numbers and the perceived universe gives him claim to be the first true mathematician. (Reader's Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader's Digest Association Limited, P. 1253).

آپ دیکھیے کہ ایک لفظ سے قرآن کتنے بڑے فلسفے کی بنیادیں ہیں، جو رکھ رہا ہے لیکن رکھ کس طرح سے رہا ہے کہ چودہ سو سال پہلے کا ایک بدو، کھجور کی گٹھلیوں پہ گزارا کرنے والا وہ بھی بات سمجھ لے اور آج کا آئن سٹائن بھی اس سے بات سمجھ لے کہ زندگی چکر میں نہیں چلتی، سیدھی جاتی ہے، بلندیوں کی طرف چلتی ہے، طبقاً عن طبق درجہ بدرجہ بلند ہوتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی، چلی جاتی ہے۔ لہذا زندگی کے پیچھے کی طرف لوٹنے کا تو سوال ہی نہیں بلکہ زندگی کے پانی کا جو دھارا آگے بڑھ جاتا ہے، واپس نہیں آ سکتا۔ دو ہی شکلیں ہوتی ہیں: سیدھی لائن پہ چلنے والا یا تو رک جائے گا، ایک مقام پہ کھڑا ہو جائے گا یا آگے بڑھے گا، پیچھے آ ہی نہیں سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کہنے کو تو یہ ایک لفظ کا تصور ہے اور دعا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (1:5) یارب ذی المعارج! ہماری صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کر دے یعنی قرآن اتنی بات میں یہ کچھ کہہ کیا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن سمجھ میں اس طرح سے آتا ہے، اس کے لیے ان چیزوں کی Comparative Study (تقابلی مطالعہ) ہونی چاہیے: Religion (مذہب) ہی کی نہیں، فلسفے کی، زندگی کے نظریات کی، کلیات کی، پھر بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک لفظ سے قرآن کہہ کیا گیا ہے۔ اب یہاں اس نے کہا کہ جب ان کے سامنے نتائج آئیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اے ہمارے رب! ایک دفعہ ہماری زندگی کے اس پانی کے دھارے کو پیچھے کی طرف لوٹا دے، ہمیں واپس بھیج دے تو پھر دیکھ کہ جو کچھ ہم نے نہیں کیا تھا، جو کچھ تم کہتے تھے اور ہم کان نہیں دھرتے تھے، ہم پھر وہ کیسے کرتے ہیں لیکن اس قسم کے سارے تصورات کے لیے قرآن کا ایک لفظ ہے: کَلَّا (23:100) زندگی کے تصور میں یہ ناممکن ہے، تم پیچھے نہیں جاسکتے، رک کے یہیں کھڑے رہ سکتے ہو، آگے بڑھ سکتے ہو، پھر پیچھے قدم نہیں پڑ سکتا۔ کس قدر ایک نیا تصور دیا ہے قرآن نے۔ کہا کہ کَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا (23:100) وہ یہ باتیں ہیں جو وہ کر رہے ہیں جبکہ یہ زندگی کی ممکنات میں سے ہے ہی نہیں۔

### برزخی زندگی کا تصور اور عذابِ قبر کی حقیقت

برزخ کے عرصہ کی وضاحت میں کہا کہ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی يَوْمٍ يُبْعَثُونَ (23:100)۔ یہاں ایک اور لفظ آ گیا ہے۔ ہمارے ہاں درمیان میں ایک تصور آتا ہے کہ اس موت میں اور قیامت کے دن زندگی کے درمیان ایک عرصہ ہے اور یہ تو عام طور پہ آپ نے سنا ہوگا یعنی درمیان میں حیاتِ برزخ، برزخی زندگی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ یہ ان کے ہاں کا تصور پیدا ہو رہا ہے کہ یہاں موت ہے اور قیامت کو کہتے ہیں کہ زندگی ہوگی۔ یہ جو درمیانی عرصہ ہے یہ وہ ہے جسے آپ قبر کا عذاب کہتے ہیں یعنی حساب کتاب بھی ابھی نہیں ہوا ہے، جرم بھی کوئی ثابت نہیں ہوا، سزا بھی نہیں ہوئی، تو یہ جو درمیان میں، یہ قبر کا عذاب ہے وہ جو حوالات میں ملتا ہے عذاب یعنی ملزم ابھی

عدالت میں بھی نہیں پیش کیا جاتا، ان میں سے ستر، اسی، نوے فیصد تو ملزم بالکل بری ہو جاتے ہیں لیکن وہ ایک رات کی حوالاات چھ مہینے کی قید سے زیادہ شدید تر ہیں ہوتی ہے۔ قبر کے عذاب کی آپ جب تفصیل سنیں، تو پوچھو نہیں کہ انسان پہ پھر کیا گزرتی ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ اس کے اندر پھر پہلے دو گزروں والے آتے ہیں یعنی یہ وہاں اکیلا ہی قبر کے اندر ہے۔ بالکل یہی نقشہ ہوتا ہے یہاں کا جو ایک ملزم اور اتنے سپاہی اتنے گزروں والے آتے ہیں پھر وہ قبر کی جود یواریں ہیں وہ پھٹتی ہیں، درمیان میں ٹکراتی ہیں اس کی جو ہڈیاں ہیں توڑی جاتی ہیں، گزروں والے اس کو مار مار کے چور کر دیتے ہیں۔ یہ جو مولوی صاحب کہتے ہیں کہ وہ حلوہ پکا کے ان کو تقسیم کرو، تو وہ کیندے یہ ہیکے نیس پئی اے او ناں دی زخم بندی سمجھی جائے گی تے اونوں سیک پنچے گاتے ارمان آئے گا مردے نوں۔<sup>①</sup>

عزیزانِ من! اس کا سوال ہی نہیں۔ زندگی تو جوئے رواں ہے۔ اس میں انقطاع ہوتا ہی نہیں ہے۔ ہر فرد جو مرتا ہے، اس کی قیامت آ جاتی ہے۔ زندگی اسی طرح آگے چلتی ہے۔ زندگی میں انقطاع کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تو ایک جوئے رواں ہے۔

برزخ ایک پردہ ہے، جہاں اہل قبور اہل دنیا کی نہ سن سکتے ہیں، نہ سنا سکتے ہیں

اب اگر میں زندگی میں انقطاع نہ ہونے کی یہاں بات کروں تو یہ بات کچھ اور ہو جائے گی۔ یہاں بھی موت نہیں ہے۔ شعور یا Consciousness کا جو Level (سطح) ہے اس میں ایک فرق آتا ہے اور وہ عجیب چیز ہے۔ بات یہ ہوگئی کہ یہ جو برزخ ہے، جسے درمیان میں پردہ کہا گیا ہے، کہا یہ گیا ہے کہ یہ پیچھے کی طرف آ نہیں سکتے، لوٹ نہیں سکتے، پیچھے والے جو ہیں وہ نہ ان کی سنتے ہیں، نہ یہ ان کو کچھ سنا سکتے ہیں۔ یہ سارا قصہ جو آپ کے ہاں درگا ہوں پہ اور قبروں پہ جا کے اور حضرت صاحب کے نام پہ یہ کچھ کر کے فریادیں کرتے ہیں، یہ کچھ کرتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ مردے کا کوئی تعلق زندہ انسانوں سے رہ سکے۔ وہ تو ان کی سنتا ہی نہیں، ان کے پیچھے بس جو دنیا ہے اس میں ایک رکاوٹ ہو جاتی ہے، پردہ لٹک جاتا ہے، یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے یہ جو وراثت (23:100) ہے، اس کے معنی آگے نہیں ہوتا، عربی زبان میں پیچھے بھی ہوتا ہے کیونکہ اسی آیت میں آگے اس نے پھر الی یوم یبعثون کہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے وہ ایک پیریڈ ایسا بھی ہے کہ جس میں یہ آمنے سامنے بھی ہو نگے۔ اب جس کے سامنے ہونا ہے اگر وہ ابھی زندہ ہے اور یہ پہلے مر گیا تو یہ واپس نہیں آ سکتا، وہ اس کے ساتھ ابھی نہیں مل سکتا تو وہ ایک دور ہے جس کے اندر پھر یہ صورت بھی ہے کہ ”او آمنے سامنے وی ہونا اے۔“<sup>②</sup> یہ اس کے آگے ہے۔

① تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کی زخم بندی سمجھی جائے گی اسے گرمانش پنچے گی تو مردے کو آرام آئے گا۔

② وہ آمنے سامنے بھی ہوں گے۔

## روزِ قیامت صور پھونکے کا قرآنی مفہوم

وہ جو نقشہ ہمارے سامنے قیامت کا لایا جاتا ہے وہ بھی عجیب و غریب ہے۔ ”پکی روٹی“<sup>①</sup> دا ای نقشہ ہیگا اے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ: **فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ (23:101)**۔ وہ صور پھونکا جائے گا جیسے وہ بگل بجتا ہے۔ قرآن کے اندر عجیب الفاظ ہیں۔ اس کے معنی ہوتا ہے تو انائی پیدا کر لینا۔ یہ صور جو ہے یہ ٹھیک ہے یہ لفظ آتا ہے جب جنگ کے لیے بگل بجتا ہے یعنی یہ جنگ کے اس بگل بجنے کے لیے آتا ہے لیکن یہاں بنیادی صورت تو کچھ اور ہے۔ وہ جسے آپ صورت کہتے ہیں Form یا پیکر کہتے ہیں اسکی جمع صور ہے جسے یہ پھر صور پڑھا جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ جب ان پیکروں کے اندر تو انائی پھونکی جائے گی اس کا نام ہے جس کو آپ حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔ تو وہاں پھر یہ بتایا ہے کہ کیفیت کیا ہوگی۔ اب واپس یہ آ نہیں سکتے کہ کسی کمی کو پورا کر لیں۔ اب یہ دیکھیے کہ وہ جو قرآن کریم نے ایک چیز کہی ہے وہ ہے ہر فرد کی Individuality (انفرادیت) ہر فرد Individual اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔ اسے ہی نتیجہ بھگتنا ہوگا، کوئی ساتھ نہیں دے سکتا کیونکہ قرآن بتاتا ہے کہ **لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (6:164)** کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، کوئی سفارش سے نہیں چھڑا سکتا، کوئی کچھ دے دلا کر نہیں چھوٹ سکتا۔

## نجات کا یا عذاب کا تصور دوسروں سے مانگا ہوا ہے

یہ جو چھوٹ سکتا ہے اصل میں یہ سارا تصور عذاب کا یا نجات کا ہے۔ یہ ہم نے دوسروں سے مانگ کر لیا ہوا ہے۔ ہم نے تو یہ سمجھا ہوا ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا گڑھا ہے جسے جہنم کہتے ہیں۔ اس میں سزا بھگتنے کے لیے گناہ گاروں کو ڈال دیا جائے گا، وہ جینیں گے چلائیں گے، وقت مقرر ہوگا، یہ چھ مہینے کی قید، دس مہینے کی قید، سال بھر کی، دو مہینے کی، ایک دن کی، کچھ انکے ہاں کے تصور کے مطابق ڈال دیا جائے گا اور اس کے بعد پتہ چلے گا۔ یہ جو ان کے ہاں کے بڑے بڑے انبیاء اور اولیاء اور لیڈران ہیں وہ وہاں جا کر پھر ان کو سفارش کر کے چھڑا لائیں گے۔ یہ سارے قصے جتنے بھی ہمارے ہاں ہیں وہ بنیادی تصور نجات کے ہی ہیں جو کہ غلط ہے۔ اصل میں سزا کا یہ سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں یورپ سے پوچھیے وہ اس کو آج Appreciate (پسند) کر رہا ہے۔ قرآن نے جو تصور دیا ہے وہ بڑا سائنٹفک تصور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی Evolutionary Stages (ارتقائی مراحل) طے کرتی ہوئی، انسانی شکل کے اندر آگئی ہوئی ہے۔ وہ Scientifically (سائنسی لحاظ سے) اس کو Prove (ثابت) کرتے ہیں بتاتے ہیں کہ زندگی کی شکل یہ ہے کہ اگر کوئی نوع (Species) اپنے اندر اس قسم کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اس سے اگلے درجے میں جانے کے قابل ہو جائے تو

① یہ ”پکی روٹی“ میں جو نقشہ دیا گیا ہے وہی ہے۔

وہ اگلا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اگر ایسی صورت نہیں ہوتی تو وہیں رک کر رہ جاتی ہے اور رک کے بعد اکثر و بیشتر وہ انواع (Species) ختم ہو جاتی ہیں۔ Species (انواع) میں جسے یہاں زندگی (لائف) کہتے ہیں، یہ لائف اپنی Stages (منازل) طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ جس Form (شکل، پیکر) میں بھی وہ ہوتی ہے اگر وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے تو اس سے بلند درجے کی شکل میں چلی جاتی ہے، اگر وہ ایسی صورت حاصل نہیں کرتی تو یا تو اسی شکل میں رک کر رہ جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے۔

### زندگی تو جوئے رواں است کے مصداق ہے

جب لائف (زندگی) آئی ہے تو اب یہاں دو تصور آئے۔ ایک مغرب کا تصور آیا۔ وہ سیکولر (Secular) تصور تھا کہ یہاں تک پہنچنے کے بعد ارتقا کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے یعنی ان کی Scientific Investigation (سائنسی تحقیق) کے اعتبار سے گروہ در گروہ قرن ہا قرن سے یہ سلسلہ مسلسل چلا آ رہا تھا اور یہاں تک پہنچنے کے بعد تو بس پھر یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہیں کے Evolutionary Scientists (ارتقا کے سائنسدان) ہیں، انہوں نے یہ کہا کہ یہ کہہ کر تو تم فطرت کے منہ پہ چابک مار رہے ہو۔ تم خدا کو نہیں بھی مانتے تو کم از کم فطرت کو تو مانتے ہو کہ وہ اتنا لمبا پروگرام کس طرح سے، قرنہا قرن تک پہنچائے جس کا جو End (اختتام) ہے، وہ تو ختم ہو جاتا ہے، بس اس کے بعد اور کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم کیا کرتے ہو؟ جو تم کہتے ہو یہ جرم ہے، یہ فطرت کے خلاف گستاخی ہے، اس کی بار میں اس کا پروگرام تو تم دیکھو کہ اس نے کہاں سے اسے شروع کیا، یہاں تک لے آیا۔ کیا اس لیے یہاں تک لایا کہ اس کے بعد بس اس پروگرام نے ختم ہو جانا ہے؟ سنو یہ ختم نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے یہ ارتقائی منازل آگے بھی چلیں گے۔ یہ وہ تصور تھا، عزیزان من! جو قرآن نے دیا ہے کہ موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، زندگی آگے چلتی ہے۔ یہ جو جسمانی پیکر ہیں، وہ فزیکل باڈی ہیں، وہ Physical Law (طبعی قوانین) کے تابع ہوتی ہیں۔ وہ ٹھیک ہے کہ ان کی Disintegration (پڑمردگی) ہو جاتی ہے، وہ ختم ہو جاتی ہیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ جلا دیجیے، مچھلیاں کھا جائیں، اس کو ویسے تباہ کر دیجیے، دبا دیجیے، اس کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ان جسمانی پیکروں کے برعکس لائف اور شے ہے، وہ آگے بڑھتی ہے اور یہ تصور قرآن کا ہے کہ اگر اس کے اندر وہ جو لائف ہے، جسے آپ انسانی ذات کہہ لیجیے اقبالؒ (1877-1938ء) نے خودی کہہ کر اس کا تعارف کرایا ہے، اسے سیلف (Self) کہہ لیجیے قرآن اسے نفس کہتا ہے، وہ شے جو جسم نہیں ہے، وہ شے جو جان بھی نہیں ہے، جان تو یہ جو فزیکل مشینری آپ کے ہاں ہے، اس کی حرکت کا نام ہے، جو وہ آگے بڑھتی ہے۔ جو جسمانی لائف ہے یہ وہ لائف نہیں ہے۔ لائف (زندگی) اور شے ہے اور وہ آگے بڑھتی ہے۔ قرآن نے یہی بتایا ہے۔

## ہر دم جواں ہے زندگی

اب یہ دیکھیے کہ یہ جو Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات) ہوئی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ زندگی آگے بڑھتی ہے ہر فرد یہ Individual کا صحیح ترجمہ ہے ترجمہ تو ہم یہی کرتے ہیں لیکن اس سے Individuallity (انفرادیت) کا تصور ہمارے ذہن میں نہیں آتا ہاں تو یہ فرد کا اپنا اپنا تشخص ہے اپنی اپنی ذات ہے میں ’میں‘ ہوں آپ ’آپ‘ ہیں اور ہر فرد جو کچھ اس زندگی میں کرتا ہے اس کے مطابق اس کا Future (آخرت) مرتب ہوتا ہے۔ اس کی ذات اس کے مطابق بنتی چلی جاتی ہے۔ اگر اس زندگی سے جو اگلی اس سے بلند منزل ہے وہ اس منزل کو طے کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے تو وہ ایک قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے جنت کی زندگی کہا جاتا ہے۔ اگر اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو اسے روک دیا جاتا ہے وہ رک جاتی ہے۔ اس کے لیے قرآن کا لفظ جحیم ہے۔ اس کے عربی زبان میں معنی ہی رک جانا کھڑے ہو جانا ہے۔ یہاں یہ مارپیٹ اور سزا وغیرہ کا تصور نہیں۔ قرآن نے بڑا نیچرل اور سائنٹفک تصور دیا ہے۔

انسان کا ایک ایک سانس اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے خدا کی ذات سفارشوں سے ماورا ہے اب قرآن کا یہ تصور ہے کہ ہر فرد کا اپنا جو کچھ عمل ہے اس کے مطابق اس کی ذات بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہاں قیامت میں جا کے ایک دن بن جاتی ہے۔ یہ بنتی چلی جاتی ہے ہر سانس میں قیامت پنہاں ہوتی ہے اسی لیے تو وہ کہتا ہے کہ

نخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

اے واعظ! بڑی بڑی لمبی چوڑی باتیں تم نے کیں قیامت کے اندر میزان ہوگی اور اعمال نامہ ہوگا۔

مگر ہزار حیف نہ بنی قیامت موجود

یہ جو تیری ہر سانس میں قیامت ہے اس پہ تیری نگاہ نہیں پڑ رہی یہ تو ہر سانس میں قیامت ہے ہر سانس میں انسان کی ذات بنتی اور بگڑتی چلی جاتی ہے اور اس کا جو Accumulative Effect (مجموعی اثر) ہوتا ہے۔ اس کے مطابق اس کا Future (آخرت) بنتا ہے۔ پھر تو اب سیدھی سی بات ہے کہ اس میں وہ سارے تصورات غیر قرآنی ہیں کہ جب وہ شفاعت کریں گے تو بخشش کی یہ چیز ہوگی وہ رحم کرے گا خدا بخش دے گا پھر یہ کرا جائے گا یہ سارا تصور ہی باطل پٹنی ہے۔ جسے اعمال کہا ہے اس کے نتائج میں تو کوئی دخل ہی نہیں دے سکتا۔ یہی نہیں ہے کہ جو عمل باہر سرزد ہوتے ہیں انہی کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے یہاں تو دل میں گزرنے والے خیالات کا اثر بھی ذات انسانی پر ہوتا ہے۔ یہ وہ جرائم ہیں جو سوسائٹی کی گرفت میں ہی نہیں آسکتے تو اس میں کسی کی سفارش کا شفاعت کا کسی کے کہنے سننے کا معافی کا سوال

ہی نہیں ہے اس میں بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن سائنٹفک تصور دیتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ جب پھر جو اگلی زندگی ہے اس کے اندر یہ چیز سامنے آئے گی۔ پہلی چیز تو کہا کہ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُوْنَ (23:101)۔ دو لفظوں میں ساری بات کہہ دی۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ وہاں ”انساب“ کسی کام نہیں آئیں گے۔ آپ کو پتہ ہے کہ انساب کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے جسے آپ نسبی رشتہ کہتے ہیں، یہ جو باپ بیٹے کا رشتہ ہوتا ہے اس کو عام طور پر انساب کہتے ہیں لیکن اس کو کیوں چکا یا جائے قرآن کی وسعت کو کیوں نہ لیا جائے۔ انساب تو نسبت کی جمع ہے۔ وہاں ہر قسم کی نسبتیں ٹوٹ جائیں گی، اور پھر نسبت تو ماں باپ ہی کے ساتھ نہیں ہوتی، یہاں تو عجیب عجیب قسم کی نسبتیں ہوتی ہیں، آپ کے ہاں سب سے بڑی نسبت تو ایک طریقت میں اور پیر و مرشد کی نسبتیں ہوتی ہیں جبکہ وہاں کوئی نسبت کام نہیں دے گی۔

### قرآن حکیم کے نزدیک نسبتوں کی حیثیت اور کیفیت

جیسا میں نے عرض کیا ہے انساب کا مفہوم وسیع تر ہے۔ کسی قسم کی کوئی نسبت کام نہیں دے سکتی اور آپ دیکھیں گے کہ یہاں ہمارے ہاں نسبتوں کے عقیدے کتنے گہرے ہیں۔ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ قرآن ہاتھ میں لے کر تو فرقے کی بات کرنا شرک ہے، عزیزانِ من! میں کسی پہ تنقید نہیں کرتا، لیکن یہ چیز جو قرآن کا تصور ہے، جسے آپ نجات کہہ لیجیے، اسے فلاح کہہ لیجیے، Future کہہ لیجیے، مستقبل کہہ لیجیے، اس میں تو ذاتی اعمال کے سوا کسی قسم کی کوئی چیز اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اب یہ جو انساب ہے، اس میں ہمارے ہاں حدیثیں ہیں اور وہ حدیث اہل سنت و جماعت کی کتابوں کے اندر کی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ چلا ہوں: ایک کتاب اللہ اور ایک میری یہ سنت، لہذا کہا گیا کہ اگر تم ان دونوں کے ساتھ تمسک رکھو گے تو پھر جنت میں جا سکو گے۔ یہ انہی کے ہاں کی اتنی بڑی نسبت حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کے دل میں حضرت علیؓ کی محبت نہیں، ایمان اس دل میں نہیں آ سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں یہ عقائد لیکن ایک منٹ ٹھہریے رکھیے یہ جو روایات تھیں یہ ان کے عقیدے کے مطابق اکٹھی ہوئیں، بلکہ عباسیوں کے دور (750-1258AD) میں بنیں۔ آپ سوچیے کہ عباسیوں کا زمانہ ہو، جنہوں نے حضرت علیؓ کی کرم اللہ وجہہ (600-66/AD) کی نسبت سے یہ جو سادات تھے ان سے انہوں نے مملکت تو چھینی کیا، ان کو انہوں نے آلہ کار بنا کے مملکت حاصل کی تھی۔ یہ ساری حدیثیں دراصل عباسیوں (750-1258AD) کے دور میں آپ کے ہاں جمع ہوئیں یا بنی تھیں۔ سلطنت ان کی تھی جس میں یہ بن رہی تھیں۔ تو وہ اہل بیت کی محبت یا حضرت علیؓ کی محبت کی حدیث کو تو کسی طرح مٹا نہ سکے۔ آپ حیران ہو گئے کہ جہاں یہ ہے اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس دل میں عباس کی محبت نہیں ہوگی، اس دل میں ایمان نہیں آ سکتا۔ چلیے صاحب! سیدھی بات ہے او یہ آج اس دورِ جمہوریت میں آپ کی کیفیت یہ ہے کہ آپ نسبتیں گھڑتے رہتے ہیں۔ وہ تو ملوکیت کا زمانہ تھا، عباسیوں کے دور

(750-1258AD) میں حدیثیں بنیں اور یہ ناممکن ہے کہ وہ ”اسے برداشت کر لیں: او شریکا اوناں دا“<sup>①</sup>۔ وہ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، یہ نہلے پہ نہلا ہیں، یہ تو سنیوں کے ہاں کی حدیثیں ہیں، شیعہ حضرات کو تو چھوڑ دیجیے۔ یہ حدیث آپ کے ہاں ہے، اس کے ساتھ ہی ہے سورۃ شوریٰ میں جو آیت آتی ہے اس کی تفسیر کے اندر آپ دیکھیے۔ پھر یہ جو حدیثیں آتی ہیں انہوں نے کہا حضرت علی ♦ کی محبت اگر نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس دل میں حضرت عباس کی محبت نہیں ہے اس دل میں ایمان نہیں آ سکتا۔ آپ اس سے اس شریکے کا اندازہ لگائیے۔

کسی انسان کا عمل دوسرے انسان کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔

قرآن کہتا ہے کہ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُوْنَ (23:101) کوئی نسبت کام نہیں دے سکے گی۔ وہ Scientific Base (سائنسی بنیاد) ہے کہ سکھیا کھا لیجیے دور کی نسبت تو ایک طرف، ڈاکٹر کا جو حقیقی بیٹا ہے، وہ بھی یہ کہہ کر کہ میں ڈاکٹر کا بیٹا ہوں، سکھیے کے اثر سے نہیں بچ سکتا، ڈاکٹر خود نہیں بچ سکتا، بیٹے نے کیا بچنا ہے۔ بیٹے کے متعلق بھی تو انہی کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے حضرت فاطمہؑ سے بھی کہہ دیا کہ فاطمہ! یاد رکھو، قیامت میں یہ کہہ کر تم نہیں چھوٹ سکتی کہ میں محمد ﷺ کی بیٹی ہوں۔ وہاں تو تمہارے اپنے ہی اعمال ہیں جن کی وجہ سے تم چھوٹ سکتی ہو۔ یہ تو اولاد کے متعلق ہے۔ حدیث کی ضرورت نہیں، یہ قرآن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی معصیت کروں تو میں بھی اس کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ جس ذات کے متعلق، پھر یہ عقیدے وضع ہو گئے کہ ساری گنہگار امت کو وہ جہنم سے چھڑا کے لے جائے گی۔ وہ اپنے متعلق یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کے بعد Any more scientific (کسی مزید سائنسی بنیاد) کی ضرورت نہیں رہی۔ نسبت ان چیزوں سے کسی کو بچا ہی نہیں سکتی۔ قرآن کا مکافاتِ عمل کا بڑا عجیب تصور ہے۔

قرآن حکیم کے بیان کردہ مکافاتِ عمل کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا اعلان

عزیزانِ من! یہیں پہنچ کر یہ نظر آتا ہے کہ لاریب یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ دنیا کے کسی مذہب میں آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ کسی اور کا کوئی اثر یا بخشش یا سفارش نہ ہو۔ کسی مذہب کو لیجیے وہاں یہی ہے کہ کسی نہ کسی نسبت سے، کسی نہ کسی کفارے سے، سفارش سے، مجرم چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں جو بلند تریں ہستی ہے، جن کی ذات کے ساتھ ہماری یہ عقیدت ہے کہ مجرموں کے آپ ﷺ شفیع ہیں، حالانکہ خدا

① وہ اسے برداشت کر لیں: وہ شریکا (قبیلہ) ان کا ہے۔



خود قرآن میں رسول سے یہ کہنجا رہا ہے کہ اس چیز کا اعلان کر دو اور رسول اعلان کر رہا ہے کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی معصیت کروں تو میں بھی اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا، کوئی ذات نہیں بچ سکتی۔ عزیزانِ من! یہ نسبتیں تو میں نے ابھی بہت دور کی کہی ہیں۔ ہمارے ہاں تو کیا بات ہے!

### ایک روایت کی روشنی میں حضرت ابراہیم جنت کے دروازے پر

جب شاعری شروع ہوتی ہے اور تصوف تو شاعری ہی ہے، تو پھر پوچھو نہیں کہ کیا سے کیا ہوتا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی روایت ہے یا ان کی طرف منسوب ہے، بہر حال ہم تک تو یوں پہنچتی ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں یوں سمجھے کہ محاکاتی انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے دروازے پہ ایک رضوان کھڑا کر رکھا ہے، وہ Ticket collector (ٹکٹ کلکٹر) ہے۔ وہ ہر ایک کی ٹکٹ دیکھ کر اندر جانے دیتا ہے۔ جب یہ سب کچھ ہو ہوا جائے گا اور پلیٹ فارم خالی ہو جائے گا تو وہ اندر جنت میں دیکھیں گے کہ لاکھوں کی تعداد میں مجرم جنت کے اندر پھر رہے ہیں تو اسے بلایا جائے گا کہ ”تو کی کر داسیں دروازے تے کھلوتا ہویا؟ کہنے لگا: جی میں تے اک نہیں بغیر ٹکٹ والے نوں اندر جان دتا۔ کہنے لگے: او اندر ویکھ تے سہی جاکے، بعض بہنیں معاف رکھیں، وہ جو اتنی پنجابی نہیں سمجھتی، بعضی گل داسوا داوندا ای پنجابی اچ ہے <sup>1</sup>۔“ کہا، ”تو دیکھ تو سہی اور وہ بھی انگشت بدنداں ہے، اوپر سے ڈانٹ پڑ رہی ہے اور حالت یہ ہوئی تو اس پہ وہ یہ جھگڑا دیکھ کے وہ پیر صاحب مسکرائیں گے۔ اللہ میاں سمجھ جائے گا۔ حضرت صاحب جب اندر جا رہے تھے تو انہوں نے ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا (ان کے ہاں کمبلیاں ہوتی ہیں) اور یہ اپنی کمبلی کے لیے سند بھی لے آتے ہیں، پہلے حضور ﷺ کو کمبلی والا بنایا، تو پھر یہ ساری کمبلیاں جتنی تھی پھر وہ ان کے ہاں آئیں۔ بہر حال پتہ چلا کہ ان کے کمبل کے جوتانے باندھے تھے اس کے بانا کے ہر تانگے کے ساتھ ان کی مریدوں کی روحیں چمٹی ہوئی تھیں، وہ گزرے تو انہوں نے اپنا ایک ٹکٹ دکھایا اور ٹھیک ہے کوئی لمبا چوڑا سا تھ سامان بھی نہیں کہ وہ تولنا ہو، کچھ بھی نہیں، خالی ہاتھ چلے جا رہے ہیں، ایک کمبل اوپر اوڑھا ہوا ہے، اندر جا کر جھاڑ دیا۔ اے جنوں تسی کیندے ہونا حضرت صاحب دی کمبلی اچ جواں پے گیاں، اسے جواں نہیں <sup>2</sup>۔ اندازہ لگائیے۔ عزیزانِ من! میں تو یہ سوچ کر خون کے آنسو روتا ہوں کہ کیا یہ قوم قرآن پہ آ جائے گی؟

<sup>1</sup> تم دروازے پہ کھڑے ہوئے کیا کر رہے تھے؟ کہنے لگا: جی میں نے تو بغیر ٹکٹ ایک کو بھی اندر نہیں جانے دیا۔ کہنے لگے: ارے اندر جا کر دیکھو تو ذرا۔

بعض بہنیں مجھے معاف رکھیں جو اتنی سی پنجابی بھی نہیں سمجھتیں۔ کچھ باتوں کا مزہ آتا ہی پنجابی زبان میں ہے۔

<sup>2</sup> یہ جسے آپ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب کی کمبلی میں جو نمیں پڑ گئیں یہ جو نمیں نہیں ہیں۔

## قرآن حکیم کے نزدیک شفاعت کی نوعیت

شریعت میں آئیے تو نبی اکرم ﷺ کی شفاعت آگئی۔ وہ اتنا گہرا عقیدہ ہے کہ ہمارے ہاں کسی کے لیے بدترین بددعا یہ ہوگی کہ خدا کرے تمہیں رسول کی شفاعت نصیب نہ ہو یا مجھے یا کسی اور کو کوئی بہت بڑی قسم کھانی ہو تو ہمارے سامنے یہ شریعت یا یہ طریقت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ (23:101) کوئی نسبت کام نہیں دے گی۔ عزیزانِ من! ایک لفظ انسب میں کہہ رہا ہوں کہ قرآن نے کیا بات کہہ دی ہے! تفصیل میں جائیے تو ایک کتاب لکھی جائے۔ ایک لفظ انسب کہہ کے اس نے وہ رشتہ داری کی بنا پر جو محبت کے عقیدے تھے ان کو بھی کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ ساری طریقت وغیرہ کے یہ جتنے عقیدے، جتنی نسبتیں تھیں، یا ہیں، وہ تمام ہمارے ہاں دوسروں کے ساتھ اس لفظ نسبت سے ہوتا ہے کہ ان کی نسبت حضرت صاحب کے ساتھ ہے اور قرآن نے کہہ دیا کہ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ (23:101)۔ انسب کہتے ہو تو سن لو کہ نہ رشتے داریاں باقی رہیں گی اور نہ ہی کوئی ایک دوسرے کا پرسان حال ہوگا۔ کوئی شفاعت نہیں بلکہ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ (23:101) وہاں تو ہر ایک کو اپنی اپنی ایسی پڑی ہوئی ہوگی کہ کوئی پہچاننے کے باوجود اس سے سلام علیکم نہیں کہے گا کہ کوئی بات نہ کر جائے کسی دوسرے کو پوچھے گا نہیں۔ دوسرے مقام پر اسی کی تشریح آئی ہے اور اس دن کا نقشہ جو کھینچا گیا ہے وہ ہے کہ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيهِ (80:34) بھائی بھائی کو دیکھے گا تو دور سے ہی بھاگ جائے گا اور اس کی اگلی ہی آیت کے عجیب لفظ ہیں کہ وَ اُمَّهٖ وَ اَبِيْهٖ (80:35) میاں اپنی بیوی کو اور ماں باپ اولاد کو چھوڑ جائیں گے وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهٖ (80:36) اس لیے کہ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيْهِ (80:37) اپنی اپنی ہر ایک کو ایسی پڑی ہوگی کہ سوال ہی نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے کو وہ پوچھ بھی لے کہ تیرا کیا حال ہے، جائیں گے کیسے! ❶

## دورِ حاضر کی سائیکولوجی (نفسیات) کے بالمقابل قرآن حکیم کی روشنی میں انسانی ذات کی وضاحت

سورۃ الانعام کی 95 ویں آیت میں ایک بڑا عجیب لفظ ”فردائی“ ہے۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو ”فرد“ کا لفظ ہے جہاں سے ہمارے ہاں انفرادیت بنا ہے قرآن نے تو اس کو ”فردائی“ کہا ہے یعنی Individuality (انفرادیت)۔ آج ہمارے ہاں کے یہ جو سائیکولوجسٹ (ماہر نفسیات) ہیں ان سے پوچھیے۔ وہ فخر کرتے ہیں کہ ہم نے تم لوگوں کو ایک ایسی اصطلاح دی ہے کیونکہ ان کے ہاں علم نفسیات میں لائف سے Soul (روح) سے Spirit سے کام نہیں چلتا تھا، اس کا مائنڈ (Mind) سے بھی کام نہیں

❶ ان نکات کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن پارہ 30 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006، ص 181 تا 197۔

چلا انہوں نے Psyche کہا ہے۔ تو اس کا بھی اور انداز ہو گیا اور پھر انگریزی زبان میں Personality (شخصیت) کہا۔ کہتے ہیں کہ آپ کو پتہ ہے کہ وہ بہت اچھی Personality ہے اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پھر اس کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ اس سے بھی کام نہیں چلا ہے۔ پھر انہوں نے ایک لفظ Individuality لے لیا ہے اور یہ جو لفظ تھا انہوں نے قرآن کریم سے لے کے ترجمہ کیا ہوا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادٰی (6:95) تم Individuality (انفرادیت) لے کر ہمارے پاس آؤ گے اور یہاں سنئے کہ Individuality کے معنی کیا کیے ہیں؟ اور یہ بات یہاں ہر ایک بولتا ہے۔ ہر ایک تو ایک طرف رہا، بڑے بڑے دانش مند بھی کھڑے ہو کر نہیں سوچتے ہیں: میرا ہاتھ، میری آنکھ، میرا گھر، میرا بیٹا، میرا باپ، حتیٰ کہ میرا جسم، حتیٰ کہ میری جان۔ یہ جسے ”میری“ کہہ رہے ہیں، یہاں لفظ جو ”میں“ ہے تو یہ کون ہے جس کا یہ سب کچھ ہے؟ جان تک بھی آپ کہتے ہیں کہ یہ میری جان ہے، یہ میرا جسم ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے یہاں کوئی چیز نہیں رہی البتہ میری زبان سے یہ نکل گیا کہ ”میں“ نے یہ کہا ہے ”میں“ نے یہ کیا ہے۔ یہ ”میں“ کون ہے جو یہ کچھ کہہ رہا ہے، کر رہا ہے یعنی یہ ”میں“ کون ہے؟ جسم نہیں، جان نہیں، ہاتھ نہیں، پاؤں نہیں، وہ تو سب تم کہتے ہو: میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میرا جسم، میری جان۔ یہ ”میں“ کون ہے جو کہہ رہا ہے کہ ”میں“ نے یہ کیا۔ یہ ساری چیزیں ”میں“ کی نسبت سے ہیں۔ ”میں“ کسی کی نسبت سے نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں یہ بغیر کسی نسبت کے اپنے مقام پہ ہے اور باقی سب کچھ اس دنیا میں جو ہے اس ”میں“ کی نسبت سے ہے۔ قرآن نے یہاں یہ جو انساب کہا تھا یعنی نسبتیں میں نے کہا تھا کہ آپ دیکھیے کیسے اس کی تشریح ہو رہی ہے۔

### موت کے عمل سے انسان کا تو جسم مرجاتا ہے لیکن ”میں“ نہیں مرقی<sup>1</sup>

قرآن یہ کہتا ہے کہ جسے تم جزا کا دن کہہ رہے ہو جسے ہمارے پاس آنا کہہ رہے ہو جسے زندگی کا Future (آخرت) کہہ رہے ہو وہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادٰی (6:94) جس کو تم میری یا میرا کہتے تھے وہ موت کے ساتھ پیچھے<sup>2</sup> رہ گیا اور انسانی ”میں“ ہمارے سامنے آ گیا۔ عزیزان من! آج دنیا کے جو سائنٹیکو لو جسٹ (ماہرین علم نفسیات) ہیں ان سے پوچھیں وہ بتائیں گے کہ قرآن یہ کیا فقرہ کہہ گیا ہے: جسے بھی تم ”میرا“ کہتے تھے یا ”میری“ کہتے تھے اسے تم پیچھے چھوڑ آئے اور یہ جو ”میں“ تھا وہ ہمارے سامنے آ گیا۔ تو پوچھا جائے گا کہ یہ ساری زندگی کہتے رہے تھے کہ ”میں“ نے یہ کیا ”میں“ نے یہ خیال کیا ”میں“ نے یہ کہا۔ یہی تھی کسی

1 فرشتہ موت کا چھوٹا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے۔ اقبال

2 نکولس باردیو (Nicholas Bardyeau) اپنی کتاب Slavery and Freedom (غلامی اور آزادی) میں موت کے متعلق لکھتا ہے کہ ”موت انسان کا خاتمہ نہیں کرتی، وہ صرف خارجی دنیا کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔“

کے ساتھ نسبت۔ تو اب اس کی یہ ”میں“ نہیں رہی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ یہ بتا کہ تو نے یہ کیوں کیا تھا۔ کہا کہ وہاں یہ ”میں“ جواب دے گا کیونکہ یہ سوال ”میں“ سے ہوگا اور وہاں یہ قطعاً نہیں کہہ سکے گا کہ صاحب! میرے ہاتھ نے یہ چرایا تھا اور میری زبان نے یہ کہا تھا وہ اس لیے کہ یہ تو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ لہذا اے ”میں“! بتا تو نے یہ کیا کیا؟ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من! یہ کیا کتاب ہے!

میں کہہ رہا ہوں کہ یہ قرآن کیا کتاب ہے! یہ بات چودہ سو سال پیشتر کہی گئی۔ میں کہتا ہوں کہ آج بیسویں صدی میں بھی اس انداز میں کوئی یہ بات نہیں کر سکتا، گو کہ آج یہ علم ان بلندیوں تک پہنچ چکا ہوا ہے۔ یہ بات چودہ سو سال پیشتر عرب جیسی سرزمین میں ایسا فرد جو چالیس سال تک لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا وہ کہتا ہے۔ ان کو مسائل کہیے ان کو نظریات کہیے وہ ان کو کچھ کہیے اس انداز میں بیان کر رہا ہے کہ کوئی نسبت وہاں نہیں رہے گی یعنی یہ نسبت میرا باپ، میری ماں، میرا دوست، میرا بھائی، میرا افسر، میرا شفاعت کرنے والا، یہ سب میری ہے۔ کہا کہ یہ جو میری اور میرا واقعہ تھا وہ تم پیچھے چھوڑ آئے تو جسے تم میری جان کہتے تھے وہ بھی پیچھے چھوڑ آئے ہوئے ہو۔ اے ”میں“! بتا جو تو کہتا تھا۔ وہاں تو اقرار کرتا ہے کہ ”میں“ نے کہا تھا۔ کیا بات ہے قرآن کے بات کرنے کی! جواب نہیں بن پڑیگا۔ ساری عمر کہا تھا کہ ”میں“ نے کیا ہے۔ اور یہاں کہا کہ ”اے میں“! بتا اور آگے کہا کہ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُمْ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ (6:94) وہاں تمہیں ان کا بہت بڑا بھروسہ تھا جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ یہ ساتھ کھڑے ہو کے شفاعت کر لیں گے سفارشیں کر دیں گے بچا دیں گے نجات دلا دیں گے۔ یہاں اس ”میں“ کیساتھ ایک بھی باقی نہیں رہا کیونکہ وہ جنہیں تم میرے شفیع اور میرے سفارشی کہتے تھے وہ میرے تو سب پیچھے رہ گئے۔ اب اس ”میں“ کا فیصلہ وہاں ہوگا۔

### مغرب کے مفکرین کے سامنے قرآن حکیم کو قرآن کی روشنی میں پیش کرنے کا طریق

اب سوال یہ ہے کہ اس ”میں“ کا یہ فیصلہ کس طرح سے ہوگا؟ عزیزانِ من! زندگی کے آخری دور میں پہنچ رہا ہوں یہ نہیں کہ کتنے دن اور زندہ رہوں گا۔ کہتا یہ ہوں کہ مغرب کے مفکرین کے سامنے قرآن حکیم قرآن کی روشنی میں پیش کرنا چاہیے کیونکہ مذہب کے عقائد میں جکڑے ہوئے انسان کا ذہن خالی نہیں ہو سکتا لہذا قرآن کا کہنا یہ ہے کہ یہ باتیں وہ سمجھ سکتے ہیں جو اپنے دل و دماغ کو پہلے سے قائم کردہ عقائد سے خالی کیے ہوئے ہوں۔ اس کے سمجھنے کے لیے یہ شرط اول ہے۔

### جہاں فردا کے متعلق ہمارے قائم کردہ تصورات

قرآن تو بات ہی سائنٹفک کرتا ہے۔ اب سنیے اگلا فقرہ آ گیا کہ یہ فیصلہ کس طرح سے ہوگا کہ یہ آگے جانے کے قابل ہے یا پیچھے رہ جانے کے قابل ہے؟ ہمارے ہاں تو تصور یہ ہے کہ انسان جائیں گے اور جتنے گنہگار ہوں گے جنہوں نے کچھ گناہ کیے ہوئے ہوں گے ان کی

سزا بھگتنے کے لیے انہیں جہنم میں بھیج دیا جائے گا وہاں جب وہ اتنی سزا بھگت لیں گا تو پھر وہ وہاں سے پاک صاف ہو کر جنت میں جائیں گے یعنی جنت میں وہ جائیں گے جن کے ساتھ گناہ کی کسی قسم کی کوئی آلائش باقی نہیں رہی ہوگی یا تو وہ شفاعت کے ذریعے سے دھو دی جائے گی اور اس طرح یہیں وہ کپڑے اتار لیں گے۔ یعنی مثالیں ہمارے ہاں یہ دی جاتی ہیں کہ جو جہنم ہے وہ دھو بی کی بھٹی ہوتی ہے۔ اصل میں وہ بھٹی میں گرا دیتے ہیں، جتنی وہاں وہ ادھر ادھر کی میل، کالک لگی ہوئی ہوتی ہے اگر اتر جاتی ہے تو پھر کپڑا صاف ہو جاتا ہے پھر اس کو جنت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ہر مذہب میں اس سزا کا اور جہنم کا تصور ہی یہی ہے کہ وہاں کچھ عرصے کے لیے بھیجا جاتا ہے تاکہ یہ جو گناہوں کی آلائشیں ہیں، وہ وہاں صاف ہو جائیں اور جنت کے اندر بالکل پاک صاف ہو کر چلا جائے۔

### قرآن حکیم کے نزدیک خدا کے حضور پیشی کا طریق: طریق موت و حیات

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری خود فریبی ہے جو یہ سمجھتے ہو کہ انسان اس زندگی میں اس دنیا میں رہتے ہوئے آلائشوں سے بالکل پاک اور صاف بھی رہ سکتا ہے اور عمل کی یہ آلائش ایسی نہیں ہیں کہ جنہیں اگر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے تو یہ اس سے الگ ہو جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ جس چیز کو تم تندرست انسان کہتے ہو کبھی کسی ڈاکٹر سے پوچھنا کہ اس کے اندر بھی کس قسم کی بیماریوں کے جراثیم ہوتے ہیں۔ یہ تندرست کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ جو اس کی Power of Resistance (مدافعت کی قوت) ہوتی ہے وہ ان تخریبی قوتوں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ وہ ان کو غالب نہیں آنے دیتی۔ بیمار اس وقت ہوتا ہے جب بیماری کے وہ جو جراثیم ہوتے ہیں وہ غالب آ جاتے ہیں۔ علاج کس کو کہتے ہیں؟ قوت مدافعت کا بڑھا دینا۔ یہ قوت مدافعت اگر غالب آ جائے تو وہ بیماری مغلوب رہتی ہے۔ یہ چیز تو آپ کے ہاں سارے طالب علم جانتے ہیں کہ اگر 60% پاس مارکس ہیں تو اس اسٹوڈنٹ کی چالیس فیصد غلطیاں بھی تو پرچے میں ہیں، 40 مارکس کی غلطیاں بھی تو ہیں لیکن اسے اگلی کلاس میں بھیج دیا جاتا ہے اور آج تک کبھی یہ چیز نہیں ہوئی کہ 100% مارکس لینے والا جو ہے وہی اگلی کلاس میں جا سکے گا۔ صلاحیت کا ایک معیار مقرر کیا ہوا ہے کہ اتنی صلاحیت ہو جائے یعنی جو کمی کمزوری ہے اس سے زیادہ کی صلاحیت اگر پیدا ہوگئی ہے تو وہ آگے جانے کے قابل ہو جائے گا اور جس نے 40% مارکس حاصل کیے ہیں وہ اگر یہ کہہ دے کہ صاحب! زیادہ نہیں، تین مہینے کے لیے اگلی کلاس میں مجھے بھیج دیجیے کیونکہ 40% تو میں نے لیے ہی ہیں لیکن اس کو اسی کلاس میں روک دیا جاتا ہے۔ اس وقت یہ 40% مارکس کچھ کام نہیں دے سکتے۔ جس وقت موت آتی ہے تو اس وقت یہ نہیں ہوتا کہ اس کے اندر جو توانائی ہے وہ بالکل ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اندر وہ جو تخریبی عناصر ہیں، وہ اتنے زیادہ بڑھ گئے ہوتے ہیں کہ یہ جو تھوڑی سی توانائی باقی ہوتی ہے یہ کچھ کام نہیں دیتی اور پھر اس پہ موت طاری ہو جاتی ہے۔

دنیا کی ہر وہی نوع آگے بڑھتی ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو

عزیزانِ من! Evolution Theory (نظریہ ارتقا) پر جس قدر بھی تحقیقات ہوئی ہیں، انہوں نے بتایا ہی یہ ہے کہ ہر نوع جس کے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اس میں جو پیچھے رہنے کی کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں، وہ اس بڑھی ہوئی صلاحیت سے Cover (پوری) ہو جاتی ہیں، دنیا بھر کے مذاہب کے ان تمام تصورات اور معیارات جو انہوں نے اپنے ہاں مقرر کیے ہوئے ہیں کے مطابق یہ ہے کہ انسان اپنے غلط اعمال کی سزا جہنم میں بھگت کر جنت میں جائے گا، قرآن کریم ایک یکدم ان کو مسترد کرتا ہے اور اسے No Scientific (غیر سائنسی) طریقہ کہتا ہے۔ وہاں اصول یہ ہے کہ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (23:102)۔ جو 60% مارکس حاصل کر لے گا، Promote (پاس) کر دیا جائے گا کیونکہ اس میں اگلی کلاس میں جانے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا پلڑا جھک جائے گا، اس کے لیے یہ نہیں کہا کہ اس کے دوسرے پلڑے میں کوئی نمبر ہی نہیں ہوگا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ صاحب! ہمارے ہاں God is mercy کا تصور ہے، جبکہ اسلام کا خدا عادل ہے۔

عیسائیت کے ہاں حضرت مسیح کے کفارے کا عقیدہ قرآن حکیم کی تعلیم کے خلاف ہے

عیسائیت کے ہاں کی Mercy (رحم) کے معنی یہ ہیں کہ انسان جو جی میں آئے کرتا چلا جائے، وہ صرف حضرت مسیح کے کفارے پر ایمان لے آئے تو جنت میں چلا جائے اور اس کو God is mercy بتایا ہے کہ عزیزانِ من! کیا بات ہے اس Mercy کی! نتیجہ اس Unscientific (غیر سائنسی) طریقے کا یہ ہے کہ آج یورپ کا جو Intellectual (دانشور) طبقہ ہے، وہ بھی کفارے کے اس مسئلے کے اوپر عیسائیت کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ میرے پاس وہ کتاب ابھی تک نہیں پہنچی۔ میں تو یہ چیزیں منگاتا رہتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ وہاں ایک Latest (جدید ترین) کتاب بھی شائع ہوئی ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ حضرت مسیحؑ کا خدا ہونے کا عقیدہ اور کفارے کے عقیدے یہ تمام کے تمام کہیں اور سے آئے ہیں، یہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ عزیزانِ من! یہ بالکل صحیح بات ہے۔ وہ دانشور خود میں God is mercy (خدا رحیم ہے) کا انکار کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں یہ توقع کسی فرد سے بھی نہیں کرتا کہ اس سے زندگی بھر کوئی ایک لغزش بھی نہ ہوئی ہو تو پھر وہ جنت میں جائے گا۔

## قرآن حکیم کے نزدیک اہل جنت کا معیار

انسان سے لغزش ہو جاتی ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ یہ جو بڑے بڑے سنگین جرائم ہیں، مومن ان سے بچا رہتا ہے، وہ اس سے سرزد نہیں ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی سی چیزیں قابلِ ملامت ہوتی ہیں، یہ ہر انسان سے ہو جاتی ہیں۔ یہ ہیں مثلاً وہ 40% جو میں نے ابھی کہا ہے جو اس میں ہوتی ہیں۔ یہ اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ Compulsory Subjects (لازمی مضامین) کے اندر وہ پاس ہو گیا ہوا ہے Optional (اختیاری) کے اندر یہ جو غلطیاں ہیں، یہ رکاوٹ نہیں بنتیں۔ Optional (اختیاری) مضامین میں خواہ کتنے ہی زیادہ مارکس کیوں لے لیے نہ ہوں، اگر وہ Compulsory Subject (لازمی مضامین) میں پاس نہیں ہو رہا تو وہ اگلی کلاس میں نہیں جائے گا۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (23:102; 7:8) یہ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں، جن کے پلڑے جھکتے ہیں۔ اس کے برعکس وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ (23:103) اور جن کا صلاحیتوں کا یہ جو پلڑا ہے، وہ اٹھا ہوا رہتا ہے، انہیں روک لیا جائے گا۔ دیکھیے، عزیزانِ من! الفاظ کہ یہ ہوتا کیا ہے۔

ابھی ابھی میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآن کا تصور یہ ہے کہ انسان کی جو ذات ہے، اس کا جو سیلف (Self) ہے، اس کی جو ”میں“ ہے، اگر اس نے اس دنیا میں حسنِ عمل سے اتنی صلاحیت حاصل کر لی ہے کہ اس میں اگلے درجے تک پروموٹ (Promote) ہونے کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے تو وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کے برعکس جس کی ذات نے یہ بات نہیں حاصل کی، اس میں کمی رہ گئی ہوئی ہے، وہ آگے نہیں جاسکے گی۔ یہ سنیے الفاظ کہ مَنْ خَفَّتْ (7:9) جس میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی توفاً وَلَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ (23:103) یہ وہ ہیں جن کی ذات میں کمی رہ گئی تھی۔ میرے اللہ! جن کی ذات کی نشوونما میں کمی رہ گئی ہوئی تھی وہ یہ ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ (23:103) وہ رک گئے، آگے نہیں بڑھ سکے، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

## عدل میں معافی کا تصور غلط ہے

یورپ کا کوئی سائنسٹ (سائنسدان) اعمال کے پلڑے کے اس تصور سے انکار نہیں کر سکتا، عزیزانِ من! اور یہ بھی کہ وہ کسی مذہب کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی سائنس میں معافی کا سوال ہی نہیں ہے۔ عدل میں معافی نہیں ہوتی۔ کہا کہ کیا پوچھتے ہو ان کا! کیا پوچھتے ہو: ان کی ندامتوں کا تَلْفَحُ وَ جُوهَهُمُ النَّارُ وَ هُمْ فِيهَا كَالِحُونَ (23:104) وہ آئینے میں اپنے سیاہ چہرے کو دیکھیں گے اور اسی سے بری طرح منہ بگاڑ رہے ہوں گے۔ ان سے یہ کہا جائے گا کہ اَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُسَلٰی عَلَیْکُمْ فَکُنْتُمْ بِہَا تُکَذِّبُوْنَ (23:105) صرف اتنی بات کی جاتی ہے کہ کیا یہ بات تو نہیں تھی کہ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ میرے قوانین کیا ہیں۔ اور اس طرح سے تمہیں یہ

کہا گیا تھا کہ اس کا نتیجہ غلط ہوگا۔ تمہیں کہا تھا، یہ بات تم تک پہنچی تھی؟ کہیں گے کہ جی ہاں، پہنچی تھی تو پھر اس کے بعد اب کس کا قصور ہے؟ اپنے آپ کو Blame (الزام) کرو۔

یہ بڑا عجیب نکتہ ہے کہ بات پہنچی تھی۔ جن تک یہ بات نہیں پہنچی ہے، تو وہ محفوظ ہی نہیں ہو سکتے۔ یہاں ہمارے ہاں دیکھیے کہ چھ چھ مہینے کے چھوٹے چھوٹے بچے مر جاتے ہیں۔ کیا ان کو بھی وہاں قیامت میں جہنم میں بھیجیں گے؟ اب ان بچوں کو کیا کریں صاحب! اگر جہنم میں بھیجتے ہیں، تو ان کی جو مائیں ہیں، وہ کہتی ہیں کہ ”تھاڈا ستیاناس ہووے۔ میرے منڈے نے کی کتا سی؟ او ایناں معصوم بچہ سی۔“<sup>①</sup> یہ کہتے ہیں کہ پھر حضرت ابراہیم ؑ ان کو ملیں گے۔ وہ ان بچوں کے چرواہے ہیں، ان کی ڈیوٹی یہ لگائی ہوئی ہے کہ وہ ان بچوں کو ساتھ لے کر جنت میں چلے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ پاگل دیوانے وحشی اقوام جن تک یہ چیز پہنچی نہیں ہے وہ کیسے قابل مواخذہ ہو سکتے ہیں؟

### قصہ آدم میں آدم کا اعتراف اور ابلیس کے انکار کی وضاحت

قرآن کہتا ہے کہ قَالُوا رَبَّنَا (23:106)۔ بات سنئے جناب! کیا بات ہے! کہا کہ یہاں بھی ان کا سب سے بڑا جرم ہے۔ عزیزانِ من! سب سے بڑا جرم ہے۔ کیا عرض کروں؟ یہ باتیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اور گھڑی ہے کہ چلے جا رہی ہے! قصہ آدم میں قرآن نے ایک ہی بات کہی ہے: آدم نے بھی یہ ایک جرم کیا، اسے کہا تھا کہ یہ نہ کرنا لیکن اس نے وہ کیا۔ ابلیس نے بھی ایک جرم کیا، اسے کہا کہ یہ کرو لیکن اس نے یہ نہیں کیا۔ دونوں نے جرم کیا۔ ایک کے متعلق تو یہ کہا کہ ٹھیک ہے، تیرا اعتراف قبول ہے۔ دوسرے کے متعلق کہا کہ تو ابدی طور پر زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم ہو گیا۔ کیا بات ہوئی؟ دونوں نے ایک جیسا جرم کیا تھا۔ کہا ہوا یہ تھا کہ جب آدم سے ہم نے پوچھا کہ تم نے کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا (7:23) بار الہا! میں اپنی غلطی کا ذمہ دار ہوں، مجھے احساس ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ کہا کہ جب تم نے اس کا اعتراف کر لیا، ذمہ داری کو قبول کر لیا، قطراتِ ندامت تیری پیشانی پہ آ گئے، تو تیری اصلاح کا امکان ہے۔ ابلیس سے کہا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ کہنے لگا: ارے خداوند! تو قادرِ مطلق، تیرے حکم کے بغیر یہ نہیں بل سکتا، میں کون ہوں خود کرنے والا؟ تو نے کرایا ہے، میں نے کیا ہے۔ کہنے لگا کہ اگر یہ ذہنیت ہے تو قیامت تک کے لیے تیری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جو ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا، اس کی اصلاح ہی نہیں ہو سکتی۔ جو یہ کہتا ہے کہ میں نے کیا ہی نہیں، اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور تقدیر کا سارا مسئلہ حل ہو گیا، عزیزانِ من! پھر آپ کے ہاں جب وہ مجوسی عقائد در آتے ہیں تو دین مذہب بنتا ہے یعنی قرآن نے آدم کا اور ابلیس کا پہلا ہی تعارف یہ کرایا ہے کہ ابلیس نے تقدیر کا بہانہ بنایا، آدم نے اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیا، اس میں اصلاح کا امکان ہے، ابدی طور پہ

① تمہارا ستیاناس ہو۔ میرے لاڈلے لخت جگر نے کیا کیا تھا؟ وہ تو بہت ہی معصوم بچہ تھا۔



وہ مسئلہ حل ہو گیا۔

### مجوسیوں کے ہاں تقدیر کا بنیادی عقیدہ

آپ کے ہاں یہ ایرانی اسلام آیا ہے جسے اقبالؒ (1877-1938ء) مجوسی اسلام یا عجمی اسلام کہتا ہے۔ مجوسیوں کے ہاں تقدیر کا یہ بنیادی عقیدہ تھا۔ یہ تھا ان کے ہاں کا دین۔ اسلام اس عقیدے کی جڑ کاٹنے کے لیے آیا۔ وہ ہر فرد کو اس کے عمل کا ذمہ دار بنارہا ہے۔ وہاں سے جب یہ دین مجوسیت کے اس کوپے سے ہو کر واپس آیا تو یہ سارا قسمت کا، تقدیر کا، نصیب کا، بخت کا عقیدہ لایا۔ یہ جسے آپ بخت کا عقیدہ کہتے ہیں ان کے ہاں یہ بخت تو انسان پیدائش سے اپنے ساتھ لے کر آیا اور یہ آپ کے ہاں پورے کا پورا تقدیر کا عقیدہ آیا اور پھر دیکھیے کہ کس طرح سے وہ جزو ایمان بنا ہے۔

### ہمارے ہاں ایمان کے سلسلہ میں تقدیر کا خود ساختہ عقیدہ

قرآن نے تو پانچ ہی اجزائے ایمان کہے تھے: <sup>①</sup> اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرِ سارے قرآن میں یہ پانچ ہی اجزائے ایمان کہے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ آپ سے یہ جو ایمان کا اقرار لیا جاتا ہے، کیسے لیا جاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ نے تو کبھی ساری عمر ایمان لایا ہی نہیں یعنی ”اسی تے جماندرو مسلمان ہیگے ہاں نا۔ ساری عمر اسی کدی ایمان لے آندا ای نہیں ہیگا۔ سوچ رہے ہیں جو میں کہہ رہا ہوں؟ ایمان نال کہہ سچ کیناں کے نہیں؟ <sup>②</sup> آج اس دور میں دو چار ذرا سخت مقام آتے ہیں۔ پہلے دور میں دو چار سخت مقام آیا کرتے تھے۔ اس میں یہ کلمہ بھی پڑھنا پڑتا تھا۔ یہ ایمان مجمل اور ایمان مفصل، تو اب عہد کہن کی داستانیں ہیں۔ ہمارے جو بچے ہیں، یہ تو ایمان مجمل اور ایمان مفصل کے یہ لفظ بھی نہیں جانتے۔ نکاح کے وقت یہ پڑھا جاتا تھا۔ ”تے ہن جیہڑ اتسی نکاح نامے تے دستخط کر کے ٹر جانڈے اتسی ایٹھوں وی گئے“ <sup>③</sup> آپ کو معلوم ہے کہ یہ آپ کے ہاں کا جو ایمان ہے، اب وہ کیا ایمان ہے۔ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ <sup>④</sup>۔ یہ چار ہو گئے اور اگلا ہے کہ وبعث بعد الموت موت کے بعد اٹھنا، یہ پانچواں آگیا ہے اور انکے درمیان یہ آتا ہے کہ والقدر خیر وشر من اللہ تعالیٰ۔ خیر اور شر سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس پر ایمان۔ یہ کہنا آپ

① وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيِّنَ (2:177) کشاد کی راہ اس کی ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، ملائکہ پر، کتب پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔

② ہم تو پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہم نے ساری عمر ایمان لایا ہی نہیں ہے۔ کیا آپ سوچ رہے ہیں جو میں کہہ رہا ہوں؟ ایمان سے کہو کہ سچ کہتا ہوں یا نہیں؟

③ اب جو آپ نکاح نامے پر دستخط کر چلے ہیں تو اب تو آپ اس سے بھی گئے۔

④ میں اللہ پر، ملائکہ پر، (آسمانی) کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان لایا۔

کے ہاں کا ایمان کا جزو ہے اور ان کے بعد ہے کہ وبعث بعد الموت یعنی مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان۔ یہ چھ جزو ہیں ایمان کے۔ اب پانچ خدا کے دیئے ہوئے ہیں یہ چھ جزو آپ کے کلمے کے اندر تقدیر کا مسئلہ داخل ہوا ہے۔ آپ اس کو کہاں کہاں سے نکالیں گے۔

### جہنم کے اندر بھی غلط روش کا عمل جاری ہے

عزیزانِ من! اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ آپ حسب کتاب اللہ<sup>①</sup> کو یعنی خدا کی کتاب کو اپنے ہر عقیدے کا ہر نظریے کا معیار بنائیں تو پھر آپ دینِ مصطفیٰ پہ نظامِ مصطفیٰ پہ آ سکتے ہیں اور اگر آپ یہی کلمے پڑھاتے رہے تو یہ تو پھر مجوسیوں کا کلمہ ہے یہ مصطفیٰ کا کلمہ تو نہیں ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں تو اس کلمے میں یہ چھٹا<sup>②</sup> جزو نہیں تھا، کوئی نہیں کرتا تھا۔ سنیے: بات کہاں تک آئی! کہا کہ کیوں یہ لوگ اس طرح جہنم میں آئے؟ اب بھی ان کی کیا کیفیت ہے؟ ان سے پوچھا جائے گا کہ جہنم میں کیوں آئے تھے؟ حالانکہ کہنے والوں نے تمہارے پاس آ کر بتایا تھا کہ یہ کچھ چھوڑ دو غلط روش ہے تباہ ہو جاؤ گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں بتایا تھا۔ پوچھا تو پھر کیا ہوا؟ قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا<sup>③</sup> (23:106) کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا کہیں کہ ہماری تقدیر نے مار دیا۔ کہا کہ اسی لیے تو جہنم میں آ رہے ہو۔ تم یہاں بھی یہ کہہ رہے ہو کہ وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ<sup>④</sup> (23:106) ایک ہم ہی نہیں تھے پوری کی پوری امت ہی اس میں گڑی ہوئی تھی۔ ہمارے ساتھ یہ ہوا۔ اب حقیقت ہم پر آشکارا ہو گئی ہے لہذا رَبَّنَا آخِرْ جُنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ۝ قَالَ اخْسِئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ (23:107-108) اے بارِ الہا! ہمیں ایک دفعہ پھر واپس بھیج دے یا اللہ! میری توبہ ایک دفعہ پھر واپس بھیج دے۔ اس نے کہا کہ تمہیں یہ کہا گیا تھا کہ یہاں دوبارہ چانس نہیں ملتا، ایک ہی دفعہ اس زندگی کے اندر ملتا ہے اس لیے اب یہ باتیں کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ ذلیل و خوار ہو کے پیچھے بٹے رہو تم آگے نہیں بڑھ سکتے اور اب باتیں بنانے سے بھی کچھ فائدہ نہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ المؤمنون کی آیت 107 تک ہم آگئے 108 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

① ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

② والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ

③ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! (یہ سب درست ہے لیکن اب ہم اس کے سوا اور کیا کہیں) کہ ہماری بدبختی ہم پر مسلط ہو گئی (پرویز):

مفہوم القرآن ص 790۔

④ اور ہماری پارٹی غلط راستے پہ چل نکلی تھی (ہم بھی اس کے ساتھ ہی تھے) (پرویز: مفہوم القرآن ص 790)۔

## سولھواں باب: سورة المؤمنون (آيات 108 تا اختتام)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج ستمبر 1977ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المؤمنون کی آیت 109 سے ہو رہا ہے: (23:109)۔

### ظہورِ نتائج کے سلسلہ میں وقت کا دریا کبھی پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا

مسلل درس کا سلسلہ ہمارے ہاں جاری ہے۔ اس میں آخری درس کافی عرصہ پہلے<sup>①</sup> ہوا تھا اور اگر شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گے حساب<sup>②</sup> میں تو وہ تو ایک مہینے سے بھی زائد کا عرصہ ہو گیا ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ پچھلی آیات میں بات یہ آ رہی تھی کہ وہ لوگ جو قانونِ شکنی اور سرکشی کی بنا پر جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں مہلت کا وقفہ دیا جاتا ہے کہ شاید اب بھی یہ اپنی اصلاح کر لیں اب بھی صحیح راستے پہ آجائیں اور جب یہ عرصہ گزر جاتا ہے اور ان کی اصلاح کی کوئی شکل باقی نہیں رہتی، مہلت کا وقفہ بھی باقی نہیں رہتا تو وہ آتا ہے جسے ظہورِ نتائج کا وقت کہتے ہیں۔ جب ظہورِ نتائج کا وہ وقت آ جاتا ہے تو ان کے ان جرائم کے نتائج محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اسے آپ سزا کہہ لیجیے، تباہی کہہ لیجیے، بربادی کہہ لیجیے، قوموں کے معاملے میں ان کی ہلاکت کہہ لیجیے۔ ان آخری لمحات میں وہ چیخنے چلانے لگ جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ (23:107) اے ہمارے پروردگار! اگر ایک موقع اور ہمیں دے دیا جائے، جیسے کہتے ہیں وقت کے دریا کو پیچھے کی طرف لوٹا دیا جائے، تو پھر دیکھ، ہم کتنے اچھے کام کرتے ہیں۔ اس وقت تم سے یہ کہا جائے گا کہ قَالَ اخْسِئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونَ (23:108) تمہیں یہ کہا گیا تھا کہ یہ وقت پیچھے کی طرف نہیں جایا کرتا، بار بار تمہیں وارننگ دی جاتی تھی، بار بار انتباہ کیا جاتا تھا، اور تم سنتے نہیں تھے۔ اب تو اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر کہا کہ تمہیں یاد نہیں کہ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِیْ یَقُولُوْنَ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرَّحِیْمِیْنَ (23:109) وہی میرے بندوں میں سے ایک جماعت ایسے لوگوں کی تھی جو ہمارے قوانین پر یقین رکھتے تھے، تمہاری اس قسم کی تدابیر کے خلاف حفاظت چاہتے تھے، ہم سے دعائیں مانگتے تھے، یہ ان کی آرزوئیں تھیں کہ یا اللہ! اس قسم کے نامساعد حالات کے اندر بھی ہماری حفاظت کر، سامانِ نشوونما بھی عطا کر۔ یہ لوگ موجود تھے لیکن فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سَخِرَیًّا حَتّٰی اَنْسَوْكُمْ ذِکْرِیْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ (23:110) تم ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ یہ باتیں بے وقوفوں کی ہیں۔ جو تم کہہ رہے ہو، اس سے بہت نقصان ہوتا ہے حالانکہ وہ بار بار تمہیں کہتے تھے کہ نہیں، ہم بات بڑی Seriously (سنجیدگی) سے کر رہے ہیں،

اس

① یاد رہے اس سے پہلے کا درس اگست 1977ء کی 12 تاریخ کو ہوا تھا۔

② کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہاں خراب میں شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گرجا میں (غالب)

غور و فکر تو کرو لیکن جیسا نشے میں مدھوش آدمی کبھی کسی ہوش مند کی بات سنتا ہی نہیں ہے، تم سنتے ہی نہیں تھے تا نکہ کہ تم نے ہمیں بھی یکسر فراموش کر دیا اور انہیں مرفوع القلم سمجھ لیا کہ ہم نے انہیں ختم کر دیا، ان کی آوازوں کو بھی دبا دیا ہے۔ اب ہمیں کوئی کچھ کہنے والا نہیں ہوگا۔

### قانون بنانے والوں کا فریضہ

ضمناً یہاں دو باتیں اہم ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ جو قرآن کی رو سے قانونِ مکافاتِ عمل ہے اس میں آپ دیکھیے کہ کس قدر عادلانہ اور Scientific Bases (سائنسی بنیادوں) پر قرآن میں یہ آیا ہے کہ وہ لوگ جن میں ان باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے ان کے متعلق یہ بات نہیں ہے کہ وہ قانونِ مکافات کی گرفت میں آجائیں۔ ان میں دوسری بات یہ ہے کہ جن تک یہ بات پہنچی ہی نہیں وہ بھی اس کے تحت گرفت میں نہیں آ سکتے۔ یہ کتنا بلند اصول ہے! حالانکہ ہمارے ہاں اب جو مہذب ترین زمانہ گنا جاتا ہے اس میں قانون میں تو کہتے ہیں کہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہاں بھی Ignorance of law is no excuse<sup>①</sup> تسلیم کیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تو قانون بنانے والوں کا، یا گرفت کرنے والوں کا، یا احتساب کرنے والوں کا، فریضہ ہے کہ یہ اس قانون کو ان تک پہنچائیں۔ اس نے کہا ہے کہ سب سے پہلے تو ہم نے یہ فریضہ اپنے اوپر عائد کیا ہے۔ ہم جس کو رسول کہتے ہیں اس کے معنی ہی قانون کو پہنچانے والے کے ہیں۔ اب یہ فریضہ اسی صورت میں ادا ہوگا کہ ہماری جو رسالت ہے یہ وہ پیغام پہنچائے جہاں تک یہ پیغام پہنچے گا وہیں تک وہ لوگ اس کی گرفت میں آئیں گے۔ ختم نبوت کے بعد اس نے کہا ہے کہ کم از کم انسانوں کے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو ان قوانین کو انسانوں تک پہنچائے اور یہ دونوں چیزیں جمع ہوں یعنی ان تک یہ پہنچ چکا ہو اور ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو اور اس کے بعد پھر اگر وہ اپنی مفاد پرستی یا ضدِ عناد یا سرکشی کی بنا پر اس کی خلاف ورزی کریں تو پھر ان کے خلاف جرم ثابت ہوتا ہے۔

### قرآن حکیم او آگون کے تصورات کی تردید کرتا ہے

کہا ہے کہ تمہارے اندر وہ لوگ تھے جو تمہیں بار بار اس کے متعلق انتباہ کرتے تھے وارننگ دیتے تھے، تنبیہ کرتے تھے، لیکن تم ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ نظر آیا کہ پیغام پہنچا بھی دیا گیا تھا اور ان میں اس قسم کی صلاحیت تھی کہ وہ سمجھ سکتے ہوں، اس کے باوجود انہوں نے یہ Attitude (رویہ) اختیار کیا اور تیسری چیز یہ کہ جب وہ پہلی شکایتیں آہستہ آہستہ مرض بن جاتی ہیں درد بن جاتا ہے، جب وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو پھر یہ جس کو چیخنا چلانا کہتے ہیں، وہ کسی کام نہیں آتا، اور اہم چیز یہ ہے کہ یہ پلٹ کے واپسی کی بات غلط ہے۔ اس سے وہ سارا جسے آپ Transmigration of Soul (تناسخ یا آواگون کا مسئلہ) کہتے ہیں، اُس سب کی تردید ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے

❶ قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے۔

کہ قرآن کی رو سے (مثلاً) یہاں دنیا سے جو مرجانے والا بھی ہے اس کا کوئی تعلق اس دنیا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بار بار قرآن میں یہ بات آئی ہے اور یہ مرجانے کے بعد ہی کی بات نہیں ہے بلکہ یہاں بھی اس دنیا کے اندر بھی قرآن کی رو سے ہلاکت و احتساب اور گرفت اور عدل اور مکافاتِ عمل کی رو سے نتائج کا برآمد ہونا اس دنیا کے اندر بھی ہے۔ قرآن ان کے متعلق بار بار کہتا ہے کہ خِزٰی فی الحیوۃ الدنیا (2:85) ان کے لیے اس دنیا کے اندر ذلت اور تباہی اور مواخذہ اور سزا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اس کی شکلیں کیا ہوتی ہیں، کن کے ہاتھوں سے وہ آتا ہے لیکن اس دنیا میں بھی وہ آتا ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ یہاں جو معاملہ پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ اعمال اپنا نتیجہ دے کر رہتے ہیں۔ کہا کہ یہ لوگ موجود تھے جو یہ کچھ کہتے تھے تمہارا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اِنِّیْ جَزٰیْتُہُمْ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْا اِنَّہُمْ ہُمْ الْفٰئِزُوْنَ (23:111)۔ ان لوگوں نے بڑی برداشت بڑے صبر و استقامت سے کام لیا۔ تمہیں تو پتہ نہیں کہ کس قسم کی ان کو تکلیفیں پہنچاتے تھے اذیتیں دیتے تھے۔ سچ بولنے والوں کو تمہاری ان سرکشیوں پر آگاہ کرنے والوں کو غلط اعمال کے نتائج سے متنبہ کرنے والوں کو تم اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور اسی بنا پر پتہ نہیں کیا کیا کچھ ان کے خلاف کرتے تھے اور یہ تھے کہ استقامت سے ثابت سے اپنے مسلک کے اوپر جے رہتے تھے۔ آج ہم ان کو اس کا معاوضہ دیتے ہیں۔ یہ ہیں کامیاب، یہ ہیں فائزون جنہوں نے کچھ Achieve (حاصل) کیا ہے۔

### حق بات کو سمجھنے والوں کا فریضہ اور ان کے مصائب

عزیزانِ من! یہ چیز بھی ہے کہ رسول خدا کی طرف سے اس پیغام کو پہنچانے کے لیے بھی معمور ہوتا ہے لیکن میں اپنی بصیرت کے مطابق یہ عرض کروں گا کہ جسے بھی حق کی کوئی بات سمجھ میں آجائے جسے بھی قرآن کی کوئی چیز سمجھ میں آجائے اس پر فریضہ رسالت عائد ہو جاتا ہے کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچائے اور یہ بھی سمجھ لے کہ اس پہنچانے کے نتیجے میں یہ کچھ ہوگا جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ کشمکش ہر دور میں جاری رہے گی۔ یہ کسی خاص دور، کسی خاص شخصیت، خاص جماعت تک محدود نہیں ہے۔ جہاں بھی آپ اس قسم کے جو مدہوش ہوتے ہیں جو قوت کے نشے میں مست ہوتے ہیں ان کے خلاف کوئی حق کی بات کہیں گے وہ یقیناً آپ کو اذیتیں پہنچائیں گے۔ وہاں کہا ہے کہ استقامت سے اس کو برداشت کرنے والی جو جماعت ہے وہی آخر الامر کامیاب ہو کر رہے گی۔ پیغام پہنچانے کا یہ فریضہ قیامت تک کے لیے ہے اب نبی تو خدا کی طرف سے آنا نہیں ہے کوئی تو یہ فریضہ ادا کرے گا۔ یہ فریضہ اس امت کے ذمے تھا جسے اس کتاب کا وارث بنایا گیا ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ یہ نبوت تو ختم ہو گئی اب خدا کی طرف سے کوئی وحی نہیں مل سکتی لیکن اس کا آگے پہنچانا ہے یہ فریضہ اس امت کے سر ہے جو وارث کتاب ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ معنوی لحاظ سے رسول کے معنی پیغامبر ہے پیغام پہنچانے والا ہے۔

ہمیں یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے لیے تبلیغ کہہ لیجیے لیکن ان پیغامات کو آگے پہنچانے کا یہ فریضہ اس امت کا ہے جو وارثِ کتاب ہے اور جسے کتاب میں سے کچھ بات سمجھ میں آئے اس کا فریضہ ہے کہ وہ اسے آگے پہنچائے۔ قرآن میں یہ چیز ہے کہ رسول سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے اس کو نہ پہنچایا تو تم سے پہلے جن قوموں کا جو حشر ہوا تھا وہی تمہارا ہوگا۔ عزیزانِ من! یہ درس سن جانا، یاد رس سنا لینا تو وہ چارہ نہیں ہے کہ دادل جائے اور داد دیدیں۔ یہ تو بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جس نے سن اور سمجھ لیا اس پہ آگے پہنچانے کی ذمہ داری ہے اور پھر اس کے لیے بھی تیار رہیے کہ پھر اس کے خلاف یہ جو قوتیں کچھ کیا کرتی ہیں وہ سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔ یہ بات آگے پہنچانے کی ہے اور اگر نہیں پہنچائی جائے گی تو وہ مرتکب جرم ہو جائے گا:

لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلمان ہونا<sup>①</sup>

سرکشی کا نشہ انسان کو مدہوش کر دیتا ہے

قرآن کریم نے سچ کہا تھا کہ اس وقت ان مجرمین سے پوچھا جائے گا قَالْ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ (23:112) ذرا گن کر بتاؤ تو سہی کہ اقتدار میں اس قسم کی سرکشی میں مدہوشی کے نشے میں کتنا عرصہ رہے؟ یہاں عجیب بات کہی ہے۔ نشے میں مدہوش کو یہ یاد ہی نہیں ہوتا کہ کتنے بجے ہیں، کتنا وقت ہو گیا ہے۔ اُسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ یہ جو ٹائم کا Concept (تصور) ہے یعنی وقت کا تصور ہے اس کا تعلق ہوش کے ساتھ یا شعور کے ساتھ ہے۔ جب اس کا شعور نہیں ہوتا، ٹائم یعنی زمان کا Concept (تصور) نہیں ہوتا۔ آپ سو جاتے ہیں تو پوری رات میں آپ کو ٹائم (زمان) کا کوئی Concept (تصور) نہیں ہوتا۔ اگر آدھی رات کے وقت بھی آنکھ کھل جائے تو ادھر ادھر کچھ دیکھ کر ”کر لوندے“ اتنی کہ کناک وقت ہو یا اے۔ اوجیہڑا نال ستا ہوندا دوسرا پر لے پاسے اووی کہندا کہ کوئی دواک دا عمل ہووے گا جناب! دواک دا عمل ہونا اے۔ سمجھے نا کچھ پنجابی والے کہ عمل کیا ہوندا اے؟ دواک دا عمل ہونا اے۔<sup>②</sup> یعنی یہ جو Concept of time (تصور زمان) ہے یہ شعور کی اس سطح کے حساب سے ہے۔ جب یہ بات آگے آئے گی تو پھر میں عرض کروں گا۔ اگر اب کہا تو ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔

① یہ شہادت گہد الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلمان ہونا (اقبال)

② تو آپ ادھر ادھر دیکھ کر پکا راٹھتے ہیں کہ بتانا کتنے بجے ہیں؟ وہ جو دوسرا پاس ہی سویا ہوا ہوتا ہے وہ بھی یہ کہتا ہے کہ جناب کوئی دواک کا وقت ہوگا۔ یہ جو دواک کا عمل (وقت) ہونا ہے آپ پنجابی سمجھتے ہیں کہ یہ ”عمل“ کیا ہوتا ہے۔

## برزخ کی زندگی کا مفہوم اور اس کی کیفیت

ہم کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد زندگی ہے۔ زندگی تو مسلسل ہے، مرتا تو جسم ہے، انسان تو نہیں مرتا لیکن ٹائم کا جو Concept (تصور) ہے یعنی اس میں جو وقت کا تصور ہے یہ جو اس کے اندر درمیانی Period (دور وقفہ) ہوتا ہے اسے Interim Period عبوری وقفہ کہہ لیجیے۔ یہ جو شعور کی موجودہ سطح ہے جو ہمارے اس طبعی جسم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اس سے نکل کے شعور کی نئی سطح پر جو آتا ہے جس کو برزخ کی زندگی کہتے ہیں اس میں یہ عبوری طور پہ وہاں تک پہنچتا ہے یہ Gradually (بدرتج) وہاں تک پہنچتا ہے۔ جو کچھ Concept (تصور) ہے وہ بڑا مدہم سا ہوتا ہے باقی Concept (تصور) ابھی واضح طور پہ آیا نہیں ہوتا۔ اسے برزخ کا دور کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات کے اوپر بھی بات کی ہے تو میں نے کہا ہے کہ میں یہ بات اس مقام پہ کروں گا جہاں یہ آئے گا۔ حیات بعد الممات کا قصہ بڑا سائنٹفک ہے عزیزان! آپ کا تو میں کہہ نہیں سکتا، میں تو اپنی کیفیت کا کہہ سکتا ہوں کہ میرے سامنے تو یوں یہ چیزیں محسوس شکل میں آ جاتی ہیں جس طرح قرآن نے بیان کی تھیں۔ یہ Metaphysics (مابعد الطبیعات) کی چیز رہتی نہیں۔ مابعد الطبیعاتی چیز کو سمجھا یا ہی اس طرح سے ہے۔ قرآن میں تو وہ میٹافزکس کی چیز ہے لیکن صاحب! اس کے سمجھانے پہ کوئی بات یوں محسوس طور پہ سامنے آ جاتی ہے تو کہا یہ ہے کہ بتاؤ کتنا عرصہ وہاں رہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ قَالُوا لَبِشْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْأَلُ الْعَادِّينَ (23:113) کہا ہے کہ کیا بتائیں صاحب! ویسے بھی سکھ کے دن تو یوں ہی بیت جاتے ہیں، دکھ کی تو وہ ایک رات بھی نہیں بنتی صاحب! جسے بیمار کی رات کہتے ہیں، بڑی لمبی رات ہوتی ہے۔ ہوتی تو وہی مثلاً کوئی دس بارہ گھنٹے کی ہے، بیمار کی رات بڑی لمبی ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ جو سکھ کے دن ہیں، وہ تو یوں چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! کچھ یاد نہیں پڑتا۔ کہا کہ اس دوران میں ہم میں سے اگر کوئی ایسا ان چیزوں کا حساب رکھنے والا تھا تو اس سے پوچھ کے دیکھیے۔ ”سانوں تے لکھ پتہ نہیں یاد رہا یا ہیگا۔ سروسر پیندیاں ہون تے اونچ ای یاد بھل جاندی ہیگی۔“<sup>①</sup> عجیب نقشہ کھینچتا ہے: قَالَ اِنْ لَبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (23:114) کہا کہ وہ عرصہ گنتی میں بھی کتنا ہی لمبا کیوں نہ ہو اگر تم کہیں علم اور شعور کی بارگاہ سے پوچھو تو یہ جو اس کے بعد کی حیات جاوداں ہے اس کے مقابلے میں تو وہ بہت ہی قلیل رہ جائے گا تو کیا حساب کرنا۔ اس کے مقابلے میں تمہیں بار بار کہا جاتا تھا کہ یہ جتنی بھی مفاد پرستیاں اور منفعت کوشیاں ہیں، بہت کم قیمت کی ہیں۔ جتنا بھی یہ عرصہ ہے، بڑا قلیل ہے اور اس کے بعد جو حیات جاوداں کی متاع ہے وہ بے بہا ہے۔ جسے اب اس دنیا کی زندگی کہا جاتا ہے اس کے لیے وہ کتنا ہی لمبا عرصہ کیوں نہ ہو دراصل وہ تھا ہی بڑا قلیل عرصہ۔ اور اب آگے ایک بات آئی ہے۔

① ہمیں تو کچھ بھی معلوم نہیں رہے گا۔ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں تو ویسے ہی سٹیگم ہو جاتی ہے۔



## قرآنی آیت کے آخر میں خدا کی دی گئی صفت کی اہمیت

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہوا ہے اور بار بار کہتا ہوں کہ قرآن کریم کی ہر آیت کے بعد جو آخر میں خدا کی صفت بیان ہوتی ہے وہ بڑی اہم ہوتی ہے۔ وہ یوں ہی شاعری کی طرح سے کافیہ سانیہ ہے کہ ایک اس کو لے آیا اور کافیہ سارکھ لیا، پھر مضمون باندھ دیا۔ یہ صورت نہیں ہے۔ آیت کے آخر میں قرآن جو خدا کی صفت لاتا ہے وہ بڑی Appropriate (موزوں و مناسب اور بر محل) ہوتی ہے بڑی مناسب ہوتی ہے۔ معنوی اعتبار سے وہ جو مضمون پہلی آیت میں آیا ہوا ہوتا ہے اس کے آخر میں خدا کی صفت کا اس کے ساتھ بڑا ہی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ خدا توفیق دے تو کبھی قرآن کو اس نگاہ سے بھی پڑھیے اور پھر سورۃ کی آخری آیات کے اندر تو اس نے اس سورۃ کے تمام مضمون کو Sum-up (مجموع) کر دیا ہوتا ہے اور اسی سے پھر وہ بات آگے چلاتا ہے۔

## آج کی دنیا میں انسانوں کا نظریہ حیات

یہ جو سارا قصہ ہے وہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر نہ کرنا، ان قوانین کو نظر انداز کرنا، پھر اس کے بعد سرکشی برتنا، ان اقدار کے علی الرغم یہ کچھ کہنا اور ان کا مذاق اڑانا ہے۔ پوچھا کہ یہ کیوں ہوتا ہے؟ یہاں زندگی کے دو نظریے بیان کیے ہیں۔ زندگی کا ایک نظریہ جو آج قریباً تقریباً ساری دنیا پہ ہی عام ہو گیا ہوا ہے یہ ہے کہ یہ کائنات یونہی اتفاق سے کسی طرح وجود میں آ گئی۔ یہ اس لیے کہ کتنے ہی بڑے بڑے سائنسٹ بھی کیوں نہ ہوں وہ اس کی ابتدا کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے وجود میں آ گئی۔ وہاں ان کے پاس چانس کا ایک لفظ ہے کہ By chance (اتفاقاً) ایسا ہو گیا۔ یہ کسی طرح سے یونہی اتفاقاً وجود میں آ گئی، پھر یہ مکینکلی، مشین کی طرح، چلی جا رہی ہے گویا اس کے اندر نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی غایت ہے نہ کوئی Objective ہے نہ کوئی Purpose، نہ کوئی Plan ہے۔ جو چیز اتفاقاً وجود میں آ جائے اور اسی طرح سے یونہی مسلسل چلی جائے تو اس میں تو Purpose (مقصد) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت یہ جسے آپ مادہ پرستی (Materialism) کہتے ہیں اور جسے سیاست میں سیکولر ازم وغیرہ کہتے ہیں وہ کیا ہیں؟ یہ ایک Concept (تصور) ہے یہ پہلے کائنات کے متعلق ایک تصور ہے۔ جب کائنات کے متعلق یہ تصور ہو تو کائنات ہی کا تو ایک جزو انسان ہے۔ خود انسان کے متعلق بھی یہ تصور ہے کہ یہی فطرت کا Physical Law (طبعی قانون) ہے کہ کسی طرح سے یہ ایک بچہ، جنین، رحم میں آتا ہے، بچہ پیدا ہو جاتا ہے پھر وہ انسان طبعی قوانین کے مطابق، یہ انسان کا جسم یہی ہے، پرورش پاتا ہے، طبعی قانون کے مطابق آہستہ آہستہ مشین کے پرزوں کی طرح، گھس جاتا ہے۔ اس کے بعد Disintegrate (منتشر) ہو جاتا ہے۔ اس میں انتقال واقعہ ہوتا ہے۔

صاحب! زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب۔ موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا۔<sup>①</sup> ٹھیک ہے، یہ موت جسم کی موت ہوگئی۔

① چپ مین کوہن (Chapman Cohen) نے مادیت (Materialism) کے متعلق Materialism Re-stated نامی بڑی مختصر لیکن بڑی جامع کتاب لکھی ہے۔ وہ مادیت کے متنوع گوشوں کی تفصیل کے بعد کم از کم تین خصائص ایسے بتاتا ہے جو مادیت کے لیے لازمی ہیں۔ وہ دراصل فلسفہ مادیت کا حاصل ہیں: (1) دنیا میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ کسی آزاد روحانی یا نفسی قوت کے ارادے کے ماتحت وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ قوائے فطرت کے امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ (2) نظریہ مادیت کی رو سے کسی ایک معین وقت پر کائنات کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اس کیفیت سے پہلے کی قوتوں کے امتزاج اور تقسیم کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اس سے یہ عقیدہ بھی لازم آتا ہے کہ کائنات میں نہ کوئی نیا عنصر یا نئی قوت وجود میں آتی ہے (اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے) اور نہ ہی اس قسم کا کوئی عنصر یا قوت خارج سے کائنات میں داخل ہوتی ہے۔ اس لیے ہم جس چیز کا نام ایک ”نیا عنصر“ رکھتے ہیں وہ موجودہ قوتوں کی ایک نئی ترتیب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مادیت کے اس ادعا کو جبریت (Determinism) یا میکا نیکیت (Mechanism) یا میکا نکی جبریت (Mechanistic Determinism) کہتے ہیں۔ (3) کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ اپنی اصل کے اعتبار سے مادہ (Matter) ہی ہے۔ اس کے ماوراء کچھ نہیں۔ مادیت کے ان تین خصائص کو گہری نظر سے دیکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس تصور کائنات کی رو سے (1) نفس انسانی (Mind) کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ یہ صرف دماغ کے مادی غلیات ہی کی کرشمہ زائیاں ہیں۔ (2) کائنات میں تخلیق (Creation) کا عمل جاری ہے۔ کچھ توانائی (Energy) کسی طرح سے ظہور میں آگئی ہے اب وہی توانائی اپنی ترتیب بدلتی رہتی ہے اور اسی تبدیلی ترتیب کا نام ”حوادث یا تغیرات“ ہیں اور تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ اس طرح ہو رہا ہے جیسے کسی نے ایک گھڑی کو لوک دیا ہو اور اس کے بعد وہ اپنے زور و دروں اور پوزوں کی میکا نکی حرکت سے خود بخود چلتی ہے۔ اس بحث (Discussion) سے مادیت سے مفہوم یہ رہ جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی اصل کے اعتبار سے مادی ہے، مادہ ہی جو ہر حقیقی (Real Substance) ہے، اس کے سوا حقیقت (Reality) کا تصور کچھ نہیں حتیٰ کہ نفس انسانی بھی، مادہ ہی کے اثر کا نتیجہ ہے (حوالہ Philosophy of Religion by Brightman) اور جب نفس انسانی بھی مادہ ہی کے ترتیبی اثر کا پیدا کردہ ہے تو اس نظریہ کی رو سے بقائے روح یا حیات بعد الممات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک تو بس یہ رہ جاتا ہے کہ

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا (چک بست)

اسے فرائڈ (Sigmund Freud: 1856-1939) کے الفاظ میں یوں کہیے کہ ”زندگی کا منتہی موت ہے“ اسے ہیری سلو کوور (Harry Slochower) نے اپنی کتاب No Voices is Wholly Lost میں درج (Quote) کیا ہے۔ چنانچہ ہیکل (Haeckel, Ernst) لکھتا ہے کہ روح (Soul) کا تصور سراب سے بڑھ کر کچھ نہیں اور جب اس کا تصور ہی فریب نفس ہے تو اس کی بقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جسم انسانی کی مشین، دماغ اور اس سے متعلقہ اعصاب کے عمل سے حرکت رہتی ہے اور دماغ کے عمل کے خاتمہ پر یہ حرکت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ عناصر کی ترتیب (Integration) کا نام زندگی، شعور، روح سب کچھ ہے اور ان کے انتشار (Disintegration) کا نام فنا۔ اس سے زیادہ سب کچھ افسانہ ہے اور ذہن انسانی کے تراشیدہ توہمات۔ (ماخوذ از پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور، 2002ء، ص 27-29)

## انسانی زندگی کے متعلق مغرب کے نظریہ حیات اور قرآن حکیم کی راہنمائی

آج کی دنیا میں یہ مفکرین اور مادیتین (Materialists) یہاں تک پہنچے ہیں۔ وہ اس جسم (Physical Body) کے علاوہ کچھ اور مانتے ہی نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جسم تو اتفاق سے ہی وجود میں آ گیا۔ اس کی کوئی Destination (منزل) نہیں، کوئی مقصد نہیں، کوئی غایت نہیں۔ جب انسان کی زندگی صرف اسی جسم سے عبارت ہے تو جسم کی پرورش کے لیے، آسائش کے لیے، آدمی کو جو کچھ چاہیے وہ جس طرح سے بھی جی چاہے حاصل کر لے۔ زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قانون ہوں گے تو وہ سوسائٹی کے قوانین ہی دھاندلی پڑتی ہو جائیں تو وہ ٹھیک ہے جنگل کا قانون ہوتا ہے: جس کی لاشی اس کی بھینس۔ یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے یعنی اس سے آگے تو کوئی غرض ہی نہیں کہ انسان زندہ رہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر لے، زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کر لے، یہی غایت رہ جاتی ہے اور تو زندگی کا کوئی مقصد (Purpose) نہیں رہتا۔ یہ ہے کائنات کا اور انسان کا (میکانکی) نظریہ زندگی جسے کفر کہا جاتا ہے۔ اس میں کائنات اور انسان کا بے غایت سمجھنا ہے بے مقصد سمجھنا ہے۔ اس زندگی کو یہ سمجھ لینا کہ یہ By chance (اتفاق) وجود میں آ گئی ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس کائنات کو ایک حکیم مطلق ایک Plan کے تابع، ایک مقصد کے لیے وجود میں لایا ہے۔ اس کی ایک غایت ہے، یہ حکیم مطلق اس کائنات کو اس کی طرف چلا رہا ہے اسی میں انسان بنا ہے۔ انسان کی زندگی میں یہ جو مغرب کا Evolution (ارتقا) کا نظریہ ہے وہ کارفرما ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک جرثومے سے لے کر یہ زندگی مختلف مدارج میں سے مراحل میں سے گزرتی ہوئی انسان کے جسم تک آئی لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان کی زندگی اس ارتقا کی آخری کڑی نہیں ہے۔ مغرب کی دنیا یہ کہتی ہے کہ یہ ارتقا کی آخری کڑی ہے یعنی جسم انسانی ختم ہوا، ارتقا کا سلسلہ ختم ہوا۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہاں سے ایک نئے ارتقا کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ ایک نئی چیز ہے جو انسان کے یا اس ارتقا کی منزل میں آئی ہے۔ وہ جسم کے علاوہ انسان کی ایک شے ہے جو ان طبعی قوانین کے تابع نہیں ہے اور طبعی قوانین کا نتیجہ بھی نہیں ہے۔ اسے قرآن تو نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ اسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اسے خودی کہا جاتا ہے۔ اسے کچھ کہہ لیجیے یہ کوئی ایک چیز ہے جو جسم کے ساتھ فنا نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ہے کہ جنہیں اقدار خداوندی یا Permanent Values کہا جاتا ہے اگر ان کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو وہ جو انسان کے اندر یہ ایک شے ہے جو اس کی موت سے مری نہیں اس کی نشوونما ہوتی ہے اور پھر وہ ارتقا کی اگلی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک تصور ہے۔ اگر اس پر ایمان ہوا تو انسان کے اسی جسم کا نام زندگی نہ ہوا۔ جسم کی پرورش ضروری ہے لیکن اصل غایت اور مقصد انسان کی اس شے کی نشوونما اور پرورش ہے جس میں جسم کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا اور آگے بڑھنا ہے۔ یہ دو نظریے ہیں۔

انسان غلط کاریوں سے، جرائم سے، سرکشیوں سے، اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ اس دوسرے نظریے پر اس کو ایمان ہو کہ سوسائٹی کی گرفت میں آ سکے یا نہ آ سکے اس کے ہر عمل کا ایک نتیجہ مرتب ہو کر رہنا ہے۔ یہ ہے دوسرا نظریہ جو آج میں نے کہا تھا دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ اتنے جرائم عام ہو رہے ہیں اور کسی سے کنٹرول ہی نہیں کیا جاتا، بڑی سے بڑی ایسی سوسائٹی بھی جو بڑی Perfection کے قریب بھی پہنچی ہوئی ہو، وہ بھی اپنے ہاں احتساب اور عدل کا کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکی جو جرائم کو کسی طرح سے ختم کر سکے بلکہ روک بھی سکے۔ اس لیے کہ یہ نظریہ حیات ہے نہیں۔ جو نظریہ زندگی اس جسم کی پرورش کے لیے ہے آپ اس کے مطابق جس طریق سے بھی سامانِ عیش و نشاط حاصل کر سکتے ہیں، آپ کرتے چلے جائیے تو کون سی چیز ہے جو آپ کو روک دے گی؟ کوئی بھی نہیں۔

### وحی کی بنیادی اقدار اور سوسائٹی کے قوانین کی نوعیت

عزیزانِ من! اس ابتدائی چیز کو ذہن میں رکھیے۔ اب آئیے قرآن کی طرف۔ کہا کہ ان سے پوچھیے کہ یہ جو بلند اقدار ہیں جنہیں Values کہا جاتا ہے یہ حق اور باطل میں امتیاز کرتی ہیں۔ اب پھر میں آپ کو سمجھا دوں کہ جسے ہم یہ Value (اقدار) کہتے ہیں، وہ ہوتا کیا ہے۔ کئی دفعہ میں یہ مثال دے چکا ہوں۔ وہ چونکہ بڑی عام فہم سی مثال ہے، اسی کو بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ بیل اپنے گاؤں سے باہر جاتا ہے، بھوکا ہوتا ہے، جو کھیت سب سے پہلے اس کے سامنے آتا ہے وہ اس میں سے چرنے لگ جاتا ہے، اس کا سارا مسئلہ اپنی بھوک اور یہ چارہ ہے۔ یہ اس کے اپنے مالک کا ہے یا کسی دوسرے کا ہے، اُسے اس سے غرض ہی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اگر کہیں اس کھیت والا ہے، وہ آیا اور اس نے اسے پانچ سات ڈنڈے مارے اور وہ بیل وہاں سے بھاگ لیا بس یہ ہے سارا کچھ۔ آج دنیا میں انسانوں کا مسئلہ اتنا ہی ہے کہ انسان نکلتا ہے اسے ہوس ہوتی ہے، جو چیز سامنے پڑی ہوئی ہے وہ اس پر جھپٹتا ہے۔ اگر مالک کہیں ہے یا وہ ڈنڈے والا سپاہی کھڑا ہے، تو اس نے دو چار ڈنڈے مار دیئے، اگر نہیں ہے تو بس بیل کی طرح، اپنی ہوس پوری کر لی۔ یہ سارا ہی یہ کچھ تصور ہے۔ انسان کا تصور یہ ہے کہ یہ اگر گھر سے نکلے، اس کو بھی بھوک لگی ہوئی ہو، باہر جائے، اب یہ جو تمیز کرنا ہے کہ یہ میرا کھیت ہے، مجھے اس میں سے لینا چاہیے، یہ غیر کا کھیت ہے، اس میں سے مجھے نہیں لینا چاہیے، یہ جو امتیاز ہے یہ ہے جسے Value (قدر) کہتے ہیں۔ حیوانات کی زندگی میں یہ نہیں ہوتی۔ انسانوں کی زندگی کے اندر بھی اگر یہ تصور یہ ایمان نہ ہو، یہ اندر والا Value نہ ہو تو وہ وہی کچھ کرتا ہے جو بیل کرتا ہے۔ مہذب سے مہذب سوسائٹی میں بھی Value (قدر) نہیں ہوتی، سوسائٹی کے قانون ہوتے ہیں، سوسائٹی نے قانون بنا دیا مثلاً

Keep to the left<sup>①</sup> سوسائٹی کا قانون ہے یہ Value (قدر) نہیں ہے۔ اس قانون کا اتباع کرنے والا کسی Value (قدر) کی پرورش نہیں کر رہا، سوسائٹی کے ایک قانون کو مان رہا ہے۔ سوسائٹی کل کہہ دے کہ Keep to the right<sup>②</sup> تو وہ Keep to the right کرنے لگ جائے گا۔ Value (قدر) یہ چیز نہیں ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ دوسرے کے کھیت سے پھل توڑنا ناجائز ہے یہ ناجائز رہے گا۔ سوسائٹیاں بدلتی رہیں، حکومتیں آتی رہیں، حکومتیں جاتی رہیں یہ ناجائز جائز نہیں ہو سکتا۔ اسے Permanent value (مستقل قدر) کہتے ہیں۔ یہ Value (قدر) سوسائٹی نہیں دے سکتی، سوسائٹی میں تو ہر صاحب اقتدار کے بدلنے کے ساتھ قانون بدلتے ہیں، ہر حکومت بدلنے کے ساتھ قانون بدلتے ہیں، Wills (خواہشات) کے اوپر قانون ہوتے ہیں۔ Values (اقدار) Permanent (مستقل) ہوتی ہیں، سوسائٹی کا قانون اور چیز ہے وہ Value (قدر) نہیں ہوتا۔

انسانی زندگی اپنے اندر ایک عظیم مقصد لیے ہوئے ہے

آپ دیکھیے کہ قرآن کریم میں کس قدر ربط ہے! کہا کہ اے رسول! ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد ان مخالفین سے پوچھو کہ اَفَحَسِبْتُمْ (23:115) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (23:115) ہم نے تمہیں بلا غرض و غایت پیدا کر دیا۔ یہ ہے صاحب کفر اور صاحب ایمان میں نکتہ امتیاز۔ اگر یہ چیز ہے کہ ہم By chance (اتفاقہ) اس دنیا میں آ گئے اب قانون طبعی کے مطابق ہم نے زندہ رہنا ہے، اسی کی رو سے ایک دن مرجانا ہے زندگی کا خاتمہ ہو جانا ہے تو یہ زندگی عبث ہو گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ زندگی عبث نہیں ہے۔

عربوں کے ہاں ”عبث“ کا مفہوم

بات یہ ہے کہ ”عبث“ کے معنی ہی ”بے غرض و غایت“ ہوتا ہے۔ یہیں سے یہ جو عرب تھے یہ مویشیوں کے گلہ کو جس کے اوپر گڈر یا نہ ہو اور ان کا راستہ متعین نہ ہو وہ جس طرح سے ادھر ادھر پھرتے ہیں وہ اسے ”عبث“ کہتے ہیں۔<sup>③</sup> مگر ایک متعین نصب العین سامنے ہو اور آپ کا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہو تو یہ ہے جسے آپ کہیں گے کہ ہم مقصد کی طرف جا رہے ہیں، ایک غایت ہے۔ عربی

① بائیں طرف چلو۔

② دائیں طرف چلو۔

③ تاج العروس المفردات فی غریب القرآن اور محیط المحيط میں ہے کہ عرب عَبِثَ النَّاسُ مختلف قبائل کے ملے جلے لوگوں کو کہتے تھے جو ایک جدِ اعلیٰ کی اولاد نہ ہوں اور اَلْعَبِثَةُ ”ملی جلی بکریوں“ کو کہتے تھے۔ اس طرح اَلْعَبَثُ کے معنی ”غیر مفید کام“ کے ہیں یعنی وہ کام جس سے غرض و غایت مطلوب نہ ہو (ماخوذ از پرویز: لغات القرآن ص 1119)۔

زبان میں آخری مقام جہاں پہنچنا ہے، ہم نے متعین کیا ہو، اور قدم اس کی طرف اٹھیں تو اسے تو حق کہا جائے گا اور اگر یہ چیز نہیں ہے یعنی متعین نصب العین کوئی نہیں ہے، کوئی Destination (منزل) نہیں ہے، کوئی Purpose (مقصد) کوئی Goal (نصب العین) نہیں ہے، تو ساری عمر آپ پھرتے رہیے۔ یہ سفر نہیں ہے آوارگی ہوگا۔ سفر اور آوارگی میں تو فرق ہی یہی ہے کہ آوارہ پھرنے والا تو سفر کرنے والے سے شام تک دگنا فاصلہ طے کر لیتا ہے لیکن پوچھیے کہ وہ شام کو پہنچتا کہاں ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ عبث کے یہ معنی ہوتے ہیں۔

قرآن کریم نے کہا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کر دیا ہے۔ وَ اَنْكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (23:115) اور تمہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔ یعنی پھر پھر اکے بھی جہاں تمہارا جی چاہے نکل جاؤ گے، اور تمہیں کوئی پکڑنے والا پوچھنے والا نہیں ہے۔ کیا تم یہ سمجھ رہے تھے؟ اس لیے یہ کچھ کہا کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت اور بلا مقصد و منزل پیدا کر دیا ہے، تم اتفاقیہ دنیا میں آ گئے، کچھ دن زندہ رہے، پھر خاک میں مل گئے اور زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا، اسی لیے جو کچھ تمہارا جی چاہے کرتے رہو، تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں؟ اور تم پر ہمارے قانونِ مکافات کی گرفت ہی نہیں؟ تمہیں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے ہماری طرف آنا ہی نہیں؟ میں نے قرآن کی رو سے یہ دو نظریات پیش کیے ہیں۔ اس کے متعلق تو بے شمار آیات ہیں جو پیش کی جاسکتی ہیں لیکن حوالوں کی غرض سے آپ دو دو چار چار آیتیں تو ضرور اس میں نقل کر لیجیے۔ پہلے تو خود کائنات کے متعلق دیکھو کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ کہا کہ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (38:27) ہم نے اس کائنات کو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو بے غرض و غایت پیدا نہیں کیا۔ دیکھیے، یہ جسے آپ باطل کہتے ہیں وہ یہاں آیا ہے۔ ہمارے ہاں تو پھر یہ Concepts (تصورات) ذہنوں میں بدل جاتے ہیں اور یہ وہ بنتا ہے جسے ہم باطل پرست کہتے ہیں اور باطل کے معنی ہی کچھ اور ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ قرآن کہہ کیا رہا ہے؟ یہ کہ ہم نے اسے بے غرض و غایت نہیں پیدا کر دیا۔ ہم نے جو پیدا کیا ہے اس کے Behind (پس پشت) ایک مقصد، ایک غایت، ایک Purpose رکھا ہے۔

انیسویں صدی میں عیسائیت کے خلاف یورپ کے ردِ عمل کی وجہ جواز

آگے سنئے۔ کہا کہ ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا (38:27) ایک تو یہ بات کہ یہ سمجھنا کہ کائنات بے غرض و غایت ہے، یہ علم کی بات نہیں ہے، سیاسی بات ہے۔ علم کی بارگاہ سے پوچھیے، وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ یہ اتنی عظیم کارگاہ کائنات یونہی الٹ پونہی بائی چانس وجود میں

① اپنے آپ کو فخر سے بڑا ثابت کرنا۔

آگئی اور بائی چانس چل رہی ہے۔ انیسویں صدی میں یورپ میں جب سے ردِ عمل شروع ہوا ہے وہ اصل میں ان کا ردِ عمل عیسائیت کے خلاف تھا کہ جہاں قیاس ہی قیاس ہے۔ وہ تو کائنات کی ابتدا کے متعلق تاریخ بھی مقرر کرتے تھے کہ کائنات تین ہزار نو سو اتنے سال مسیح سے پہلے وجود میں آئی۔ یہ تو رات میں ہے وہاں جو پادری تھے انہوں نے یہ بات کہی کہ وہ حضرت مسیح سے تین ہزار نو سو اکتالیس سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ کہا کہ ستائیس اکتوبر تین ہزار نو سو اکتالیس کہیے یہ بڑا ”بڑکپن“<sup>①</sup> تھا۔ وہیں سے انہوں نے اپنا رخ بدلا اور اس کے بعد یہ سائنس کے اوپر آئے۔ انہوں نے یہ بات کہی کہ وہاں سے ان کا جو ردِ عمل شروع ہوا ہے تو انہوں نے سب کچھ لپیٹ کر پھینک دیا ہے۔ جب مذہب کے خلاف ردِ عمل ہوتا ہے تو اس میں پھر انسان ساری چیزیں یہ خدا اور وحی اور رسول سب کچھ پھینک دیتا ہے تو وہاں یہ بات ہوئی کہ کسی طرح یہ کائنات وجود میں آگئی۔ انہوں نے پوچھا پھر یہ کیسے آئے؟ انہوں نے کہا کہ یہ کیسے کا ہمیں پتہ نہیں ہے یہ سلسلہ کسی طرح وجود میں آگیا اور چل رہا ہے۔ اب وہی یورپ اس کے اوپر آ رہا ہے کہ نہیں اس کے Behind (پچھے) کوئی Purpose (مقصد) ہے۔ یہ بات لمبی ہو جائے گی کہ میں ان کے سینکڑوں نظریات و تصورات پیش کر دوں۔ اب ان کی یہ چیزیں ہیں ان میں دن بدن تو پوچھو نہیں کتنا زیادہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کہا کہ ان سے کائنات کے متعلق پوچھیے کہ ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا (38:27) یہ ظن ہے، علم نہیں ہے یہ کفر ہے ایمان نہیں ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ کفر کس بات کو کہا گیا ہے۔ یہاں کائنات کو بے مقصد ماننا کفر ہے۔ یہاں تو نفی کی گئی اور دوسری جگہ الحق کی رو سے یہ کہا گیا کہ يَادْرُكُوْا حَلْقَ اللّٰهِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بِالْحَقِّ (29:44)۔ وہاں کہا تھا کہ باطل پیدا نہیں کیا، یہاں کہا کہ بالحق پیدا کیا۔ اب حق کے معنی آپ کے سامنے آ گئے: متعین نصب العین، غرض اور غایت اور Purpose اور Goal۔ یہ چیز اگر متعین طور پہ ہو تو وہ تو الحق ہے اور پھر صرف حق نہیں، یہ الحق ہے۔ الحق کے معنی ہیں The Truth یعنی صرف وہی حق ہوتا ہے۔ یہ لفظ حق تو آپ کے ہاں مختلف معنی میں استعمال ہوگا لیکن جب الحق ہوگا تو یہ وہ ہوگا جسے خدا نے حق قرار دیا ہے وہ غرض و غایت کہ جسے خدا نے متعین کیا ہے۔ کہا کہ یہ ہے جس کے لیے یہ کائنات وجود میں آئی۔ اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ یہ یونہی کھیل تماشے کے طور پر بلا مقصد و غایت پیدا نہیں کی گئی۔

### تخلیق کائنات کا اصل مقصد اور اس کی غرض و غایت

اس ارض و سما کی غرض و غایت کے متعلق تو قرآن کریم نے مختلف مقامات پہ بہت کچھ کہا ہے لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے یہ عظیم چیز ہے عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے سائنسٹس کا بھی اور ریسرچ اسکالر کا بھی رخ ابھی اس طرف تو آیا ہی نہیں ہے۔ کہا تھا کہ

① اپنے آپ کو فخر سے بڑا ثابت کرنا۔

② خدا نے اس کائنات کی پیتھوں اور بلندیوں کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر پیدا کیا ہے جس کا ایک خاص مقصد ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص-920)۔  
وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ (45:22)۔ اب قرآن حق کی تشریح کی طرف آیا۔ کہا کہ ہم نے اس کائنات کو اس کا رگہ ارض و سما کو اس محیر العقول مشینری کو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا رگہ کائنات کی یہ عظیم محیر العقول مشینری کا ہے کے لیے سرگرم عمل ہے؟ خود ہی اس کا جواب یہ دیا کہ وَلِتُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (45:22) اس لیے ہے کہ ہر فرد کو اس کے عمل کا نتیجہ مل کر رہے اور کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ یہ ساری کائنات اس لیے سرگرم عمل ہے۔

عزیزانِ من! سوچئے کہ یہ قرآن کیا کتاب ہے۔ کہا کہ یہ سارا سلسلہ کائنات اس کے لیے سرگرم عمل ہے کہ کسی فرد کا کوئی عمل بغیر نتیجہ برآمد ہوئے نہ رہ سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر روٹی تیرے ہاتھ میں آئے تو تو اقدار (Values) سے غافل ہو کر اس کو نہ کھا۔ آپ اندازہ لگائیے کہ بالحق کی یہ کیا خوب تشریح ہو رہی ہے۔ الحق یہ ہے کہ کائنات کی پوری مشینری اس مقصد کے لیے سرگرم عمل ہے کہ کسی فرد کا کوئی عمل بغیر نتیجہ برآمد کیے نہ رہ سکے۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (45:22) اور کسی پہ زیادتی نہ ہو۔ عزیزانِ من! اس کا نام ہے نظام خداوندی۔ آپ نے دیکھا کہ اس کی غرض و غایت کیا ہے۔

یہ پوری کی پوری کائنات انسانی اعمال کے نتائج کو ہی مرتب کرنے میں مصروف کار ہے

اب اس کائنات کے اندر انسان آیا۔ آپ پہلے اس عظیم کائنات کو دیکھیے کہ قرآن کریم نے یہ کہا کہ یہ پوری کائنات اس مقصد کے لیے ہے کہ وہ انسان کے اعمال کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے سرگرم عمل رہے۔ پھر انسان سے کہا کہ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (23:115) کائنات تو بالحق ہے تمہارے اعمال کے نتیجہ خیز کرنے کے لیے عمل میں آئی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ تم بلا غرض و غایت پیدا کر دیئے گئے ہو أَفَحَسِبْتُمْ (23:115) تم یہ خیال کرتے ہو۔ یہاں (23:14) میں تو عبث کہا۔ دوسری جگہ بڑا ہی دلچسپ لفظ آیا ہے۔ کیا لفظ ہے یہ! کہا کہ أَيْحَسِبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى (75:36) کیا انسان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسے ”سدی“ چھوڑ دیا جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ سامنے کیا بات یا کیا چیز ہے؟ وہ ہے مقصد غرض و غایت۔

یہ جو کپڑا بنا جاتا ہے اس میں پہلے ہی وہ جولا ہا تانی تننا ہے۔ اس تانی بننے کے لیے سوت کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر لے جاتے ہیں۔ یہ تانی ہوتی ہے اسی کا وہ تانا ہوتا ہے جو وہ پھریوں پٹی پہ لے آتے ہیں اور وہاں پھر یہ تانا کھلاتا ہے۔ یہ نہایت عمدہ تاگا ہوتا ہے۔ وہ صاف ستھری پٹی پہ بڑی عمدہ شکل میں یہ سب کچھ کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ کپڑا بن گیا؟ نہیں اس کے اندر ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہے جسے بانا کہتے ہیں۔ عرب خالی تانا تننتے رہنے کو ”سدی“ کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ تم یہ سمجھے ہو کہ انسان کی



سرگرمیاں یہ ہیں کہ بس وہ تاناہی تانا تنتر ہے اس میں بانا کبھی نہیں آئے پھر تو اس جولاہے کی کھڈی سے کپڑا نہیں بنتا۔<sup>①</sup> یہ تانے اور بانے کا امتزاج ہے جس سے یہ مقصد (ثوب یعنی کپڑا) حاصل ہوتا ہے۔ یہ طبعی زندگی ہے جس کی مفاد پرستیوں کو اس کے سارے اسباب و ذرائع کو بار خداوندی کے بانے کے اندر رکھنا ہے۔ اس سے ثوب بنتا ہے۔ ثوب سے ہی تو ثواب ہے۔ ثوب کپڑے کو کہتے ہیں۔ اب آپ سمجھے کہ ثواب کیا ہے؟ یہ بنا ہوا کپڑا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ تاناہی سمجھے ہمارے ہاں ساری عمر تاناہی سمجھے ہو تاناہی تانا تا کہ ثوب یعنی کپڑا بن جائے۔<sup>②</sup> اپنے ہاں دیکھ لیجیے گا مختلف کھڈیاں کو ایوانات حکومت کے اندر اور کامرس کے اندر لگی ہوئی ہیں۔ یہ تانے ہی تانے ہیں۔ مساجد اور خانقاہوں کے اندر ان کے ذہن کے مطابق باناہی بانا ہے۔ اُس سے مساجد میں یہاں کپڑا بنا جاتا ہے اور وہاں خانقاہوں میں کپڑا بنا جاتا ہے۔ ثواب کیسے ہوگا؟ ثوب کیسے بنے گا؟ اس کے لیے تو تانا اور بانا ضروری ہے۔ اس طرح سے ثواب حاصل کرنا تو اس لفظ کی توہین ہے۔ اب سوچ لیا جو کہتے ہیں کہ جی ثواب ہوندا اے ایہدا۔ ہوندا اے ثواب خالی بانے تے خالی تانے نال؟ کسے جولاہے کو لوں پوچھ کے دیکھ لوؤ۔ تہا نوں نہیں پتہ تے سن لو ساڈے کو لوں۔ اس کو قرآن کا معجزہ کہتے ہیں۔<sup>③</sup>

عزیزانِ من! قرآن کا انداز یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے اس اونٹ چرانے والے بد کو ”سُدی“ سمجھ میں آ جائے اور آج کے بڑے بڑے سائنٹسٹ کی سمجھ میں بات بھی آ جائے۔ کہا کہ یہ سمجھتے ہو کہ کبھی خالی تانے کو زندگی سمجھ لی، کبھی بانے کو زندگی سمجھ لی۔ سنو یہ غلط ہے، یہ عبت ہے اور پوچھا کہ یہ جو زندگی ہے اس کے متعلق تمہارا تصور کیا ہے؟ آج کا تصور یہ ہے کہ انسان اتفاق سے دنیا میں آ گیا ہے اور اس میں ٹائم کا سوال ہوتا ہے، وقت گزر جاتا ہے، زمانے کی گردش یہ ہے۔ آپ کے ہاں یہ وہی اصطلاحیں ہیں۔ پھر ٹائم کی چیز آ جاتی ہے۔

① اَلْسُدَى کپڑے کے تانے کو کہتے ہیں۔ قَدْ اَسْدَى الثَّوْبَ وَ سَدَّاهُ اس نے کپڑے کا تانا سیدھا کر دیا۔ اَلْسُدَى وہ اونٹ جنہیں بغیر چرواہے کے چھوڑ دیا جائے کہ وہ جدھر جی چاہے خود ہی منہ اٹھائے چرتے پھریں (تاج العروس)۔ ذَهَبَ كَلَامُهُ سُدَى اس کی بات بیکار چلی گئی (محیط المحيط)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سُدَى کے معنی کسی چیز کو بے قید چھوڑ دینا اور جدھر اس کا منہ اٹھے اُدھر چلنے جانا ہیں۔ خلیل نے کہا ہے کہ سُدَوِیُّوْنَ کے گولیوں اور اخروٹوں سے کھیلنے پر بولا جاتا ہے جس میں وہ چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے پھینکتے اور چھوڑ دیتے ہیں۔ (پرویز: لغات القرآن جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام لاہور 1960ء، ص 864)

② تاریخ عالم پہ نگاہ ڈالیے۔ انسان نے جو نظام بھی بنایا وہ یا تنہا تانا تھا یا تنہا بانا۔ وہ کبھی ”روحانیت“ حاصل کرنے کے لیے خانقاہوں، تہجد گاہوں اور سادھیوں کی طرف چلا گیا اور کبھی خالص دنیا دار بن کر حکومت و سلطنت کی طرف آ گیا۔ اس نے روح اور مادہ آتما اور پراکرتی، دین اور دنیا، مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ رکھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ یا وہ تانا رہا یا بانا، وہ ثوب (کپڑا) کبھی نہ بن سکیں۔

③ جی! اس کا ثواب ہوتا ہے۔ کیا صرف تانے یا صرف بانے سے ”ثواب“ ہوتا ہے؟ اور کسی سے نہیں تو کسی جولاہے سے ہی پوچھ لو۔ آپ کو معلوم نہیں تو ہم سے سن رکھو اسے قرآن کا معجزہ کہتے ہیں۔

یہ ہمارے ہاں نئی بات نہیں ہے کہ زمانہ ہے یعنی وہ جسے اب عمر کہتے ہیں، وہی چیز ٹائم بھی زمانہ بھی ہوگئی کہ بالآخر آدمی کچھتر سال جی لے، سو سال جی لے، سو سو سال جی لے، جتنا جی چاہے لمبا وقت ہو جائے آخر اس کے بعد پھر موت آ جاتی ہے۔ یہ جو تصور ہے کہ وہ عمر اس طرح سے ماپی جائے اور آخر میں وہ ختم ہو جائے یہ ہے جسے زمانہ یا ٹائم کا تصور کہتے ہیں کہ زمانہ انسان کو ماردیتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں ہے، بہت پرانی بات ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں عرب میں بھی یہ تصور تھا۔ کہا کہ **وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا** (45:24) یہ کہتے یہ ہیں کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے، بس طبعی زندگی ہے۔ **نَمُوتُ وَنَحْيَا** (45:24) انسان پیدا ہوتا ہے، طبعی قوانین کے مطابق پیدا ہوتا ہے اسی کے مطابق مر مر جاتا ہے۔ **وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ** (45:24) بس یہ تو زمانہ ہے زمانے کی گردش ہے، جس سے انسان ختم ہو جاتا ہے۔ طبعی زندگی کے علاوہ انسان کی کوئی اور زندگی نہیں۔ اس پر کہا کہ **وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ** (45:24) محض عقیدے کی رو سے بات نہیں کرتا۔ کہا کہ جب علم کی بارگاہ میں یہ لوگ آئیں گے تو یہ خود اس خیال کو چھوڑ دیں گے۔

### انسان کی موجودہ زندگی نظر یہ ارتقا کی ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہے

انسان صرف اس کے طبعی جسم (Physical Body) سے عبارت نہیں ہے جس کے ختم ہو جانے سے خود انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ محض حیوانی سطح زندگی ہے۔ سائنکولوجی انسان کے متعلق ایک سائنس ہے۔ وہ ایک ہی جزییشن<sup>1</sup> میں اس نتیجے پہنچ گئی ہے کہ جسم انسانی کے مرنے سے انسان مرتا نہیں ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ وہ Survival (بقا) تک تو پہنچ گئے ہیں اور پچاس سال میں نظریہ ارتقا کے بنیادی اصولوں کے متعلق بہت مختلف اور متضاد تصورات پیش ہو چکے ہیں۔ دو شاگرد ہیں جن سے دو گروہ<sup>2</sup> بنے۔ جو نزو غیرہ<sup>3</sup> Survival تک پہنچ چکے ہیں مگر وہ ابھی تک بقائے نفس تک نہیں پہنچے۔ اس بات کی تردید تو آج ہو رہی ہے کہ نہیں، باہر سے انسان مرتا

① قریباً پچاس سال کا عرصہ

② ایک گروہ کا نام Rationalist ہے۔ اس مکتب فکر کو عام طور پر Aristotelian-Kantian یعنی ”ارسطو کانت“ گروہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے گروہ کا نام Empiricists ہے۔ یہ مکتب فکر Platonian-Hegelian یعنی ”افلاطون ہیگل“ کے نام سے متعارف ہے۔ ان دونوں گروہوں میں بڑی شدید بحث چلی آتی ہے۔

③ یہ مانچسٹر یونیورسٹی کا اناتومی کا پروفیسر F.W. Jones ہے۔ اس کی کتاب کا نام Design and Purpose ہے۔ اس کتاب میں اس موضوع پر شرح و بسط سے گفتگو کرتا ہے کہ کائنات میں کس طرح وحدت نظم (Monism of Order) موجود ہے اور یہ تمام کائنات کس طرح ایک سوچی سمجھی ہوئی تدبیر (Plan) کے تحت سرگرم عمل ہے۔ اس موضوع پر The Great Design بہت عمدہ روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ تمام سلسلہ کائنات عجیب و غریب نظم و ضبط کے ماتحت جاری و ساری ہے۔ یہ سب کچھ حیرت انگیز Design کے مطابق ہو رہا ہے جس میں کہیں کوئی سقم نہیں، کوئی جھول نہیں، کوئی دراڑ نہیں، کوئی سلوٹ نہیں۔ یہ سلسلہ ایک مقصد کے تحت عمل میں لایا گیا ہے۔ پال (Leslie Paul) اپنی کتاب The Meaning of Human Existence میں اس پر شرح و بسط سے (Srruggle) جدوجہد اور ایک خاص سمت (Direction) کے حوالے سے بات

کرتا ہے (ماخوذ از پرویز: انسان کے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام کراچی، 1956ء، ص 111 تا 113)۔

نہیں ہے۔ باہر کے متعلق برگسان<sup>①</sup> نے تحقیق کے بعد جو نئے نظریے پیش کیے ہیں ان سے اس نے تو ٹائم کا تصور ہی بدل کر رکھ دیا لیکن وہ اس درس کی بات نہیں، معاف رکھیے گا وہ کلاس میں نصاب کی طرح پڑھانے کی بات ہے۔ یہ جو زندگی ہے وہ قرآن کے نظریہ حیات کی رو سے ایک نئے سلسلہ ارتقا کا آغاز ہے۔ یہاں سابقہ سلسلہ ارتقا کی کڑیاں آخری کڑی ہیں، جو محض طبعی یا فزیکل قوانین کے تابع چلتی تھی اب یہ ایک نئے سلسلہ ارتقا کی پہلی کڑی کا آغاز ہے۔ جب میں وہاں آؤں گا تو بتاؤں گا کہ لفظ آخرت کے معنی یہ ہیں کہ یہ پچھلی کڑیوں کا اختتام ہے اور نئی کڑی کا آغاز ہے۔ یہاں سے تو ایک نئی قسم کی Evolution (ارتقا) شروع ہوتی ہے اور آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو Evolutionists ہیں یعنی جو مغرب کے نظریہ ارتقا کے قائل ہیں، انہوں نے ڈارون<sup>②</sup> کی اس کی تھیوری کی تردید کر دی ہے جو اس کو آخری کڑی کہتا تھا۔ اب وہ خود اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اس کے بعد یہ ایک نیا سلسلہ ارتقا شروع ہو رہا ہے اور وہ فزیکل لاء (طبعی قانون) کے تابع نہیں ہے۔ یہ تو ایک نئی زندگی ہے جس کا آغاز یہاں سے شروع ہو رہا ہے۔

ہماری یہ تمام تر زندگی جہاں فردا کی زندگی کا دیباچہ ہے

عجیب عجیب انداز میں یہ ہمارا اس دور کا قرآن کا مبصر<sup>③</sup> جسے اللہ تعالیٰ نے اتنی فراست عطا کی تھی، بڑے حسین انداز میں بات سمجھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

① برگسان کہتا ہے کہ حافظہ مادہ کی تخلیق ہے ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ روح ایک ایسی چیز کا نام ہے جو منقسم (Decompose) نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ مرکب نہیں، سبب (Simple) ہے۔ یہ Incorruptible ہے اس لیے کہ یہ غیر منقسم (Indivisible) ہے اور اپنی ذات کے اعتبار سے ناقابل فنا

(Immortal) ہے۔ حوالہ: The Two Sources of Morality and Religion, P.251

یاد رہے کہ انسان کے اندر جو چیز طبعی جسم سے ماورا ہے اُسے مختلف اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً انسانی نفس (Self) یا انا (I) یا ایگو (Ego) یا انفرادیت (Individuality) یا ذات (Personality)۔ نام مختلف ہیں بات ایک ہی ہے۔ انسانی جسم ہر آن بدلتا رہتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد سابقہ جسم کی جگہ ایک بالکل نیا جسم وجود میں آ جاتا ہے اور یہ سلسلہ تغیر و تبدل مسلسل جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو ان تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتی۔ وہ انسان کی ”میں (I-am-ness)“ ہے۔ ”میں“ غیر متبدل رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی (Change) کے معنی یہ ہیں کہ جس شے میں تغیر واقع ہوتا ہے اس کی پہلی حالت یکسر معدوم ہو جاتی ہے یعنی It ceases to exist اور اس کے بعد وہ شے از سر نو ایک نئی حالت میں پیدا ہوتی ہے لیکن انسانی ذات کی خصوصیت برگسان کے الفاظ میں یہ ہے کہ

We change without ceasing (ہم میں تغیر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر) (ماخوذ از پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام کراچی، 1956ء، ص 87 تا 90)۔

② Darwin, Charles Robert (1809-82)

③ یہ اشارہ مفکر قرآن سرڈاکٹر محمد قبال (1877-1938) کی طرف ہے۔

ز میں خاک در میخانہ ما

یزمین تو ہمارے میخانہ کے دروازے کی مٹی ہے اور

فلک یک گردش پیانہ ما

کائنات کا یہ آسمان ہمارے پیانے کی ایک گردش ہے۔ اس کے بعد یہ ہے وہ بات جو وہ کہہ گیا ہے:

حدیث سوزو ساز ما

جہاں دیباچہ افسانہ ما

ہمارا جو اصلی افسانہ ہے جو اصلی زندگی کی کہانی ہے اس دنیا کی یہ ساری زندگی تو اس کا دیباچہ ہے۔ یہ بات یہی کہہ سکتا تھا۔ دیباچہ ہی پڑھتے رہیے جو کتاب ہے اس کو کہیں پھینک دیجیے تو اصلی زندگی کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں ”دیباچہ افسانہ“ بڑی عمدہ تشبیہ ہے۔ یہاں کا جو مقصد بتایا گیا وہ وہی ہے جو اس نے کہا ہے جہاں ویلیوز آتی ہیں۔ عزیزانِ من! وہ بات بڑی لمبی ہے لیکن دو لفظوں میں قرآن یہ بتا گیا۔ آؤ تمہیں بتائیں۔ مقصد حیات وہ شے ہے جسے میں نے کہا ہے کہ قرآن نے اسے نفس کہہ کر پکارا ہے۔ یاد رکھیے گا وہ نفس ہے نفس نہیں ہے عربی زبان میں فرق ہے۔ نفس سانس کو کہتے ہیں اور نفس وہ شے ہے جسے میں نے کہا ہے کہ وہ طبعی جسم کے ساتھ مرتا نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ اب اس زندگی میں مقصد حیات جو ہے وہ اس شے کی نشوونما ہے۔

### قرآنی الفاظ افلاح اور فلاح کی تشبیہات کا مفہوم

اب ہماری موجودہ زندگی کی غایت اس شے یعنی نفس ذات کی نشوونما ہوئی جس نے طبعی جسم کے مرنے کے ساتھ مرتا نہیں اور جس نے اگلی ارتقائی منزل کی پہلی کڑی بن کر آگے چلنا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ بس اس شے کی نشوونما کرنا ہے۔ یہ بات نظری یا Theoretically رہ جائے گی اور یہ پریکٹیکل خدا کی مقرر کی ہوئی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے بنے گی۔ اس سے خود بخود اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ اب یہ بات نظری نہیں رہی، عملی ہوگئی وہ اقدار قرآن کے اندر آگئیں اور اسی لیے یہ کہا کہ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ① (91:9-10)۔ بس یہ ہے جی ایک ایک لفظ میں سارا پروگرام۔ اگر اس کی تشریح کروں تو کئی درس آجائیں۔

تشبیہات ملاحظہ فرمائیے صاحب! ایک ہے افلاح۔ اس سے فلاح ہے فلاح کبھی باڑی کو کہتے ہیں۔ قرآن کی تشبیہ ایک ایک

① اس کی مفصل تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ

لاہور 2006ء، ص 454 تا 465۔

لفظ میں تو ہوتی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ اس میں کس قدر غایات و معانی ہوتے ہیں جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔ تشبیہ ہی وہ کھیتی سے دیتا ہے۔ آپ ساری چیز اس کے اندر دیکھیے: مٹی پانی ہوا روشنی اور اس میں ایک بیج۔ صالح بیج پہ آج کل کتنا زور دیا جا رہا ہے۔ دیکھ رہے ہیں ٹی وی کے اوپر ریڈیو کے اوپر اشتہارات کے اوپر فلاں جگہ سے بیج منگایا ہے فلاں جگہ سے بیج لیجیے۔ دار و مدار ہی سارا اس پہ ہے کہ بیج صالح ہو ورنہ یہ مٹی پانی سب کچھ آپ مہیا کر لیجیے اس میں بیج نہ ڈالیے۔ ”تے کر دے رہو گوڈی صبح و شام گل جاوے گا“<sup>①</sup> اون بیج۔ کہا کہ ساری مادی زندگی کے لیے یہ بڑا ضروری ہے یعنی یہ اس بیج کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ فلح کے معنی ہوتا ہے کھیتی پروان چڑھنا، ”دانے گھر اوہدے اون گے۔“<sup>②</sup> یہ دیکھیے قرآن کہتا ہے کہ مَنْ زَكَّاهَا (91:9) صالح بیج کی جس نے نشوونما کر لی اس کی کھیتی پروان چڑھے گی اور اسی تشبیہ کے مطابق آگے کہا کہ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا (91:10)۔ یہ ٹھیک ہے کہ بیج بھی اس کے پاس ہے یہ دوسری چیزیں بھی ہیں لیکن ”دسہا“ ہو جاتا ہے۔ اب یہ کھیتی باڑی کرنے والے پچپائیں گے اور بتائیں گے۔ اگر موٹا سارا ڈھیلا کسی بیج کے اوپر آ جائے وہ جو بیج اندر ہوتا ہے پوچھو تو سہی اس بیچارے کے پاس قوت کون سی ہوتی ہے جو وہ شگوفہ مٹی کے ڈھیلے کے نیچے سے نکل آئے۔ اس شگوفے نے مٹی کے اوپر آنا ہے، مٹی کو پھاڑ کر اوپر آنا ہے اس کے لیے اس میں اتنی قوت ہونی چاہیے اور مٹی اتنی نرم ہونی چاہیے۔ یہ جو ہر چوتھے دن آ کر گوڈی کر دیتے ہیں وہ کرتے کیا ہیں؟ اس کے اوپر سے مٹی کو نرم کرتے ہیں۔ اگر اتنا بڑا مٹی کا ڈھیلا آ جائے تو وہ نرم و نازک شگوفہ دب جاتا ہے۔ اگر مادی زندگی کے مٹی کے اتنے وزنی ڈھیلے آپ اوپر رکھ دیتے ہیں تو پھر وہ اگتا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لیے مٹی ضروری ہے لیکن وہ اتنی نرم ہونی چاہیے کہ یہ اس میں سے سرفرازیوں سے اس کے اوپر آ جائے اور اگر یہ اس مٹی سے دب گیا تو پھر یہ جو اس کسان کی ساری محنت ہے وہ بے کار جاتی ہے۔ تو جو اس مادی زندگی کا مقصد حیات ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔ یہ جو میں نے زراعت کی تشبیہ میں عرض کیا ہے: مٹی پانی ہوا روشنی یہی مادیت اس سب کی غایت ہے اور مقصد اس بیج کی نشوونما کرنا ہے۔ ان مٹی پانی، ہوا اور روشنی کو کہا کہ یہ بڑھانا اور پھر اس بیج کو فصل بنادینا۔ اس مادی زندگی کی اس جسمانی زندگی کی اس طبعی زندگی کی یہ غرض و غایت ہے یہ مقصود ہے۔ اب پھر وہی آگے آ گیا اقبال (1877-1938)۔ کس کس انداز سے یہ شخص معنی بیان کر جاتا ہے! کہتا ہے کہ

① صبح شام گوڈی کرتے رہیے وہ بیج ہی گل سڑ جائے گا۔

② اس کے گھر ناج آئے گا۔

مقام پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن  
نہ سیرگل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

(اقبال: بال جبریل)

اگر کہو گے کہ صاحب! یہی زندگی ہے جس کے اندر ہم نے رہنا ہے اور یہیں ختم ہو جانا ہے۔ یہ چمن مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے۔ وہاں ”حدیث سوز و ساز“<sup>1</sup> کہا تھا۔ اسی اعتبار سے یہاں ”آہ و نالہ“ کہا ہے۔ یہ ہے غرض و غایت اور جسے موت کہتے ہیں وہ کس طرح سے ہے اس کے لیے کہا کہ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (67:1)۔ آپ دیکھیے انداز کیا ہے! ابتدا کس طرح سے ہو رہی ہے! پہلے تبارک کہا۔ اگر میں اس آیت کی تشریح میں چلا جاؤں گا تو وہ دیکھیے گھڑی تو بھاگ رہی ہے اور ادھر سے شیخ صاحب<sup>2</sup> ہیں کہ جن کا وہ ٹیپ ختم ہوتا جاتا ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ عرب<sup>3</sup> برکت کے کیا معنی لیتے تھے۔ اس کے لیے دیکھیے کہ برسات کے دنوں میں جس طرح سے یہ سبزہ گھنا ہو کر سیاہ ہو جاتا ہے اُس افراط سے جب کوئی چیز اگتی ہو تو اسے برکت کہتے ہیں۔ اے جیہڑے کیندے سن کہ تل کے روٹی کھایا کرو اللہ برکت پادیندراہیگا۔ اے بات بڑی ہے<sup>4</sup>۔ کبھی بسم اللہ<sup>5</sup> پہ آؤں گا تو میں عرض کروں گا۔ یہاں کہا ہے کہ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ (67:1)۔ کائنات کا پورا کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ کہ یہ ایسے یہاں یہ چیزیں نشوونما پائیں جیسے برسات کے دنوں میں تمہاری سبزی اگتی ہے۔ یہ اس کے لیے ہے۔ یہ ملک اگی ہوئی کھیتی واسطے نہیں ہیگی۔<sup>6</sup> یہاں تو ابتدا اس کے لیے ہوتی ہے اور آگے کہا کہ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (67:1) اس کا جو ”ملک“ ہے وہ دھاندلی کا نہیں۔ اس نے ہر شے کے لیے ایک قانون مقرر کر دیا ہے۔

1 حدیث سوز و ساز ما جہاں دیباچہ افسانہ ما (اقبال)

2 یہ اشارہ شیخ عبدالمحید رحمہ کی طرف ہے جو دروس کو اس زمانے میں ٹیپ کیا کرتے تھے۔

3 اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006، ص 29 تا 96۔

4 یہ جو کہا کرتے تھے کہ روٹی (چپاتی) تل کر کھایا کرو تو اللہ برکت ڈال دیتا ہے یہ بڑی بات ہے۔

5 اس کے لیے دیکھیے مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الفاتحہ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2007، ص 73 تا 92۔

6 یہ ”ملک“ پیدا شدہ کھیتی کے لیے نہیں ہے۔

## اس زندگی کے بعد موت جیسے حادثہ کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے لیے ایک قانون مقرر کر دیا ہے حتیٰ کہ اَلَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (67:2) زندگی ہے اور زندگی کے بعد موت ہے اور موت تو بڑا حادثہ گنا جاتا ہے۔ سب سے بڑا حادثہ انسان کی زندگی میں موت ہے۔ کہا کہ یہ موت کا ہے کے لیے ہے؟ جواب میں کہا کہ لَيَبْلُوْكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2) یہ دیکھنے کے لیے یہ ٹیسٹ کرنے کے لیے ہے کہ اب تم میں سے کس نے اس زندگی میں وہ اعمال کیے تھے جو اسے اگلی زندگی کے قابل بنادیں اور اس میں اس کے لیے حسنِ عمل کی راہیں کھول دے۔ موت تو یہ دروازہ ہے اور ایک نئے راستے کا ہے ”لیبلو کم“ تاکہ تم اپنے آپ کو ٹیسٹ کر سکو کہ اس پوری زندگی میں میں نے جو کچھ کیا تھا اس نے مجھے اس قابل بنادیا ہے کہ مجھ میں اگلی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ موت یہ ٹیسٹ کرنے کے لیے ہے۔ اگر اس میں اس زندگی کے اندر اتنی ارتکاز یعنی Crystallization، سختی، جسے صلابت کہتے ہیں پیدا ہوگئی ہے تو پھر آدمی موت سے مر نہیں سکتا۔ ٹیسٹ یہ ہے کہ موت مجھے ماردیتی ہے یا نہیں؟ اگر تمہارا جسم ہی جسم ہے اور اس شے (انسانی ذات) کی نشوونما نہیں ہوئی تو پھر تو آپ مر گئے اور اگر اس میں یہ پختگی آچکی ہوئی ہے تو اس کے بعد اس موت سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لَيَبْلُوْكُمْ (67:2) موت تو تمہارے لیے یہ دیکھنے کا ایک ٹیسٹ ہے کہ اس زندگی میں تم نے کس قسم کے کام کیے ہیں۔ روز کے مشاہدے کی تشبیہ کے لیے یہ ہے کہ اے مکھن دودھ وچ ہوندا اے یعنی مکھن دودھ کے اندر ہی تو ہوتا ہے۔ اس میں بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے اندر پانی ڈالتے جاییے اور دودھ پتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر بھی پتہ نہیں چلتا۔ اب ذرا کششِ حیات کی مدھانی سے اسے رڑھک دیجیے۔<sup>1</sup> آپ کو پتہ ہے ”پھر کدی ویکھیا اے رڑکدے کس طرح داد دودھ ہوندے؟ اے تے دودھ ہی نہیں ہونداتے رڑکنا کی؟ اے پانی رڑکن والی گل ہیگی نا۔ رڑکدے رہو۔ ایہدے بعد پھر اے ساڈی اگلی جزیشن کدی مدھانی ای نہیں ویکھی۔ نہیں سی کدی مکھن نکلا اوتے مدھانی اچ کڈ دے سن نا۔ چاٹی ہوندی اے نا، وہ مدھانی ہوندی اے۔ نہ اے نیں مدھانی ویکھی نہ چاٹی نہ اور رڑکدی اے ویکھیا۔ پرورش ہوندی اے ساری! وہ جو رڑکنا ہے نازندگی کا۔“<sup>2</sup>

<sup>1</sup> بلو دیجیے۔

<sup>2</sup> پھر کیا کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ کس قسم کا دودھ بلوتے ہیں؟ یہ تو دودھ ہی نہیں ہوتا تو اس کا بلونا کیا؟ یہ تو محض پانی بلونے کی بات ہے کہ بلوتے رہو۔ اس کے بعد تو یہ ہے کہ ہماری اس اگلی نسل نے تو کبھی مدھانی ہی نہیں دیکھی۔ مکھن نہیں نکلتا تھا وہ تو بلونی سے نکالتے تھے۔ ایک ”چاٹی“ (دودھ رکھنے یا دہی بلونے کا مٹی کا بڑا برتن) ہوتی ہے ایک ”مدھانی“ (بلونی) ہوتی ہے۔ نہ اس نسل نے ”مدھانی“ دیکھی نہ ”چاٹی“ اور نہ ہی بلوتے دیکھا۔ وہ جو زندگی کا بلونا ہوتا ہے وہ پرورش (Nourishment) ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ کشمکشِ حیات کے لیے اس سے بہتر لفظ نہیں ہے ”لیکن اس کشمکشِ حیات کا نتیجہ کی ہوندا اے؟ او جیہڑا رڑکدی ہنگی اے او ہدے اچ گونج پیندی ہنگی اے باہر تیکر۔“<sup>①</sup> اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جو پانی میں چھپا ہوا مکھن ہوتا ہے جو کبھی نظر نہیں آتا، آپ اس کو پکڑ نہیں سکتے اس کا اندازہ نہیں ہوتا، وہ ایک سخت چیز بن کے اوپر آ جاتا ہے۔ سارا دن اس میں پانی ڈالتے چلے جاؤ، مکھن وہاں مکھن ہی رہتا ہے وہ پھر اس کے اندر گھلتا ہی نہیں۔ انسانی زندگی کے اندر جو خود گھلی ہوئی محلول ہے ”جو اس طرح سے کشمکشِ حیات دی رڑکن پیندی ہنگی نا چاٹی اچ“ اس کے بعد پھر وہ آہستہ آہستہ مکھن دا پیڑا بن جاندی ہنگی اے۔ تے فیر او ہدے بعد پاویں سارا دن پانی پوندے رہو او ہدے وچ او پیڑا او سے طراں دار ہندا اے۔“<sup>②</sup> کہا کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (67:2) ”اے مدھانیاں تے اے چاٹیاں تے ایس واسطے اسی بنایاں نیں“<sup>③</sup> تاکہ یہ نظر آ جائے کہ تمہارے دودھ میں مکھن کتنا تھا اور نظر جھی آئے گا کہ وہ پیڑا بن کر اوپر آ جائے۔ اگر وہ پیڑا بن کر اوپر آ گیا ہے تو پھر موت سے بھی کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

جو صدف گوہر پیدا نہ کرے اس صدف کا کوئی فائدہ نہیں ہے

عزیزانِ من! انہی نکات کو اجاگر کرنے کے لیے مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے کیا ہی خوب کہا کہ

زندگانی ہے صدف قطرہ نیساں ہے خودی

وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خود بگرو خود گرو خود گیر خودی

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مرنہ سکے

(ضربِ کلیم: حیات ابدی)

تیرے ”دودھ اچ ملی ہوئی کریم جے مکھن دا پیڑا بن جائے تے فیر اے پانی تے مدھانیاں تے چاٹیاں تے کچھ نہیں بگاڑ سکدیاں ایہدا۔“<sup>④</sup>

کہا اَفَحَسِبْتُمْ (23:115) تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں اِنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنْتُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجِعُوْنَ (23:115)

① لیکن اس کشمکشِ حیات کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جو بلونی سے بلوتی ہے تو اس سے باہر تک ایک گونج سی پیدا ہوتی ہے۔

② جو اس طرح سے زندگی کی ”چاٹی“ میں کشمکشِ حیات کی بلونی چلتی ہے تو اس کے بعد پھر زندگی آہستہ آہستہ مکھن کا پیڑا بن جاتی ہے۔ پھر اگر آپ اس میں تمام دن پانی بھی ڈالتے رہیں وہ پیڑا ویسے کا ویسے ہی رہتا ہے۔

③ یہ بلونیاں یہ چاٹیاں تو اسی لیے ہم نے بنائی ہیں۔

④ تیرے دودھ میں ملی ہوئی ملائی اگر مکھن کا پیڑا بن جائے تو پھر یہ ”پانی“ یہ بلونیاں یہ چاٹیاں تیرا بال بھی بیک نہیں کر سکتیں۔



یونہی بے غرض و غایت اور بلا مقصد و منزل پیدا کر دیا ہے اور اب یہ سمجھے ہوئے ہو کہ تمہیں کوئی پکڑنے والا ہی نہیں ہے اس لیے یہ ساری بد مستیاں اور سرکشیاں اور بدعنوانیاں اور دھاندلیاں یہ سمجھتے ہوئے کر رہے ہو کہ یہ سب کچھ بائی چانس ہو رہا ہے کوئی پکڑنے والا ہی نہیں ہے تم سمجھتے ہو کہ بھاگے ہوئے ہو تم اشتہاری مجرم ہو تم آ ہی نہیں رہے ہو لیکن سمجھ رکھو کہ تمہارا تو ہر قدم ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ راجعون عجیب چیز ہے۔ تم بھاگے ہوئے ہو سائر اٹاکے جیل سے نکل کے کہ ہماری گرفت میں نہ آؤ۔ اپنے ذہن میں سمجھتے ہو کہ تم بھاگ کے دور جا رہے ہو۔ کہا کہ تمہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ تمہارا ہر قدم تو ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ ہے جی جسے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ (2:156) کہتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم بھاگ کر کہیں اور جا رہے ہو تمہارا ہر قدم تو ہماری عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے۔ فَتَعْلٰی اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ (23:116) خدا اس سے بہت بلند ہے کہ تم یہ سمجھو کہ اس نے کائنات کو یونہی عبث پیدا کر دیا اور تمہاری زندگی کو بھی بلا مقصد رکھ دیا۔ یہ اس کے شایان شان ہی نہیں ہے۔ ”وہ رب ہی نہیں بن سکتا جیہڑا ایہو بے کم کر دیا ہووے۔“<sup>①</sup> کیا تم یہ سمجھتے ہو؟ اور پھر لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ (23:116) یہ بھی نہیں ہے کہ کوئی بات نہیں یہاں نہیں وہاں اپیل کر لیں گے اس مجسٹریٹ کے ہاں مقدمہ دائر کر دیں گے ”اور دوسرا جیہڑا ایہو بے نال کچھ لگی ہیگی۔ اے منتقل کرا کے اس عدالت اچ لے جان۔“<sup>②</sup> کہا کہ یہاں عدالت ہی ایک ہے دوسری عدالت ہی نہیں ہے۔ تمہارا ہر قدم اس عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے اور عدالت دوسری ہے نہیں۔ کیا بات ہے صاحب!

### خدا تعالیٰ ایک فائزل اتھارٹی کے باوجود الکریم ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ (23:116)۔ یہاں ہمارے ہاں بھی تو جوڈیشری کے اندر ایک فائزل اتھارٹی ہے جسے سپریم کورٹ کا چیف جسٹس کہتے ہیں۔ اس کے آگے کوئی نہیں ہوتا۔ یہ جو رب العرش الکریم ہے اس کے یہ معنی ہیں۔ تخت جہاں بانی کا وہ جو آخری اسٹیج ہے یہ اس کی کڑی کے اوپر جو کنٹرول کرنے والا ہے وہ ہے جسے اللہ کہتے ہیں یعنی فائزل اتھارٹی ہے لیکن عزیزان من! یہ فائزل اتھارٹی جھوم جائے چوم لیجیے کیسا الکریم ہے! وہ تمہارے نہیں ہے۔ تکریم انسانیت کی پرورش کرتا ہے سب سے بڑی چیز تکریم انسانیت ہے عزیزان من! دیکھیے قرآن کریم الکریم کہاں لایا ہے۔ وہ رب العرش ہے لیکن الکریم ہے۔ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰہًا اٰخَرَ لَا بُرْہَانَ لَّہٗ بِہٖ (23:117)۔ بڑا چیلنج ہے صاحب! جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہاں اس ایک کا قانون نہیں کسی اور کا بھی قانون چلتا ہے تو کہا کہ اس سے یہ نہ کہو کہ وہ مرتد ہو گیا اس کی سزا قتل ہے۔ اس سے کہو کہ دلیل و برہان کی رو سے بات کرے۔

① وہ رب ہی نہیں بن سکتا جو اس طرح کے یہ کام کرتا ہو۔

② اور یہ جو دوسرا ہے اس کے ساتھ کچھ لاگ سی ہے اس لیے اس مقدمے کو منتقل کرا کر دوسری عدالت میں لے جائیں گے۔

توحید کا دوسرا نام: پوری کائنات میں ایک ہی قانون کی فرما روائی ہے

چیلنج دیا گیا ہے کہ یہ ساری دنیا کے انکار کرنے والے بھی اکٹھے ہو جائیں تو وہ اس کے حق میں دلیل نہیں لاسکیں گے کہ اس کائنات میں دو کے قانون چل رہے ہیں۔ بہر حال یہ جو کائنات ہے جس کے اندر اس وقت تک ریسرچ ہوئی ہے اس میں تو یہ ساری دنیا کے سائنسٹ اسی نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ یہاں قانون ایک ہی کا چل رہا ہے۔ توحید کے قائل اس باہر کی دنیا کے اندر جو یہ Objective کائنات ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ <sup>1</sup> Absolute sovereignty in the entire Universe ہے۔ یہاں تک تو دہریئے بھی پہنچے ہوئے ہیں کہ یہاں قانون ایک ہی کا چلتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ توحید کے قائل ہیں۔ اس نے کہا کہ لاؤ برہان، تم ان کو چیلنج دے دو ہاتوا برہانکم ان کنتم صدقین (27:64) صاحب! یہ ہے اصل چیز۔ اپنی بات کی سچائی کے اوپر Confidence (اعتماد) بھی اتنا ہے کہ ساری دنیا کو کہتا ہے کہ ان سے کہو: ”جاؤ لاؤ دلیل“ لاؤ اپنے دعوے کے حق میں دلیل اگر سچے ہو، اور ساتھ کہتا ہے کہ لَا بُرْهَانَ لَهُ (23:117) تم دیکھو گے کہ دلیل نہیں لاسکیں گے دھاندلی کی تو اور بات ہے۔

مذہب کی سطح کے اوپر تو عزیزانِ من! روز ایک دوسرے مذہب کے مناظرے ہوتے ہیں، مباحثے ہوتے ہیں۔ وہ ادھر سے دلیل لاتا ہے وہ ادھر سے دلیل لے آتا ہے۔ کبھی کوئی فیصلہ کن نتیجہ پہ پہنچ ہی نہیں سکا۔ اگر آپ دین کے اسٹیج کے اوپر آتے ہیں جس کو آپ Purely scientific stage <sup>2</sup> کہتے ہیں اس میں تو اس کے خلاف دلیل ہی نہیں۔ وہاں تو یہ ہے کہ یہاں ایک قانون چلتا ہے، دو قانون نہیں چل سکتے۔ شرک کے حق میں کوئی کائناتی دلیل نہیں آ سکتی اسی لیے کہا کہ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ <sup>3</sup> فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ (23:117) جو یہ سمجھتا ہے کہ نہیں، کسی اور کا بھی قانون چلتا ہے وہ دیکھے گا کہ آخری نتیجہ تباہی و بربادی ہوگا۔ آخر الامر اسے دیکھنا ہوگا کہ نہیں یہاں فیصلے اسی ایک کے قانون کے مطابق ہوتے ہیں کسی دوسرے کا قانون نہیں چل سکتا اور اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو سن رکھئے کہ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (23:117) جو زراعت کے ان قوانین سے انکار کرتا ہے اس کی کھیتی کبھی بھی پنپ نہیں سکتی۔

انسانی دنیا میں وحی کے قانون کو نافذ نہ کرنے کا نتیجہ ہر سو تباہی، ہر آن تباہی ہے

یہ جو آپ کے ہاں بڑے سے بڑا ماہر زراعت ہو، جو قوانین زراعت ہیں وہ ان کی خلاف ورزی کرے اور پھر کچھ اگا کے بتائے۔ کہتا ہے وہاں تو ہتھیلی پہ سرسوں جمتی ہے۔ ساری دنیا نے Values (اقدار) سے انکار کرنے کا تماشہ دیکھ لیا۔ ساری دنیا اس وقت ایک

1 اس تمام کائنات میں صاحبِ اقتدار مطلق

2 خالصتاً سائنسی اسٹیج

جہنم کے اندر ہے۔ یہ وہ جہنم ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ جس میں نہ موت آتی ہے نہ زندگی ملتی ہے بلکہ دوسری جگہ کہا کہ چاروں طرف سے موت آتے دکھائی دیتی ہے وہ ہزار چاہتا ہے کہ میں مر ہی جاؤں لیکن موت بھی تو نہیں آ سکتی۔ یہ کیا ہے جو اس وقت ساری دنیا میں ہو رہا ہے؟ یہ ہے قانونِ خداوندی سے سرکشی کا نتیجہ یہ ہے Values (اقدار) سے کفر برتنے کا انجام۔ اور دنیا نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے کچھ نہیں بنا۔ یہ ہے جسے قرآن کہتا ہے کہ اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَفِرُونَ ﴿۱۰۸﴾ (23:117)۔ اس سورۃ کی آخری آیت آگئی لہذا قُلْ (23:118) دل کی گہرائیوں سے یہ کہو کہ رَبِّ اغْفِرْ (23:118) یہ آرزو دل میں رکھو اور دعا کی حیثیت سے زبان میں لاؤ کہ اے ہمارے پروردگار! یہ جو کچھ اس انکار سے یہاں ہو رہا ہے ہمیں اس سے اپنی حفاظت میں رکھ یہ بڑی Infection Disease (بیماری متعدی) ہوتی ہے یہ Epidemic (وبائی) ہوتی ہے جسے وبائی مرض کہتے ہیں یعنی اڑ کے لگنے والا مرض۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ دور آتا ہے جس میں شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا (67:7) ہوتا ہے کہ جس میں شر اڑ کے لگ جایا کرتا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ پھر دیکھیے کہ وبائی امراض کے اندر یہ بچارے ڈاکٹر کس قدر چلاتے ہیں اور کیا کیا تدبیریں بتاتے ہیں: یہ نہ کرنا، یہاں سے احتیاط رکھنا، وہاں سے دور رہنا، یہ ہوگا۔ وہ دبائی مچ جاتی ہے۔ یہ شرمستطیر ہو جاتا ہے۔ کہا کہ اس قسم کا شرمستطیر جب Values (اقدار) سے کفر کر کے انسانی معاشرہ میں آتا ہے تو پھر اس کے اندر یہ شر ہر وقت رہتا ہے۔ دیکھو! قُلْ (23:118)۔ کس کو پکار رہے ہو؟ رَبِّ (23:118) یہاں ربوبیت دینے والے کو کہا ہے کہ اے جس نے ہماری ربوبیت کا ذمہ لیا تھا! رَبِّ اغْفِرْ (23:118) بارالہا! تو اپنے قانونِ ربوبیت کی رو سے ایسا انتظام کر دے کہ ہم تخریبی قوتوں کی ہلاکت سامانیوں سے محفوظ رہیں۔ یہ شر اڑ کے لگتا ہے یہ شر آ رہا ہے یہ Epidemic Disease (وبائی بیماری) پھیل گئی ہے ہماری حفاظت ہونی چاہیے۔

### دعا کا مفہوم

اس سے میں عرض کروں یہ جسے دعا کہتے ہیں یہ شدتِ آرزو ہے جب بے ساختہ زبان کے اوپر آ جائے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

تمنا جب شدت اختیار کر جائے تو بے ساختہ لب پہ وہ جو الفاظ آتے ہیں اسے دعا کہتے ہیں تو اس کے لیے کرنا کچھ آپ ہی ہوتا ہے لیکن اگر آپ اس شدت کا احساس کریں کہ Epidemic (وبا) پھیل رہی ہے بڑی ضرورت ہے کہ اس سے میں محفوظ رہوں تو پھر آپ ہر وقت دیکھیں گے کہ پانی ابال کے پیوں میں باہر اس طرح سے نہ جاؤں۔ یہ جتنی بھی احتیاطی تدابیر بتائی جاتی ہیں اس کے معنی یہ ہوتے

ہیں۔ اس سے آپ کے احساس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے: رَبِّ اغْفِرْ (23:118) ہماری حفاظت کر اور اگر وہاں آپ کے ہاں ترجمے یہ ہوں کہ ایسے وقت میں کہو کہ یا اللہ! بخش دے مینوں! یا اللہ! بخش دے۔ میں نہ کچھ کراں تو بخش دے مینوں۔ روز سویر یوں فقیر اوند اہیگا اے۔ اے صدالگا ندائے پر ہوندا ہواندہ کچھ نہیں<sup>①</sup>۔ یہاں دعا کی ہے کہ سامان حفاظت بہم پہنچاؤ۔ اب اگر سامان حفاظت کے لیے کام کرو گے تو محفوظ رہو گے۔ پھر ڈاکٹر یہ بھی ساتھ کہا کرتے ہیں کہ اس سے بھی وبائی امراض کے حملے کے وقت روک تھام ہوتی ہے محض ”بخش دے“ کہنے سے نہیں۔

### لفظ رحم کا قرآنی مفہوم

یہ وہ چیز ہے جس سے قوت مدافعت ملتی ہے اور سامان نشوونما ملتا ہے۔ اس سامان حفاظت پہنچانے کے فوراً بعد کہا کہ وَارْحَمْ (23:118) رحم وہ سامان نشوونما ہے جو حالات کے بالکل مطابق ملے۔ رحم کو اس لیے رحم کہتے ہیں کہ وہاں بچے کو نشوونما کے لیے جو سامان ملتا ہے وہ اس کی ضرورت کے مطابق ملتا ہے۔ بچے اوٹھے اونوں اے سامان نہ ملے<sup>②</sup> تو اس کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ رحم (Womb) میں لچک اور لوچ ہوتی ہے۔ اس مسکن کے اندر وہ بچہ پہلو بدلتا رہتا ہے۔ اس کی حرکت باہر نظر آتی رہتی ہے، محسوس ہوتی رہتی ہے۔ اگر وہاں کوئی لچک اور لوچ نہ ہو تو وہاں بچہ نشوونما ہی نہیں پاسکتا۔ اندازہ لگائیے وہاں وہ سانس لیتا ہے، اس کا خون پیدا ہوتا ہے، دل دھڑکتا ہے اور ساری نشوونما ہوتی ہے۔ سامان نشوونما جو اسے باہر آ کر ملتا ہے، اس قسم کا وہاں کوئی سامان نشوونما نہیں ہے۔

### رزق کے ساتھ اگر Values (اقدار) شامل نہ کریں تو پھر رزق پورا ہی نہیں ہو سکتا

اس وَارْحَمْ (23:118) اور ہلاکت سامانیوں سے محفوظ رہنے کے ساتھ، ہمیں سامان نشوونما بھی ملتا رہے کے لیے دیکھیے کہ عرب کرتا کیا تھا؟ کیا بات تھی ان کے ہاں کی! ان کے ہاں رحم سے متعلق رحیم کا لفظ آیا۔ مادی زندگی کے اندر آیا تو پھر اس نے رازق کہا۔ اس رزق کے اندر جب Values (اقدار) شامل کیں تو اس نے رب کہا۔ تربیت یہی چیز ہے۔ ان عربوں کے ہاں بھی یہ تصور تھا کہ یہ جو سیپ کے اندر ایک قطرہ ابر بہار کا آتا ہے تو پھر وہ آہستہ آہستہ موتی بن جاتا ہے۔ وہ اس کو ربوبیت کہتے تھے۔ قرآن میں یونہی لفظ نہیں آئے ہوئے کہ کہیں اس کو رحیم کہہ دیا، کہیں رازق کہہ دیا، کہیں رب کہہ دیا، یونہی کہیں کہنے والی بات نہیں ہے۔ یہاں کہا

① اے بارالہا! مجھے بخش دے۔ میں کچھ نہ کروں تو مجھے بخش دے۔ روزانہ علی الصبح فقیر آتا ہے یہ صدالگا تا ہے مگر ہوتا ہوا تا کچھ نہیں۔

② اگر اسے وہاں یہ سامان نہ ملے۔

کہ وَارْحَمْ ① (23:118)۔ ٹھیک ہے اور جگہ سے بھی کسی حد تک کچھ سامانِ نشوونما مل سکتا ہے لیکن وَ اَنْتَ خَيْرُ الرَّحِمِينَ (23:118) تو سامانِ نشوونما دیتا ہے، خیر کے معنی اب میں نے بتائے تھے کہ خیر اور اختیار کا ایک ہی مادہ ہے اس سے صرف جسم کی نشوونما نہیں ہوتی، انسانی اختیارات میں بھی وسعت ہوتی چلی جاتی ہے تو تو اس قسم کا نشوونما دینے والا ہے۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے (رب)! ان حالات میں جن میں ہم گھر چکے ہیں، معاشرہ اس قسم کا بن چکا ہے کہ اس میں شرمستطیر ہو گیا ہوا ہے، تو حفاظت کا سامان بھی دے، نشوونما کا سامان بھی دے اور ایسا دے کہ ہماری بالیدگی کی وسعتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں۔

سورۃ المؤمنون کا درس آج اختتام پذیر ہوا۔ عزیزانِ من! آئندہ ہم چوبیسویں سورۃ النور سے درس کا آغاز کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

